مباحثہ گلزار نسیم

یعنی



مؤلفہ
خلاصۃ الحکما میرزا محمد شفیع شیرازی ثم لکھنوی

مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں طبع ہوا

ہشتم

باہتمام بی-بی-کپور سپرنٹنڈنٹ

۱۹۳۲ء

فہرس مباحثہ گلزار نسیم حصۂ اول

فہرس مباحثہ گلزار نسیم حصہ دوم ظریفانہ مضامین



جس وقت ۱۹۰۵ء میں گلزار نسیم کا ایک نیا اڈیشن مسٹر چکبست کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوا تو قدر دانان سخن کو یہ خیال ضرور پیدا ہوا تھا کہ اُردو زبان کی تصانیف میں ایک ایسا نیا اضافہ ہوا ہے کہ جس سے فن تنقید کو ترقی ہوگی۔ مگر یہ خیال کسی کو نہ تھا کہ اس دیباچہ سے اُردو کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ حشر برپا ہو جائے گا اور ایک زبردست مباحثہ چھڑ جائیگا جس کی یاد مشکل سے دلوں سے بھولیگی۔ مگر ہوا ایسا ہی جنوری یا فروری ۱۹۰۵ء میں گلزار نسیم کا نیا اڈیشن شائع ہوا۔ مارچ اور اپریل ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے اس نئے ایڈیشن کا ریویو شائع کیا جس میں یہ تین عنوان قائم کئے گئے تھے کہ (الف) گلزار نسیم پنڈت دیا شنکر نسیم کی تصنیف نہیں ہے بلکہ آتش کی تصنیف ہے (ب) گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے۔ (ج) گلزار نسیم کے متعدد اشعار پر اعتراضات کیے گیے تھے اس مضمون کے متعلق ۱۱۔ مئی ۱۹۰۵ء کے اودھ پنچ میں ایک مضمون منشی سجاد حسین صاحب کا شائع ہوا جس میں ظریفانہ عبارت میں یہ لکھا گیا تھا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ گلزار نسیم آتش کی تصنیف ہے تو یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس کی زبان غیر مستند ہے اسی سلسلہ میں حضرت شرر کے چند اعتراضات کا مختصراً جواب بھی دیا گیا تھا۔ اس مضمون کے بعد ایسا معرکہ آرا مباحثہ چھڑ گیا کہ جس کا سلسلہ سال بھر تک قائم رہا اور جس میں ملک کے تمام اہل قلم شریک ہوئے

اور جس کے متعلق اب تک اکثر مضامین اخباروں یا رسالوں میں نکل آتے ہیں۔ اس مجموعہ کے شائع کرنے سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ اس مباحثہ کا جو غیر لطیف حصہ تھا اس کی یاد تازہ کر کے پرانے زخم ہرے کئے جائیں یا کسی خاص فریق کی تائید میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان کی اشاعت کی جائے بر عکس اس کے اس مجموعہ کے شائع کرنے سے ہماری اصل مراد یہ ہے کہ تحقیقات زبان کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ہیں۔ یا جن میں تنقید کا لطف پایا جاتا ہے یا جن میں ایسی ظریفانہ شوخی موجود ہے جو کہ بدتہذیبی کے درجہ تک نہیں پہونچی ہے وہ ایک جگہ فراہم کر دئے جائیں اور زمانے کے ہاتھوں تلف نہونے پائیں۔

گلزار نسیم کا مباحثہ تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ ایک حصہ ایسے مضامین کا ہے جن میں علمی تحقیقات اور تنقید کی شان موجود ہے۔ اور جن کے پڑھنے سے زبان اور محاورے کی بہت سی باریکیاں حل ہو سکتی ہیں دوسرا حصہ ایسے مضامین کا ہے جن میں ظرافت کا چٹخارہ موجود ہے مگر تہذیب و ادب کو خیر باد نہیں کہا گیا ہے تیسرا حصہ اُن مضامین کا ہے جن میں ناپاک اور گندے خیالات نہایت غیر مہذب طریقے سے ظاہر کیے گئے ہیں اور نہایت شرمناک طریقے سے ذاتی حملے کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ نسیم مرحوم کی شان میں بھی ایسے ناشائستہ اور بیہودہ کلمے استعمال کئے گئے ہیں جن کو دیکھ کر شرافت کی آنکھیں خون روتی ہیں۔ ہم نے اس مجموعہ میں یہ التزام کیا ہے کہ گلزار نسیم کی بحث کے متعلق جس قدر سنجیدہ مضامین دستیاب ہو سکے وہ شائع کر دیے ہیں بہر حال کوشش یہ کی گئی ہے کہ کسی ادنے سے ادنے رسالے یا اخبار کے مضمون کو اس بحث کے سلسلہ میں نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ تاکہ کسی فریق کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ جو مضامین اُس کی تائید میں شائع ہوئے تھے وہ اس مجموعہ میں داخل نہیں کیے گئے۔ علاوہ اس کے جو ظرافت آمیز مضامین اودھ پنچ میں شائع ہوئے تھے اُن میں سے چند ایسے مضامین منتخب کر لئے

گئے ہیں جن میں ظریفانہ لطافت کے ساتھ جا بجا تنقید کا لطف بھی موجود ہے۔ اب رہے تیسری قسم کے مضامین جن میں قومی مذہبی اور ذاتی حملے نہایت فحش اور گندہ الفاظ میں کیے گئے ہیں اور جن کے ہر فقرہ کی بنیاد پر ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش ہو سکتی ہے ان کو اس مجموعہ میں جگہ نہیں دی گئی ہے بلکہ جو ظریفانہ مضامین شائع بھی کیے گئے ہیں اُن میں بھی ایک مضمون میں ایسے ایک یا دو لفظ ایک موقع پر لکھنے سے چھوڑ دیئے گئے ہیں جو تہذیب مضمون نگاری کے خلاف تھے۔ جہاں تک کہ اس جھگڑے کی تاریخ کا تعلق ہے وہ حضرت طپش بلگرامی کے قلم سے لکھے ہوئے اس مجموعہ میں درج ہے اور اس کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں لیکن ہم اس مباحثہ کی مجموعی حیثیت پر مختصراً چند خیال ضرور ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

اس علمی جنگ میں جناب شرر اور جناب چکبست کے درمیان معرکہ در پیش تھا اب رہا یہ کہ ان دونوں پہلوانان سخن میں سے کس کو فتح ہوئی اور کس کو شکست ہوئی اس کا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں۔ اس کا فیصلہ جناب احمد علی صاحب شوق منشی سجاد حسین صاحب حافظ خلیل حسن صاحب جلیل و جناب حسرت موہانی و حضرت طپش بلگرامی وغیرہ نے کر دیا ہے۔ ان حضرات کے مضامین کے پڑھنے سے یہ آئینہ ہو جاتا ہے کہ کون حق کی طرف ہے اور کون باطل کی طرف ہم صرف اس قدر لکھنا چاہتے ہیں کہ اس مباحثے کے دیکھنے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان میں فن تنقید ابھی تک بہت کچھ اصلاح طلب ہے۔ یعنی یہاں علمی مباحثوں میں بھی قومی اور ذاتی جذبات جوش میں آجاتے ہیں جن سے مذاق سلیم کا خون ہو جاتا ہے۔ فحش اور گندہ مضامین کو چھوڑ کر سنجیدہ مضامین کے پڑھنے سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے دل میں مخفی علمی تحقیقات کا شوق موجود نہیں ہے بلکہ اور جذبات بھی موجزن ہیں۔ جو انصاف کی آنکھوں پر تعصب کا پردہ ڈالے ہوئے ہیں۔ اس بحث کی ابتدا مولانا شرر سے

ہوئی مولانا موصوف کی انشا پردازی اور علمی قابلیت محتاج بیان نہیں۔ لیکن ہم نہایت ادب سے یہ عرض کریں گے کہ آپ کے مضامین سے اکثر مقام پر بیجا غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے اور ایک آدھ جگہ قومی تعصب کی بھی بو آتی ہے۔ مثلاً اتحاد مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء کے صفحہ ۹ پر مولانا موصوف اپنے احباب کے مضامین کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ ان مضامین پر ہمارے احباب اور اردو مذاق کے قدردان ضرور توجہ کریں خاصۃً مسلمان پبلک کی توجہ کی ضرورت ہے۔ ہم کو مولوی شرر ایسے بزرگ کے قلم سے ایسے الفاظ نکلتے دیکھ کر سخت تعجب ہے۔ برعکس اس کے انصاف ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ جناب چکبست کے قلم سے جو مضامین جناب شرر کے اعتراضات کے جواب میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں پوری شان تنقید قائم ہے۔ اور اپنے مخالفین کی شان میں ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کیا ہے جو مذاق سلیم کے پایہ سے گرا ہوا ہو۔ سنجیدہ مضامین کے علاوہ جو مضامین اودھ پنچ میں جنت کی ڈاک کے سلسلے میں آتش کے خطوط کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں وہ بھی لوگ جناب چکبست کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ہم کو بھی ذاتی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مضامین مذکور جناب چکبست کے لکھے ہوئے ہیں ان مضامین میں بھی مولوی شرر صاحب کی زبان دانی کا مضحکہ ضرور اڑایا گیا ہے۔ مگر کسی مقام پر قومی یا مذہبی تعصب کا شبہہ نہیں ہوتا ہے۔ ہم جناب چکبست کے معین نہیں ہیں اور نہ ہم کو ان کی رائے سے کلیتہً اتفاق ہے اور نہ ہم مولوی شرر صاحب کے تمام اعتراضات کو بیجا سمجھتے ہیں۔ ہمارا مطلب صرف اس قدر ہے کہ مولوی شرر صاحب نے جو لباس اپنے خیالات کو اعتراضات کرتے وقت پہنایا ہے اس میں کافی شان تنقید موجود نہیں ہے۔ اور جناب چکبست کا انداز تحریر ایسا ہے جس کو فن تنقید کا ایک اچھا معیار خیال کرنا چاہیئے۔ ہمارے اس بیان کی تائید وہ حضرات کریں گے جنھوں نے جناب چکبست کے وہ مضامین اردوئے معلی اور اودھ پنچ میں پڑھے۔ جو مولوی شرر صاحب

کے اعتراضات کے جواب میں شائع ہوئے ہیں اور جن سے حضرت چکبست کی علمی قابلیت کا سکہ دلوں پر جاری ہوگیا۔ علاوہ ان دو حضرات کے جن حضرات کے مضامین قابل قدر ہیں ان میں منشی سجاد حسین صاحب و منشی احمد علی صاحب شوق و حضرت مولانی صاحب اور ضامن کنتوری صاحب و حضرت جلیل کے مضامین قومی اور مذہبی تعصب سے بالکل پاک ہیں۔ اور بیجا غیظ و غضب کے جذبات سے بری ہیں۔ خصوصاً احمد علی صاحب شوق کے مراسلے فن تنقید کے اعلیٰ نمونے ہیں گو کہ جناب چکبست نے اپنے دیباچہ میں حضرت شوق کی مثنوی ترانۂ شوق کے خلاف لکھا تھا لیکن آپ نے جناب چکبست کے اس خیال کو ذاتی حملہ نہ سمجھا اور گلزار نسیم کے متعلق اپنی رائے نہایت آزادی کے ساتھ ظاہر کردی۔ یہی شان تنقید ہے۔ بعض حضرات کے مضامین معیار تنقید سے گرے ہوئے ہیں مثلاً نقاد لکھنوی صاحب نے زمانہ میں جو مضمون اس بحث کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں نسیم کو عرش پر پہونچا دیا ہے اور میر حسن کو کہیں کا نہیں رکھا ہے دکن ریویو کے نقاد صاحب نے نسیم کے خلاف ایسے ایسے اعتراض کر ڈالے ہیں کہ سبحان اللہ نسیم کا شعر ہے ؎

چمکی ہوئی پیٹ سے وہ دلگیر
آئینہ کی پشت پر تھی تصویر

نقاد صاحب (چمکی ہوئی) کو (چپکی ہوئی) پڑھتے ہیں اور جب شعر کے معنے سمجھ میں نہیں آتے ہیں تو نسیم پر اختصار بیجا کا اعتراض فرماتے ہیں۔ اسی طرح ہوا خواہ نسیم نے تہذیب کے صفحوں کو نسیم کی بیجا تعریف میں سیاہ کیا ہے ظریفانہ مضامین جو خاص منشی سجاد حسین صاحب کے قلم سے اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہیں ان کو نہایت اعلیٰ درجہ کی ظرافت کا نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اودھ پنچ کے بعض نامہ نگاروں نے ایسے مضامین لکھے ہیں جن میں باوجود دیگر محاسن کے مولوی شرر صاحب پر ذاتی حملے

سکئے گئے ہیں اور اسی وجہ سے یہ مضامین اس مجموعہ میں داخل نہیں کئے گئے

عہ مثلاً ذیل کے اقتباس ملاحظہ ہوں۔

ذرا سنئیے گا

پھلے پھولے گی اب خاک بدایوں ؛ کہ اس میں کھاد کرہی کی پڑی ہے۔ واللہ قلم توڑ دیئے ہیں۔ اور کیا کہوں زمین شعر میں ہل چلوا دیا۔ کیا روانی ہے تسلیمات کی تخم ریزی کرتا ہوں ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ ؎ جلیمن کہتی ہے بدر النسا سے ؛ تجھے اپنی مجھے اپنی پڑی ہے ؛ بندہ نواز کیا شوخ طبیعت پائی ہے۔ واللہ داغ یاد آگئے کو رنش عرض ہے دو قطعہ ملاحظہ ہوں۔

قطعۂ اول

اڈیٹر پنچ کا ہے خان عالی، ظرافت اسکی گھٹی میں پڑی ہے
وہ ہے شیر نیستان فصاحت رقیب اس کا مجسم لومڑی ہے

قطعۂ ثانی

رفیق پنچ ہے شوخ سخن سنج کہ جسکی دھوم عالم میں پڑی ہے
جو اس کی نظم ہے سلک جواہر تو اس کی نظم موتی کی لڑی ہے

حضرت اعجاز ہے اعجاز کس زبان سے آپ کی تعریف کیجائے۔ بس ان قطعوں کی لطافت کا اندازہ یہ ہے کہ حاسد کا دل بجھ کر رہ جائے گا۔ یہ آپ کی قدر افزائی ہے محبت ہے حاسد کیا اور اسکا دل کیا۔ اچھا لگے ہاتھوں ایک شعر اور سنئیے ؎ حمل قائم رہے بدر النسا کا ؛ یہ غم آٹھوں پہر جو سنٹھ گھڑی ہے ؛ اس شعر کی تعریف ناممکن ہے۔ جانصاحب کی روح لوٹن کبوتر ہو گئی ہے۔ واللہ تعقید کا نام نہیں۔ اور مضمون ایسا دُگر انبار، حضرت آپ نے تو تعریف کے پل باندھ دیئے ہیں کس زبان سے شکریہ ادا کروں ایک شعر ملاحظہ ہو اپنے رنگ میں فرد ہے ؎ پیام یار گندھی بڑھ رہا ہے ؛ جلیمن خندہ پیشانی کھڑی ہے ؛ واللہ دماغ مہک گیا اس شعر سے سچی شاعری کی بو آتی ہے مگر خیالات کی پاکیزگی شرط ہے۔ آداب کا کنٹھ کھولتا ہوں۔ اسی تلازمہ کا ایک دم ریزی شعر ملاحظہ ہو ؎

لیکن جیسے گندہ اور ناپاک اور فحش مضامین اپریل ۱۹۰۵ء اور مئی ۱۹۰۵ء کے پیام یار میں مولوی شرر صاحب کی تائید میں شائع ہوئے ہیں اور جن کے اقتباسات اس مجموعہ میں حضرت طپش بلگرامی کے مضمون میں درج ہیں انکا جواب چرکین کے دیوان میں بھی

پڑا بیہوش ہی پلنگ میں گندھی | پھریری ناک میں اُلٹی اڑی ہے

بندہ نواز کیا صنعت رکھی ہے۔ مانتا ہوں اُستاد کہتا ہو ع پھریری ناک میں اُلٹی اڑی ہے۔ دیکھئے (ناک، کو اُلٹیے تو دکان، ہو جاتا ہے اور پھریری کو کان سے تعلق ہے واللہ یہ لغت تو میں بھی نہیں سمجھا تھا آپ خالی سخن فہم ہی نہیں ہیں بلکہ معنی آفریں ہیں اچھا دو ایک شعر اور سُنیئے ؎

خدا رکھے حلیمن تو ہے تیار | مگر بدر النسا سوکھی سڑی ہے

واللہ اس شعر میں کیا بے تکلفی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اچھا ایک قطعہ اور عرض ہے۔

قطعہ

شگوفہ پنچ نے کیسا یہ چھوڑا | کہ جس سے اک قیامت آپڑی ہے
ادھر بدر النسا ہے مُنہ پھلائے | حلیمن اُس طرف روٹھی کھڑی ہے

کیا کہنا دوسرے شعر کی تعریف نا ممکن ہے۔ اس شعر کا لطف جبھی آسکتا ہے جب ذرا لطف بیان سے واقفیت ہو۔ تھوڑی سی زیادہ نہیں بیشک ایک اور شعر سنیئے ؎ نسیم صبح برساتی ہے واں پھول ٭ یہاں پر لاش آتش کی گڑی ہے۔ قسم ہے خاک و آتش و آب و باد کی اس شعر کا جواب نہیں ہو سکتا کیا لطافت ہے اور کیا پاکیزہ خیالی ہے۔ خیر تسلیمات عرض ہے آخری شعر ملاحظہ ہو ؎

شرر کہتا ہے میں چکنا گھڑا ہوں | اگرچہ بست ساون کی جھڑی ہو

واللہ کیا برابر کے مصرعے ہیں شعر کیا ہے شاعری کا سانچہ ہے۔ تسلیمات۔ کورنش۔ آداب۔ سب ایک ہی مرتبہ عرض ہیں۔ جو کچھ آپ نے فرمایا یہ محض آپ کا حسن ظن ہے۔ اور قدردانی ہے۔ بھلا شرر کے دل سے تو میرے اشعار کی داد لیجئے۔

المخبر مولانا شررؔ

از اودھ پنچ ۷۔ دسمبر ۱۹۰۵ء

ملنا مشکل ہے ہم کو تعجب ہے تو اس قدر کہ مولوی شرر نے ان مضامین کے خلاف نعرہ نفرین کرنے کے بدلے اپنا دامن ان کی تعریف سے کیوں آلودہ کیا جیسا کہ حضرت طپش کے مضمون کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے بہر حال باوجود جملہ عیوب کے یہ بحث ایک یادگار بحث ہے اس میں نکتے بہت سے محاوروں اور اصلاحوں کے متعلق اس بحث میں حل ہو گئے وہ اردو زبان کی کسی علمی بحث میں حل نہیں ہوئے ہوں گے اور نہ کسی علمی بحث میں ملک کے اتنے زیادہ سخن سنجوں نے حصہ لیا ہوگا۔

کورنش عرض ہے

کورنش عرض ہے۔ بندہ نواز۔ مزاج مبارک۔ شکر ہے خدا کا۔ کہئے آجکل کیا شغل رہتا ہے۔ حضور ایک غزل لکھی ہے کہ مومن مرحوم کی روح وجد کرتی ہے۔ فرمائیے فرمائیے سنئے بندہ پرور مطلع ہے ؎ معیبت دیکھ کر بدر النساکی حلیمن نے کہا مرضی خدا کی ؞ اے سبحان اللہ کیا کہنا ہے شعر کیا ہے بیکسی کا پچارہ ہے تیلمات کی کھونٹی گستاہوں۔

دوسرا مطلع ملاحظہ ہو

ترقی بھی شمر سنے کی تو کیا کی ؞ گھٹا کی عقل اور داڑھی بڑھا کی ؞ واللہ کیا برابر مصرعے ہیں۔ گندھی کا دل چاہے تو بھری بھر تول لے۔ قسم ہے پروردگار پاک کی کیا مصرع کہا ہے ؏ گھٹا کی عقل اور داڑھی بڑھا کی کیا ترقی اور تنزل کی تصویر کھینچی ہے فارسی کا استاد بھی کہہ گیا ہے ؏ کو سالہ ما پیر شد و گاؤ نہ شد۔ محبت ہے قدر افزائی ہے تیسرا مطلع ملاحظہ ہو۔

تو سکے آتش تہ ڈاک آئی صبا کی ؞ تلافی پنج نے کی بھی تو کیا کی ؞ واللہ شعر کیا کہا ہے۔ شاعری کی رجسٹری کر دی ہے کورنش کا لفافہ کھولتا ہوں۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ جو بینی مرغ سے مانگے ملی تھی ؞ وہی اکٹا ٹانگ گندھی کی چلا کی ؞ آہا ہا ہا کیا معنی خیز شعر ہے۔ شرر کی مرغ کی ایک ٹانگ اور گندھی کی اس کی تائید میں ہٹ دھرمی اور باتھ آگئی تھی کتنی رعنائیں ہیں کس کس کی تعریف کی جائے آداب سے ہوتے ٹپکتا ہوں۔

ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ گلزارنسیم کے خلاف اور موافق جس قدر سنجیدہ مضامین مولوی شرر صاحب اور جناب چکبست کی بحث کے سلسلہ میں شائع ہوئے ہیں وہ سب اس مجموعہ میں شائع کر دئے گئے ہیں اگر کوئی قابل اشاعت مضمون چھپنے سے رہ گیا ہو تو ناظرین اس سے ہمیں مطلع فرما دیں دوسرے اڈیشن میں وہ بھی شایع کر دیا جائے گا۔ کیونکہ ہمارا مطلب یہ ہے۔

سنئے گا ؎ ابھی اس راہ سے گندھی گیا ہو + کہے دیتی ہے بو نقش پا کی + قسم ہے قدر دانان شرر کے سر کی دبجی کا کیا لفظ لکھدیا ہے مصرع پڑھا نہیں کہ انکھے نقش پا کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی یعنی گھومے ہوئے پنجے کا نقش تو چکر گنی ہو کر رہ جاتا ہے اور ایڑی کا خدا حافظ ہے تسلیمات عرض ہے دوسرا وزن ملاحظہ ہو۔ ؎ رہے کرسی کے خواندہ تک بھی احمق + عجب تاثیر ہے آب وہوا کی۔ بارک اللہ کیا روزمرہ کی صفائی ہے۔ کیوں نہو لکھنؤ کی زبان ہے حضور کی قدر افزائی ہے ؎ جو ہو عطار اور گندھی کا فضلہ + اڈیٹر وہ بنے قدرت خدا کی + بجا ارشاد ہوا حضرت یہ وہی مثل ہے چھچھوندر لگائے چنبیلی کا تیل جناب کی سخن فہمی ہے ؎ دبا ہو جو بلی ہیں کرسی کے دامن خرابی ہے بدایوں کے قلا کی ۔ کیا کرسی اور بدایوں کا اتحاد دکھایا ہے اسکا نام شاعری ہے واللہ حاسدوں کی جوتیں ڈھیلی کر دی ہیں ؎ عجب کرسی کی مرغی میں ہے شامت + ہر ایک انڈا نکل جاتا ہے خاکی + سبحان اللہ وبحمدہ کل غزل مرصع ہے کورنش عرض ہے۔ المخبر مولانا شرر۔

آداب بجا لاتا ہوں

از اودھ پنچ مورخہ ۹۔ نومبر ۱۹۰۵ء جلد ۲۹

آداب بجا لاتا ہوں مطلع عرض ہے ؎ زلف جاناں کی طرح ہے ناگن بل کھائی ہوئی + اف تری گندھی جوانی جوش پر آئی ہوئی۔ قسم خدا کی کیا جوش ہے معلوم ہوتا ہے کہ تول کا کاگ اڑا جاتا ہے تسلیمات عرض ہے اچھا اور سنئیے ؎ اسقدر گرما گیا گندھی کہ گندھک ہو گیا + زنگ لائی ہے شرر کی آگ بھڑکائی ہوئی + واللہ قلم توڑ دیے ہیں۔ مدرسے مردک سنا تھا مگر دگندھی سے دگندھک آپ نے بنا کر دیکھیے رنجک نہ چاٹ جائے۔ کورنش عرض ہے یہ شرر اور گندھک کا اتحاد ملاحظہ ہو اپنے منہ—

کہ یہ مباحثہ ایک حیثیت میں ہمیشہ کے لئے یادگار رہے ہم کو یہ سنکر نہایت خوشی ہوئی کہ جناب چکبست اور مولوی شرر صاحب میں اب کوئی ذاتی رنجش باقی نہیں ہے اور یقین ہے کہ جناب منشی سجاد حسین صاحب اور مولوی شرر صاحب میں بھی صفائی ہو جائے۔

راقم الآثم خلاصۃ الحکما میرزا محمد شفیع شیرازی ثم الکھنوی عفا عنہ

اپنی تعریف گوکہ بیجا ہے مگر اتنا کہوں گا کہ اگر آتش زندہ ہوتے تو اس شعر کی داد دیتے خیر ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎ دیکھنا انصاف اس پروردگار پاک کا + پردہ در کی پردۂ عصمت سے رسوائی ہوئی۔ اعجاز ہے اعجاز۔ خفت قسم ہے ستار عیوب کی کیا روانی ہے اور کیا پاکیزگی و گلدازی کی صادق القول چلبین اسپر تسلیم ہے آداب کا پردہ اٹھاتا ہوں حضور نے چلبین اور علیمین کی تجنیس خطی خوب پیدا کی ایک شعر اور سنئے ؎ ہے علیمین سرنگوں بدر النسا ہے شرمسار + اک پیام یار سے دونوں کی رسوائی ہوئی + آہاہا کیا شعر کہا ہے .....

..... بس آگے کیا کہوں تعریف ناممکن ہے میں کیا اور میرا شعر کیا آپ کا حسن ساخت و قدردانی ہے ؎ شور کے داڑھی سے تنکے کی پھریری ہو بہم + آجکل گندھی کے دل میں ہے یہ دھن آئی ہوئی + قسم خدا کی اسکا نام جدت ہے۔ دیکھئے اس تنکے کی اوٹ میں کیا کیا نکتے پنہاں ہیں اور دھن، بھی کیا خوب کیا کیا رعایتیں ہیں قدر افزائی ہے ناچیز اپنے تئیں کچھ سمجھتا نہیں محض تخلص کی رعایت سے شعر کہہ لیتا ہوں ؎ بیکسی پر اپنی رو کر یہ علیمین نے کہا + لکھنؤ کی صبح مجھکو شام رسوائی ہوئی + واللہ رقت آگئی اب ایسا شعر نہ پڑھئے گا ورنہ بزم ماتم بپا ہو جائے گی اچھا دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎ ہوش اڑ جاتے ہیں گندھی کے شال اوڑھے عطر + ہے اگر طبع جناب نماد گرائی ہوئی۔ کیا کہنا۔ جی ہاں گندھی کیا اور اس کی ہستی کیا۔ نوکر باوجود پیرانہ سالی کے عقل نہ آئی۔ عمر بھر تو تیل بیچا کئے ؎ بوتلوں کے کاگ نکالتے نکالتے۔ ایک ٹانگ پیچ کش ہو کر رہ گئی + اب بچپن میں فارسی پڑھی تھی اسکا خیال آیا ہے مضمون نگار بنتے ہیں۔ تسلیمات عرض ہے آخری شعر ملاحظہ ہو ؎ ہے بیاباں کے تکیے پر جوانی کا درخت + پھر اس کی آگ کاری ناگہانی ہوئی۔ اس شعر پر سید آتش اور ناسخ زندہ ہوتے مگر اسکا جواب ناممکن ہے آداب بجا لاتا ہوں۔

الفقیر میلا نا شرر ۸ جولائی سنہ [illegible]

از اودھ پنچ مطبوعہ ۸- فروری ۱۹۱۶ء جلد ۳۰ نمبر ۶

گلزار نسیم کے جھگڑے کی تاریخ

(از طپش بلگرامی)

فاش میگویم واز گفتہ خود دلشادم — بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

جناب اڈیٹر صاحب۔ تسلیم اودھ پنچ کے گذشتہ نمبر میں ایک تحریر میری نظر سے گذری جس میں اس امر کے متعلق بحث تھی کہ گلزار نسیم کی بحث نے جو اسقدر طول کھینچا ہے تو اسکے لیے کون ذمہ دار ہے چونکہ میں نے بھی اس بحث کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے لہذا اسکے متعلق میں چند خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

جناب من دو ماہ پیشتر میرا خیال تھا کہ اس بحث نے جو اسقدر طول کھینچا ہے تو اسکے لئے صرف اودھ پنچ ذمہ دار ہے۔ اور عبد الحلیم صاحب شرر بالکل معصوم ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ میں نے شروع سے اس بحث کے متعلق مضامین نہ دیکھتے تھے محض دو چار ماہ سے میں ادھر اُدھر کچھ پڑھ لیا کرتا تھا اور چونکہ زیادہ تر مضامین اودھ پنچ میں دیکھتا تھا لہذا میں خیال کرتا تھا کہ شرر بیچارے تو خاموش ہیں مگر اودھ پنچ مسلسل انکے اعتراضات و تصنیفات کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔ مگر حال میں میرا لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں جاکر میں نے مختلف افواہیں سنیں۔ کوئی شرر کو ملزم قرار دیتا ہے کوئی اودھ پنچ کی زیادتی کی شکایت کرتا تھا۔ اس گتھی کے سلجھانے کے لیے میں نے وہ تمام مضامین جمع کیے جو کہ اس بحث سے متعلق شائع ہوئے تھے اور سلسلہ وار پڑھے۔ ان کے پڑھنے سے مجھ پر یہ امر آئینہ ہوگیا کہ اودھ پنچ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور جس قدر حصہ اس بحث کا قابل الزام ہے اسکے لئے شرر صاحب ذمہ دار ہیں۔ چونکہ میں خیال کرتا ہوں کہ اکثر اصحاب میری ہی طرح اڈیٹرین میں

ہونگے کہ اس بحث کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اور اسکی خرابیوں کے لئے کون واقعی ذمہ دار ہے لہذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ناگوار بحث کی تاریخ کی نسبت چند سطور تحریر کی جائیں جن سے ہر شخص منصفانہ نتیجہ نکال سکے۔

مارچ و اپریل۔ دلگداز میں شرر صاحب نے گلزار نسیم پر ریویو شائع کیا جسمیں تین عنوان قائم کئے گئے تھے۔

(۱) گلزار نسیم آتش کی تصنیف ہے۔

(۲) گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے۔

(۳) گلزار نسیم کے چند قابل اعتراض شعر تمثیلاً پیش کئے گئے تھے۔

۱۱۔ مئی ۱۹۰۵ء کے اودھ پنچ میں ایک مضمون ایڈیٹوریل نکلا جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ جس حالت میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ گلزار نسیم آتش کی تصنیف ہے تو اس کی زبان پر اعتراض کرنا۔ گویا کہ لکھنؤ کے سرمایہ ناز شاعر آتش کی زبان پر اعتراض کرنا ہے۔ نیز یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ شرر کو اہل لکھنؤ کا وکیل بن کر اعتراضات شائع کرنے کا منصب نہیں حاصل ہے وہ اپنی ذاتی ذمہ داری پر ایسا کر سکتے تھے۔ علاوہ اسکے چند اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا تھا۔ میں نے اودھ پنچ کا یہ مضمون دیکھا اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو کہ شستہ ظرافت کے پایہ سے گری ہوئی ہو۔ اور دیگر حضرات یہ مضمون دیکھکر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں

اگر شرر صاحب کے مزاج میں مصالحت پسندی کا جوہر ہوتا تو وہ یا اودھ پنچ کے مضمون کا باضابطہ جواب دیتے یا خاموش رہتے مگر انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے اڈیٹر اودھ پنچ کی سراسر سبکی اور علی توہین متصور تھی اور میں شرر صاحب کی اس نازیبا حرکت کو اصل بنائے فساد قرار دیتا ہوں۔ یعنی شرر صاحب نے ۱۶۔ جون ۱۹۰۵ء کے ریاض الاخبار میں ایک مضمون (بدر) کے نام سے شائع کرایا جس میں یہ لکھا تھا کہ ۱۱۔ مئی ۱۹۰۵ء اودھ پنچ میں جو مضمون شرر کے خلاف شائع ہوا ہے وہ منشی سجاد حسین کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ

کسی اور شخص کا لکھا ہوا ہے (اور یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس مضمون کا انداز عبارت شرر کے انداز عبارت سے بالکل مشابہ ہے سر مو فرق نہیں) اور یہ لکھ کر اودھ پنچ کے اڈیٹوریل مضمون کا خوب خاکہ اڑایا گیا تھا اور اس کے لکھنے والے کو فاتر العقل وغیرہ کا خطاب دیا گیا تھا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر اڈیٹر اودھ پنچ کی کیا ذلت ہو سکتی تھی کہ اس کے مضمون کے لئے لکھا جائے کہ کسی اور شخص کا لکھا ہوا ہے۔ شرر صاحب بھی لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ شرر صاحب اُن سے دریافت کر سکتے تھے کہ آیا یہ آپ کا مضمون ہے کہ راقم کا نام غلطی سے رہ گیا ہے۔ مگر شرر صاحب کا تو منشا ہی کچھ اور تھا۔ اسی سلسلہ میں اڈیٹر اودھ پنچ کی تردید میں ایک بیہودہ اور مخش مضمون اپریل ۱۹۰۵ء کے پیام یار غالباً نمبر پیام یار کا حسب معمول دو ایک ماہ بعد شائع ہوا ہوگا، میں پھر (بدر) کے نام سے اور شرر کی تائید میں شائع ہوا جس میں مختلف بیہودہ کلمات کے علاوہ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ منشی سجاد حسین صاحب نے کچھ ایسی گھڑی جنم لیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کا جب کوئی جھگڑا پیش ہوتا ہے تو وہ ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں اور اسی اصول پر گلزار نسیم کی طرفداری کر رہے ہیں۔ یہ فقرہ بہت قابل لحاظ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا ہی میں شرر اور انکے طرفداروں نے اس علمی بحث کو ایک مذہبی جھگڑا بنانے کی کوشش کی مگر اودھ پنچ نے ان بیہودہ اور مخش کلمات کو تو ناقابل لحاظ سمجھ کر ترکی بہ ترکی جواب نہ دیا ۲۹، جون ۱۹۰۵ء کے

ع ۵ مثلاً شرر کا اعتراض تھا کہ جانی کا لفظ سوائے معشوقہ کے اور وہ بھی خلوت کے وقت کسی دوسرے کی شان میں نہیں استعمال ہو سکتا۔ اڈیٹر اودھ پنچ نے اس اعتراض کی نسبت لکھا تھا کہ ابا جانی جو لکھنؤ کا عام محاورہ ہے اسکی ماہیت کیا ہو گیا معشوق کو ابا جانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسکا جواب ان بیہودہ الفاظ میں دیا گیا تھا کہ آپ اپنی والدہ کو جانی کہئے تو آپ کے والد آپ کو بتا دینگے کہ (جانی) کا استعمال غلط ہے کہ صحیح ناظرین خود انصاف کر سکتے ہیں کہ اودھ پنچ کے پہلے مضمون کے خلاف ایسے بیہودہ مضامین شائع کئے گئے تھے ۱۲

اودھ پنچ میں ایک مضمون مولانا (بدر الشرر) کی خاک بیزی) کے عنوان سے لکھا اور اس میں ان گستاخانہ جملوں کو دہسکڑا لمڑیا ۔ یعنی یہ لکھا کہ شرر نے ہمارے ساتھ بھی وہی ظلم کیا ہے جو پنڈت دیا شنکر نسیم کے ساتھ کیا ہے یعنی ہمارے جیتے جی یہ لکھنے میں تکلف نہیں کیا کہ جو مضمون ۱۱ مئی کے اودھ پنچ میں اڈیٹوریل کالم میں شائع ہوا ہے وہ ہمارا نہیں ہے ۔ بلکہ کسی نامہ نگار کا ہے ۔ موت کے بعد تو خدا ہی حافظ ہے ۔ ان فقروں کے علاوہ اکثر اعتراضات کے جواب الجواب بھی لکھے تھے ۔ اودھ پنچ کے اس مضمون کے جواب میں ایک بیہودہ اور فحش مضمون پیام یار میں شائع ہوا ہے جسکے فقرے کسی مہذب تحریر میں نقل نہیں ہو سکتے ۔ اس مضمون میں منشی سجاد حسین صاحب کی شان میں متعدد گستاخانہ کلمے لکھے گئے تھے ۔ ممکن ہے شرر یہ عذر پیش کریں کہ چونکہ ان مضامین کے نیچے انکا نام نہیں لکھا تھا اسلئے وہ انکے ذمہ دار نہیں ہیں بیشک شرر قانوناً ان مضامین کے ذمہ دار نہیں ہیں ۔ مگر اخلاقاً وہ ان کے ذمہ دار ضرور ہیں کیونکہ سب اہل لکھنؤ جانتے ہیں کہ مضمون شرر کی مرضی سے شائع ہوتے تھے اور ان کی تردید کرنے کے برعکس انھوں نے اتحاد میں ان کے لکھنے والے کو (یعنی ، بدر) جو کہ اسم فرضی کے بدلے ان مضامین کے نیچے لکھا رہتا تھا (مکرم) کا خطاب دیا (دیکھو اتحاد یکم اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲) جب اس قسم کے بیہودہ اور فحش مضامین اودھ پنچ کے خلاف نکلے تو اس کے نامہ نگاروں نے بھی کروٹ لی اور جان صاحب کی ریختی نکلی جس میں شستہ ظرافت کے پیرایہ میں شرر کی دیہاتی زبان کا خاکہ اڑایا گیا تھا اس کے بعد ۲۰ ۔ جولائی ۱۹۰۵ء سے آتش کے مشہور خطوط کا سلسلہ شروع ہوا ان خطوط میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ شرر کے اعتراضات والے مضمون میں کس قدر منطقی لغزشیں ہیں اور شرر نے کیا کیا رنگ دیئے ہیں آتش کے دو خط شائع ہوئے تھے کہ جناب منشی احمد علی صاحب شوق کا لاجواب مراسلہ ۳ ۔ اگست ۱۹۰۵ء کے اودھ پنچ میں شائع ہوا یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ منشی صاحب موصوف نے صاف صاف الفاظ میں لکھدیا تھا کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان ہے

اور اگر کچھ غلطیاں نسیم کے کلام میں موجود ہیں تو اُن سے کسی شاعر کا کلام پاک نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے نظیری ظہوری وغیرہ کی غلطیاں تمثیلاً پیش کر دی تھیں منشی سجاد حسین صاحب نے اس مراسلہ کو تو قول فیصل قرار دیا جس کے معنی یہ تھے کہ گویا بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ اور واقعی ہے جناب منشی احمد علی صاحب شوق کے ایسے مشہور اور مستند شاعر کا قول فیصل ہر صورت سے قابل وقعت تھا مگر شرر صاحب نے اپنی خفت پر جھلا کر پھر ایک ایسی نازیبا حرکت جس سے بحث تازہ ہو گئی اور جس کا خمیازہ اب وہ اُٹھا رہے ہیں یعنی ۳۰ اگست کو حضرت شوق کا مراسلہ شائع ہوا یکم اگست ۱۹۰۵ء کے اتحاد میں جو کہ ۹ اگست کو شائع ہوا تھا شرر نے اڈیٹر اودھ پنچ کو شہدا قرار دیا۔ اور اودھ پنچ کو بحیثیت مجموعی بدنام اور ذلیل کرنا چاہا اور یہ لکھا کہ اودھ پنچ نے اس بحث کو (گلزار نسیم کی بحث) بہت ناپاک اور گندے طریقے سے اٹھا لیا، ہر منصف مزاج اس اودھ پنچ کے فائل اٹھا کر دیکھ سکتا ہے کہ یکم اگست میں جو مضامین اڈیٹر اودھ پنچ اور منشی احمد علی صاحب شوق کے نکلے ہیں۔ یا آتش کے خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں یا ان میں کس میں شہدپن کا اظہار کیا گیا ہے اور کس میں پاک اور گندہ طریقہ بحث کا اختیار کیا گیا ہے۔ کیا طریقہ اختیار کیا جاتا تو قابل معافی تھا۔ کیونکہ ریاض الاخبار (بدر) ولسے مضمون میں اور پیام یار کے گندے اور ناپاک آرٹیکل میں بلا وجہ سخت و سُست کہا گیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ منشی سجاد حسین صاحب نے منشی احمد علی صاحب شوق کے مراسلہ کو قول فیصل مان کر بحث کو ختم کر دیا تھا۔ مگر شرر صاحب نے یہ دیکھ کر حضرت شوق کے محققانہ مراسلہ نے ان کے اعتراضات کی وقعت کھو دی اپنی جھینپ مٹانے کے لیئے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ یعنی اس تعلیمی مباحثہ کو مذہبی اور قومی جھگڑا بنانا چاہا۔

اور لوگوں کو اودھ پنچ کے خلاف یہ کہکر برانگیختہ کرنا چاہا کہ اودھ پنچ ایک ہندو شاعر کی طرفداری کر رہا ہے جیسا کہ پیام یار میں پیشتر ہی لکھا جا چکا تھا کہ منشی سجاد حسین صاحب نے ایسی گھڑی جنم لیا ہے کہ جب ہندو مسلمانوں کا جھگڑا ہوتا ہے تو وہ ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں

لہذا اس موقع پر بھی گلزار نسیم کے مؤید ہیں۔ نیز شرر کی تائید میں اور نسیم مرحوم کی خدمت میں جو فحش ناپاک اور گندے مضامین مسلسل نکل رہے ہیں اور جن کی بدولت (اتحاد و دلگداز بند ہے) انھیں ناپاک مضامین کی نسبت حضرت شرر اپنے قلم مبارک سے اتحاد میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان مضامین پر ہمارے احباب اور اردو مذاق سخن کے قدردان ضرور توجہ کریں خاصۃً مسلمان پبلک کی توجہ کی ضرورت ہے (دیکھو اتحاد یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۸) ہم شرر اور ان کے معاونین سے پوچھتے ہیں کہ اگر شرر نے اس علمی مباحثہ کو قومی یا مذہبی جھگڑا نہیں بتا دیا ہے تو اس جملہ کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی (کہ خاصۃً مسلمان پبلک کی توجہ کی ضرورت ہے)

اب تو شرر صاف صاف گلزار نسیم کی بحث کو مذہبی اور قومی جھگڑا بتا رہے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ شروع ہی سے ان کا در پردہ یہی مطلب تھا کہ گلزار نسیم کی بحث میں قومی و مذہبی تعصب سے کام لیا جائے۔ کیونکہ گلزار نسیم کے نئے ایڈیشن پر جب انھوں نے ریویو کیا تو ایسے الفاظ نسیم مرحوم کی شان میں استعمال کئے جن سے قومی و مذہبی تعصب کی توانائی تھی (کہیں نسیم کو در پردہ جاہل و بدتمیز قرار دیا ہے۔ کہیں گلزار نسیم کی زبان کو لکھنو کی بازاری زبان سے بدتر کہا ہے۔ جن صاحب کو شک ہو وہ مارچ و اپریل ۱۹۰۵ء کے دلگداز دیکھ کر میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ شرمناک حرکت شرر صاحب کی یہ ہے کہ انھوں نے نسیم کے چال چلن پر حملہ کیا ہے۔ یعنی آپ نے مارچ کے دلگداز میں لکھا ہے کہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر آتش نے (اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انھیں نوعمر شاگرد (یعنی نسیم) سے تھی اس مثنوی (گلزار نسیم) کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو اور ... ... پھر بجائے اپنے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہو (دلگداز مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۴۲) جب یہ اعتراض کیا گیا کہ آخر آتش کو نسیم سے کیا دلبستگی تھی تو اس کا جواب ریاض الاخبار کے (بدر) والے مضمون میں یوں دیا گیا۔ کہ مولانا شرر نے ... ... خود تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسی گلزار نسیم کو کیا عجب آتش نے تفنن طبع کے لیے کہا ہو اور غلطیاں دیکھ کے (نوعمر خوبصورت شاگرد کی طرف منسوب کر دیا ہو

(دیکھو ریاض الاخبار ۱۶۔ جون ۱۹۰۵ء صفحہ ۵) اس کے بعد مئی ۱۹۰۵ء کے پیام یار میں (جو حسب معمول دیر سے شایع ہوا تھا) مولانا شرر کے اس وعدے کی یوں تشریح کی گئی کہ (آتش ...... نے پنڈت جی (نسیم کو بنایا تھا ...... کیونکہ کشمیری حسن نے وہاں تو من شدی من تو شدم کا مضمون پورا کر رکھا تھا خالی بنانے کے لئے مثنوی کی وضع میں کچھ غلط سلط شعر کہہ ویسے تھے پنڈت جی) (نسیم) نے خوشی میں آکے اسے شائع کر دیا اور یہ نہ سمجھے کہ میں اُستاد کا شاگرد نہیں مسخرا ہوں) بجاے اس کے کہ شرر ان سنئے اور بیہودہ مضامین کی ظاہرا تردید کرتے انھوں نے (اتحاد میں اس شخص کی بہت تعریف کی جس کا نام ان مضامین کے نیچے لکھدیا جاتا تھا۔ یعنی (بدر) کی چنانچہ انھیں مضامین کی نسبت شرر صاحب فرماتے ہیں کہ اعتراضوں کے جواب میں اور وہ تریخ کے صفحوں پر کچھ لکھا گیا ہے وہ خود بتائے دیتا ہے کہ ان اعتراضات کے اُٹھانے کی کوشش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ اگر کسی صاحب کے دل میں کچھ شبہہ رہ گیا ہو تو اُس کا فیصلہ ...... جناب بدر نے کر دیا" دیکھو اتحاد یکم جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۳) شرر صاحب ہر ایک سے کہتے پھرتے ہیں کہ مسٹر چکبست نے گلزار نسیم کے نئے ایڈیشن کے دیباچہ میں نسیم کو اکثر شعرائے لکھنؤ پر ترجیح دی ہے اور قومی جوش سے کام لیا ہے اسلئے دلگداز میں نسیم کی خبر لی گئی۔ اگر یہ مان لیا جاوے کہ چکبست نے واقعی اور شعرائے لکھنؤ کے ساتھ نا انصافی کی ہے تو اس کے ذمہ دار چکبست ہیں نہ کہ نسیم۔ اگر شرر کو اعتراض کرنا تھا تو وہ چکبست کے دیباچہ پر اعتراض کرتے۔ بقول حضرت جلیل (مہتمم دبدبۂ آصفی) یہ کہاں کا انصاف ہے کہ چکبست کے مقدمہ کے جواب میں گلزار نسیم کے پھول روندے جاتے ہیں بلکہ نسیم مرحوم کی شان میں فحش کلمے استعمال کیے جاتے ہیں اس سے بڑھکر بد تہذیبی اور بد اخلاقی کیا ہو سکتی ہے ہم نے خود چکبست کا دیباچہ پڑھا ہے مجھے خود مسٹر چکبست کے اکثر خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ مثلاً یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ

نسیم کی غزلیں زند و صبا کی غزلوں کے پایہ کی ہیں۔ مگر اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں نسیم مرحوم کی شان میں فحش کا استعمال کرنے پر آمادہ ہو جاؤں یا چکبست کو گالیاں دینے لگوں ہر شخص ایک خیال کی پرستش نہیں کر سکتا۔ دیکھنا تو یہ جاتا ہے کہ خیالات کا اظہار کس صورت سے کیا جاتا ہے۔ چکبست کی رائے سے اتفاق ہو کہ نہو مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ چکبست نے زند و صبا کی توہین کی ہے۔ برعکس اسکے زند و صبا و نسیم کا موازنہ نہایت تہذیب متانت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ آتش مرحوم کی شاعری کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے بہت صحیح کہا گیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ چکبست نے آتش و ناسخ و زند و صبا کی توہین کی ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکلتا ہے کہ چکبست کو جواب دینے کے بدلے نسیم مرحوم کی شان میں بیہودہ الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اور گلزار نسیم پر بے تکے اعتراض محض اس امید پر جڑے جائیں کہ مسلمان تو سب اعتراضات تسلیم ہی کر لیں گے اور اگر کوئی انصاف پسند مسلمان ان اعتراضات کی تردید کرے تو اُسے گالیاں دی جائیں جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ تین چار ماہ سے برابر جناب اڈیٹر صاحب اودھ پنچ و جناب منشی احمد علی صاحب شوق۔ پروفیسر شہباز حضرت صبا دہلوی جناب منشی آغا صاحب ہوش لکھنوی مولوی ممتاز حسین صاحب عثمانی۔ جونیر اڈیٹر الحکم، وغیرہ کی شان میں فحش اور بیہودہ مضامین نکل رہے ہیں۔ اور اسی قسم کے مضامین کی نسبت شرر صاحب لکھتے ہیں کہ مسلمان پبلک کی توجہ کی خاص ضرورت ہے۔

اصل یہ ہے کہ اس وقت تو شرر صاحب نے متعصبانہ حماقتوں کی معذرت کے لئے (بہانہ بسیار ہیں سے) یہ بہانہ ڈھونڈھ لیا ہے کہ چونکہ چکبست نے نسیم کی تعریف کی تھی اور ان کو زند و صبا کا مد مقابل ٹھہرایا تھا لہذا بحیثیت ایک مسلمان کے میرا فرض یہ تھا کہ نسیم کی دھجیاں اڑا دوں مگر جو لوگ شرر صاحب سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں آپ کی عادت میں داخل ہیں۔ جب شرر صاحب نے "منصور موہنا" لکھ کر

ہندو مسلمانوں میں آتش تعصب مشتعل فرمائی۔ تو اُس وقت کون سا دیباچہ لکھا گیا تھا۔ یا جب سکینہ بنت حسین (پر آپ نے ایک بیہودہ مضمون لکھ کر شیعہ و سنیوں میں ہنگامہ آرائی کرادی اور خود بھی حیدرآباد میں سخت خفت اُٹھائی تو اسوقت کس نے آپکو چھیڑا تھا میں کہتا ہوں کہ جو شخص اپنے مذہب کی ایک مقدس خاتون کی شان میں بیہودہ اور گستاخانہ کلمے لکھنے میں تکلف نہ کرے اسکے لئے غیر مذہب کے کسی شاعر کی توہین کرنا کیا بات ہے۔ اسی طرح جب آب حیات (مصنفہ آزاد دہلوی) شایع ہوئی تو اسکا خیر مقدم دلی لکھنؤ کے اساتذہ نے نہایت کشادہ پیشانی سے کیا۔ کیونکہ یہ سب جانتے تھے کہ جو کچھ حالات شعرائے لکھنؤ و دلی کے اس کتاب میں قلمبند کئے گئے ہیں وہ دس برس اگر اور نہ لکھے جاتے تو کسی کو یاد بھی نہ رہتے۔ مگر شرر صاحب نے اپنے اُردو لٹریچر والے مضمون میں محمد حسین صاحب آزاد مصنف آب حیات کو بھی تعصب کا ملزم ٹھہرایا اور یہ لکھا کہ آزاد نے دہلی کے تو بہت سے شعرا کا ذکر کیا مگر لکھنؤ کے صرف دو ہی شاعر (آتش، و ناسخ) تذکرے کے لئے منتخب کیے اور رند و صبا و خلیل و رشک وغیرہ کو چھوڑ دیا جو کہ اکثر باتوں سے آتش و ناسخ سے بڑھکر تھے اس مضمون کا صرف یہ مطلب تھا کہ دہلی اور لکھنؤ کی پرانی معرکہ آرائیوں کا زخم تازہ ہو جائے ورنہ جس شخص کو اُردو تاریخ سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ جانتا ہے کہ محمد حسین آزاد نے اپنا تذکرہ پانچویں دور پر ختم کر دیا ہے اور چونکہ لکھنؤ میں آتش و ناسخ و دبیر و انیس اس پانچویں دور کے باکمال شعرا تھے۔ لہذا انکا ذکر کیا ہے۔ رند و صبا و رشک وغیرہ چھٹے دور کے شعرا تھے جن کا ذکر پانچویں دور میں نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا انکا ذکر نہ کرنا محمد حسین آزاد کے تعصب کا ثبوت نہیں خیال کیا جا سکتا تھا۔ ان مثالوں کے پیش کرنے سے یہ غرض ہے کہ شرر صاحب نے اپنی قدیم عادت کے مطابق (گلزار نسیم کے متعلق یہ ہنگامہ برپا کیا تھا اور یہ سمجھے تھے کہ سب اہل اسلام اس علمی تعصب میں میرے شریک رہیں گے مگر اڈیٹر صاحب اودھ پنچ و منشی احمد علی صاحب شوق کے دندان شکن مضامین نے شرر صاحب کے حواس گم کر دیے۔ گو کہ مسٹر چکبست نے منشی احمد علی صاحب شوق کے

خلاف لکھا تھا مگر منشی صاحب کی عالی ظرفی اور بلند نظری نے یہ نہ گوارا کیا کہ چک بست کو خواہ مخواہ گالیاں دینے لگیں یا گلزار نسیم کو پامال کرنا شروع کر دیں بلکہ برعکس اسکے آپ نے جو حق بات تھی وہ لکھدی شرر یاد رکھیں کہ اسلام کا نام ایسی ہی انصاف پسندی سے روشن ہوتا ہے جس کا ظہور جناب شوق سے ہوا ہے۔ نہ کہ بیہودہ ہٹ دھرمی سے خیر کچھ ہو شرر صاحب اپنی ان حرکتوں کی بدولت کئی مرتبہ خفت اٹھا چکے ہیں مگر اس مرتبہ انھیں اودھ پنچ سے سابقہ پڑا ہے جسکا مارا پانی نہیں مانگتا۔ حضرت شرر اکثر مضامین میں یہ بھی شایع کراتے ہیں کہ تمام اساتذہ حال اور تمام اخبار اور رسالہ میری طرف ہیں اور میرے اعتراضات تسلیم کرتے ہیں۔ مگر یہ محض غلط ہے آج تک ایک مستند شخص نے بھی شرر کی تائید میں ایک حرف نہیں لکھا اور نہ کسی باوقعت اخبار یا رسالہ نے ان کی تائید کی ہے اس بحث کے متعلق جو قابل لحاظ مضامین نکلتے ہیں ان سے اقتباس درج ذیل ہیں جناب منشی احمد علی صاحب شوق تحریر فرماتے ہیں۔

(الف) میں تو یہی کہونگا کہ یہ مثنوی نسیم مرحوم ہی کی ہے اسکے خلاف صرف قصہ اور کہانیوں سے کوئی دلیل اس بات پر نہیں قائم ہوسکتی کہ یہ مثنوی کسی اور کی ہے اگر گلزار نسیم حضرت نسیم کی نہیں ہے تو گلستان شیخ سعدی کی نہیں ہے۔ اور خمسہ نظامی کا نہیں ہے اس کیلئے بھی حضرت نسیم کی جانب سے چند قصہ تصنیف ہو سکتے ہیں۔

(ب) نسیم مرحوم لکھنؤ کے رہنے والے تھے اہل زبان تھے جب باہر والے لکھنؤ میں رہکر زباں داں ہو سکتے ہیں تو وہ شخص جسنے لکھنؤ میں پیدا ہوکر یہیں آنکھیں کھولی ہوں یہیں زبان کھولی ہو اسکا فصیح البیان ہونا کیا تعجب کی بات ہے۔

(ج) نسیم مرحوم سے اگر کہیں چوک ہوئی ہو تو اس سے انکی فصاحت اور شاعری پر حرف نہیں آسکتا ۔۔ ۔۔ ۔۔ مثل ہے کہ شہسوار ہی گرتا ہے۔ اس سے میری غرض یہ ہے کہ شاعر ہی سے خطا ممکن ہے۔ نہ کہ اس سے جو شعر ہی نہ کہے آپ شعرائے فارس کے دیوانوں کو

ملاحظہ فرمائیے کتنے شعرا ایسے ملیں گے جنھوں نے الف کے دعوے کے بیں عین کو تقطیع سے گرا دیا ہے تو کیا اس سے ان کی استادی اور فصاحت بیانی مٹ گئی تو یہ البتہ اسقدر ہم کہیں گے کہ دھوکا ہوا۔ خطائے انسانی کی مثالیں میں پیش کرتا ہوں شاید میرے ان دوستوں کی جو نسیم مرحوم پر نکتہ چینی فرمارہے ہیں ان مثالوں سے تسکین ہو جائے اس موقع پر جناب شوق نے محتشم کاشی۔ کلیم۔ اسمٰعیل اصفہانی ظہوری وغیرہ کی غلطیاں دکھلائی ہیں۔ مضمون شوق مطبوعہ ۳۔ اگست ۱۹۰۵ء دوسرے مضمون میں جناب شوق فرماتے ہیں میں اپنے معزز دوست حضرت چکبست سے رشک کروں تو درست ہے۔ غالباً میرے معزز دوست بابو جوالا پرشاد صاحب برق کو یہ بات یاد ہو کہ میں نے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں ایک بار قصد کیا تھا کہ نسیم مرحوم کی لائف لکھوں اور اس کا ذکر بھی کیا تھا مجھے زمانہ کی گردش نے لکھنؤ سے دور پھینک دیا اور حضرت چکبست میرے دل کی تمنا کو اڑا لے گئے۔ خیر تمنا تو نکل گئی وہ میرے قلم سے نہیں حضرت چکبست کے قلم سے سہی .... نسیم کی لائف لکھ کر اگر حضرت چکبست نے اردو کی شاعری اور زبان پر احسان کیا ہے تو انکا شکر گذار ہونا مناسب ہے تاکہ حوصلے بڑھیں اور لائف سے مُردوں کے نام زندہ ہوں۔ آخر میں اور حضرت تو سب مرنے کو آئے ہیں اگر میں زندگی میں یہ خیال کروں کہ مرنے کے بعد مجھے لوگ گالیوں سے یاد کریں گے تو کس قدر میری روح کو زندگی میں تکلیف ہو (مضمون شوق مطبوعہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء اودھ پنچ)

حضرت حسرت موہانی اڈیٹر اردوئے معلّی تحریر فرماتے ہیں۔

(۱) گلزار نسیم کی تصنیف کو طریقہ آتش کے ساتھ منسوب کرنا خطا ہے بلکہ ہمارے نزدیک اس قسم کی بے بنیاد روایتوں کو درحقیقت صحیح سمجھنا اپنے تئیں مذاق صحیح سے بیگانہ ثابت کرنا ہے۔

(۲) گلزار نسیم کی زبان بیشک لکھنؤ کی زبان ہے اگرچہ اس میں بعض غلطیاں موجود ہیں

لیکن ساتھ ہی ساتھ ان چند غلطیوں کی بنا پر یہ کہنا نہایت درجہ کی کوتہ نظری ہے۔ کہ نسیم کی زبان لکھنؤ کی زبان نہیں رہی یا یہ کہ ان غلطیوں نے (گلزار نسیم) کو مٹا دیا۔

(۳) حضرت شرر کے اعتراضوں میں سے اکثر اعتراضات موجودہ زبان کے لحاظ سے صحیح ہیں اور غالباً مسٹر چکبست کا مضمون (جواب) دیکھنے سے پہلے بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ ان کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا لیکن مسٹر چکبست نے جس محنت اور قابل تعریف تلاش کے ساتھ اساتذہ کے اشعار سے مثالیں اور سندیں بہم پہونچائی ہیں اسکے داد انکے حریفوں کو بھی دینا پڑیگی اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو اکثر غلطیوں کے الزام سے نسیم کو مجبوراً بری کرنا پڑیگا (اردوئے معلی بابت ماہ اگست ۱۹۰۵ء و دسمبر حضرت جلیل (مہتمم دبدبۂ آصفی) تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا حالی کے مقدمہ کا جواب یوں دیا گیا تھا کہ ان کی زبان و بیان اور دیوان کی دھجیاں اڑا دیگئی تھیں یہاں مقدمہ (چکبست) کے جواب میں گلزار نسیم کے پھول روندے جاتے ہیں۔

اگر مثنوی میر حسن دہلی کے لئے سرمایۂ فخر ہے تو گلزار نسیم لکھنؤ کے لیے وجہ ناز ہے اور یہ کچھ آج کی تصنیف نہیں اسپر کئی دور گذر چکے ہیں اور ہر دور میں دونوں مقبول رہیں۔ اب اگر اہل دہلی سحر البیان کی برائی کریں یا اہل لکھنؤ گلزار نسیم کی ہجو فرمائیں تو یہ کہا جائیگا کہ اپنے عیب آپ کہہ لیتے ہیں۔ ... ... اغلاط سے پاک کوئی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ کہا جاتا ہے کہ گلزار نسیم میں بہت زیادہ نقصانات ہیں ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ اور ممکن ہے کہ مثنوی میر حسن میں بھی اسی قدر نقصانات ہوں۔ مگر اسوقت ان مضامین کی تنقید کی حاجت نہیں ہے ورنہ ان سے ان کی مقبولیت کو کچھ ضرر پہونچ سکتا ہے (گلزار نسیم) اسکے متعلق طرح طرح کے مباحث در پیش ہیں۔ گلزار نسیم میں شاعری کیسی ہے۔ زبان لکھنؤ کی ہے یا نہیں۔ نسیم کا شعرا میں کیا رتبہ ہے حقیقت اتنی ہے کہ مثنوی گلزار نسیم لکھنؤ کے ایک لبستان قادر سخن کی تصنیف ہے۔ آتش نے کہی ہو یا کسی نے

ہم کو اس سے بحث نہیں۔ جناب مولوی عبدالحلیم شرر سے اس کی ابتدا ہوئی کہ انھوں نے گلزار نسیم پر ریویو فرمایا اور نقائص کو چن چن کر دکھایا ان کی بحث بڑی قابلیت کے ساتھ ہے ۔۔۔ مگر مسٹر چکبست نے جو جواب کہ اردوئے معلیٰ میں دیا ہے وہ بھی دیکھنے کا ہے خصوصاً سند کے اشعار بہم پہونچائے ہیں ان کی تلاش حیرت انگیز ہے۔ سب اعتراضات کا بجا ہونا جس طرح دشوار ہے اسی طرح ہر ایک جواب کا باصواب ہونا بھی مشکل ہے۔ دبدبۂ آصفی مطبوعہ ۶۔ رجب المرجب ۱۳۲۳ھ ہجری نقاد لکھنوی زمانہ [illegible] تحریر فرماتے ہیں۔ گلزار نسیم اس قبیل کی ایک نظم ہے کہ جتنے جتنی مرتبہ اور جتنے غور سے پڑھیے ایک نیا لطف ملتا ہے اور جب ذہن اس کے دقائق اور نزاکت فن تک پہونچتا ہے تو ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ درحقیقت اس میں ایسے نازک استعارہ اور بلند خیالی کے نمونے موجود ہیں جو اردو شاعری کی انتہائے ترقی کا پتہ دیتے ہیں اور مجموعی حیثیت سے اس میں اعلیٰ شاعری کے اتنے ارکان جمع ہوگئے ہیں جو دوسری مثنویوں میں بلکہ اردو کی کل تصانیف میں کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں (زمانہ۔ ۷ جون ۱۹۰۵ء) اخبار تلقل رقم طراز ہے۔ اس بے لطف جھگڑے کی ابتدا شرر صاحب نے کی ہے۔ نہیں معلوم کہ ان کو کیا ضرورت داعی ہوئی تھی کہ نسیم ایسے شاعر کا جن کی شاعری اپنا نقش جما چکی ہے آج یہ اعتراضات تذکرہ کئے جائیں، جبکہ حضرت حافظ فرما گئے ہیں۔

بہ مستاں نوید سرودے فرست　　بہ یاراں رفتہ درودے فرست

نسیم آج نہیں۔ ان کی مثنوی زیر تصنیف یا ابتدا زیر طبع نہیں ہے۔ ہمارے شمار اعتراضات سے وہ کیا اصلاح ہے جو منظور تھی۔ وغیرہ وغیرہ (تلقل مطبوعہ۔ نومبر ۱۹۰۵ء) حکیم برہم صاحب لکھتے ہیں کہ جو اعتراضات شرر نے کئے ہیں گو موجودہ زمانے میں انکا حرف حرف صحیح ہے۔ مگر جس زمانے میں نسیم نے اس وقت کی زبان اور [illegible] اور تصرفات دیکھتے ہوئے ہم نسیم کی کوئی خطا نہیں دیکھتے۔ ریاض الاخبار مطبوعہ ۱۹ جنوری ۱۹۰۵ء۔

ان اخباروں اور رسالوں کے علاوہ رسالہ زندہ دل اودھ اخبار تفریح وغیرہ نے شرر صاحب کی لغویت کا خاکہ اُڑایا ہے۔ اب ہم اس مضمون کے آخر میں منشی سجاد حسین صاحب اور انکی معاونین سے چند سوالات پوچھتے ہیں اور ناظرین پر انکا انصاف چھوڑتے ہیں۔

(۱) اودھ پنچ میں جو پہلا مضمون (۱۱۔ مئی ۱۹۰۵ء) گلزار نسیم سے متعلق نکلا تھا اسپر ایسا بیہودہ اور در پردہ حملہ (بدر) والے مضمون میں (مطبوعہ ۱۶۔ جون ۱۹۰۵ء ریاض الاخبار) کیوں لکھا گیا۔ اور واقعی یہ بنائے فساد ہے کہ نہیں۔ اور نیز اودھ پنچ کے اس مضمون کے جواب میں پیام یار میں فحش اور گندہ مضمون اسلئے شائع کیا گیا۔

(۲) یکم اگست تک جو مضامین اڈیٹر اودھ پنچ کے حکم سے گلزار نسیم کے متعلق نکلے تھے اُن میں کوئی حرف یا جملہ ایسا تھا جس کے لئے یکم اگست کے اتحاد میں اڈیٹر صاحب موصوف کو شہدے کا خطاب دیا گیا۔ آیا یہ شرر کی زیادتی ہے کہ نہیں اور وہ سرزنش کے مستحق تھے کہ نہیں۔

(۳) مسٹر چکبست کے قلم سے کون جملہ بد تہذیبی کا نکلا ہے کہ انکے خلاف فحش اور گندے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔

(۴) اگر شرر اس علمی جھگڑے کو مذہبی جھگڑا بنانا چاہتے ہیں تو گلزار نسیم کے خلاف جو فحش مضامین نکل رہے ہیں انکی نسبت انھوں نے یہ جملہ کیوں لکھا کہ اُن پر مسلمان پبلک کی توجہ کی خاص ضرورت ہے۔ اور اودھ پنچ کے پہلے ہی مضمون (مطبوعہ ۱۱۔ مئی ۱۹۰۵ء) کے جواب میں یہ کیوں لکھا گیا کہ منشی سجاد حسین نے کچھ ایسی گھڑی میں جنم لیا ہے کہ جب ہندو مسلمانوں کا جھگڑا درپیش ہوتا ہے تو وہ ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں۔

(۵) ان سب حرکات نازیبا کے بعد آیا شرر اس بات کے مستوجب تھے کہ نہیں کہ نامہ نگاران اودھ پنچ کانی طور سے ان کی خبر لیں تاکہ آیندہ وہ ایسے ناشائستہ افعال سے باز رہیں۔

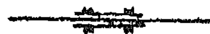
(۶) شرر جو بار بار اس قسم کے فقرے شایع کراتے ہیں کہ انکے اعتراضات سب اساتذۂ حال نے تسلیم کر لئے ہیں تو یہ محض بے بنیاد دعولے ہے کہ نہیں۔

(۷) آخر میں یہ سوال ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ اودھ پنچ اور مسٹر چکبست نے شرر کے ساتھ زیادتی کی تو یہ کہاں کی شرافت اور تہذیب ہے کہ نسیم مرحوم کی شان میں فحش اور گندے مضامین برابر شائع کئے جائیں۔

(۸) کسی مرے ہوئے بزرگ کی توہین کرنا انتہا درجہ کا کمینہ پن ظاہر کرتا ہے کہ نہیں۔

راقم ب ع طیش بلگرامی

اودھ پنچ کے گو کہ ایسے بے نمک مضامین کا چھاپنا اودھ پنچ کی وضع کے خلاف ہے مگر چونکہ اکثر احباب کی سفارش کے ساتھ یہ مضمون آیا ہے لہذا شائع کیا جاتا ہے۔ جو لوگ ابتدا سے اس بحث کا رنگ دیکھ رہے ہیں اُنکے لیے اس مضمون کی ضرورت نہیں۔ بیشک جو ناواقف حضرات تھوڑے عرصہ سے اس بحث میں دلچسپی لینے لگے ہیں وہ اس مضمون کے پڑھنے سے ان مغالطوں کے جال میں پھنسنے سے محفوظ رہیں گے جو شرر نے پھیلا رکھا ہے۔ حضرت طیش نے شرر کی انھیں گستاخیوں اور بدعنوانیوں کا ذکر کیا ہے جو اخباروں میں اشاعت حاصل کرنے کی وجہ سے طشت از بام ہو گئی ہیں۔ نہ ابتدا سے جو جو نازیبا و ناشائستہ حرکات شرر سے ثابت ہوئے ہیں برابر پہونچے ہیں جو اودھ کی نسبت کے خطوط کے ذریعہ سے مشہور کی گئی ہیں اُن میں سے اکثر کا تحریری ثبوت موجود ہے اور ان کا خیال کر کے جو کچھ شرر کی نسبت ابتک لکھا گیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔



دیباچہ گلزار نسیم

(از پنڈت برج نرائن چکبست)

پنڈت دیاشنکر صاحب کول متخلص بہ نسیم ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول تھا۔ لکھنؤ آپ کا وطن تھا۔ بزرگوں سے سنا جاتا ہے کہ وجاہت جس کے لئے عموماً اہل خطہ مشہور ہیں آپ کا حصہ نہ تھی۔ پستہ قامت گندمی رنگ سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ سلسلۂ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا۔ اردو فارسی کی تعلیم عالم صغر سنی میں پائی۔ شعرائے اردو و فارسی کا کلام نظر سے گذرتا رہا۔ خلقی طبیعت داری اور ذہانت نے شاعری کا شوق دلایا۔ غرضکہ بیس برس کی عمر میں شعر و سخن کا اچھا خاصہ مذاق پیدا کر لیا خواجہ حیدر علی آتش کی گرمی سخن اور آتش بیانی نے ایسا فریفتہ کیا کہ ان کی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں غزل گوئی کا شوق رہا لیکن جو دل کا ولولہ تھا وہ غزل میں نہ نکل سکا جدت طبع نے کہا ؎

بقدر شوق نہیں اپنے تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

مگر وسعت کہاں ملے اُردو شاعری کی کائنات کیا۔ غزل۔ قصیدہ۔ رباعی یا مثنوی میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا اس زمانہ میں ہر طرف چرچا تھا اصناف سخن میں مثنوی کا رنگ ایسا پسند آیا کہ خود بھی اس کوچہ میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔ مناسب طبع نے آمین کہا۔ غرضکہ گل بکاولی کا قصہ جو کہ نثر میں تھا اس کو نظم کے سانچے میں ڈھالا پچیس ۲۵ برس کی عمر میں یہ مثنوی تیار ہوئی۔ چونکہ گلہائے مضامین سے پُر تھی لہٰذا نام گلزار نسیم رکھا۔ واقعی اس گلزار کا

کیا کہنا تھا ع سینچا تھا جسکو خون جگر سے وہ باغ تھا + لیکن جس وقت یہ مثنوی تیار ہوئی اس کا حجم بہت زیادہ تھا۔ جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو اُنھوں نے کہا۔ ارے بھئی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھے گا۔ یا تم پڑھوگے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا میں اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤں گا۔ اُستاد کی بات دل پر اثر کر گئی۔ مثنوی کی نظر ثانی کی جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے بلکہ جو مطلب چار شعروں میں ادا ہوتا تھا اس کو اختصار کے ساتھ ایک ہی شعر میں ادا کیا اس صورت پر گلزار نسیم کو خس و خاشاک سے پاک کیا اور آتش کے پاس لے گئے۔ اُستاد نے شاگرد کی محنت پر آفریں کہی اور اصلاح کا قلم اُٹھایا۔ لیکن اکثر اصلاحیں نسیم نے نہ مانیں اور اشعار کو اپنی اصلی حالت پر رہنے دیا مثلاً مثنوی کا ایک شعر تھا ؎ قلیاں پیئے مشکبو دھواں دھار + بیڑے چکھے پان کے مزیدار۔ آتش نے اس شعر کا دوسرا مصرعہ اسطرح بدلنا چاہا ع بیڑے چکھے بہت مزیدار + لیکن نسیم کو یہ اصلاح پسند نہ آئی اور مصرعہ کی تبدیلی مناسب نہ سمجھی[1] غرضکہ آتش کی نظر ثانی کے بعد یہ مثنوی ایک مشاعرے میں پڑھی گئی جس میں کہ لکھنؤ کے تمام سربرآوردہ شعرا جمع تھے بعد ازاں طبع ہوئی شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی زمانہ نے پورے طور سے قدر کی۔ ابھی تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا۔ اب گلزار نسیم کے بھی جا بجا چرچے ہونے لگے۔ جواہر سخن کے پرکھنے والے سمجھ گئے کہ مثنوی کیا کہی ہے موتی پروئے ہیں۔ نسیم کو بھی شہرت عام کا خلعت نصیب ہوا اور بقائے دوام کے دربار میں میر حسن کے برابر کرسی ملی اور واقعی حق یہ ہے کہ جب تک اُردو شاعری کا مذاق قائم ہے اُسوقت تک گلزار نسیم کی شادابی میں فرق نہیں آسکتا۔ مگر افسوس کہ نسیم کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی۔ گلزار نسیم کو طبع ہوئے ایک برس گذرا تھا کہ باغ جوانی پر اوس پڑ گئی۔

[1] یہ واقعہ حکیم میر رضا حسین صاحب سُہا کی زبانی مجھ کو معلوم ہوا۔ یہ بزرگ آتش کے شاگرد رشید اور میر وزیر علی صبا کے داماد اور شاگرد تھے۔ یہ اُن معدودے چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے پرانے اُستادوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور جنکی وضع کے بزرگوں سے ابتک لکھنؤ میں اُردو شاعری کا نام زندہ ہے۔ تین چار سال کا عرصہ ہوا کہ قضا کی ع کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ہیضہ کی بیماری نے دفعتہً خاتمہ کر دیا۔ اپنے شعر کے آپ ہی مصداق ہوے سہ
روح رواں وجسم کی صورت میں کیا کہوں، جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا اُدھر گیا
۱۲۸۳ھ میں تخمیناً بتیس ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی سخن شناس جانتے ہیں کہ نسیم نے گو کہ میرحسن کے مقابلہ پر مثنوی کہی۔ لیکن بالکل دوسرے رنگ میں کہی۔ کوئی نسیم کو میر حسن کے خرمن کا خوشہ چین نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ اپنے رنگ میں فرد ہیں تو یہ اپنے طرز میں یکتا ہیں اگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اُٹھانا ہو تو میرحسن کی مثنوی دیکھو اگر باریک بینی اور معنے آفرینی کا رنگ پسند ہے تو گلزار نسیم کی سیر کرو دیکھو فراق یار میں صدمہ گذرنے کا مضمون ایک ہی ہے۔ دونوں اُستادوں کی طبیعت اس مضمون پر برابر لڑی ہو۔ مگر دونوں کے انداز سخن پر خیال کرو۔

میرحسن

روانی سی ہر سمت پھرنے لگی درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
خفا زندگانی سے ہونے لگی بہانے سے جا جا کے رونے لگی
جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اُسے محبت میں دن رات گھٹنا اُسے
کسی نے اگر بات کی بات کی یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلانا تو پینا اُسے غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

نسیم

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
کرتی تھی جو بھوک پیاس بس ہیں آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ کپڑے رنگنے عوض بدلتی تھی رنگ

یکچند جو گذرے بے خور و خواب | زائل ہوئی اُسکی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ | ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آسنے لگے بیٹھے بیٹھے چسکر | فانوس خیال بن گیا گھر

دونوں نے اپنے اپنے رنگ میں حق سخنوری ادا کیا ہے میر حسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شب ہجراں بیقراری کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہیں الفاظ کی شوکت۔ بندش کی چستی۔ اشعار وں کی نزاکت تشبیہوں کی پختگی سے مصنف کا زور طبیعت معلوم ہوتا ہے۔ نازک خیالی اور بلند پردازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے جہاں پہونچتے ہوئے ہمارے طائر خیال کے پر جلتے ہیں۔ غرضکہ اگر صورت حال کا بیان میر حسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔ میر حسن کہتے ہیں ؎

سب اعضا بدن کے موافق درست | ہر ایک کام میں اپنے چالاک و چست
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام | قیامت کرے جسکو جھک کر سلام

نسیم اسی مضمون کو اپنے رنگ میں ادا کرتے ہیں ؎

دن دن اُسے ہو گیا قیامت | بوٹا سی بڑھی وہ سرو قامت
چلتی تو زمین میں سرو گڑتے | باتیں کرتی تو پھول جھڑتے

یا حسن تعمیر کا مضمون دونوں نے اپنے اپنے طرز پر نظم کیا ہے۔

میر حسن

عمارت کی خوبی در و نکی وہ شان | لگے جسمیں زربفت کے سائبان
چقیں اور پردے بندھے زرنگار | دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

نسیم

گول اُسکے ستون تھے ساعد حور | چلمن مژگان چشم مخمور

دکھلاتا تھا وہ مکان جادو	محراب سے در سے چشم وابرو

شاہزادے کے غائب ہو جانے پر میرحسن نے پس ماندہ لوگونکی پریشانی کا حال اس صورت پر نظم کیا ہے ؎

کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں | جو دیکھا تو واں شاہزادہ نہیں
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی | کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی | کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو | گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

....

ہوا گم وہ یوسف پڑی پھر یہ دھوم | کیا خادمان محل نے ہجوم
کہا شہ نے واں کا مجھے دو پتا | عزیزو جہاں سے وہ یوسف گیا
گئیں لے وہ شہ کو لب بام پر | دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیمبر
جو دیکھی جگہ وہ جہاں سے گیا | کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا
میرے نوجوان اب کدھر جائے پیر | نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحر غم میں ڈبویا مجھے | غرض جان سے تو نے کھویا مجھے

پھول کے غائب ہو جانے پر بکاؤلی کے اضطراب کی تصویر نسیم نے اپنے رنگ میں یوں کھینچی ہے ؎

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے | کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل | جھنجھلائی کہ کون دیگیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون | ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے | بو ہو کے تو گل اُڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل | سوسن تو بتا کدھر گیا گل

سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا
ٹھہرائیں خواصیں صورتِ بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

. . . .

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پڑ گیا وس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا — غنچے کے بھی منھ سے کچھ نہ پھوٹا
اور خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل
او باد صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

میرحسن کے اشعار کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے جو حالت وہ بیان کرتا ہے اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں ایک کی زینت حسن صورت سے ہے دوسرے کی شان لطف معنے سے قائم ہے۔ میرحسن سخن آفریں ہیں نسیم معنی آفریں ہیں۔ میرحسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصہ ہے۔ مگر اتنا کہنا ناانصافی نہیں کہ جو سوز و گداز میرحسن کے کلام میں ہے وہ نسیم کے کلام میں نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جو درد عموماً شعرائے دہلی کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ اہل لکھنؤ کے کلام میں نہیں پایا جاتا مگر بااین ہمہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے۔ نسیم کی مثنوی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب انکے طائر شہرت نے پر پرواز نکالے تو یہ کسی کے خرمن کے خوشہ چین نہ خیال کیے گئے بلکہ خود صاحب طرز کہلائے۔

گلزار نسیم کا ایک خاص جوہر جو کہ نسیم کا حصہ ہے تناسب لفظی ہے تناسب لفظی کی صفت

ہمیشہ اُردو شاعروں کے پسند خاطر رہی ہے لیکن کسی نے اسکو اس درجہ کمال پر نہیں پہونچایا جیسا کہ گلزار نسیم میں ہم دیکھتے ہیں چند اشعار تمثیلاً لکھے جاتے ہیں سہ

پردہ سے نہ دایہ نے نکالا — پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
ایک مُرغ ہوا اسیر صیاد — دانا تھا طائرِ چمن زاد
پالا تو مفارقت ہے انجام — دانا ہے تو مجھ سے بے پیر دام
مجنوں ہو اگر تو قصد کیجئے — سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے
سودا ہے میری بکاؤلی کو — ہے چاہ بشر کی پاؤلی کو
سختی سہی پاکری اُٹھائی — اُفتاد تھی جو پڑی اُٹھائی

اس رنگ کے اشعار گلزار نسیم میں کثرت سے ملیں گے۔ واقعی اس رنگ کو خوب بنا رہی اور طرہ یہ کہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ تناسب لفظی کی صنعت کا لطف یہ ہی کہ کسی مقام پر یہ نہ معلوم ہو کہ فلاں لفظ خواہ مخواہ شعر میں اسلئے بھر دیا گیا ہے کہ دوسرے لفظ سے تناسب رکھتا ہے اور یہ لطف گلزار نسیم میں ہی مثلاً کیا خوب مصرع ہے ع سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے اس مصرع میں سایہ دھوپ کے ساتھ عجیب کیفیت دکھا رہا ہے لیکن دونوں لفظ اس خوبصورتی سے آئے ہیں کہ بالکل ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہیں اور الگ بھی حالانکہ ایک کی رونق دوسرے کی وجہ سے دوبالا ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ سایہ کا لفظ خواہ مخواہ دھوپ کے لیے لایا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس صنعت کا خوبی کے ساتھ نباہنا آسان نہیں ہے یہ راہ بڑی کٹھن ہے قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کا اندیشہ ہے مثلاً امانت کے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجہ تک پہونچ گیا ہے۔ لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہیں ہے اور طبیعت میں شستگی کا جوہر نہیں لہذا جو شعر اس رنگ میں کہا ہے اسے پڑھکر ہنسی آتی ہے۔ فرماتے ہیں سہ

پانی نہ آبرو پہ پھیرے بحر حرص ڈال — موتی ملیں تو دانت نہ اپنے نکالیئے

ایک اور شعر اسی رنگ میں ہے ؎

قبر پر میری لگایا نیم کا اس نے درخت — بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

سبحان اللہ کیا تناسب الفاظ ہے۔ نیم حکیم اور نیم ملا سنتے تھے اس شعر کا مصنف نیم شاعر ہے ایک صاحب نے گلزار نسیم کا جواب کہا ہے اور چونکہ تناسب لفظی گلزار نسیم کا خاص جوہر ہے لہذا انھوں نے بھی اس رنگ کے شعر کہے ہیں۔ مگر لطافت سخن قائم نہ رکھ سکے۔ ایک شعر انکا بھی تمثیلاً لکھا جاتا ہے ؎

پاجی ہیں شریفے سب اُجڑ جائیں — بیری ہوے بیر کیڑے پڑ جائیں

اپنے نزدیک ان صاحب نے یہ شعر نسیم کے ذیل کے شعر کا جواب کہا ہے ؎

سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

لیکن سخن شناس جانتے ہیں دونوں شعروں میں اندھیرے اُجالے کا فرق ہے خلیل کا بھی ایک شعر اس رنگ میں یاد آگیا ہے ؎

وہ شمع رو پتنگ اُڑاتا ہے شاید آج — کچھ پیچ پڑ گیا ہے جو آنے میں ڈھیل کی

یا رند کہتے ہیں ؎

میلا ہے چاند گنج میں سورج گہن کا آج — تم کس لیے نہ غیرت شمس و قمر گئے

تلق بھی طلسم الفت میں کہتے ہیں ع قند لب پی رہے تھے گڑ گڑیاں + ان اشعار کے تمثیلاً پیش نظر کرنے سے یہ مراد ہے کہ تناسب الفاظ کا لطافت کے ساتھ نباہنا ایک امر دشوار ہے نسیم کو اس رنگ میں یدطولیٰ حاصل ہے الفاظ کے الٹ پھیر سے وہ کام لیا ہے کہ کلام کی رونق دوبالا ہوگئی ہے۔ آتش کا شعر ان کی شاعری پر صادق آتا ہے ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ اکثر جگہ نسیم سے بھی تناسب الفاظ کے ساتھ لطافت سخن قائم نہیں رہ سکی ہے مثلاً کہتے ہیں ؎

ان مختصروں نے جب دیا طول — بولی وہ بکاؤلی کہ معقول
پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل — پہونچا لب حوض سے نہ چنگل

لیکن اس قسم کے اشعار کل مثنوی میں دو فیصدی سے زیادہ نہ ملیں گے لہذا قابل معافی ہیں۔

اختصار

اختصار جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے اس مثنوی کا عجیب جوہر ہے واقعی دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے کل مثنوی میں ایک شعر بھرتی کا مشکل سے ملے گا۔ بعض مقامات پر طول طویل مضامین کو چند شعروں میں اس خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے کہ کسی قسم کی کوتاہی کا شبہہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً صحرائے طلسم کی داستان میں مندرجہ ذیل دو شعر کتنے پُر معنے ہیں اور کسقدر اختصار سے پُر ہیں ؎

طوطا بن کر شجر پہ جا کر — پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتے پھل گوند چھال لکڑی — اس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی

یا ایک مقام پر تین چار داستانوں کا خلاصہ کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

وہ جھل وہ ہار وہ غلامی — وہ گھات وہ جیتنا تمامی
وہ دسترس اور وہ پائے مردی — وہ بیکسی اور وہ دشت گردی
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر — وہ حلوے کی چاٹ اور وہ تحریر
وہ سعی وہ دیونی کی صحبت — محمود اکی وہ آدمیت
تجویز کی وہ سرنگ کی راہ — اور موش دوانیاں وہ دلخواہ
وہ سیر چمن وہ پھول لینا — وہ عزم وطن وہ داغ دینا
وہ کور کے حق میں خضر ہونا — وہ غولوں سے نکلے پھول کھونا
وہ بال کو آگ پر دکھانا — وعدے پہ وہ دیونی کا آنا
وہ نزہت گلشن نگاریں — وہ دعوت بادشاہ وہ تمکیں
گذرا تھا جو کچھ بیاں کیا سب — پنہاں تھا جو کچھ عیاں کیا سب

یا اکثر جگہ دو تین شعر کا مطلب ایک شعر میں ادا کر دیا ہے ؎

تیورا کے دریں وہ بار بر دوش	بیٹھا تو گرا گرا تو بیہوش

مفلس زر دار امیر قلاش	نوکر تاجر فقیر خوش باش

اقرار میں تھی جو بے حیائی	شرمائی لجائی مسکرائی

پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت	پوچھا کہ طلب کہا قناعت

میر حسن کی مثنوی میں معاملہ برعکس ہے اُسمیں ہر مضمون کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے اور یہی اس مثنوی کا بہت بڑا عیب ہے علاوہ بریں نسیم کے کلام میں وہ پختگی اور ترکیب میں وہ متانت ہے کہ اکثر اشعار کی بندش نلدمن لیمنی کا دبدبہ یاد دلاتی ہے واقعی کیا پر شوکت کلام ہے ؎

پر بحر سخن سدا ہے باقی	دریا نہیں کاربند ساقی
مرغانِ ہوا سے ہوش راہی	نقش کف پا تھے ریگ ماہی

سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا	عنقا تھا نام جانور کا

جاگی مُرغ سحر کے غل سے	اُٹھی نکہت سی فرش گل سے

پانچوں سر پنجہ وفا تھے	یا مطلع خمسہ صفا تھے

اسے آئینہ دار خود نمائی	دے سُرمہ چشم آشنائی

اک شب تھی کہ خال روئے قسمت | یا مردم دیدۂ قیامت
. . . .
خورشید بصر گہن سے چھوٹا | خیرات سے کے در کا قفل ٹوٹا
. . . .
انساں سے جھکی پری کی گردن | کانٹے سے رکا ہوا کا دامن

نسیم نے عموماً مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کیا ہے اور نہایت لطافت کے ساتھ مثلاً ذیل کے دو اشعار تشبیہ کامل کا نمونہ ہیں ؎

(۱) (تشبیہات کامل)

آنے لگے نیٹھے چیکر | فانوسِ خیال بن گیا گھر
. . . .
محرم جو ہٹی تھی اس کے سر کی | بُرجوں پہ سے چاندنی تھی سرکی
. . . .

لیکن اکثر مقامات پر طبیعت نے تکلف کا پردہ اُٹھا دیا ہے اور سادگی سے کام لیا ہے ایسے اشعار جو ہیں وہ لاجواب ہیں اور ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ مثلاً ؎

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے | جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
. . . .
غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجیے | دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجیے
. . . .
سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار | اب مان نہ مان تو ہے مختار
. . . .
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے | مختار ہے جس طرح نباہے
. . . .

پانی تہ خاک گو رواں ہے   لو شعلہ کی سوے آسماں ہے

انسان و پری کا سامنا کیا   مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے   جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے

درویش رواں رہے تو بہتر   آب دریا بہے تو بہتر

نسیم کی زبان بھی نہایت سلیس و پاکیزہ ہے اور اسے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہیے واقعی کیا خوب کہا ہے ؎

لپٹی تھی جو زلف کروٹوں میں   بل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں

نور آگیا چشمِ آرزو میں   آیا پھر آب رفتہ جو میں

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں   غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں   گر ذبح کیا تو مشت پر ہوں

اس نام کے اس لقب کے صدقے   اس نامے کے اس طلب کے صدقے

کیوں مُنہ پہ شفق خوشی سے پھولی   کیا شام وصال راہ بھولی

منھ پھیر کے ایک مسکرائی	آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

. . . .

چتون کو ملا کے رہ گئی ایک	ہونٹھوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

. . . .

کیا رنگ زمانے نے دکھائے	گل لینے گئے تھے داغ لائے
راتوں کو جو گنتی تھی ستارے	دن گننے لگی خوشی کے مارے

گلزار نسیم کی زبان میں اور آج کی زبان میں کچھ فرق نہیں ہے صرف اکثر محاورے جو کہ نسیم کے وقت میں رائج تھے اب متروک ہو گئے ہیں مثلاً نسیم کہتے ہیں ؎

پل مارنے کی ہوئی جو دیری	سبحان اللہ شان تیری

اب دیری متروک ہے دیر جو زیادہ فصیح ہے رائج ہے یا ایک شعر ہے ؎

ٹھہری یہ غرض کہ آج کی رات	فیروز شہ آگے چھیڑیے بات

اب یوں کہیں گے فیروز شہ کے آگے چھیڑیے بات غرضکہ تناسب لفظی کے ساتھ اختصار پختگی کلام - چستی بندش - شوکت الفاظ - پاکیزگی زبان اُس مثنوی کے خاص جوہر ہیں اور استعاروں اور تشبیہوں سے جو مینا کاری کی ہے اس نے اور حسن دوبالا کر دیا ہے اس مثنوی کے مقبول ہونے کا راز یہی ہے کہ باوجود اس اختصار کے یہ اتنے محاسن کا مجموعہ ہے اور حق یہ ہے کہ زمانے نے جیسی اسکی قدر کی اُس پر ہر مصنف کو ناز ہو سکتا ہے پسند عام کے ساتھ قبول خاص کا شرف گلزار نسیم کو حاصل ہے نقادان سخن کا سرتاج اور اردو زبان کا مستند مورخ محمد حسین آزاد لکھتا ہے "پنڈت دیا شنکر صاحب نسیم نے گلزار نسیم لکھی اور بہت خوب لکھی اسکی عام و خاص سب میں شہرت ہے اُسکے نکتے اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں جتنی سمجھ میں آتی ہے اُسی پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے جاتے ہیں . . . . . . ہمارے ملک سخن میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے

ایسے نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی ایک "سحر البیان" دوسری گلزار نسیم (آب حیات) مگر طبائع کا رنگ مختلف ہے جہاں منصف مزاجوں نے گلزار نسیم کی قدردانی سے آبیاری کی وہاں اکثر نگاہوں میں اس باغ کی شادابی کانٹا بنکر کھٹکی۔ ان حضرات نے اپنی اپنی ہمت کے موافق نسیم کی شہرت پر خاک ڈالنے کی فکر کی ہو۔ چنانچہ ابتک اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آتش نے یہ مثنوی کہہ کر نسیم کو دیدی تھی۔ لیکن میری رائے میں اس دعوے بے دلیل پر چین بجبیں ہونا بیکار ہے ایک معنی میں یہ بیان قدردانان نسیم کے لیے باعث فخر ہے اس سے بڑھ کر نسیم کی شاعری کی تعریف کیا ہو سکتی ہو کہ اسکا کلام آتش ایسے زبردست استاد کی طرف منسوب کیا جائے حالانکہ سخن شناس جانتے ہیں کہ جس رنگ میں گلزار نسیم کہی گئی ہے اس رنگ میں آتش نے اپنی زندگی میں ایک شعر نہیں کہا۔

ایک تذکرہ نویس صاحب فرماتے ہیں کہ نسیم مشرف باسلام تھے اسکا جواب مجھے نہیں آتا خیر یہ تو پرانے زمانے کے لوگوں کی طباعی ہے۔ اس زمانے میں مولانا حالی نے گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم سے پامال کرنا چاہا ہے آپ فرماتے ہیں کہ مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے مصنف گلزار نسیم نے اسکا لحاظ نہیں رکھا ہو

گلزار نسیم میں دو شعر اس صورت پر ہیں ؎

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے — ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو — پھر دیکھ نہ سکیئے گا کسی کو

جو مطلب کہ مصنف ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ تو اس طفل مہ جبیں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے مگر نجومیوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اسکو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیئے گا کیونکہ اسکو دیکھ کر بینائی جاتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں بیتوں میں جب تک کئی لفظ بڑھائے اور جب تک کئی لفظ بدلے نہ جائیں تب یہ

یہ مطلب جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے ان بیتوں سے سیدھی طرح نہیں نکل سکتا اور پہلا مصرع دوسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپاں نہیں ہو سکتا (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۵ سطر ۴ - ۱۲) اس کے جواب میں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اگر مولانا حالی گلزار نسیم کا کوئی صحیح نسخہ ملاحظہ فرماتے تو مولانا موصوف کو اس اعتراض کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑتی آجکل گلزار نسیم کے بیشمار نسخے شائع ہوئے ہیں جن میں سیکڑوں جگہ کاتب کی اصلاحیں ہوتی ہیں۔ اور تو اور اکثر اشعار ان نسخوں سے غائب ہیں اور جو ہیں ان کی ترتیب میں غلطی ہے چنانچہ یہ دو شعر بھی جو مولانا حالی کی طبع گرامی کے بار خاطر ہوئے صحیح نسخہ[1] میں اس صورت پر ہیں

خوش ہوتے ہی طفل مہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسکو پھر دیکھ نہ سکیئے گا کسی کو

اب مطلب صاف ہے اور مصرعوں میں کامل ربط ہے یعنی طفل مہ جبیں سے خوش ہوتے ہی ستارہ بیں سے یہ ثابت ہوا کہ یہ لڑکا پیارا تو ہے مگر اسکو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیئے گا۔

---

[1] یہ نسخہ کمیاب ضرور ہے لیکن لکھنؤ میں پرانے بزرگوں کے پاس بہت ملیگا اس نسخہ کی شناخت یہ ہے کہ اسکے آخر میں ذیل کی عبارت درج ہے۔ پنڈت دیاشنکر متخلص بنسیم کہ در فن شاعری کمالے بہم رسانیدہ اند ...... قصہ تاج الملوک بکاؤلی را از نثر بنظم آوردہ و بگلزار نسیم موسوم ساختہ بودند ...... در بیت السلطنت لکھنؤ محلہ محمود نگر متصل امام باڑہ کبری دروازہ در مطبع حسینی سیدی سندی میر حسن رضوی ولد میر حسین عشرت میر کامل مرحوم و مغفور بہ تصحیح و مقابلہ مصنف حلیہ طبع پوشید۔ اس نسخہ میں مصنف کی طبع زاد تاریخ طبع مثنوی بھی درج ہے جو کہ آجکل کے نسخوں میں نہیں ملتی یہ نسخہ حال اسی پرانے نسخہ کی نقل ہے گو اس پرانے نسخہ میں بھی اکثر چھاپے کی غلطیاں موجود ہیں مگر بہت کم ۱۲

اے خالق کردگار شکرا شکرا شکراً ہزار شکرا

کیں جملہ ز ابتدا خبر داد شاخ قلم چنیں ثمر داد

در عہد خلافت شہنشاہ امجد علی شاہ خلد اللہ

سید حسن آنکہ طبع پاکش چوں مطلع اوست خوب و دلکش

از سمع رضا شنیدہ بشنود در مطبع خویش طبع فرمود

دوسرا اعتراض

دوسرا اعتراض ملاحظہ ہو نسیم کا شعر ہے ؎

نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو | چشمک تھی نصیب اس پدر کو

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھوں کے لئے ظلمت تھا پس جب تک دوسرے مصرع کے الفاظ نہ بدلے جائیں کلام مربوط نہیں ہو سکتا (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۱۶) میں اس اعتراض کی تہ کو بالکل نہیں پہونچا مجھ کو یہ شعر کسی صورت پر بے ربط نہیں نظر آتا جو مضمون مولانا حالی نے نثر میں بیان کیا ہے وہی نظم کے پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ نسیم کے اس شعر پر اعتراض کرنا ہوا سے لڑنا ہے۔

تیسرا اعتراض

تیسرا اعتراض مولانا حالی کا یہ ہے کہ نسیم کا ذیل کا شعر اصلاح طلب ہے ؎

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ | نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

آپ فرماتے ہیں کہ اس شعر کے دونوں مصرع مربوط نہیں ہیں کیونکہ ظاہراً الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ (شاہ) اور شخص ہے اور پدر اور شخص ہے حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۶۔ سطر ۴-۱۱) اس اعتراض کی نسبت صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اصل شعر اس صورت پر ہے ؎

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ | نظارہ کیا پسر کا ناگاہ

ابھی لکھنؤ میں ایسے بزرگ موجود ہیں جنکو قریب قریب کل مثنوی حفظ ہے۔ ان کی زبان سے یہ شعر اسی صورت پر سنا گیا نسیم نے بکاولی کے اضطراب کے بیان میں چند شعر کہے ہیں ؎

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں | آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ | کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
یکچند جو گذرے بے خور و خواب | زائل ہوئی اسکی طاقت و تاب
چوں زیور طبع نیک پوشید | بہر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم شد چو مسموع | گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع

۱۲۶۰ھ

صورت میں خیال رہ گئی وہ ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ ان اشعار میں تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا اور ظاہرا مصنف نے کوئی مطلب رکھا بھی نہیں ہو مصنف کو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی اور کپڑوں کے عوض رنگ بدلتی تھی (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۲۱۵ سطر ۲ - ۹)۔

مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا حالی کا ان اشعار کو بےمعنی قرار دینا اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ مولانا موصوف اصول شاعری سے بیخبر ہیں۔ نازک خیالی اور بلند پروازی جو کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے جوہر ہیں ان اشعار میں موجود ہیں۔ پھر ان کو بےمعنی کہنا چہ معنی دارد وجہ یہ ہے کہ مولانا حالی مغربی شاعری کی پیروی کی فکر میں انگریزی نظموں کے ترجمے پڑھتے ہیں اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ ہونے سے ان نظموں کی نازک خیالی اور بلند پروازی کے جوہر تشریف لیجاتے ہیں اور استعاروں اور تشبیہوں کی پیچیدگیاں قائم نہیں رہتیں لہذا آپ خیال کرتے ہیں کہ مغربی شاعری کا اصول یہ ہے کہ عبارت سادہ نظم کر دیجائے اور اس خیال کے موافق اردو کے جن اشعار میں آپ نازک خیالی اور باریک بینی کی وجہ سے کسی قسم کی پیچیدگی پاتے ہیں اُس کو بےمعنی اور مہمل قرار دیتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش اور پر تاثیر ہو۔ نثر کا انداز یہ ہے کہ جو مضمون بیان کیا جائے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ ان سے ایک خاص معنی صاف طور پر پیدا ہوں برخلاف اسکے شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اختصار کے ساتھ باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گذر جائیں۔ اگر اس اصول کو پیش نظر رکھکر اشعار مرقومۂ بالا کی وقعت کا اندازہ کیا جائے تو وہ بےمعنی نہ نظر آئیں گے۔ بلکہ ایک کوزہ

(مولانا حالی اصول شاعری سے بیخبر ہیں)

(۱) پہلے شعر کے معنی
(۲) دوسرے شعر کے معنی
(۳) تیسرے شعر کے معنی

دریا نوشی کی کیفیت نمایاں کریں گے۔ مثلاً پہلے شعر کے معنی یہ ہیں کہ اسکے دل پر فراق یار کا صدمہ ایسا تھا کہ کھانے پینے کی اُس کو مطلق فکر نہ تھی اگر کوئی شخص اس قسم کا ذکر بھی کرتا تھا تو ٹال دیتی تھی بس دن رات ضبط گریہ سے کئے پڑی رہتی تھی اگر کوئی کھانے پینے پر اصرار کرتا تھا تو قسمیں کھاتی تھی کہ میں نہ کھاؤں گی۔ یہ ظاہر ہے کہ نثر میں یہ مضمون اس فصاحت کے ساتھ وہ لطف نہیں دیتا جو لطف کہ نظم میں اختصار کے ساتھ پیدا کرتا ہے۔ اسیطرح دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی سے تنگ تھی اپنی آسائش کا اُس کو مطلق خیال نہیں رہتا تھا یہاں تک کہ کپڑے بھی نہیں بدلتی تھی بیشک طرح طرح کے صدمے جو اسکے دل پر گذرتے تھے تو اُسکے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ چوتھا شعر سچی شاعری کی تصویر ہے اس میں مصنف نے اپنی قوت خیال کا کمال دکھایا ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی نحیف و زار ہو گئی تھی کہ اسکی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بس اک تصویر خیالی روبرو ہے جسمیں کہ نہ دم ہے نہ تاب و تواں اسکی عجیب ہیئت ہو گئی تھی بس اک سکتے کا عالم طاری تھا عالم اجسام کے رہنے والوں کی اسمیں کوئی بات باقی نہیں رہی تھی وہ اپنی اگلی ہستی کا محض اک شبہہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ان اعتراضات کو دیکھکر انیس مرحوم کا ایک قطعہ یاد آتا ہے[۱]

مزہ یہ طرفہ کہ مضموں تو دستیاب نہیں — مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو
غلط یہ لفظ وہ بندش بری وہ مضموں سست — ہنر عجیب ملا ہے یہ عیب بینوں کو

لیکن ان نکتہ چینیوں سے نسیم کی شہرت میں فرق نہیں آسکتا جب تک اُردو شاعری کا مذاق قائم ہے اور طبیعتوں میں جوہر شناسی کی قابلیت باقی ہے گلزار نسیم کی تازگی قدردانان سخن کے دماغ کو فرحت بخشتی رہیگی۔ ہاں جن لوگوں کے دماغ میں تعصب کی ہوا بھری ہے وہ اس گلزار میں پھول ہٹا کر کانٹے چنا کریں گے صرف اکثر احباب کے اصرار نے مجھ کو مجبور کیا ورنہ میں ان

[۱] مولانا حالی کے اعتراضات کی نسبت صرف میری ہی یہ رائے نہیں میرے ایک دوست اور مولانا شبلی سے گلزار نسیم کی نسبت کچھ خط و کتابت ہوئی تھی۔ مولانا شبلی نے اپنی ایک تحریر میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بیرحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے ۱۲

اعتراضات کا ذکر بھی نہ کرتا۔ کیونکہ ایسے بے بنیاد اعتراضوں کو زمانہ خود فنا کر دیتا ہو انکی تردید کرنا فعل عبث ہو۔

علاوہ مثنوی کے نسیم کا غزلوں کا چھوٹا سا دیوان بھی ہے لیکن ناتمام بہت سی غزلیں جو تلف ہو گئیں انکا نام و نشان بھی اس دیوان میں نہیں ملتا۔ سن رسیدہ حضرات سے معلوم ہوا کہ چند غزلیں اکثر احباب نے اپنی تصنیف کی اس دیوان میں رکھدی ہیں یہ منت کرم داشتن کا نرالا مضمون ہے مگر یہ غزلیں صاف نسیم کے کلام سے الگ معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ نسیم کی وفات کے بہت روز بعد یہ دیوان شائع ہوا لہذا لوگوں کو اس دست اندازی کا موقع ملا۔ بہرحال جو ذخیرہ اشعار کا نسیم کے زور طبیعت کا یادگار رہے وہ واقعی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جانیکے قابل ہو۔ اکثر مقامات پر طبیعت کی بلند پروازی اور معنی آفرینی قیامت کرتی ہے مثلاً ؎

بنجر گور غریباں نقش پا تھے پھر نہیں آ گئے
یہیں تک ہر مسافر نے پتا پایا ہے منزل کا

نسیم اپنے ہی اعمالوں سے گردش ہو زمانہ کی
رواں کشتی پہ آتا ہے نظر ہر نخل ساحل کا

اے مرغ دل تو شاخ نشیمن سے گر پڑا
حیف آشیاں بلند ہے پر واز پست ہے

تھے محو زلف دیدۂ تر دل بھی آ پھنسا
مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل اک روز جھونکا کھائیگی

جان نکل جائے گی تن سے اے نسیم
گل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

طریق شعر و سخن میں اگر نہیں اعجاز
قلم کی طرح سے ہر اک شکستہ پا چلتا

ذرہ کا بھی چمکے گا ستارہ
قائم جو زمین و آسماں ہے

معنی روشن جو ہو تو سو سے بہتر ایک شعر
مطلع خورشید کافی ہے پئے دیوان صبح

اسمیں شک نہیں کہ نسیم کا کلام آتش و ناسخ و ذوق و غالب کے کلام کا ہم پلہ نہیں ہے یہ لوگ آسمان سخن کے تارے ہیں انکے برابر کسی کو عروج نہیں حاصل ہوا۔ لیکن غزل گوئی کے میدان میں نسیم رند و صبا وغیرہ سے پیچھے نہیں ہیں تینوں اُستادوں کی بطرح غزلوں کے انتخاب

درج ذیل ہیں۔ جن غزلوں میں ایک ہی مضمون کے شعر ہیں وہ بھی پہلو بہ پہلو لکھدیے گئے ہیں۔ سخن شناس نگاہ انصاف سے دیکھیں۔

نسیم	صہباکشوں کی خاک ہی ہر اک مقام پر	ساقی لنڈھا شراب کو مستونکے نام پر
صبا	لائی ہی مجھ کو وحشت دل اس مقام پر	ہنسنے کی جا ہے قیس کے سودائے خام پر
رند	پڑتی ہی آنکھ جب میری مینا و جام پر	سو سو درود پڑھتا ہوں ساقی کے نام پر
نسیم	دل سے ہر دم ہمیں آواز بکا آتی ہے	بند کانوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہی
رند	تیرہ و تار دھواں دھار گھٹا آتی ہے	میکشو با فصل مے ہوش ربا آتی ہی
نسیم	گل ہوا کوئی چراغ سحری او بلبل	ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صبا آتی ہی
رند	جانب خانۂ خمار سے کیا آتی ہی	لڑکھڑاتی ہوئی جو باد صبا آتی ہی
نسیم	چھو لیا دھوکے سے دامان صبا تونے کیا	غنچۂ گل کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہی
رند	یہ بتا کوچہ کا اس حور کے سن رکھ قاصد	لو نہیں چلتی ہی جنت کی ہوا آتی ہی
نسیم	خم نہ بنکر خود غرض ہو جائیے	مثل ساغر اوروں کے کام آئیے
رند	دھوپ دن کی اوس شب کی کھائیے	آستان یار پر مر جائیے
نسیم	آپ آہو چشم ہیں آہو نہیں	ہم سے وحشت کی نہ لیجے آئیے
رند	مجھ سے بیہودہ نہ گرمی کیجیے	ٹھنڈے ٹھنڈے آپ گھر کو جائیے
نسیم	ابر رحمت سنتے ہیں نام آپ کا	خاکساروں پر کرم فرمائیے
رند	دن کو تو تشریف تم لاتے ہو روز	شب کو بھی اک دن کرم فرمائیے
نسیم	جوہر تیغ نگہ کھل جائے گا	منھ نہ میرے زخم کا کھلوائیے
رند	کچھ کرونگا میں بھی اب خدمت میں عرض	چپکے رہیے منھ نہ اب کھلوائیے
نسیم	لائے اس بت کو التجا کرکے	کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے
رند	کیا ملا عرض مدعا کرکے	بات بھی کھوئی التجا کرکے

(نسیم و صبا کا مناظرہ)

نسیم	جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا	شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا
صبا	واعظ کے میں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا	جام شراب لائے تو ساقی کدھر گیا
نسیم	روح روان جسم کی حالت میں کیا کہوں	جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا
صبا	مثل حباب بحر جہاں میں نہ دم لیا	اک موج تھا کہ میں ادھر آیا ادھر گیا
نسیم	گذرا جہاں سے میں تو کہا سنکے یار نے	قصہ گیا فساد گیا درد سر گیا
صبا	اچھا ہوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم	فتنہ گیا فساد گیا شور و شر گیا
نسیم	ہے رنج عشق میرے لیے میں برائے رنج	خود بھی مٹے یقین ہے جو مجکو مٹائے رنج
صبا	دل ہے غذائے رنج جگر ہے غذائے رنج	پیدا کیا ہے ہمکو خدا نے برائے رنج
نسیم	یا تنگی کنار رکھی یا اب فشار قبر	وہ ابتدائے عیش تھی یہ انتہائے رنج
صبا	آدم سے باغ خلد چھٹا ہے کوئے یار	وہ ابتدائے رنج ہے یہ انتہائے رنج
نسیم	ہم شیشۂ شکستہ ہیں تم کیف موج مے	بنیاد عیش تمسے ہے ہمسے بنائے رنج
صبا	اے صانع ازل مری مٹی خراب کی	کیا چاہیے تھی خانۂ دل میں بنائے رنج
نسیم	زاروں سے ڈریے بھولیے زر پر نہ زور پر	کیجیے نگاہ حال سلیمان و مور پر
	اک عمر سے وظیفہ ہے صاحب کے نام پر	ناخن کے خط میں انگلیوں کی پور پور پر
نسیم	اگلی برس جنوں جو رہا زور و شور پر	زنجیر ہم چڑھائیں گے مجنوں کی گور پر
صبا	دنیا تمام بازی شطرنج باز ہے	مہروں کی طرح ایک کے ہے ایک زور پر
نسیم	کسی کے دل سے نہ یارب کبھی خراب گرے	نہ شیشہ طاق سے نے شیشے سے شراب گرے
صبا	تمہارے دور میں گر خاک پر شراب گرے	پڑے زمین پہ افتاد آفتاب گرے
نسیم	کہوں میں اپنی جو افتاد بزم ساقی میں	منہ سے بادہ گرے سیخ سے کباب گرے
صبا	بغیر یار ہوئی بزم مے تہ و بالا	شراب خم سے بھی سیخ سے کباب گرے
نسیم	منت دلا کسی کی نہ اصلا اٹھائیے	مر جائیے نہ ناز مسیحا اٹھائیے

صبا: اُفتادگی سے خاک سر اپنا اُٹھائیے | ممکن نہیں کہ نقشِ کفِ پا اُٹھائیے
نسیم: چاہ اپنی مانتا نہیں وہ بے یقیں اگر | قرآں کا جامہ پہنئے گنگا اُٹھائیے
صبا: اُس بُت کو اعتبار کسی بات کا نہیں | قرآں سر پہ رکھئے کہ گنگا اُٹھائیے
نسیم: فراق دیدہ ہوں میں وصلِ یار باقی ہے | خزاں رسیدہ چمن کی بہار باقی ہے
״ ہوا تو کہتی ہے صاف آمدِ بہارِ چمن | صدائے غنچہ و صوتِ ہزار باقی ہے
״ جنون و عقل کے قصہ سے چھوٹے بعدِ فنا | نہ پردہ در ہے نہ وہ پردہ دار باقی ہے
״ بتوں کے قہر سے ہم کو مقامِ امن نہیں | اُمیدِ رحمتِ پروردگار باقی ہے
صبا: نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے | جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے
״ خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ واعظ | زباں ترے ابھی اختیار باقی ہے
״ ہزار حیف اسے بھی فلک مٹا دیگا | کہیں کہیں جو یہ نقش و نگار باقی ہے
״ پھنسائیگا مجھے دشتِ جنوں کے کانٹوں میں | یہ ایک آدھ جو دامن کا تار باقی ہے
نسیم: کیوں خفا رشکِ حور ہوتا ہے | آدمی سے قصور ہوتا ہے
״ جس کو دیکھو وہ اِس زمانہ میں | اپنے نزدیک دور ہوتا ہے
״ خاکساری وہ ہے کہ ذرّوں پر | روز بارانِ نور ہوتا ہے
صبا: بندہ اب با صبور ہوتا ہے | عفو ہووے قصور ہوتا ہے
״ پرتوِ رُخ سے اُن کا جیبِ قبا | دامنِ کوہِ طور ہوتا ہے
״ اے صبا جب بہار آتی ہے | ہمکو سودا ضرور ہوتا ہے

اس موقع پر یہ لکھنا غیر مناسب نہیں کہ گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمیِ سخن ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی ان کی مشکل پسند طبیعت نے ناسخ کا رنگ پسند کیا مگر باوجود اس تصنع کے جو کہ اس رنگ کا خاص جوہر ہے نسیم کا کلام بالکل بے نمک نہیں ہے طبیعت میں ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزیدار بنا دیتی ہے۔

طبیعت کا رنگ

شاعری کا رنگ تو دیکھ چکے اب طبیعت کا رنگ ملاحظہ ہو سنا جاتا ہو کہ بڑے ظریف و بذلہ سنج آدمی تھے تیزی ذہن و ذکاوت طبع کا عجب عالم تھا حاضر جوابی تیغ زبان کا جوہر تھی۔ انھیں صفات خاص نے انکا وقار ہمعصر شعرا میں قائم کیا۔ اگر یہ جوہر نہ ہوتے تو کون پوچھتا اس زمانے میں لکھنؤ کل ہندوستان کی تہذیب و تربیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ گو کہ اُردو شاعری کے زوال کا زمانہ قریب آپہنچا تھا لیکن جیسے چراغ کی روشنی بجھنے کے پیشتر تیز ہو جاتی ہے اسیطرح اس زمانہ نے شعرو سخن کا ایسا عروج دیکھا کہ باید و شاید۔ آتش و ناسخ کی جادو کار طبیعتیں اپنا زور دکھا رہی تھیں انیس و دبیر فن مرثیہ گوئی کو عرش پر پہونچا رہے تھے خواجہ وزیر صبا رند و خلیل وغیرہ کی نوجوان اور شوخ طبیعتیں ایک طرف قیامت برپا کر رہی تھیں۔ اس زمانہ میں ایک ہندو شاعر کے لئے شعرا کے زمرہ میں اپنا وقار قائم کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن نسیم نے اپنے کھائے مضامین کا سب کو ہزار جان سے شیدا بنا لیا۔ ایسے ایسے معرکہ جیتے کہ دھاک بیٹھ گئی ایک مشاعرہ میں نسیم نے مطلع پڑھا ؎

منت ولا کسی کی نہ اصلا اُٹھایئے
مرجایئے نہ ناز مسیحا اٹھایئے

(آتش کی تعریف)

آتش بھی اس مشاعرے میں موجود تھے اُنھوں نے نسیم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ میرا مطلع اسکے آگے گرد ہے مطلع آتش ؎

جاں بخش لب کے عشق میں ایذا اٹھایئے
بیمار ہو کے ناز مسیحا اُٹھایئے

(ناسخ سے معرکہ)

خصوصاً نسیم کی حاضر جوابی اور سوز دلی طبع کے سب قائل تھے ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کہیں مشاعرہ کی صحبت تھی یہ بھی وہاں موجود تھے قبل مشاعرہ شروع ہونے کے شیخ ناسخ نے ایک مرتبہ ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ پنڈت جی ایک مصرع کہا ہے دوسرا مصرع نہیں سوجھتا کہ پورا شعر ہو جائے۔ انھوں نے جواب دیا فرمایئے ناسخ نے مصرع پڑھا ع شیخ نے مسجد بنا مسمار بتخانہ کیا۔ انکے منہ سے یہ مصرع نکلنے کی دیر تھی کہ یہاں دوسرا مصرع تیار تھا ع تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا۔ اس مصرع کا سننا تھا

کہ حاضرین جلسہ پھڑک اُٹھے اور ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین و آفریں بلند ہوئے۔ شیخ ناسخ نے شاعری کی آڑ میں مذہبی چوٹ کی تھی۔ لیکن نسیم نے ٹھنڈا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص نے مشاعرہ میں ایک شعر پڑھا جس کا دوسرا مطلع یہ تھا ع جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں، پہلا مصرع کچھ مہمل سا تھا نسیم کے منہ سے بیساختہ نکل گیا کہ دوسرا مصرع تو خوب ہے لیکن پہلا مصرع ٹھیک نہیں وہ صاحب بھی کچھ جلے تن تھے اُنکے کان تک یہ بات پہونچی تھی کہ جھلاکر بولے کہ اچھا اس سے بہتر مصرع کہہ دیجئے۔ یہاں تو مضامین ہر وقت ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہتے تھے اسی وقت مصرع موزوں کرکے سنا دیا ع تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں، نسیم کی مشاعرہ میں دھاک بیٹھ گئی وہ بیچارہ ذلیل ہوگیا ایک روز آتش کے یہاں شاگردوں کا جمگھٹا تھا رند۔ صبا۔ خلیل۔ وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے نسیم بھی موجود تھے۔ صبح کا سہانا وقت برسات کا موسم مینھ برستا ہوا عجیب کیفیت تھی موسم بہار سے کچھ ایسی طبعیتیں مست ہوئیں کہ شاگردوں نے آتش سے فرمائش کی استاد اسوقت ایک غزل کہہ ڈالئے گو کہ آتش کا دل بجھا تھا لیکن طبیعت میں جوانی کا زور بھرا تھا فی البدیہہ اشعار موزوں کرکے شروع کر دیے اور کہا کہ لکھتے جاؤ جس غزل کا مطلع ہے ؎

دہن پر ہیں اُنکے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

وہ اسی موقع کی کہی ہوئی ہے۔ نسیم کی طبیعت بھی جوش بہار سے لہرائی ہوئی تھی اُنھوں نے ان اشعار کی تخمیس کرنی شروع کر دی۔ جتنی دیر میں آتش دوسرا شعر سوچتے تھے۔ یہ اس عرصے میں اُنکے پہلے شعر پر تین مصرعے لگا چکتے تھے اور بعض بعض مصرع تو واقعی اس انداز سے نکالے ہیں کہ اگر کوئی برسوں فکر میں سر بگریبان رہے تو اس سے بہتر مصرع نہیں لگا سکتا آتش کے دو شعروں کی تخمیس تمثیلاً لکھی جاتی ہے ؎

نہ خونی کفن ہیں نہ گھائل ہوئے ہیں
نہ زخمی بدن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں
لہو مل کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں
تمھارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں

گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

کوئی جانتا ہے کسی کو خبر ہے — کہ پردہ میں کون اے صنم جلوہ گر ہے
کہیں کچھ خیال اور کہیں کچھ نظر ہے — دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمھارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

(صبا سے یارانہ)

اسی طرح چودہ پندرہ شعر کی غزل پر مصرع لگائے ہیں۔ آتش کے شاگردوں میں صبا سے انسے بہت یارانہ تھا انکے مرنے پر صبا نے ایک شعر کہا جو کہ واقعی دردِ دل کی تصویر ہے سہ

اُٹھ گئے ہیں نسیم جس دن سے — اے صبا وہ ہوائے باغ نہیں

(زند سے چشمک)

لیکن زند سے چشمک تھی چنانچہ ایک مشاعرہ میں نسیم نے زند کی ایک مشہور غزل پر خمسہ پڑھا۔ جسکا مطلع یہ تھا سہ

وصلِ انساں کو پریزادوں کا ہو ہے دشوار — فائدہ کچھ نہیں تم مفت میں کیوں ہوتے ہو خوار
سکتے کہتے تو ہوئے تم کو نسیم اب ناچار — عشق کو ترک کر دیا نہ کرو ہو مختار
نیک و بد ہم ہیں تمھیں زند سجھاتے جاتے

اس مصرع کا زبان سے نکلنا تھا کہ ع سکتے کہتے تو ہوئے تم کو نسیم اب ناچار۔ کہ زند نے سرِ مشاعرہ تلوار کھینچ لی اور نسیم سے برسرِ پیکار ہونے کا ارادہ کیا۔ نسیم کے مزاج میں بھی بانکپن تھا یہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ تلوار پر نہ بھولنا یہاں تھپڑوں سے تلوار چھین لیتے ہیں لیکن آفتاب الدولہ قلق وغیرہ اس مشاعرہ میں موجود تھے اُنھوں نے بگڑی ہوئی طبیعتوں کو سنبھالا اور بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالا۔ اور زند سے کہا کہ بندہ نواز یہ تلوار کا مقام نہیں۔ یہاں زورِ قلم سے کام لیجیئے۔ اس ہنگامہ آرائی کی وجہ یہ تھی کہ زند جو کہ ایک رنگین مزاج اور عاشق تن آدمی تھے اس زمانہ میں کسی بارگاہِ حسن کے اُمیدواروں میں تھے لیکن قسمت کی نارسائی سے منزلِ مقصود تک رسائی نہیں ہوتی تھی۔ تلوّن مزاجی نے اس مایوسی کی حالت کو غیظ و غضب سے بدل دیا تھا نسیم نے اس خمسہ میں در پردہ اسی کیفیت کا اشارہ کیا تھا۔

رند کے چوٹ کھائے ہوئے دل پر یہ طعن آمیز نصیحت گراں گذری اور اس معرکہ کا باعث ہوئی
علاوہ بریں اسی غزل میں رند کا ایک شعر ہے ؎

راستہ روک کے کہہ لوں گا جو کہنا ہے مجھے ۔۔۔ کیا ملوگے نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

نسیم نے ایک صحبت میں اس شعر کا دوسرا مصرع پڑھا تو مذاقاً "ملوگے" تانیث کے ساتھ پڑھا یعنے ؎

راستہ روک کے کہہ لونگا جو کہنا ہے مجھے ۔۔۔ کیا ملوگی نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

اس پر بڑا قہقہہ پڑا اور اس شعر کو لوگ اسی صورت پر پڑھنے لگے ۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر رند کے کانوں تک بھی پہونچی حریفوں نے اصل واقعہ پر اپنی طرف سے اور حاشیے چڑھا لئے ۔ غرضکہ رند کے دل میں اس واقعہ کی وجہ سے بھی ایک کاوش موجود تھی یہ بھی ان کے لئے نسیم سے بگڑنے کی وجہ ہوئی ۔ ایک موقع پر رند نے ایک شعر پڑھا ؎

کیا ملا عرض مدعا کر کے ۔۔۔ بات بھی کھوئی التجا کر کے

نسیم نے پہلا مصرع یوں بدل کر پڑھا ع فائدہ عرض مدعا کر کے ۔ اور کہا اب شعر بہتر ہوگیا اور لوگ بھی جو بیٹھے تھے اُنھوں نے بھی نسیم ہی کی ایسی کہی ۔ یہ امر بھی رند کو ناگوار گذرا ۔ نسیم کی جو وقعت شعرائے لکھنؤ کے زمرہ میں تھی اسکا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعہ سے ہوسکتا ہے ۔ ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے کہ شاعران لکھنؤ ان پر مصرع لگاکر بھیجیں تینوں مصرعہ ملاحظہ ہوں

(۱) ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا ۔۔۔ (۲) اسلئے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت

(۳) من میروم بکعبہ و دل میرود بدیر ۔

اب اہل لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعہ کہہ کر بھیجے جائیں کہ دہلی والوں کو بھی یہاں کی شاعری کا قائل ہونا پڑے ۔ اگر مصرعے سُست ہوئے تو کرکری ہو جائے گی غرضکہ تین شخص کو جو ہر طرح اس کام کے لیے موزوں خیال کئے گئے ایک ایک مصرعہ پر مصرع لگانے کا کام سپرد ہوا پہلا مصرعہ ناسخ کو دیا گیا دوسرا آتش کو اور تیسرا نسیم کو گو کہ اسوقت اور بڑے بڑے شاعر موجود

تھے مگر آتش و ناسخ کے ساتھ لکھنؤ کی آبرو قائم رکھنے کا شرف نسیم ہی کو حاصل ہوا۔ تینوں اُستادوں نے جی توڑ کر مصرع لگائے ہیں۔

ناسخ کا مصرع ہے۔ ڈالدے سایہ اپنے آنچل کا + ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا)

آتش کا مصرع ہے۔ حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے + اس لئے قبر میں رکھا انھیں زنجیر سمیت +

نسیم کا مصرع بھی لاجواب ہے۔ دارم ز دین و کفر بہر یک قدم دو سیر + من میروم بکعبہ و دل می رود بہ دیر)

نسیم کے مزاج میں آزادی اور بیباکی کوٹ کوٹ کر بھری تھی کبھی دنیا کے مال و دولت کی تمنا نہ کی گو کہ بہت اہل کشمیر اس زمانہ میں عہدہائے جلیلہ پر ممتاز تھے اور دربار شاہی میں ان لوگوں کی رسائی تھی ان حضرات نے کئی مرتبہ نسیم سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کو دربار شاہی تک پہونچائیں اور ان کے منصب و جاگیر کی فکر کریں۔ مگر شہنشاہ سخن نے دوات و قلم کو طبل و علم پر ترجیح دی اور دنیا کی شان و شوکت کی طرف رُخ نہ کیا۔ اور یہ کیا اکثر اہل کمال اسی رنگ کی طبیعت رکھتے ہیں انیس مرحوم فرماتے ہیں ؎

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے ۔۔۔ سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

ایک مرتبہ امجد علیشاہ کے سامنے ایک طوائف نے نسیم کی وہ لاجواب غزل گائی جسکا مطلع ہے ؎

جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی ۔۔ کیا یہ دنیا عاقبت بخشائیگی۔

جب اس مرصع غزل کا مقطع گایا۔ جان نکل جائیگی تن سے اے نسیم + گل کو بوئے گل ہوا بتلائیگی، تو سخن شناس بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ غزل اسی نسیم کی ہے جو گلزار نسیم کا مصنف ہے۔ اس نے کہا ہاں یہ سنتا تھا کہ ارشاد ہوا کہ اس سخنور باکمال کو دربار شاہی میں حاضر کرو۔ حریفوں نے کہا کہ حضور نسیم کا تو انتقال ہوگیا۔ خدا جانے وہ کیا وقت تھا اور یہ منحوس کلمہ کیسی زبانوں سے نکلا تھا ادھر یہ بات منھ سے نکلی اُدھر تقدیر انداز قضا کے ترکش سے تیر نکلا جسنے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں نسیم کا خاتمہ کر دیا۔ مرنیکے دو تین گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا تھا ؎

پہونچی نہ راحت ہم سے کیسکو بلکہ اذیت کوش ہوئے ۔۔۔ جان پڑی تب بار شکم تھے مرکے وبال دوش ہوئے

از دلگداز بابت ماہ مارچ ۱۹۰۵ء نمبر ۳ جلد ۹

گلزار نسیم پر ریویو

(از مولوی عبد الحلیم "شرر")

ہمارے ہم شہر بلکہ ہم محلہ روشن خیال نوجوان پنڈت برج نرائن چکبست نے گلزار نسیم کا ایک نیا اڈیشن بڑی لیاقت وقابلیت کے ساتھ شائع کیا ہے اور شاید پنڈت دیاشنکر نسیم مرحوم کی ایک خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ انھیں کی مثنوی پہلی اردو نظم ہو جو اس خوبی کے ساتھ اڈیٹ کر کے شائع کی گئی اور ایسے لائق وبامذاق نوجوان کے ہاتھ سے اڈیٹ ہوئی پنڈت برج نرائن صاحب وکیل اپنے ذوق انشاپردازی اپنے حسن عبارت اور اپنے شائستہ مذاق کی حیثیت سے ملک میں ایک ممتاز درجہ حاصل کرتے جاتے ہیں اور انکی یہ کوشش اگر جاری رہی تو کسی وقت میں وہ ملک کے سرمایۂ ناز انشاپردازوں میں ہونگے۔

اپنا جوہر طبع دکھانے کے لیے انھوں نے جس مثنوی کو منتخب کیا ہے۔ وہ بھی علاوہ اس کے کہ قومی تعلقات کے لحاظ سے نوجوان اڈیٹ کرنے والے پر بہت بڑا حق رکھتی تھی اردو کی ایک عجیب وغریب معرکہ آرا نظم ہے اگر اسکے محاسن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ان نظموں میں ہے جس سے کہ اردو شاعری کو اپنی اس صدی دو صدی کی عمر میں شاید دو ہی چار نصیب ہوئی ہوں گی۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اسکے معائب پر نظر ڈالی جائے تو اس سے زیادہ معیوب کسی اردو نظم میں نہیں ہیں۔ پہلے اعلےٰ اور مقبول عام اردو مثنوی میر حسن کی مثنوی ہے

جس میں اور اس میں باعتبار مذاق شاعری و خوبی زبان کے کوئی نسبت نہیں ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں ہمیشہ اس کا نام لیا گیا۔ اور اُن دو شعرا کے کلام کا موازنہ کیا گیا جن کا مذاق ایک دوسرے کی ضد واقع ہوا ہے گلزار نسیم کو جو مقبولیت عام حاصل ہوئی حیرت انگیز ہے۔ لیکن اگر اسکی خوبیوں کا اندازہ کیا جائے تو یہ بے انتہا شہرت بھی اسکے مرتبے سے کم ہے۔ اُردو ہی نہیں اکثر زبانوں میں اس پائے کی نظمیں کم ملیں گی لیکن اسکے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ایسے عیبوں سے بھری ہوئی نظم بھی کوئی نہیں جسوقت اسکے محاسن پر نظر ڈالی جائے تو اس قدر لطف آتا ہے کہ مجبور ہو کے تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔ کہ اس سے اچھی نظم نہیں ہوسکتی۔ اور جسوقت اسکی غلطیوں کی طرف توجہ کیجیئے تو خیال گذرتا ہے کہ شاید اور کسی شاعر کے کلام میں اتنی غلطیاں نہوں گی جتنی کہ نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام میں ہیں۔ اُردو کے شعرا کا خاصہ ہے کہ وہ زیادہ تر لفظی بحثوں میں پڑے رہتے ہیں اور جس کسی کے کلام میں ایک غلطی بھی نکل آتی ہے اُس کا کلام بالکل مٹ جاتا ہی اور ساری شاعرانہ خوبیاں اُس ایک لفظی لغزش پر قربان کردی جاتی ہیں۔ لیکن ایسی شاعری کی دنیا میں نسیم لکھنوی کی مثنوی کا باوجود بہت سی غلطیوں کے چمکنا اور مقبول ہوجانا قابل حیرت چیز ہے۔ یہی امر اس بات کی شہادت ہے کہ گلزار نسیم کی خوبیاں کس پائے کی ہیں کہ بہت سی لغزشوں کے ہونے پر بھی ایسے مذاق والوں میں عام پسند ہوگئی جو ہمیشہ لفظی بحثوں کا شاعری کا اصلی جوہر سمجھتے رہے۔

مسٹر چکبست نے مثنوی کو تصحیح کر کے اور سب سے پہلے ایڈیشن کے مطابق کر کے شائع کیا ہے اور آخر میں پنڈت دیا شنکر نسیم کے دیوان کا کچھ انتخاب بھی چھاپ دیا ہے۔ مگر قابل غور ۱۳ صفحوں کا وہ دیباچہ ہے جو شائع کرنے والے کی لیاقت و قابلیت کو ظاہر کرتا ہی اسکے ابتدائی تین صفحوں میں مصنف گلزار نسیم کے حالات زندگی ہیں اور چونکہ لکھنے والے مصنف مرحوم کے ہم قوم ہیں لہذا ہمیں باور کر لینا چاہیئے کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح ہوگا۔

گلزار نسیم کی تصنیف کے حالات میں مسٹر چکبست نے لکھا ہے جسوقت یہ مثنوی

تیار ہوئی اس کا حجم زیادہ تھا جب آتش کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو انھوں نے کہا ارے بھئی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھے گا۔ یا تم پڑھو گے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا میں اصلاح کے خیال سے ایک مرتبہ دیکھ جاؤں گا۔ استاد کامل کی بات دل پر اثر کر گئی مثنوی کی نظرثانی کی جتنے بھرتی کے شعر تھے نکال ڈالے مگر معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انتخاب و اختصار کا یہ آخری عمل اور تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ منشی اشرف علی اشرف مرحوم جو نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور اس سے پہلے دور کے یادگار میں تھے اس واقعہ کو خود مجھ سے بیان کرتے تھے بلکہ اُن کا بیان تھا کہ پنڈت دیاشنکر کی لکھی ہوئی اصل مثنوی کے بہت سے اوراق بھی میں نے اپنی آنکھ سے دیکھے تھے جو بہت ہی عامیانہ مذاق کے تھے اور ایسے تھے کہ سوا ایک مبتدی شخص کے کسی کہنہ مشق شاعر کی جانب نہیں منسوب کیئے جا سکتے" اسی بیان کی تصدیق میر وزیر علی صبا نے بھی ہمارے بعض بزرگوں کے سامنے کی تھی۔ اور اسی کی بدولت یہ خبر مشہور ہوگئی کہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی ہے۔ انھوں نے پنڈت دیاشنکر کو کہہ کے دیدی"۔ جسکی بنیاد پر چودھویں صفحہ میں مسٹر چکبست نے پہلے تو اس شہرت کی بدولت مصنف کو اعلیٰ ناموری کا تاج پہنایا ہے اور پھر لکھا ہے "سخن شناس جانتے ہیں کہ جس رنگ میں گلزار نسیم کہی گئی ہے اس رنگ میں آتش نے اپنی زندگی میں ایک شعر نہیں کہا" مگر مجھے تعجب ہے کہ مصنف کے دیوان کا جو انتخاب مسٹر چکبست نے اسی مثنوی کے آخر میں چھاپا ہے اس میں بھی اس رنگ کا کوئی شعر نہیں ہے۔ ہمارے روشن خیال دوست نے اس بات کا لحاظ نہیں کیا کہ غزل اور چیز ہے اور مثنوی اور چیز۔ انسان کی طبیعت جو رنگ غزل میں دکھاتی ہے۔ ضرور نہیں کہ مثنوی میں بھی وہی رنگ دکھائے آتش وہ شخص تھے جو غزل کے سوا کسی اور صنف سخن میں کہنا اپنی شان شاعری سے ادنےٰ خیال کرتے تھے۔ اگر انکی کوئی اور مثنوی موجود ہوتی تو بیشک مقابلہ کیا جا سکتا تھا کہ جو رنگ اس مثنوی میں تھا انہیں کیوں نہیں ہے لیکن دیوان کے رنگ کو پیش کر کے مثنوی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا اس بات کا

ثبوت دیتا ہے کہ مسٹر چکبست کو اسکی خبر ہی نہیں کہ شاعرانہ مذاق ہر صنف سخن میں جداگانہ رنگ دکھایا کرتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر آتش نے اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انھیں نو عمر شاگردوں سے تھی اُسی کی تحریک سے یا اُسکی مشق اولیں دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پہ کہا ہو۔ پھر اسمیں متعدد لغزشیں دیکھ کے اُسے بجائے اپنے اُسی کی طرف منسوب کر دیا ہو۔

جن دنوں یہ مثنوی کہی گئی ہو ان دنوں شاعری کا یہ رنگ تھا کہ معائب محاسن پر غالب خیال کئے جاتے تھے۔ اور شعرا کو کلام میں خوبیاں پیدا کرنے سے زیادہ فکر اس بات کی ہوتی تھی کہ کلام عیوب سے پاک ہو۔ لہذا یہ خیال اس بات کا پورا محرک ہوسکتا تھا کہ آتش اس مثنوی کو کہیں اور اپنے کمسن شاگرد کو دیدیں مصنف کی مختصر لائف کو ختم کرتے ہی مسٹر چکبست نے مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم کا موازنہ شروع کر دیا ہے اسکے متعلق مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ موازنہ سے پیشتر ضرورت تھی کہ گلزار نسیم پر بلا لحاظ کسی اور نظم کے ایک مفصل اور معقول ریویو کیا جاتا۔ اور ہر قسم کی خوبیاں اُسمیں سے نکال کے دکھائی جاتیں اس کام کو مسٹر چکبست نے کیا ہے مگر بہت ہی ناقص اور ناتمام درجہ تک۔

مسٹر چکبست کے اس خیال کی میں تائید کرتا ہوں کہ اس مثنوی کا مصنف کسی کی خرمن کا خوشہ چین نہیں بلکہ خود صاحب طرز ہے۔ اسکے بعد قابل (ریویو) نگار نے تناسب لفظی کی بحث شروع کی ہے اور اس صنعت میں نسیم لکھنوی کا اعلیٰ کمال دکھایا ہے۔ رعایت لفظی کا خیال چاہیئے اُسے حسن کہئے خواہ عیب سمجھئے۔ بعض شعرائے لکھنؤ میں مرض کے درجے تک پہونچا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس دھن میں مبتلا ہو کے بعض اوقات وہ جادۂ اعتدال سے گذر گئے ہیں۔

مسٹر چکبست نے امانت۔ خلیل۔ رند۔ اور قلق کا ایک ایک شعر یا مصرع نقل کر کے سب کی شاعری میں دھبہ لگایا ہے۔ چنانچہ امانت کی نسبت لکھتے ہیں۔ تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجہ تک پہونچ گیا ہے لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہیں ہے اور طبیعت میں شستگی کا جوہر نہیں لہذا جو شعر کہا ہے اس رنگ میں کہا ہے اُسے پڑھکر ہنسی آتی ہے)

اگر دیگر شعرا کے حال پر صرف اتنی ہی مہربانی کی ہے کہ تناسب الفاظ کا لطافت کے ساتھ نباہنا ایک امر دشوار ہے اور آخر میں جب دیکھا کہ ایسے ہی معیوب اشعار گلزار نسیم میں بھی موجود ہیں تو تسلیم کر لیا۔ کہ "اکثر نسیم سے بھی تناسب الفاظ کے ساتھ لطافت سخن قائم نہیں رہ سکی" پھر جب دیکھا کہ اس اقرار کے گناہ سے اوپر کا دعوےٰ بالکل منسوخ ہوا جاتا ہے تو اس دشواری کو یہ کہہ کے ٹالا کہ "اس قسم کے اشعار کل مثنوی میں دو فی صدی سے زیادہ نہیں ملیں گے لہذا قابل معافی ہیں"۔ مگر ہمارے دوست کو خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جن شعرا کو انھوں نے ملزم ٹھہرایا ہے ان کے کلام میں بھی ایسے معیوب اشعار فیصدی دو سے زیادہ نہ نکلیں گے اور کوئی تعجب نہیں کہ اتنے بھی نہ نکل سکیں سچ یہ ہے کہ امانت نے تناسب الفاظ کی فکر میں اپنے تئیں بدنام تو بہت کیا۔ مگر اس صنعت کے پیچھے پڑ کے ٹھوکریں بہت کھائیں تو کامیاب بھی سب سے زیادہ وہی ہوئے۔

گلزار نسیم کے اختصار۔ اس کی ترکیبوں کی پختگی تشبیہات کامل، کلام کی سادگی و روانی اور پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے بہت صحیح ہے بلکہ اس سے بڑھ کے ہے ہم لکھتے تو اس سے کچھ زیادہ ہی لکھتے اسلئے کہ ہم ہمیشہ سے گلزار نسیم کے بہت بڑے معترف ہیں مگر افسوس اس بات کا ہو کہ اسکے دوسرے رُخ یعنی مثنوی گلزار نسیم کے عیوب کی طرف سے مسٹر چکبست نے بالکل چشم پوشی کی ہو اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ اس اڈیشن میں گلزار نسیم پر ایک منصفانہ ریویو کیا جاتا اسلئے کہ جس قدر یہ مثنوی ایک عمدہ ریویو کی محتاج تھی اردو کی اور کوئی نظم نہیں۔ مگر افسوس کہ ریویو نویسی میں ہمارے یہاں یا تو مروت و دوستی کے جذبات ظاہر کیئے جاتے ہیں یا بغض و عناد کے۔ اور اگر معاصرین سے واسطہ نہو تو ہمارے ریویو نگار قوم پرستی کرتے ہیں اور اپنی قوم و گروہ میں ہیرو پیدا کرنے کی ایسی ہوس ہوتی ہو کہ انصاف کو بالکل ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں اس مرض سے انگلستان کے ریویو نگار بھی پاک نہیں ہیں مگر زمانے کی مساعدت سے مغرب والے اپنی اس ہوس میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ہم اپنی وقعت

اور کم کر دیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ وہاں ایک ہی قوم ہے اور سب کے جذبات یکساں ہیں بخلاف اسکے یہاں باہمی اختلاف ہے لہذا ایک گروہ کسی شخص کو زبردست ہیرو بناکے بڑھاتا ہے تو دوسرا گروہ اُسکے گرانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی سبب سے ہمکو ریویو لکھنے میں جسقدر اعتدال اور منصف مزاجی سے کام لینے کی ضرورت ہے اہل یورپ کو نہیں ہے۔ واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ اس ریویو میں نسیم کے مقابل میں لکھنؤ کے بعض مشہور و معروف اور مستند شعرا کے مٹانے کی کوشش کیگئی ہے اور محض اُن غیر معتبر کہانیوں کی بنیاد پر جس سے یہاں کے تمام شعرائے حال ناآشنا ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ کسی خاص حلقہ میں شہرت رکھتی ہوں مگر محققین کے نزدیک بالکل بے بنیاد ہیں اور اتنی وقعت ہرگز نہیں رکھتیں کہ تحریر میں لائی جائیں۔

اس سلسلے کو ہمنے ابھی ختم نہیں کیا ہے دلگداز کے آیندہ نمبر میں ہم اصل مثنوی گلزارنسیم پر ایک (ریویو) لکھیں گے جس کے لئے اس نمبر کے صفحات کافی نہیں ہیں ہم گلزارنسیم کے محاسن کو نہیں بتائیں گے اسلئے کہ وہ سب کے نزدیک مسلم ہیں اور اُن کے حیطۂ تحریر میں لانے کیلئے ضرور ہے کہ ایک ضخیم کتاب لکھی جائے ہم صرف ان اشعار کو درج کریں گے جن پر عام اہل سخن معترض ہیں اور جن کا اسوقت تک جواب نہیں دیا گیا ہے گلزارنسیم میں ایسے اشعار بہت ہیں جن کی بنا پر صرف یہی نہیں کہا جاتا کہ نسیم کی زبان میں غلطیاں ہیں بلکہ یہ بھی دعوی کیا جاتا ہو کہ پنڈت دیاشنکر نسیم زبان پر اتنی حکومت نہیں رکھتے کہ ہر ایسے مضمون کو جو خیال میں آوے ادا کرسکتے جائیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ مسٹر چکبست بجائے مولوی حالی کے اعتراضات کا جواب دینے کے اُن عیوب کے مٹانے کی کوشش کرتے۔

دلگداز بابت ماہ اپریل ۱۹۰۵ء نمبر ۴ جلد ۹

مسٹر چکبست نے شمس العلماء مولانا حالی کا جواب دینے کے لئے خاص اہتمام کیا ہے اور اُس بحث کو مکرر چھیڑ دیا ہے جو پیشتر اودھ پنچ میں چھڑ چکی تھی ہمارے مہربان کو حالی کو جواب دینے سے پہلے ان اعتراضوں کے اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے تھی جو خود اساتذۂ

لکھنؤ کی جانب سے وارد کیے جا رہے ہیں۔ باہر والوں کو یقین کامل ہے کہ گلزار نسیم کی زبان خاص لکھنؤ کی زبان ہے جسکے باعث سارے ہندوستان میں لکھنؤ کی زبان کا نہایت ہی غلط اندازہ کیا جاتا ہے۔ دہلی والے گلزار نسیم پر اعتراض کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اعتراض عام اہل لکھنؤ اور لکھنؤ کی مستند زبان پر ہے اسلئے ضرورت بھی ہے کہ عام پبلک پر ظاہر کر دیا جائے کہ گلزار نسیم میں اہل لکھنؤ کے نزدیک صدہا غلطیاں ہیں اور اس مثنوی کی زبان اہل لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔

میرا مقصد اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ صرف دو مقصد ہیں۔

(۱) یہ کہ عام غلط فہمی دفع ہو کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مسلم و مستند زبان ہے۔

(۲) یہ کہ چکبست کی توجہ اس جانب مائل کیجائے کہ ان شبہات سے جو اس مثنوی کی نسبت اکثر اہل لکھنؤ اور عام شعرائے اردو کو ہیں وہ واقف ہو سکے اُن کو دور کریں اور اس مثنوی کو ویسا ہی پاک و بے عیب ثابت کر دکھائیں جیسا کہ میرے نزدیک اسے ہونا چاہیئے۔ لہذا اب میں مثنوی کے اشعار نقل کر کے لوگوں کے شبہات و اعتراضات کو پیش کئے دیتا ہوں منشی چکبست کو اختیار ہے چاہیں اُنھیں تسلیم کریں یا اُنکی تردید فرمائیں۔ گلزار نسیم ایسی مثنوی ہے کہ ان اعتراضوں اور شبہوں سے اُسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہونچ سکتا نہ اُسکی خوبیاں کم ہو سکتی ہیں اور نہ اسکی شہرت مٹ سکتی ہے۔ اسلئے کہ وہ باوجود ان غلطیوں کے اعلیٰ درجہ کی اور بے مثل اور بے نظیر مثنوی ہے مگر ہاں اتنا ضرور ہو گا کہ لوگ دھوکے سے بچ جائینگے اور اُن غلطیوں سے محفوظ رہیں گے جو دکھائی جاتی ہیں۔

بعض اشعار کا مطلب ہی نہیں سمجھ میں آتا ممکن ہے کہ میری ہی فہم کا قصور ہو۔ ایسی صورت میں جن صاحبوں کی فہم رسائی کرتی ہو وہ مجھے سمجھا دیں ؎ صاد آنکھوں کی دیکھ کر سیر کی +

بینائی کے چہرے پر نظر کی + بینائی کے چہرے پر نظر کرنے سے کیا مراد ہے ؎

اک بلی جو چھیٹی چوہے کو بھانپ
نیولے نے بھگا دیا دکھا سانپ

سانپ کو نیولا مار ڈالا کرتا ہے۔ مگر یہ دکھا سانپ کیا۔ آخر نیولے نے مداری کا تماشا کیوں دکھایا

سن کے قیدی کے زار نالے + زنجیر کے پیچ سے نکالے + مانا کہ زنجیر کے ایسے پیچ نکال ڈالے" مگر اس سے یہ مطلب کیونکر نکلا کہ بکاؤلی کے پاؤں میں سے زنجیر نکال لی؟ سچ یہ ہے کہ یہ شعر یوں ہو ؎ سن کے قیدی کے زار نالے + زنجیر کے پیچ سے نکالے + زار نالے چاہیے غلط ہو مگر مصنف نے اس سے رونے دھونے کے معنے لئے ہیں اور دوسرے مصرع میں وہی ترکیب رکھی ہے جو اس کے کلام میں عام ہے۔ یعنی زنجیر کے پیچ سے نکالے بجائے زنجیر کے پیچ سے اسے نکالا ؎ واں پھانسی پھنسی ہے اسکو غم کی + یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی + "ایک دم کی سانس نہ ہونا" اس محاورے کے معنی مجھے نہیں معلوم۔

بعض جگہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کسی مضمون کے ادا کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ضروری الفاظ کے چھوڑ دینے سے مطلب خبط ہو گیا ہے اور کامیابی نہیں ہوئی یا کچھ اور مطلب ہو گیا ؎ چاہا گلچیں کا امتحان لے + پوچھا کہ نگین جو لے کہاں لے + جب تک کہ کسی خاص نگیں کو دکھا کے یہ نہ کہا جائے کہ اس نگین کو لے تو کہاں لے اس وقت تک اس عام سوال کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ ٹرکنا ہوا اس پری کا مشکل + یہ دل لگی اب لگائے گی دل + پہلے مصرع کے ذریعے سے مصنف نے تو یہ مضمون ادا کرنا چاہا ہے کہ اس پری دروح افزا کے ٹھہر جانے سے دشواریاں پیش آئیں مگر زبان پر قدرت نہ ہونے سے مطلب یہ ہو گیا کہ اس کا ٹھہرنا مشکل ہوا یعنی ٹھہر نہ سکی۔ شہزادے نے ایک دن پھر آکر + شادی کو کہا حیا اٹھاکر + "پردۂ حیا اٹھاکر" کی جگہ صرف "حیا اٹھاکر" موزوں تو کر دیا گیا ہے مگر معنی کچھ نہیں رہے ع دختر جو پسند مہ لقا ہے۔ صرف ترکیب کی خرابی نے مطلب خبط کر دیا۔ کہنا یہ تھا کہ مہ لقا دختر جو پسند ہے۔ بہت سے اشعار میں لفظی غلطیاں ہیں یا تو لفظ کے حرکات غلط ہو گئے ہیں۔ یا ان کے معنے غلط لئے گئے ہیں یا بے محل انکا استعمال ہو گیا ہے یا ان میں تذکیر و تانیث کی یا اور کسی قسم کی غلطی ہے ؎ بولا کہ چکھوں گا میں یہ انسان" یا "بیڑے چکھے پان کے خریدا" میرے خیال میں ناسخ و آتش کے زمانے سے لے کے اس وقت تک چکھوں گا اور چکھے کی جگہ

لکھوں گا اور یہ حکھے غیر فصیح ہی نہیں بلکہ غلط ہے دوسرے مصرع میں صرف بڑے گاتی تھا
ان کے بڑے محاورے میں اچھا نہیں۔ مسٹر چکبست نے آتش کی جو اصلاح نقل کی ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُستاد نے یہ دونوں غلطیاں نکال دی تھیں مگر نسیم نے بلا لحاظ اسکے
اسی غلطیوں کا اعتراف کرتے اپنا وہی ناقص مصرع قائم رکھا۔ خیر ان کی خوشی۔ مگر خرابی یہ
کہ ذمہ دار لکھنؤ قرار دیا جاتا ہے ـ کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا + اور "وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی"
ان دونوں مصرعوں میں حمل کی جگہ حَمَل نظم کر دیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے ـ بادل سا وہ بحرِ آسماں تک
بجلی سی لہر سے تھا ہم آغوش + قطع نظر اسکے کہ پہلا مصرع بہت بھونڈا ہے "لہر" کی جگہ "لہر"
یعنی ہائے متحرک کے ساتھ موزوں کر دیا گیا ہے جو اردو میں غلط ہے ـ جاگی تو سب اسکے جوڑ کی
تھیں + اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں۔ اس میں "پری" کی جگہ "پریاں" چاہیے جو نہایت
ذلیل قسم کی غلطی معلوم ہوتی ہے ـ خوش لہجہ بہت بکاولی تھی + گاتی اور ناچتی بڑی تھی اول
مصرع میں خوش گلو یا خوش آواز کی جگہ غلطی سے "خوش لہجہ" کا لفظ استعمال ہو گیا اور دوسرے
مصرع میں "بڑی" کا لفظ سراسر غلط اور بہت ہی بُرا ہے۔ یا تو بڑی ناچنے گانے والی "چاہیے"
یا یوں کہنا چاہیے کہ "خوب گاتی ناچتی تھی" یہ "ناچتی گاتی بڑی" کیا؛ یہاں "بڑی" کا
لفظ صرف اس سبب سے بگڑ گیا کہ مسٹر چکبست نے بے سمجھے تصرف فرمایا ہے۔ نامی پریس
لکھنؤ کی چھپی ہوئی مثنوی میں اس شعر کا آخری مصرع یوں ہے ـ گاتی اور ناچتی بڑی تھی۔
یعنی بڑی گانے اور ناچنے والی تھی۔ گو اُس پر بھی یہ اعتراض ہوتا کہ "گائن" کی جگہ "گاتی
اور ناچنے والی کی جگہ "ناچتی" غلط ہے۔ مگر شعر کے معنی پیدا ہو جاتے اور ایسا مہمل نہ رہتا
جیسا کہ اسے مسٹر چکبست نے بنا دیا ہے "چنگل اور چنگال" کا لفظ تین جگہ استعمال ہوا ہے
اور تینوں جگہ بے موقع اور غلط "پہونچا لب حوض سے نہ چنگل" یعنی ہاتھ نہیں پہونچا "شہزادے
پر اس نے مارا چنگال" یہاں اگر یہ کہا جائے کہ پریوں کی طرح پری کے پنجے بھی تھے تو شاید صحیح
ہو جائے "پیارے یہ نہیں حنائی چنگال" یہاں تاج الملوک اپنے مہندی لگے ہاتھوں کو

"سنائی جنگال" کہتا ہے لکھنؤ کی تو یہ زبان نہیں ہے ہاں نیرنگ نسیم باغ کشمیر ہو تو اور بات ہے ؎

"بیجا وہ ہوا کہ کہا کہ جا جا۔ کیسی رانی کہاں کا راجا۔ برہم ہوا کی جگہ پر "بیجا" ہوا کہنا میرے خیال میں بہت ہی مبتذل بازاری زبان ہے اور بازار بھی لکھنؤ نہیں کہیں اور کا ؎

جھنجھلا کے ڈرا کے غل مچا کے + سمجھا کے بجھا کے دست پا کے + اردو میں دسترس پانا کہہ سکتے ہیں مگر دست پانا قابو پانا کی جگہ پر ہرگز نہیں جائز ہے۔

اردو میں جانی کا لفظ سوا معشوقہ کے اور کسی کی شان میں اور وہ بھی خلوت کے سوا دیگر موقعوں پر استعمال کرنا بدتمیزی ہی نہیں غلطی ہے مگر گلزار نسیم میں تاج الملوک اپنی معشوقہ نہیں بلکہ روح افزا سے پہلی ہی ملاقات میں کہتا ہے کہ "جی بجھا نہ جانی" اور وہ جواب دیتی ہے "تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی" اس آخر الذکر مصرع میں "تجھ پاس" کا لفظ بھی "تیرے پاس" کے محل پر معلوم نہیں کہاں کی زبان ہے ؎ نکلا جیسے ہی منہ کے باہر + پتھر اگئی چشم حلقۂ در + حلقۂ در فارسی میں کنڈی کو کہتے ہیں اور یہاں جب ہی معنی درست ہو سکتے ہیں کہ حلقۂ در سے دروازے کا پورا چوکھٹا مراد لیا جائے اگر صرف چشم در کہا گیا ہوتا تو یہ خرابی نہ پیدا ہوتی۔ اک دن پنجرا اڑا کے لائی + حسن آرا کو وہ کل بجھائی + یہ تدبیر بتائی کہ کیونکر یہ آدمی قمری بنایا گیا ہے۔ اردو میں صرف مادی مشینوں کی نسبت کل کا لفظ مستعمل ہے طلسم جادو اور عمل وغیرہ کی نسبت اس کا استعمال ہرگز جائز نہیں کہا جا سکتا ؎ دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی + شب کو اسے آدمی بناتی + طوطا پڑھایا جاتا ہے۔ مینا پڑھائی جاتی ہے۔ فاختہ کا پڑھایا جانا بالکل نئی بات ہے۔ سوچا تو نہ تھا صلاح الجھنا۔ دانائی تھی بات کا سمجھنا۔ "دانائی تھی" کتنا برا اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔ رعایت لفظی کے التزام کو دور کرنے کے بعد بھی مسٹر چکبست نے تسلیم کر لیا ہے مگر فرماتے ہیں کہ اوروں سے کم ہے۔ شاید ایسا ہی ہو اس لئے کہ ہم اس کا موازنہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر اتنا جانتے ہیں کہ اس رعایت کے شوق نے نسیم لکھنوی کے کلام میں بہت سے بدنما عیوب بھی

نہیں پیدا کئے بلکہ بعض موقعوں پر انھیں ابتذال اور فحش گوئی پر بھی آمادہ کردیا ہے
داغا تو چلے تفنگ سے وہ + چھوٹے قید فرنگ سے وہ + تفنگ کے چلنے سے انسان کی
چال کو کیا علاقہ مگر صرف اس وجہ سے کہ بندوق بھی چلا کرتی ہے اُسے موزوں کردیا گیا ہے
وہ پوربی کرکے جوگیا بھیس + جنگلے کی راہ سے چلا دیس + اور سب راستے چھوڑ کے
تاج الملوک جنگلے کی راہ سے صرف اسلئے بھیجا گیا ہے کہ مصنف گلزار نسیم کو اس لفظ کی ضرورت
تھی ہے نقش اسکو ہوا کہ بس رہی ہے + ان سادوں سے کندہ کب ہوئی ہے۔ رعایت نے
کیا کیا خرابیاں پیدا کیں ہیں (۱) اُسکے دل پر نقش ہوا۔ نہیں بند ہو سکتا تھا۔ مگر "نقش" کے
لفظ کی ضرورت تھی "نقش اس کو ہوا" گو بے معنی ہے مگر لکھ دیا گیا ہے (۲) اصل تو
سادہ مزاج سادہ لوح تھے "سادے آدمی" اور سادے لوگ بھی۔ سہی مگر محض
"سادوں" کا لفظ تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اس کے بعد (کندہ کب ہوئی ہے) تو فحش
بازاری اور انتہا درجے کا ابتذال ہے ہے دیوؤں نے ادھر محل بنایا + کشتی سے وہ دختِ رز کو لایا
مطلب تو یہ ہے کہ محل کے بنتے ہی وہ کشتی سے اپنی معشوقہ عورتوں کو لایا اور بغیر خیال کے پر
دختِ رز لکھ دیا۔ اور یہ یاد ہی نہ رہا کہ دختِ رز شراب کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی شاید یہ کیے
جائیں کہ محل کے بنتے ہی جام شراب کا دور چلنے لگا۔ مگر سیاقِ کلام بتا رہا ہے کہ مصنف کا مقصد
یہ نہیں ہے کیونکہ اسکے بعد ہے ہے حال اُس کی مادرِ پیر + محمودہ سے ہوئی بغلگیر + اگر دخت رز
کا آنا محمودہ کا آنا نہیں تھا تو پھر حالہ اُس سے کیونکر ملی کیونکہ وہ تو کشتی میں ہے اور ابھی نہیں آئی ہے
وہ گندم جو نما تھی بالی" ملاحظہ ہو کہ رعایت لفظی نے مضمون کی کیا مٹی خراب کی ہے اب
اس سے بھی زیادہ شرمناک اور فحش رعایت لفظی دیکھیے ہے حوض اس کی ہوئی یہ دیکھتے ہی
فوارہ تو گم خزانہ باقی + بھلا فحش اور ابتذال کی کوئی حد ہے ہے باہم زن و مرد نے کیا میل +
دریا سے ملا وہ قطرہ زن سیل + یہاں سیل کے معنی ہی کچھ نہیں باقی رہے ہے
غربت میں وطن کی دھن سمائی + اُس نیل کو یاد ہند آئی + فیل سے تشبیہ صرف ہند کی

ضرورت سے دیکھی ہو۔ مگر کسقدر بُرا معلوم ہوتا ہے "خواہش جو بلائے جاں ہوئی وہ ہلکا
ہوا یہ گراں ہوئی وہ" یعنی بکاؤلی تو آدمی تیھر کی ہوگئی تھی اس لئے گراں ہوئی مگر ایسی حالت
میں تاج الملوک صاحب کیونکر ہلکے ہوئے۔

بہت سے شعروں میں افعال کا استعمال ایسی بُری طرح ہوا ہے کہ جو نہ لکھنؤ والوں کے نزدیک
جائز ہے اور نہ دہلی والوں کے نزدیک اس قسم کے افعال عموماً حیدرآباد دکن والوں کی زبان پر ہیں
مگر فصحا وہاں بھی چھوڑ جاتے ہیں "خاتم کے نگین بتاتے ہوتے" بجائے خاتم کے نگین انھوں
نے بتائے ہوتے دیا، خاتم کے نگین کو بتایا ہوتا "حیلہ کرکے چھپائی یک چند" بجائے اس کے
چھپایا "مردانہ لباس سے نکالی" بجائے اسکو نکالا "بھڑکائی جمیلہ مادر اسکی" کہنا یہ چاہیے کہ
بھڑکایا اسکی مادر جمیلہ کو "چھینٹے سے جلی ہوئی جلائی" بجائے جلی ہوئی کو جلایا ؎
اُس شب کو بغل میں آکے جاگا + پر دوسری شب وہ جاکے جاگا + مطلب یہ کہ اس رات
(تاج الملوک) جب وہ آئی تب جاگا۔ مگر دوسری رات کو جب وہ جائیگی تب جاگا ؎
دائیں دیکھا نظر نہ آئی + بائیں دیکھا کہیں نہ پائی + یعنی کہیں نہ پایا "یہ جاکے ہوئی وہ فتنہ بیدار"
یعنی اسکے جانے کے بعد وہ بیدار ہوئی (بیدار کیا وہ ماہ پیکر) یعنے اُس ماہ پیکر کو بیدار کیا۔
روح افزا سے بکاؤلی کو + اُلفت تھی رو کے دگلی کو + بجائے رو کا "منہ بولی بہن بنائی اسکو"
بجائے بنایا اُس کو۔ وہ جالی کہا یہ پردہ پوشی + گندم کے بہانے جو فروشی۔ بجائے
"وہ جالی تو" یا اُس کے جانے کے بعد کہا۔ شتر گربہ کے عیب سے بھی مثنوی پاک نہیں ہو ؎
سہنے یا نہیں یہ خطا تمھاری + فرمایئے کیا سزا تمھاری + افسوس معلوم ہوتا ہے کہ اس نقصان نے
کیسے اچھے شعر کو مٹا دیا دو ایک جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے چھپنے میں غلطی ہوگئی اور وہ
ابتک چلی آتی ہے۔ مسٹر چکبست نے ان غلطیوں کی طرف بھی توجہ نہیں کی ؎
رہرو کو دیا بہ لطف و اکرام + کرتے آرام جاتے پیغام + صاف ظاہر ہے کہ پیغام کی جگہ اصل
میں "انعام" کا لفظ ہوگا ؎ دیکھا تو تمام دشت گلزار + دائیں بائیں دو رستہ بازار

اسمیں میں سمجھتا ہوں دو رستہ کی جگہ (دو دستہ) ہوگا اس ایڈیشن میں جو اس اہتمام سے شائع کیا گیا ہے ایسی فردگذاشتیں ہرگز قابل معافی نہیں مگر خرابی تو یہ ہے کہ اصلاح درکنار اس ایڈیشن میں جہاں کہیں تصرف کیا گیا ہے اور کسی قسم کی تصحیح کی کوشش کی گئی ہے وہاں بجائے بنانے کے شعر غارت کر دیا گیا ہے۔

مسٹر چکبست صاحب نے اس نئے ایڈیشن کو خود مصنف صاحب کے اصلی ایڈیشن کے مطابق درست کرکے شائع کیا ہے میں نے اس کا اندازہ کرنے کے لیے مطبع نامی لکھنؤ کے آخر سنہ ۱۹۰۸ء کی چھپی ہوئی مثنوی گلزارنسیم منگوائی اور اُس سے مقابلہ کرکے دیکھا امید تو یہ تھی کہ اُن کی اس کوشش سے بہت سی فردگذاشتوں کا جواب ملجائیگا اور جو اعتراضات وارد ہوتے تھے دور ہوجائیں گے۔ مگر حالت یہ نظر آئی کہ جو غلطیاں پیشتر سے تباہی چلی جاتی تھیں انکا مٹنا تو درکنار ہمارے دوست نے بہت سی اور نئی غلطیاں پیدا کر دیں۔ چنانچہ ان تصرفات کی حالت بھی ملاحظہ ہو ؎ گلزار کی سیر خوب بھائی + برسوں سے نہیں تو گھر بھی آئی + اسکے پہلے مصرع میں تصرف کرکے "گلزار کی سیر کیا خوش آئی + بنایا گیا ہے اہل زبان سے پوچھیے کہ اس اصلاح سے شعر بنایا بگڑا ؎ آکر جو ہے دیکھتی جمیلہ + روشن ہے چراغ اور فتیلہ اُسمیں روشن کی جگہ روشن تھے بنا دیا گیا اور اسکا خیال نہیں کیا گیا کہ جو ٹنس پہلے مصرع میں ہے وہی دوسرے میں بھی رہنا چاہیئے علاوہ بریں یہاں فعل واحد ہی محاورہ میں فصیح ہے ؎ دو دل جو ہوں چاہنے پہ راضی + یہ جان لے کیا کرے گا قاضی + اسمیں (چاہنے پہ) میں تو سمجھتا ہوں کہ اس اصلاح نے شعر کی مٹی خراب کر دی (جانبین) کے ساتھ جب تک کوئی اور حرف ربط نہ ملایا جائے مطلب ہی نہیں نکل سکتا (جانبین سے دل راضی ہوں) (جانبین کے دل راضی ہوں) خالی جانبین تو کوئی چیز نہیں ہے (بولی وہ جمیلہ پھر کروں کیا) کی جگہ (کہہ کروں کیا) بنا دیا گیا ہے جس سے اصل مصرع کی فصاحت بے تکلفی و سادگی جاتی رہی ہے ؎ ایک ایک سے رات بھر نہ چھوٹا + پو پھٹتے ہی جگ انکا ٹوٹا +

مسٹر چکبست نے دوسرے مصرع کو (دیو پھٹتے جگت انھوں کا ٹوٹا) بنا دیا ہے
ایسی تصحیح کر کے کیا ہمارے دوست ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ اس مثنوی میں جتنی غلطیاں
ہمیں نظر آئی ہیں اصلی ایڈیشن میں ان سے بھی زیادہ تھیں؟ تو یہ کہنا چاہیئے کہ بازاری
پریس نے مثنوی کو بگاڑا نہیں بلکہ بنا دیا ؎ شبنم کے سوا چرانے والا + تھا اوپری کون آنیوالا
اس کی تصحیح یہ کی گئی ہے کہ (اوپر کا تھا کون آنے والا + دونوں کا فرق اُن لوگوں سے پوچھیئے
جن کی زبان کوثر کی دھوئی ہوئی سمجھی جاتی ہے ؎ تھا داغ پسر مقدر اسکو + جنتی تھی ہمیشہ دختر اسکو
اسکی تصحیح یہ کی گئی ہے کہ (جنتی تھی ہمیشہ دختر اس کو) شاید مسٹر چکبست نے یہ خیال فرمایا
ہے کہ (جنتی تھی اُسکو) کے معنی یہ ہیں کہ (وہ لڑکی جنا کرتی تھی) جو اصل مثنوی کا مقصد ہے مگر
اس اصلاح سے تو اب صاف یہ معنی پیدا ہو گئے کہ ہمیشہ دختر اسکو جنا کرتی تھی ؎
قاصد نے جو رُخ پری دکھایا + دھیان اُس کو بکاؤلی کا آیا + اس میں یہ اصلاح دیگئی ہے
کہ (رخ پری) کے تو یہ معنی ہیں (پری سا چہرہ) وہ چہرہ جو پری تھا یعنی خوبصورت تھا
اضافت کے ساتھ (رُخ پری) کے یہ معنی ہوئے کہ (پری کا چہرہ) اسلئے کہ اضافت توصیفی
نہیں ہو سکتی۔ وہ جب ہوگی جب (رُخ پری وش) کہا جائے فارسی میں (پری) کے معنے
(خوبصورت) کے نہیں آئے ہیں۔ اب سنئے کہ یہ قاصد تن پری تھی اور اس نے اپنا چہرہ دکھایا
تھا لہذا (پری کا چہرہ) کہنے کا محل نہیں بلکہ (پری سا) چہرہ کہنے کا محل ہے فرض کیجئے کہ کوئی
پری کسی کے سامنے آئے تو آپ کہیں گے کہ (پری نے اپنا چہرہ دکھایا) یا یہ کہیں گے کہ
(پری سا چہرہ دکھایا) ہرگز نہیں کہیں گے کہ (پری کا چہرہ دکھایا۔ اور (پری سا چہرہ) اسی
صورت میں سمجھا جائے گا جب (رُخ پری) بغیر اضافت کے کہا جائے غرض اس اصلاح میں
بھی ناسمجھی سے مثنوی پر ظلم ہوا ہے۔ قسمت سے مفر ہے اب نہ مامن + پتھر کے تلے دبا ہے دامن
اصلاح میں مفر کا لفظ مقر بنا دیا گیا ہے۔ مفر کے معنے بھاگنے کی جگہ اور جائے پناہ ہیں اور
مقر کے معنی جائے قرار ہیں۔ یہ محل اس بات کے کہنے کا ہے کہ قسمت سے بھاگ کے بھی

کہیں پناہ نہیں مل سکتی اور یہی اہل زبان کے محاورے میں بھی ہے۔ مگر خدا جانے کس مصلحت سے یہ لفظ اصلاح دے کر مقرر بنا دیا گیا۔ وہ مست مے شبانہ گوئی + مہتابی پہ چاندنی سی سوئی۔ اصلاح یہ دی گئی ہے کہ (چاندنی میں سوئی) کہاں (چاندنی سی) جسمیں مصنف ایک نہایت ہی پرلطف تشبیہ دیتا ہے اور معشوقہ کو خود چاندنی قرار دیتا ہے۔ اور کہاں (چاندنی میں) جو بالکل معمولی اور بے مزہ بات ہوگئی ہے صیادنی لائی پھانس کر صید + کرسی پہ بٹھائے نقش امید۔ (صیادنی) کو بدل کے (صیاد تھی) بنا یا گیا ہے۔ افسوس کہ (صیادنی) کتنا بے تکلف اور پیارا لفظ تھا۔ مگر اپنی اپنی سمجھ ہے اور اپنا اپنا خیال ہے چلئے گا تو ساتھ ہیں بلا عذر + رہیئے گا تو بندگی میں کیا عذر + اسمیں یہ اصلاح ہوئی ہے کہ (ساتھ میں) بنا دیا (ساتھ ہیں) میں کس قدر بیساختہ پن اور کیسی صحیح و بے تکلف زبان تھی اور (ساتھ میں) نے اس بے تکلفی کو خاک میں ملانے کے بعد شعر کو کیسا غارت کر دیا ہے جاتے تھے ادھر سے دو جواری + ایک ایک کی کر رہا تھا خواری (جاتے تھے) کی جگہ (چلتے تھے) بنا یا گیا ہے۔ افسوس ان اصلاحوں سے مثنوی کو بہت بڑے اور گہرے زخم لگے ہیں۔ گو انکے علاوہ اس مثنوی میں اور بھی بہت سے شبہات ہیں مگر اسیقدر لغزشوں کا ظاہر کر دینا کافی سمجھتا ہوں اور انکے پیش کرنے کے بعد معذرت خواہ ہو کے رخصت ہوتا ہوں بعض حضرات کو یقیناً یہ تحریر ناگوار گذرے گی اور میں بھی خدا سے چاہتا ہوں کہ انہیں سخت ناگوار گذرے۔ کیونکہ ایسی صورت میں شاید وہ زیادہ جوش سے جواب لکھیں گے اور انکا جوش ممکن ہے کہ ان شبہات کو میرے دل سے مٹا دے جس سے بڑھ کے مجھے کسی بات میں خوشی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مجھے اس خیال سے نہایت ہی تکلیف ہوتی ہے کہ (افسوس گلزار نسیم غلطیوں سے پاک نہیں ہے)۔

از دلگداز نمبر ۷ جلد ۹ بابت ماہ جولائی ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم پر ریویو

(از مولوی عبد الحلیم صاحب شرر)

جو اعتراضات ہم نے پیشتر کئے تھے وہ ایک خاص جماعت کو نہایت ناگوار گذرے اور بجائے اسکے کہ تہذیب و شائستگی سے جواب دیا جاتا یا کوئی بھی قابل لحاظ جواب دیا جا سکتا نہایت بے عنوانی اور بد تہذیبی سے بحث ہونے لگی۔ ہم ایڈیٹر صاحب ریاض الاخبار کے شکر گذار ہیں جنھوں نے ہماری تحریر کو غور و انصاف کی نظر سے دیکھا اور صاف کہدیا کہ اعتراض صحیح اور کسی کے اٹھائے نہیں اٹھ سکتے ہمارے خیال میں انکا فیصلہ کافی ہے اسلئے کہ شاعری کی دنیا میں اور کسی اخبار کو وہ وقعت و اشتہار نہیں نصیب ہو جو انھیں حاصل ہو اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے ساتھ انکے اس ارشاد کی نسبت کہ جو اعتراضات شرر نے کیے ہیں گو موجودہ زمانے میں اُن کا حرف حرف صحیح ہے مگر جس زمانے میں نسیم تھے اُسوقت کی زبان اور طرز کلام اور تصرفات کو دیکھتے ہوئے ہم نسیم کی کوئی خطا نہیں دیکھتے نہ ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ نسیم کو اتنا زمانہ نہیں گذرا کہ انکی طرف سے ایسی عذرداری جائز سمجھی جائے زہر عشق۔ بہار عشق اور طلسم الفت انھیں کے زمانے کی یا اُنسے پہلے کی مثنویاں ہیں۔ اور وزیر۔ رند۔ صبا اور خلیل وغیرہ کا جو دور تھا اسکے آخری شخص نسیم ہیں۔ غزل سرائی میں آجکل کے شعرا کی قریب قریب وہی زبان ہے جو ان اساتذۂ کامل فن کی تھی ایسے تصرفات اور ایسی لغزشیں اگر اُس زمانے میں جائز تھیں تو ضرور تھا کہ اُنکے معاصروں اور دیگر شاگردان ناسخ و آتش کے کلام میں بھی پائی جائیں حالانکہ ان سب کا کلام ان عیوب سے

پاک ہے پھر نسیم کو جو ان غلطیوں میں منفرد ہیں کیونکر معذور رکھا جا سکتا ہے۔ اتنا عرض کرنے کے بعد ہم اپنے وعدے کے موافق نسیم کی کچھ اور غلطیاں سخن فہموں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(جس گل کی ہوا لگی تھی لائی) شوق تھا، یا (ہوس تھی) کے محل پر (ہوا لگی تھی) غلط محاورہ ہے (لازم ہے گل اپنے ہاتھ رکھے) (اپنے ہاتھ میں رکھیے) ہونا چاہئے تھا اس محل پر لفظ (میں) کو حذف کر دینا جائز ہے (پالا اپنے ہاتھ رہا) بولیں گے۔ مگر یہ نہ کہیں گے کہ (گل اپنے ہاتھ رکھا) معروض کیا کہ یا شہنشاہ) (معروض کیا) غلط ہے (عرض کیا) چاہیئے۔ اس میں محاورہ ہی نہیں غلط ہے بلکہ نحو و صرف کی جاہلانہ غلطی ہے (دیکھا آ جو تجھے دہل نہ ہووے) (ڈر نہ ہووے) کی جگہ (دہل نہ ہووے) خدا جانے کہاں کی زبان ہے۔ اہل لکھنؤ تو نہ بولتے تھے اور نہ بولتے ہیں (قاصد سے کلام لطف بولا) (کلام بولنا) شاید آج کل صاحب لوگوں کے بنگلوں کے آس پاس بیرا اور خانساماں لوگوں کی زبان ہے نسیم نے واقعی بڑی ترقی کی تھی کہ پچاس ساٹھ برس کی زبان بھی بول کے دکھا دی (ہوش اس کے ہوا ہوئے کہے تو) یہ کہے تو) فارسی کے (گوئی) کا ترجمہ ہے لوگ اسے اردو کے ابتدائی دور میں بیشک لکھ جاتے تھے۔ اس لیے کہ اس وقت تک فارسی و ہندی محاوروں نے مل جل کے اچھا مزاج نہیں پکڑا تھا چنانچہ مثنوی میر حسن میں بھی جا بجا موجود ہے۔ مگر ناسخ و آتش کے وقت سے یہ الفاظ متروک ہیں۔ اور نسیم کے کے لئے انکا موزوں کرنا ہرگز جائز نہیں تھا (مشہور ہے ضد انس و جانی) ممکن نہیں کہ (ضد انس وجاں) کی جگہ پر (ضد انس وجانی) جاہل کے سوا کسی پڑھے لکھے کی زبان سے نکلے (مشتاق کو خوش خبر سنائی) جس اصول سے (انس وجانی) میں حرف یا بڑھایا گیا تھا اسی اصول کے مطابق (خوش خبری) میں گھٹایا گیا ہے۔ بھلا کوئی بھی (خوش خبری) کی جگہ (خوش خبر) کہہ سکتا شاید کہا جائے گا کہ (خوش خبر) (خبر خوش) کی ترکیب مقلوب ہے مگر یہ اردو میں اس سے بدتر ہے۔

جہاں شب عروسی کی صبح کو تاج الملوک اور بکاؤلی کی حالت دکھائی ہے فرمایا ہے ؎

واں جوڑا چست تنگ بدلا + یاں جوڑے کے منہ کا رنگ بدلا + دوسرے مصرع میں (جوڑے) سے مراد بکاؤلی ہے اس میں اگر (جوڑے) کے عوض (مادہ) کا لفظ استعمال کیا جاتا تو میں خیال کرتا ہوں کہ زیادہ فصیح ہوتا (دیکھا تو وہ دونوں کرتے تھے خواب) (خواب کردن) فارسی کا محاورہ ہے اُردو میں سونے کے محل پر (خواب کرنا) کہنا غلط ہے، اور اگر اس میں کسی صاحب کو عذر ہو تو ناسخ و آتش کے زمانے سے اس وقت تک کسی مستند شخص کے کلام سے ثبوت پیش کریں (اُس نقش مراد کو جگایا) یعنی بکاؤلی کو۔ مگر جب اُسے نقش قرار دیا تھا تو فعل بھی اُسکے مناسب لاتے۔ حالانکہ جگایا صرف جادو جاتا ہے نقش نہیں جگایا جاتا (وہ نقش وفا عمل میں پائی) چاہیئے تو یوں تھا کہ (اس نقش وفا کو عمل میں پایا) لیکن خیر اگر خلاف محاورہ زبان اختیار کی تھی تو تذکیر و تانیث کا لحاظ رکھتے بکاؤلی کو قرار تو دیا (نقش) اور پھر اُسکے ساتھ فرماتے ہیں (پائی) زبان کو یہ کسقدر ناگوار گذرتا ہے۔

بکاؤلی راجہ اندر کی محفل میں جل جانے کے بعد پھر زندہ ہوئی اور ناچنے کو کھڑی ہوئی تو چونکہ کثافت سے پاک وصاف ہوگئی تھی لہٰذا اسکی تعریف کرتے ہیں (شعلے سے زیادہ پاک داماں) بھلا یہ پاک دامانی کا کونسا محل تھا) کہنا چاہتے تھے (پاک وصاف) اور کہہ گئے (پاکدامن) یہ کتنا معقول تصرف شاعرانہ ہے (معمول سے بزم میں ہوئے جمع) (حسب معمول) یا (معمول کے موافق) کی جگہ (معمول سے) نسیم کی اُن فصاحتوں سے ہے جنسے سارا لکھنؤ محروم ہے۔

اس سے زیادہ خوبی رعایت ملاحظہ ہو فرماتے ہیں (جام اُس نے بھرا کہا پیالے) سبحان اللہ (پیالے) کیا خوب! رعایت تو اچھی ہے مگر یہ بکاؤلی ہے یا تاج الملوک کے گھر میں کوئی گنوارن پڑ گئی ہے ؎ کف میں نمکین کباب لے کر + چھڑکا نمک اُن جراحتوں پر کیوں صاحب اگر باورچیخانہ سے خاص اس ضرورت کے لئے نمک منگوایا تھا تو کباب کیوں ہاتھ میں لئے؟ کیا یہ بھی کوئی ٹوٹکا تھا۔ اور اگر انھیں کبابوں کا نمک تھا تو چھڑکا کیونکر۔

(پہونچا اس بزم میں سماں پہ) اگر سماں (یہاں (وقت) کے معنوں میں ہے تو خلاف محاورہ ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ جسوقت سماں بندھا ہوا تھا پہونچا تو یہ خیال ان الفاظ میں ادا کرنا کہ (سماں پر پہونچا) بالکل ہی غلط محاورہ ہے ؎

(دی آنکھ جو شہ نے رونمائی + چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی + کیا چیز نہ بھائی (بادشاہ کا رونمائی میں آنکھ دینا) تو پھر (بھایا) چاہیئے۔ مگر نسیم کو یہاں تو بھائیوں کی رعایت سے (بھائی) کا لفظ چاہیئے تھا مطلب چاہے خبط ہو جائے کوئی مضائقہ نہیں۔

آیندہ انشاء اللہ اور اعتراضات بھی پیش کئے جائینگے۔

از اردوئے معلیٰ جلد ۵ بابت ماہ جولائی ۱۹۰۵ء نمبر ۶ - مرتبہ سید فضل حسین صاحب حسرت موہانی بی اے

گلزارِ نسیم

(جواب اعتراضات شرر)

(از پنڈت برج نرائن صاحب چکبست)

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

گذشتہ مارچ اور اپریل کے دلگداز میں میرے عنایت فرما عبد الحلیم صاحب شرر کے دو مضمون گلزار نسیم کے متعلق شائع ہوئے ہیں جو کہ قدر دانان نسیم کے لئے کسی قدر دلخراش ثابت ہونگے حال میں گلزار نسیم کا ایک نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے جسکے ترتیب دینے کی خدمت میں نے اپنے ذمہ لی تھی۔ یہ اس نئے ایڈیشن کی اشاعت ہی جسنے حضرت شرر کی روشنی طبع کو اشتعال دی ہے حضرت موصوف نے جو کچھ گلزار نسیم کی نسبت تحریر فرمایا ہے اسکا مناسب جواب خاموشی ہی کیونکہ جیسا کہ ذیل کی تحریر سے ثابت ہوگا آپ کے مضامین خود زبان حال سے آپکے دلائل کی تردید کرتے ہیں لیکن ان مضامین سے ناواقفان سخن کے دلمیں اکثر غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس خیال نے مجھ کو ذیل کی چند سطریں لکھنے پر مجبور کیا ؎

منظور ہے گزارش احوال واقعی اپنا بیان حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

حضرت شرر نے اپنے پہلے مضمون کی تمہید میں تحریر فرمایا ہے کہ "اگر اس مثنوی (گلزار نسیم) کو محاسن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اُن نظموں میں ہے جیسی کہ اردو شاعری کو اپنی اس صدی کی عمر میں دو ہی چار نصیب ہوئی ہوں گی لیکن اسکے ساتھ ہی اسکے معائب پر نظر ڈالی جائے تو

اس سے زیادہ معیوب کسی اردو نظم میں نہیں ہیں۔ یا اسی سلسلہ میں آپ پھر تحریر فرماتے ہیں کہ جس وقت اس کے محاسن پر نظر ڈالی جائے تو اس قدر لطف آتا ہے کہ مجبور ہو کر تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ اس سے اچھی نظم نہیں ہو سکتی اور جس وقت اسکی غلطیوں کی طرف توجہ کیجائے تو خیال گذرتا ہے کہ شاید کسی شاعر کے کلام میں اتنی غلطیاں نہ ہوں گی کہ نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام میں ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شرر نے ان الفاظ کے پردے میں کیا معنی پوشیدہ رکھے ہیں ظاہراطور پر جو معنی ان الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں وہ اصولاً قابل اعتراض نظر آتے ہیں یعنی جس نظم کی نسبت یہ کہا جائے کہ محاسن کے اعتبار سے اس کا شمار ان نظموں میں ہے کہ جیسے اردو شاعری کو دو ہی چار نصیب ہوئی ہوں گی اسی نظم کی نسبت یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ اسمیں اس قدر غلطیاں ہیں جن کا پتا کسی اردو شاعر کے کلام میں نہ ملتا ہو۔ مگر چونکہ اصل واقعات سے اس دعوی کی تردید ہوتی ہے۔ لہذا میں اس کے متعلق اصول کی بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا حضرت شرر نے اپنے دوسرے مضمون میں گلزار نسیم کے جن اشعار پر اعتراض کیا ہے۔ انکی تعداد چالیس پچاس سے زیادہ نہیں ہے۔ گلزار نسیم میں تقریبًا ڈیڑھ ہزار اشعار ہیں اب اگر بفرض محال یہ مان لیا جائے کہ حضرت شرر کے سب اعتراض سچے ہیں اس حالت میں بھی گلزار نسیم تین یا چار فیصدی اشعار قابل اعتراض ثابت ہونگے۔ چونکہ حضرت شرر نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ایکے علاوہ ان اعتراضات کے اس مثنوی میں اور بھی بہت سے شبہات ہیں اس لئے یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہو کہ جس قدر اعتراضات حضرت شرر نے تحریر فرمائے ہیں وہ حضرت کے نشتے نمونہ از خروارے ہیں اور اصل میں حضرت شرر ان اعتراضات سے چوگنے اعتراضات پیش کر سکتے ہیں اس حساب سے بھی گلزار نسیم میں بارہ یا تیرہ فیصدی سے زیادہ اشعار قابل اعتراض نہ نکلیں گے۔ لہذا جسوقت حضرت شرر یہ فرماتے ہیں کہ گلزار نسیم سے زیادہ معیوب کسی اردو نظم میں نہیں ہیں" تو کیا حضرت موصوف کا یہ مطلب ہو کہ کسی اردو شاعر کے کلام میں بارہ فیصدی یا تیرہ فیصدی شعر بھی قابل اعتراض نہ نکلیں گے میں اسکا انصاف سخن شناسوں کی رائے پر چھوڑتا ہوں کیونکہ جس شخص کی

نظر سے دس پانچ اُردو شعرا کا کلام بھی گذرا ہوگا وہ اس امر کا فیصلہ نہایت آسانی سے کرسکے گا کہ حضرت شرر کے اس دعوی کی تائید واقعات سے کس حد تک ہوتی ہے یوں تو کہنے کو جس کا جو جی چاہے کہہ سکتا ہے۔ میر حسن ہی کی مثنوی کی نسبت ایک بزرگ کا قول ہے (بدر منیر کی مثنوی نہیں کسی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اسکو شعر کیونکر کہیئے سارے لوگ دلی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہیں ع وہ چلی وان سے دامن اٹھاتی ہوئی۔ کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی (آب حیات مصنفہ محمد حسین صاحب آزاد) ظاہر ہے ان بزرگوں نے کچھ سمجھ ہی کے یہ فرمایا ہوگا جسطرح ان بزرگوار میر حسن کی مثنوی کے مقبول ہونے پر حیرت ہے۔ اسیطرح حضرت شرر فرماتے ہیں کہ (گلزار نسیم کو مقبولیت عام حاصل ہوئی ہی حیرت انگیز ہے) ان دونوں بزرگوں کا جواب فصیح شیراز کئی سو برس پیشتر دے گیا ہے ع قبول خاطر و لطف سخن خدا داد ست۔ ہاں اس موقع پر میں اسقدر ضرور عرض کرونگا کہ گلزار نسیم کی شہرت کا ایک بہت بڑا راز یہ بھی ہے کہ اس میں محاسن کے مقابلے میں معائب بہت ہی کم ہیں یا برابر ہوسکتے ہیں اور اردو زبان میں بہت کم نظمیں ہیں جو اس صورت میں اسکا مقابلہ کرسکتی ہیں۔

حضرت شرر کی مضمون کے اس تمہیدی حصے کے انداز تحریر سے تو یہ پایا جاتا ہے کہ حضرت موصوف پنڈت دیا شنکر نسیم ہی کو گلزار نسیم کا مصنف تسلیم کرلیتے ہیں اور جیسا کہ دکھلایا جائیگا اس مضمون کے آخری حصے میں بھی شرر نے یہی عقیدہ ظاہر کیا ہے لیکن مضمون کے درمیانی حصے میں آپ نے اس پرانے قصے کو گلزار نسیم آتش کی کہی ہوئی ہے اِس پردہ میں تازہ کیا ہے کہ گلزار نسیم کا بہترین حصہ آتش کے زور فکر کا نتیجہ ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انتخاب و اختصار کا یہ آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ منشی اشرف علی اشرف مرحوم۔ جو نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور اُس پہلے دور کے یادگاروں میں تھے۔ اس واقعہ کو خود مجھ سے بیان کرتے تھے بلکہ اُن کا بیان تھا کہ پنڈت دیا شنکر کی لکھی ہوئی اصل مثنوی کے بہت سے اوراق بھی میں نے اپنی آنکھ سے

دیکھے تھے۔ جو بہت ہی عام مذاق کے تھے اور ایسے تھے کہ سوا ایک مبتدی شخص کے کسی کہنہ
مشق شاعر کی جانب نہیں منسوب کئے جا سکتے۔ اس بیان کی تصدیق میر وزیر علی صبا نے بھی
ہمارے بعض بزرگوں کے سامنے کی تھی۔ قبل اس کے کہ حضرت شرر کے اس بیان کی نسبت
کچھ عرض کروں اتنا ضرور کہوں گا کہ منشی اشرف علی مرحوم کی اس زبانی شہادت سے مجھ کو
عبدالغفور خاں نساخ کی شہادت زیادہ پرزور معلوم ہوتی ہے جنھوں نے صاف الفاظ میں لکھدیا
ہے کہ نسیم لکھنوی مشرف باسلام تھے حضرت نساخ بھی آخری دور کے یادگاروں میں تھے اور
بقول غالب شیخ ناسخ تو محض طرز کے ناسخ تھے وہ بصیغۂ مبالغہ نساخ تھے لہذا اگر انکی شہادت پر
اعتبار کیا جائے اور انھیں کی تائید میں دلائل پیش کئے جائیں تو گلزار نسیم کا نقاد ان وسوسوں سے
نجات پا سکتا ہے جو حضرت اشرف کی زبانی شہادت کی پیروی کرنے میں پیدا ہو سکتی ہیں
مثلاً مخالف کہہ سکتا ہے کہ یہ امر کہاں تک قابل اعتبار ہے کہ حضرت اشرف نے گلزار نسیم کا مسودہ
دیکھا تھا کیونکہ مبتدی شعرا کا یہ عام دستور ہے کہ جبتک استاد سے اصلاح نہیں لیتے وہ اپنی ایک
معمولی غزل بھی کسی کو نہیں دکھاتے اس حالت میں نسیم مرحوم نے ایسی مثنوی کا مسودہ کسی شخص کو
دکھانے کی جرأت کیونکر کی جسمیں کہ باوجود آتش کی زبردست اصلاح کے اسقدر معائب موجود ہیں
کہ اسکے دیکھنے سے یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید کسی اور شاعر کے کلام میں اتنی غلطیاں نہونگی جتنی کہ
نسیم لکھنوی مرحوم کے کلام میں ہیں علاوہ اسکے یہ بھی سب جانتے ہیں کہ نسیم دہلوی سے اور شعرائے
لکھنؤ سے عموماً معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں اور یہ بھی سنا ہے کہ نسیم لکھنوی اور نسیم دہلوی سے
خصوصاً چوٹ چلا کرتی تھی ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر عقل سلیم اس امر کو قبول نہیں کرتی کہ نسیم
لکھنوی نے اپنی مثنوی کا مسودہ نسیم دہلوی کے ایک شاگرد کو دکھایا ہو۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے
کہ اشرف علی اشرف مرحوم نے گلزار نسیم کا مسودہ دیکھا تھا تب بھی یہ امر غور طلب ہے کہ انکی
رائے نسیم لکھنوی کے کلام کی نسبت کس قدر منصفانہ ہو سکتی ہے کہ اگر دو شاعروں کا یہ عام دستور رہا ہے
کہ وہ اپنے استاد کو بیجا فروغ دینا اپنا ایمان سمجھتے ہیں اور اپنے استاد کے مقابل کے شعرا کو

اٹھانا اپنا ایمان نہیں تو اپنا فرض ضرور سمجھتے ہیں۔ آتش و ناسخ اور انیس و دبیر کے شاگردوں کی معرکہ آرائیاں ضرب المثل ہوگئی ہیں۔ اس صورت میں اگر اشرف مرحوم نے گلزار نسیم کے مسودہ کو عام مذاق کا بتلا کر حق شاگردی ادا کیا ہو تو اُس زمانہ کی روش کے لحاظ سے بہت بجا کیا۔ ان باتوں سے قطع نظر کر کے اشرف مرحوم کی تنقید کے نسبت یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا جانے حضرت اشرف نے عام مذاق سے کیا مراد لی ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت اشرف کے مذاق شاعری کا معیار غیر معمولی طور سے بلند ہو اور گلزار نسیم کا مسودہ اس خاص معیار کے لحاظ سے (عام مذاق) کا خیال کیا گیا ہو۔ اور کون جانتا ہے کہ اگر گلزار نسیم کی موجودہ حالت کی نسبت اشرف سے رائے پوچھی جاتی تو وہ اب بھی اسکو عام مذاق) کا نہ بتلاتے غرضکہ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے حضرت اشرف مرحوم کی زبانی شہادت ایسی مجمل ہے کہ اسمیں سیکڑوں شاخسانے پیدا ہو سکتے ہیں۔ عبد الغفور خاں نساخ کی تحریری شہادت اس سے زیادہ صاف اور زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مجھکو اس سلسلے میں ایک اور روایت یاد آئی جو کہ ان دونوں روایتوں سے زیادہ دلچسپ ہے لکھنؤ کے ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر جو کہ اس آخری دور کے یادگاروں میں تھے اور اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے میرے کرم فرما پنڈت بشن نرائن صاحب در سے یہ روایت بیان کرتے تھے کہ گلزار نسیم اصل میں حضرت پروانہ کی تصنیف ہے حضرت پروانہ آتش کے ہمعصر تھے آتش کو پروانہ کی یہ تصنیف کسی طرح ہاتھ لگ گئی اُنھوں نے اصلاح وغیرہ دیکر نسیم سے ایک مشاعرے میں پڑھوا دی ان بزرگوں نے بھی غالباً یہ روایت غیر معتبر ذرائع سے سنی تھی یہ مختلف روایتیں سنکر میرے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ گلزار نسیم میں باوجود اس قدر عیوب کے جس سے (زیادہ عیوب کسی اُردو نظم میں نہیں ہیں یہ عجیب تاثیر ہے کہ اس کو کوئی آتش کی طرف صاف طور پر منسوب کرتا ہے کوئی یہی روایت دبی زبان سے بیان کرتا ہے۔ کوئی اس کو حضرت پروانہ کی پرواز فکر کا نتیجہ بتاتا ہے کوئی اسی مثنوی کی بدولت نسیم لکھنوی کو اسلام کی دولت سے مالا مال کئے دیتا ہے

غرضکہ گلزار نسیم میں کتنے ہی عیب کیوں نہوں مگر اسکے مصنف کے زور طبع کا یہ طرفہ اثر ہے کہ
ع بس ہمایوں مرغ عقل از آشیاں انداختہ - پھر سوچتا ہوں کہ ممکن ہے کہ ان روایتوں کے
گھڑنے سے عصبیت کی بنا پر قائم ہوں - ان روایتوں کے لکھنے والوں کا یا بیان کرنے والوں کا
یہ منشا ہو کہ پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام ایسی مثنوی کے ساتھ نہ وابستہ رہنے (جس سے زیادہ
معیوب کسی اردو نظم میں نہیں ہیں) اور جس سے لازمی طور پر نسیم مرحوم کی بدنامی متصور ہے
بیشک مجھ کو تعجب ہے تو اس قدر کہ مجھ کو جو کچھ اس مثنوی کی تصنیف و تالیف کے مطابق معلوم ہوا
کہ وہ ان روایتوں کے خلاف معلوم ہوا۔ حکیم رضا حسین صاحب شہا مرحوم میر وزیر علی صبا کے
داماد تھے اور شاگرد بھی تھے ان کی خدمت میں مجھے برسوں نیاز حاصل رہا اور بہت مرتبہ
گلزار نسیم کا ذکر بھی آیا انھوں نے مجھ سے کبھی یہ نہ کہا کہ گلزار نسیم میں آخری تصرف و اختصار کا
عمل خواجہ آتش کے قلم سے ہوا تھا یا آتش نے تفنن طبع کے طور پر یہ مثنوی کہہ کر نسیم کو
دیدی تھی بلکہ وہ کہتے تھے کہ میر وزیر علی صبا ہمیشہ ایسی روایتوں کی تردید فرماتے تھے اور کہتے تھے
کہ گلزار نسیم خاص پنڈت دیا شنکر نسیم کی تصنیف ہے بیشک حسب دستور کہیں کہیں آتش
کی اصلاحیں موجود ہیں اور میر وزیر علی صبا پر کیا منحصر ہے تمام سخن شناس اور انصاف پسند
اہل اسلام کو اس سے انکار نہیں کہ گلزار نسیم نسیم ہی کی تصنیف ہے بقول اڈیٹر اودھ پنچ کے
لکھنؤ کے بھنگڑ خانوں کے سوا اب یہ روایت کہیں نہیں سنی جاتی کہ گلزار نسیم آتش کی تصنیف
کی ہوئی مثنوی ہے چنانچہ یہ باتیں ملحوظ خاطر رکھ کر میں نے اس روایت کی نسبت صرف
اسقدر لکھ دینا کافی سمجھا تھا کہ سخن شناس جانتے ہیں کہ جس رنگ میں گلزار نسیم کہی گئی ہے
آتش نے اپنی زندگی میں اس رنگ میں ایک شعر نہیں کہا۔ اس دلیل کی تردید میں حضرت
شرر تحریر فرماتے ہیں کہ غزل اور چیز ہے اور مثنوی اور چیز۔ انسان کی طبیعت جو رنگ غزل میں
دکھاتی ہے ضرور نہیں کہ وہی رنگ مثنوی میں بھی دکھائے .... دیوان (آتش کے دیوان)
کے رنگ کو پیش کرکے مثنوی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ مسٹر

چک بست کو اسکی خبر ہی نہیں کہ شاعرانہ مذاق ہر صنف سخن میں جداگانہ رنگ دکھایا کرتا ہے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر آتش نے اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انھیں نو عمر شاگردوں سے تھی (اس دلبستگی کی وجہ آپ نے نہ بتلائی) اسکی تحریک سے یا اس کی مشق اولیں دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو پھر اس میں متعدد دلفریبین دیکھ کے اسے بجائے اپنے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ مجھ کو افسوس ہے کہ حضرت شرر نے شاعرانہ مذاق کی رنگا رنگی کی نسبت جو سبق مجھے دیا ہے میں اس کو قبول نہیں کر سکتا اور میں کیا جو شخص اصول شاعری سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ میرے ہی خیال کی تائید کرے گا یہ یاد رہے کہ شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ ایک ہی ہوتا ہے یہی رنگ مختلف پیرایوں میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے پیرائے بدلتے رہتے ہیں شاعر کا کلام ایک آئینہ ہے جس میں اس کی نورانی طبیعت کا عکس پڑتا ہے آئینہ کی ساخت میں تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں مگر عکس کی ہیئت نہیں بدلتی۔ غزل ہو یا مثنوی ہو یا مسدس ہو ہر پیرایہ میں شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ نظر آتا ہے۔ مثلاً جس شاعر کی طبیعت میں روانی اور آمد ہے وہ ہر صنف سخن میں مذاق بنا ہے گا اگر اسکے مزاج میں آورد کو دخل ہو تو اسکی غزل ہو یا مثنوی یا مسدس سب میں اسی مذاق کا پتہ ملے گا۔ میر کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے وہی ان کی مثنویوں میں موجود ہے۔ داغ کی غزلوں میں جو شوخی اور رسیا کی کا رنگ ہے وہی انکی مثنوی فریاد داغ کا رنگ خاص ہے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی شاعر کی مثنوی اس پایے کی نہو جیسی کہ اس کی غزلیں ہیں لیکن دونوں میں (مذاق سخن) کا رنگ ایک ہی ہوگا مثلاً فریاد داغ کا پایہ داغ کی تصانیف میں ادنےٰ ہے لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فریاد داغ کا مذاق شاعرانہ گلزار داغ سے جداگانہ ہے اب دیکھنا چاہیئے کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ حضرت شرر کو بھی اس سے انکار نہوگا کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص آمد ہے۔ اسکی زبان شعر اسطرح نکلتا ہے جیسے کمان سے تیر۔ برعکس اس کے گلزار نسیم میں ہر شعر شروع سے آخر تک آورد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جسطرح سنگ تراش پتھروں کو تراش کر بت تیار کرتے ہیں

اسی طرح نسیم نے اپنے تیشۂ فکر کی مدد سے مضامین کے گل بوٹے تراشے ہیں گلزار نسیم کی نیت ہے چاہے یہ رنگ برا ہو یا اچھا۔ مگر اس سے ان کی طبیعت کو خاص مناسبت ہو چنانچہ یہی رنگ سلان کی غزلوں کے کلہائے مضامین سے بھی شبنم کیطرح ٹپکتا ہے مجھ کو سخت حیرت ہے کہ حضرت شرر کے قلم سے ذیل کے الفاظ کس طرح نکلے کہ (تعجب ہے کہ مصنف (یعنی نسیم) کے دیوان کا انتخاب جو اس مثنوی (گلزار نسیم) کے آخر میں چھپا ہے اسمیں بھی اس رنگ (یعنی گلزار نسیم کے رنگ) کا کوئی شعر نہیں ہے اس موقع پر میں چند شعر انتخاب دیوان نسیم سے تمثیلاً لکھے دیتا ہوں سخن شناس خود فیصلہ کریں گے کہ حضرت شرر کا بیان مندرجۂ بالا کسقدر درست ہے۔

اشعار

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

شوریدگی سے میری یہاں تک وہ تنگ تھے
روٹھا جو میں تو خیر منائی کہ شر گیا

بوسے گل سے غنچے سے کہتی ہے نسیم
بات نکلی منھ سے افسانہ چلا

چمن میں دھر کے آگرہیں کیا نہال ہوا
برنگ سبزۂ بیگانہ پامال ہوا

کہانی کہہ کے سلاتے تھے یار کو شب
فسانہ عمر ہوئی خواب وہ خیال ہوا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ
بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا

بلبل کے منھ پہ اڑنے لگی ہیں ہوائیاں
صیاد کو بتا کہیں او باغباں ہوا

جلد او ماہ تو گھر سے نکلا
شکر ہے چاند کدھر سے نکلا

معنی روشن جو ہوں تو سو سے بہتر ایک شعر
مطلع خورشید کافی ہے پئے دیوان صبح

جب سے ملے دو دل مخل پھر کون ہے
بیٹھ جاؤ خود حیا اٹھ جائے گی

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل ایک روز جھونکا کھائیگی

داغ سودا ایک دن دے گا بہار
فصل اس گل کی شگوفہ لائے گی

کچھ تو ہوگا ہجر میں انجام کار — بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائے گی
صندلی رنگوں سے مانا دل ملا — دردِ سر کی کس کے ملنے جائے گی
خاکساروں سے جو رکھیگا غبار — او فلک بدلی تری ہو جائے گی
صبر رخصت ہو تو جانے دیجئے — بیقراری آئے تو ٹھہرائیے
دل میں ہی دکھلائیے تاثیر عشق — ٹھنڈی سانسوں ہی نہیں گرمائیے
گل ہوا کوئی چراغ سحری اُو بلبل — ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صبا آتی ہے
جس کو دیکھو وہ اس زمانے میں — اپنے نزدیک دُور ہوتا ہے
خاکساری وہ ہے کہ ذروں پر — روز باران نور ہوتا ہے

اس رنگ کے نوّے فیصدی اشعار نسیم کے دیوان میں مل سکتے ہیں ان اشعار میں بھی وہی ترکیب کی چستی وہی تناسب لفظی وہی آورد کا رنگ جو کہ مثنوی کا رنگ خاص ہے آتش کا مذاق شاعرانہ اس رنگ سے اعلیٰ تر ہے لیکن اس سے بالکل جُداگانہ ہے۔ اگر وہ تفنن طبع ہی کے طور پر کوئی مثنوی کہتے تو یہ ممکن تھا کہ وہ مثنوی اس پائے کی نہوتی جیسے انکی غزلیں ہیں۔ لیکن اس مثنوی میں انکی رنگ طبیعت کا ضرور پتہ ملتا علاوہ اس کے یہ کہنا کہ شاعر نے گلزار نسیم کو محض تفنن طبع کے طور پر تصنیف کیا ہے کسقدر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے یہ تو ویسا ہی ہے جیسا کہ آجکل کوئی شخص کہے کہ جاپان روس سے (تفنن طبع) کے طور پر لڑ رہا ہے قطع نظر ان سب باتوں کے ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے جو کسیقدر غور طلب ہے یعنی حضرت شرر نے اس مضمون کے ایک حصے میں تو یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ گلزار نسیم میں محض انتخاب و اختصار کا آخری عمل بہ تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا لیکن آپ ہی صاف الفاظ میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کوئی تعجب کی بات نہیں اگر آتش نے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو پھر اسمیں متعدد تغیر دیکے اسے بجائے اپنے نسیم کی طرف منسوب کر دیا ہو یہ دونوں دعوے ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں چونکہ حضرت شرر کے اس مضمون کا رنگ خاص یہی ہے کہ ایک دعوی کی

تردید دوسرے دعویٰ سے کی جائے لہذا اسکی نسبت زیادہ لکھنا فضول ہے حضرت شرر کا یہ مقولہ صحیح ہو یا نہو کہ (شاعرانہ مذاق ہر صنف سخن میں جداگانہ رنگ دکھاتا ہے) مگر اسقدر ضرور صحیح ہے کہ حضرت موصوف کو مذاق تنقید ہر صفحے پر نیا رنگ دکھاتا ہے۔

دیباچہ میں تناسب لفظی کی بحث کے سلسلہ میں میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ صنعت مذکور کا لطافت کے ساتھ نباہنا اک امر دشوار ہے۔ اور یہ دکھانے کیلئے کہ کس صورت پر تناسب لفظی بجائے حُسن کے عیب ہو جاتا ہے میں نے مثال کے طور پر امانت۔ رند۔ خلیل۔ قلق وغیرہ کا ایک ایک شعر یا مصرع لکھدیا تھا اس سلسلے میں گلزار نسیم کے بھی دو ایک شعر لکھدیے تھے اس بنا پر حضرت شرر تحریر فرماتے ہیں کہ مسٹر چکبست نے امانت۔ رند۔ اور قلق کا ایک ایک شعر یا مصرع نقل کرکے سب کی شاعری میں دھبا لگایا ہے۔ مجھکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں اس الزام بیجا کا مستحق نہ تھا صرف و نحو کی کتابوں میں یا کتب عروض میں اکثر غلطیوں کی تشریح کے لیے بڑے بڑے اساتذہ کے شعر لکھے ہوئے ملیں گے ان اشعار کے پیش کرنے سے لکھنے والے پر الزام نہیں کیا جاسکتا کہ اُسکا منشاء یہ تھا کہ ان اُستادوں کی شاعری میں دھبہ لگایا جائے آخر کسی کے کلام سے مثال دینا پڑیگی۔ لہذا ایک صنعت خاص کا ذکر کرتے ہوئے اگر میں نے رند و خلیل و قلق وغیرہ کے کلام سے ایک ایک مصرع یا شعر نقل کر دیا تو میری مُراد اس سے یہ نہ تھی کہ میں اُنکی شاعری کو بحیثیت مجموعی قابل نفرین قرار دوں اگر ان مثالوں کے پیش کرنے سے کوئی معنی پیدا ہو سکتے ہیں تو وہ یہ تھے کہ جہاں تک تناسب لفظی کی صنعت کا تعلق ہے رند و خلیل و قلق وغیرہ نسیم کا مقابلہ نہیں کر سکتے اگر حضرت شرر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتے تو میرے سر مفت کا الزام نہ دھرتے ؎

چو در بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

بیشک امانت کے لئے میں نے صاف الفاظ میں یہ لکھدیا تھا کہ ان حضرت کیلئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجہ تک پہونچ گیا ہے حضرت شرر کا یہ خیال نہیں ہے آپکے نزدیک

گلزار نسیم کی طرح امانت کے کلام میں بھی ایسے معیوب اشعار جن میں تناسب لفظی کے ساتھ لطافت سخن نہ قائم رہی ہو دو فیصدی سے زیادہ نہ نکلیں گے اور حضرت موصوف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تناسب لفظی کے نباہنے میں امانت ہی سب سے زیادہ کامیاب بھی ہوئے ہیں میں حضرت شرر کی اس تنقید کی نسبت زیادہ عرض کرنا نہیں چاہتا جس شخص نے امانت کا کلام ایک سرسری نظر سے بھی دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت شرر نے امانت کی مدحت سرائی میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ایک شاعرانہ مبالغے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا چند اشعار امانت کے درج ذیل ہیں سخن شناس تفنن طبع کے طور پر ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ امانت نے تناسب لفظی کی صنعت کو کیا معراج دی ہے ؎

چھولوں جو کان پور میں وہ زلف حلقہ دار
پھانسی کا حکم چھوٹتے ہی کوتوال دے

دُر دُور کرے صدف کو جو وہ گوہر مراد
موتی ہر ایک دانت خوشی سے نکال دے

سوراخ در کے بند کرو چھوڑو جھانکنا
روزن تمہاری شرم میں رخنہ نہ ڈالدے

کھلاتا ہے ہوا اس شعلہ رو کو برف خانے کی
رقیب روسیہ کو فکر ہے نقشہ جمانے کی

ملائی اس نے شہنا سے جو دھن اپنے ترانے کی
ندامت سے بُری نوبت ہوئی نقار خانے کی

ایک گیسو کو جو اس کے سانپ پھن کہتی ہو شانے کو
مری طبع رسا کرتی ہے باتیں مار کھانے کی

خط بہت بڑھ گیا ہے بنواؤ
گلشن حسن ہے کہ جنگل ہے

طائر دل کو میرے صدقے کر
بت بے پیر آج منگل ہے

عاشق زلف کیوں نہ سر ٹکرائے
مانگ دار اس پری کی ہیکل ہے

نظم کرتا ہوں خط سبز کا وصف
مرغ مضموں جو ہے وہ ہریل ہے

اسے کہتے ہیں تکلف اسے نازک طبعی
گھاس[1] کے تھان پر اس شوخ نے گھوڑا باندھا

بند انگیا کا کم و بیش جو پایا اس نے
ہنس کے خیاط کو چڑیا کا بنایا اس نے

میں قدر دانان امانت کا مشکور ہوں گا اگر وہ امانت کے دیوان میں دو فیصدی شعر بھی ایسے

[1] ایک قسم کا کپڑا ہوتا ہے ۱۲

نکالدیں جن میں تناسب لفظی کے ساتھ لطافت سخن بھی قائم رہی ہو یوں دعویٰ بے دلیل کرنا تو بہت آسان ہے۔ حضرت شررؔ نے مجھ کو اس بات کا بھی ملزم ٹھہرایا ہے کہ میں نے جو نسیم کے معرکے لکھے ہیں ان کے پردہ میں لکھنؤ کے بعض مشہور و معروف و مستند شعرا کے مٹانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن بزرگوں کی شہادت پر لکھا ہے جو نسیم کے ساتھ مشاعروں میں شریک تھے اور جنکے سامنے یہ معرکہ پیش آئے۔ اگر حضرت شررؔ کو اسمیں شک ہو تو یہ اُنکا حسن ظن ہے اور چونکہ اس بحث سے اور نفس مضمون سے زیادہ تعلق نہیں لہذا میں اسکی نسبت زیادہ عرض کرنا نہیں چاہتا۔

حضرت شررؔ نے مجھ غریب پر یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ بجائے مولوی حالی کے اعتراضات کا جواب دینے کے میرا فرض یہ تھا کہ گلزار نسیم کے ان عیوب کے مٹانے کی کوشش کرتا جن پر عام اہل سخن معترض ہیں اور جن کا اسوقت تک جواب نہیں دیا گیا ہے۔ اس اعتراض کی نسبت میں یہ عرض کرونگا کہ مولانا حالی کے اعتراضات چاہے واجب ہوں یا غیر واجب اُنھوں نے اُن کو نقادان سخن کے سامنے تحریری حیثیت میں پیش کیا ہے لہذا اعتراضات مذکور سے ہر شخص پورے طور سے واقف ہو سکتا ہے چنانچہ وہ اعتراضات میری نظر سے بھی گذرے اور جو کچھ میری سمجھ میں آیا میں نے اُنکی نسبت لکھا ہے علاوہ ان اعتراضات کے اور ایسے اعتراضات گلزار نسیم پر میری نظر سے نہیں گذرے جو کسی مستند شخص کی طرف سے پیش کیے گئے ہوں۔ جو اعتراضات حضرت شررؔ نے اساتذہ لکھنؤ کا وکیل بنکر پیش کئے ہیں ان کی نسبت میں صرف اسقدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ ان اعتراضات سے اساتذہ لکھنؤ کا دامن آلودہ کرنا سخت بے رحمی ہے میرے خیال میں کوئی لکھنؤ کے رہنے والے جس کو شعر و سخن کا مذاق ہو اور جس نے گلزار نسیم کے علاوہ اور شعرائے اُردو کا کلام بھی پڑھا ہے اسکے قلم سے ایسے اعتراضات نکل ہی نہیں سکتے ہیں چنانچہ انھیں اعتراضات کے متعلق الامئی کے اودھ پنچ میں لکھنؤ کے مستند اور مسلم الثبوت زباں داں منشی سجاد حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے خیال

میں اساتذہ لکھنؤ کی اس سے بڑھکر ذلت نہیں ہو سکتی کہ اُن کی جانب یہ اعتراض (یعنی حضرت شرر کے اعتراض) منسوب کیئے جاویں جن سے فارسی محاوروں سے عموماً اور لکھنؤ کی زبان اور شاعری سے خصوصاً عدم واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر حضرت شرر خود غور سے کام لیں تو وہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اساتذہ لکھنؤ کی جانب یہ اعتراض منسوب کرنا کہ نسیم نے (حیا اُٹھاکر) خلاف محاورہ نظم کیا ہے (پردۂ حیا اُٹھاکر) چاہیئے ایسا فعل ہے کہ جس سے جرأت کا تو ضرور اظہار ہوتا ہے مگر دور اندیشی کا نہیں یا یہ کہنا کہ (تجھ پاس) کہاں کی زبان ہے اور پھر کہنا کہ یہ اعتراض اساتذہ لکھنؤ کی جانب سے ہے لکھنؤ کو بدنام کرنا ہے۔ مجھ کو خود اکثر اساتذہ لکھنؤ کی خدمت میں باریابی حاصل ہے میں نے ان کی زبان سے کبھی ایسے اعتراضات نہیں سُنے اب رہے اُن حضرات کے اعتراضات جو گلزار نسیم پر اعتراض کرنا ثواب سمجھتے ہیں۔ وہ اکثر میرے گوش گذار ہوتے رہے۔ مگر اُنکے جواب میں میں کسی فارسی استاد کا یہ شعر دل ہی دل میں پڑھ لیا کرتا ہوں سہ بسیار زخمہاست کہ خاک است مرہمش ۔ نتواں بہ رشتہ دوخت دہان بریدہ را ایسے اعتراضات کا کسی سنجیدہ تحریر میں ذکر کرنا حماقت ہے اور ایسی حماقت ہے کہ جسکی کبھی انتہا نہیں ہو سکتی۔ اسی خیال سے میں نے محض مولانا حالی کے اعتراضات کا ذکر کرنے پر قناعت کی اب چونکہ حضرت شرر نے اپنے رسالہ میں چند اعتراضات پیش کیئے ہیں اُنکی نسبت آگے چلکر جو کچھ میری سمجھ میں آئیگا لکھونگا۔

اس مضمون کے آخری حصے میں حضرت شرر فرماتے ہیں کہ (گلزار نسیم میں ایسے اشعار بہت ہیں جنکی بنا پر صرف یہی نہیں کہا جاتا کہ نسیم کی زبان میں غلطیاں ہیں بلکہ یہ بھی دعوے کیا جاتا ہے کہ پنڈت دیا شنکر نسیم زبان پر اتنی حکومت نہیں رکھتے کہ ہر ایسے مضمون کو جو خیال میں آئے ادا کر جائیں۔ اس سلسلے میں حضرت موصوف فرماتے ہیں کہ انکا مقصد گلزار نسیم پر اعتراضات پیش کرنے سے یہ ہے کہ عام پبلک پر ظاہر کر دیا جائے کہ گلزار نسیم میں اہل لکھنؤ کے نزدیک صدہا غلطیاں ہیں اور اس مثنوی کی زبان اہل لکھنؤ کی زبان نہیں ہو اس اعلان کی

نسبت دو امور دریافت طلب ہیں اولاً یہ کہ یہ اعلان حضرت شرر کے پہلے مضمون کے اس حصے کی تردید کرتا ہے جس میں آپ نے اس امر کا اقرار کر لیا ہے کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان ہے۔ یعنی میرے دیباچہ پر رائے زنی کرتے ہوئے حضرت شرر تحریر فرماتے ہیں کہ گلزار نسیم کے اختصار اس کی ترکیبوں کی پختگی۔ کلام کی روانی اور سادگی اور پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے بہت صحیح ہے بلکہ اس سے بڑھ کے ہے (دلگداز بابت ماہ مارچ ۱۹۰۵ء) اس سے صاف ظاہر ہے کہ پاکیزگی زبان کی نسبت جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے حضرت شرر کو پورا اتفاق ہے بلکہ آپ لکھتے تو اس سے کچھ زیادہ ہی لکھتے۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ (پاکیزگی زبان) کی نسبت میں نے کیا لکھا ہے۔ دیباچے کے بارھویں صفحے کے حاشیہ پر (پاکیزگی زبان) کی سُرخی قائم کر کے گلزار نسیم کی زبان کے متعلق صاف الفاظ میں میں نے یہ لکھا ہے کہ نسیم کی زبان بھی نہایت سلیس و پاکیزہ ہے اور اسے لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھنا چاہیئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت شرر نے پیشتر نسیم کی زبان دانی کو کیوں تسلیم کیا اور پھر اپنے ہی بیان کی تردید اس زور سے کیوں کی۔ دوسرا سوال اس بیان کی نسبت یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیشتر حضرت شرر اپنا عقیدہ یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ گلزار نسیم کے اصل مسودے کے ورق نہایت ہی عام مذاق کے تھے اور جو کچھ محاسن اس مثنوی میں پیدا ہوئے وہ اس سبب سے ہوئے کہ انتخاب و اختصار کا آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا۔ یا یہ کہ حضرت شرر کے دوسرے عقیدے کے مطابق آتش نے یہ مثنوی خود تفنن طبع کے طور پر کہی اور پھر اسکے اشعار میں متعدد لغزشیں دیکھ کر نسیم کو دیدی گویا نسیم سے اور اسکی تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں عقل سلیم یہ کیونکر قبول کر سکتی ہے کہ گلزار نسیم کی زبان اہل لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے یہ ظاہر ہے کہ چاہے خواجہ آتش نے اس مثنوی کی اصلاح میں آخری انتخاب و تصرف کی زحمت اپنے سر لی یا حضرت شرر کے دوسرے عقیدے کے رو سے آتش نے خود یہ مثنوی (تفنن طبع) کے طور پر کہی اور پھر نسیم کو دیدی ان دونوں صورتوں میں اس مثنوی کے

ترتیب دینے میں آتش نے اس قدر غور و فکر سے ضرور کام لیا کہ اسمیں ایسے محاسن پیدا ہو گئے جنکی وجہ سے حضرت شرر بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ باعتبار خوبیوں کے گلزار نسیم کے مقابل کی دو ہی چار نظمیں نکلیں گی۔ اس حالت میں گلزار نسیم میں ایسے شعر کہاں سے آ گئے جنکی نسبت آج حضرت شرر تک کو یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ انکی زبان نہایت ہی متبذل اور بازاری زبان ہے اور بازار بھی کہیں اور کا لکھنؤ کا نہیں۔ یہ ممکن تھا کہ آتش کے کلام کے مقابلہ میں یہ مثنوی پھیکی ہوتی مگر جہاں تک زبان کا تعلق ہے یہ ضرور مستند خیال کی جاتی۔ آتش کی بہت سی غزلیں ہیں جن میں ایک شعر بھی قابل تعریف نہیں ہے یا بہت سے شعر مہمل ہیں۔ ان غزلوں کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ آتش نے انھیں محض تفنن طبع کے طور پر تصنیف کیا ہوگا یعنی زیادہ غور و فکر سے کام نہ لیا ہوگا مگر با این ہمہ یہ مہمل شعر بھی زبان کی بحث میں اسی وثوق کے ساتھ سند کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جیسے کہ آتش کے اعلے سے اعلے شعر۔ ان اشعار میں شاعری کے اور جوہر نہوں لیکن انکی زبان کی نسبت یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ متبذل بازاری زبان ہے اور بازاری زبان بھی کہیں اور کی لکھنؤ کی نہیں۔ مثلاً اگر یہ بحث درپیش ہو کہ آیا (حلال کرنا) لکھنؤ کا محاورہ ہے کہ نہیں تو آتش کا ذیل کا شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ؎

آتی جو عید قربان خنجر کو لال کرتے ذبحے کے بدلے فربہ عاشق حلال کرتے

اس شعر میں چاہے اور صدہا عیوب ہوں مگر اسکی زبان مستند ہے کیونکہ یہ شعر آتش کا ہے افسوس ہے کہ حضرت شرر نے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ کوشش تو یہ ثابت کرنے کی کر رہے ہیں کہ گلزار نسیم میں نسیم کا کلام برائے نام ہے یا برابر نہونے کے ہے اور جو کچھ اسکو فروغ حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ یا تو اسپر آتش کی زبردست اصلاح ہے یا آتش نے خود اُسے (تفنن طبع) کے طور پر تصنیف کیا ہے اور پھر یہ اعلان بھی شائع کرتے ہیں کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آتش نے نہ اسکی اصلاح میں غور و فکر سے کام لیا ہے اور نہ وہ اسکے مصنف ہو سکتے ہیں حضرت شرر کی اس تنقید پر "ما چہ می سرائیم و تنبورۂ ما چہ می سراید" کی

مثل صادق آتی ہے۔ کیا حیرت کا مقام ہے کہ حضرت شرر کا طائرِ خیال ایک شاخ پر بیٹھتا ہی نہیں شروع سے آخر تک کل مضمون متضاد بیانات سے پُر ہے جنکی وجہ سے حضرت موصوف کے دلائل کا سلسلہ تارِ عنکبوت سے زیادہ مضبوط نہیں نظر آتا جسوقت آپ کا خیال گلزارِ نسیم کے محاسن کی طرف جاتا ہے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس مثنوی کا بہترین حصہ آتش کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور اپنے دعوے کی تقویت کے لئے نقادانِ سخن کے دربار میں اُن بزرگوں کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ جو موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں اور جن کو اس بات کی مطلق خبر نہیں کہ آج انکی نسبت کیا کہا جا رہا ہے جب حضرت شرر کو گلزارِ نسیم میں معائب تلاش کرنے کی فکر ہوتی ہے تو اُس وقت آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ نسیم کی تصنیف ہے اور اس لئے اسکی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے اس سے صرف ایک ہی منطقی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ چالیس پچاس شعر جو حضرت شرر کے نزدیک قابلِ اعتراض ہیں وہ نسیم کے ہیں باقی ڈیڑھ ہزار شعر آتش کے ہیں اصل یہ ہے کہ اکثر حضرات کا خیال یہ ہے کہ چونکہ پنڈت دیا شنکر نسیم ہندو تھے اس لیئے ان کی زبان مستند نہیں ہے گو کہ حضرت شرر نے کسی مصلحت سے اس خیال کو جلبابِ خفا میں رکھا ہے مگر آپ کے اعلان کے پردہ میں اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے مگر اس خیال کے لوگوں کو اس امر پر غور کر لینا چاہیئے کہ نسیم کے وقت کا لکھنؤ وہ لکھنؤ تھا کہ جس کا ذرّہ ذرّہ تہذیب و ترتیب کے نور سے معمور تھا بقول امیر احمد صاحب بی۔ اے۔ کے اُس زمانے میں لکھنؤ میں شاعری اور سخن سنجی کا وہ دریائے مواج جوش زن تھا اور زبان دانی اور مضمون آفرینی کا یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اس کی دلکش سیرگاہوں اس کے دلچسپ منظروں اور اسکے دلفریب میلوں ٹھیلوں کی بہار دیکھنا بھی انسان کو تہذیب سکھانے اور شاعر بنانے کے لئے کافی تھا اور پھر نسیم کی ایک خاص حالت تھی۔ ایک تو وہ خود ہی قدرتی طور پر غیر معمولی طور سے ذہین اور طباع شخص تھے۔ دوسرے انکا تمام وقت آتش و صبا وغیرہ ایسے زباندانوں کی صحبت میں صرف ہوتا تھا جن کی زبان آج تک محاورۂ اُردو کی دستور العمل سمجھی جاتی ہے

قطع نظر اسکے یہ سب جانتے ہیں کہ گلزارنسیم آتش کی اصلاح کے بعد ان کی زندگی میں شائع ہوئی اس صورت میں یہ کہنا کہ چونکہ گلزارنسیم کا مصنف ہندو تھا اس لئے اسکی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنا ہے جس مشاعرے میں یہ مثنوی رات بھر پڑھی گئی وہ مشاعرہ آتش ہی کے نام سے کیا گیا تھا لہذا اس میں شہر کے تمام سربرآوردہ شعرا جمع تھے۔ اکثر بزرگ اب بھی زندہ ہیں جو اس مشاعرے میں شریک تھے کیا ایسا مشاعرہ کرنے سے آتش کی مراد یہ تھی کہ سخن سنجان لکھنؤ کے سامنے اپنے شاگرد سے ایسی مثنوی پڑھواکر اپنی ہنسی کرائیں جسمیں اسقدر غلطیاں ہیں کہ شاید کسی اُردو نظم میں نہونگی اور جس میں ایسے شعر موجود ہیں (جن کی زبان لکھنؤ کی بازاری زبان بھی نہیں ہے) یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے راسخ الخیال اور منصف مزاج اہل اسلام گلزارنسیم کی زبان کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھتے ہیں حضرت شرر نے جو اعلان شائع کیا ہے کہ گلزارنسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے وہ کسی قدر دیر سے شائع ہوا ہے کیونکہ اس اعلان کی اشاعت سے قبل اساتذہ لکھنؤ اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ گلزارنسیم کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ لکھنؤ کے مشہور و معروف شاعر منشی امیر احمد صاحب مینائی نے امیر اللغات میں زبان و محاورہ کی بحث میں گلزارنسیم کے سیکڑوں شعر سند کے طور پر پیش کئے ہیں اب اس سے بڑھکر گلزارنسیم کی زبان کے مستند ہونے کا ثبوت کیا ہوسکتا ہے ظاہر ہے کہ لغت میں اسی شاعر کا کلام سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے میرا خیال ہے کہ حضرت شرر امیر مرحوم کو اُن (عام اساتذہ لکھنؤ) کے زمرے سے خارج نہ سمجھتے ہونگے جنکا وکیل بنکر آپ نے یہ اعلان شائع کیا ہے کہ گلزارنسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے علاوہ امیر مرحوم کے لکھنؤ کے سرمایہ ناز انشا پرداز اور مسلم الثبوت زباندان منشی سجاد حسین صاحب نے حضرت شرر کے اعلان مذکور کی نسبت جو کچھ ۱۸ مئی کے اودھ پنچ میں لکھا ہے وہ شائقین سخن کی نظر سے گذرا ہی ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ گلزارنسیم کی زبان کو غیر مستند ثابت کرنے کا زمانہ گذر گیا اب تو اسکے سیکڑوں شعر زبان اُردو کا حصہ ہوگئے ہیں اور زباندان اسکی زبان کو مستند تسلیم کرچکے ہیں۔

اب اگر کسی کا دل چاہے تو وہ یہ خیال کرکے اپنا دل خوش کرے کہ یہ مثنوی نسیم کی کہی ہوئی نہیں ہے اور اگر قلم میں زور ہو تو اس دعوی کی تائید میں دلائل بھی پیش کرے اور میرے خیال میں قدر دانان نسیم کو ایسے مضامین سے ناخوش نہیں ہونا چاہیئے میں تو یہ مان لینے کو تیار ہوں کہ نسیم لکھنوی کا اس عالم ایجاد میں وجود ہی نہیں ہوا تھا (پنڈت دیا شنکر نسیم) محض اک اسم فرضی ہے یہ مثنوی کسی بندۂ خدا کی تصنیف ہے جس نے اسکو اس فرضی نام سے شائع کر دیا اب یہ بندۂ خدا چاہے آتش ہو یا پروانہ یا تحقی داگر منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کے معتبر نائی کی روایت صحیح ہے) یا کوئی اور شخص ہو جو مشرف باسلام تھا مجھ کو تو مثنوی گلزار نسیم سے مطلب ہے نہ کہ اسکے مصنف کے مذہب سے ہاں اگر (گلزار نسیم) میں لفظ نسیم کھٹکتا ہو تو اسکو (قصہ گل بکاولی منظوم) کہو مگر خدا کیلئے اسکے جوہروں پر تو خاک نہ ڈالو۔

خاص اعتراضات کے متعلق کچھ تحریر کرنے سے پیشتر یہ لکھ دینا مناسب ہے کہ اس مضمون میں انہیں شعرا[سلہ] کے کلام سے مثالیں دی گئی ہیں جنکے اشعار امیر اللغات اور بہار ہند[ع] میں بھی زبان اور محاورے کی بحث میں سند کے طور پر پیش کیے گئے ہیں حضرت شرر نے گلزار نسیم کے اکثر اشعار کو بے معنے قرار دیا ہے۔ ایسے اشعار سلسلہ وار لکھے جاتے ہیں ؎

سلہ صیاد آنکھوں کی دیکھ کر کسر کی بینائی کے چہرے پر نظر کی

اعتراض ہے کہ بینائی کے چہرے پر نظر کرنے سے کیا مراد ہے (چہرے پر نظر کرنا) شاہی دفاتر کی اصطلاح ہے (چہرہ) نام کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ جس شخص کا نام دفتر میں لکھا جاتا تھا اسی کے ساتھ اسکا خط و خال بھی لکھ لیا جاتا تھا (نظر کرنا) دوسری اصطلاح ہے۔ اگر کسی شخص کا نام دفتر سے کاٹ دیا جاتا تھا تو اصطلاحاً یہ کہا جاتا تھا کہ اسکے چہرے پر نظر کر دی گئی۔ آب ع (بینائی کے چہرے پر نظر کی) کے معنی صاف ہیں یعنی (بینائی کا چہرہ کاٹ دیا گیا) جس کا

سلہ آتش ناسخ صبا۔ رند۔ واجد علیشاہ (اختر) انیس۔ جان صاحب۔ نواب مرزا شوق۔ محمد حسین آزاد۔ آب حیات وغیرہ ۱۲ ع حضرت شرر کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ صاحب امیر اللغات کیطرح مولف بہار ہند نے بھی پنڈت دیا شنکر نسیم کے اشعار سند کے طور پر پیش کئے ہیں ۱۲

مطلب سادہ الفاظ میں یہ ہوا کہ (بینائی کو کھو دیا) نسیم کے علاوہ مختلف شعرائے اردو نے اس اصطلاح کو نظم کیا ہے۔ خواجہ وزیر ؎

نرگس پہ نظر کیجیے دو بار اگر وہ کٹ جائے ۔۔۔ ہو جائے نظر ثانی میں اس کی نظری آنکھ

قلم نے چہرے حسینوں کے لوح پر لکھ کر ۔۔۔ آتش ۔۔۔ بگھڑیوں کو کیا خط و خال سے واقف

پھر آئے رنگ رفتہ جو رُخ پر عجب نہیں ۔۔۔ " ۔۔۔ اکثر ہے چہرۂ نظری صاد ہو گیا

ہر طرف غم کر دیا دکھلا کے اسنے صاد چشم ۔۔۔ صبا ۔۔۔ چہرۂ عشاق کو حکم بحالی ہو گیا

غیاث اللغات صفحہ ۴۸۲ نظری۔ آنچہ بداں نظر کنند و منظور نبود۔ لفظ نظر برائے بطلان باشد اس اصطلاح اہل دفتر است (مجھ کو حیرت ہے کہ حضرت شررؔ نے ایک عام اصطلاح سے کیوں ایسی بیخبری ظاہر کی اور گلزار نسیم کی لاجواب فرد کو کیوں نظری بنا دیا۔

۵۲ ۔۔۔ اک بلی جو جھپٹی چوہے کو بھانپ ۔۔۔ نیولے کو بھگا دیا دکھا سانپ

اعتراض ہے کہ سانپ کو نیولا مار ڈالتا ہے۔ مگر یہ دکھا سانپ کیا۔ آخر نیولے نے مداری کا تماشا کیوں دکھایا۔ اگر بفرض محال یہ اعتراض تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی گلزار نسیم کا مصنف اسکا ذمہ دار نہیں ہو سکتا نسیم نے گل بکاؤلی کا وہ قصہ نظم کر دیا ہے کہ پیشتر نثر میں موجود تھا اگر یہ اعتراض ہے تو اس غریب پر جسنے قصے کے واقعات کو ترتیب دیا نسیم نے تو شروع ہی میں کہہ دیا ہے ؎

۲ ہر چند سنا گیا ہے اس کو ۔۔۔ اردو کی زبان میں سخنگو

وہ نثر تھا داد نظم دوں میں ۔۔۔ اس مے کو دو آتشہ کروں میں

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت شررؔ کا یہ اعتراض کسی حالت میں جائز نہیں ہو کیونکہ اس شعر کے بعد دوسرے شعر کا پہلا مصرع ع دیکھا تو یہ ہے شگون نرالا۔ اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ مصنف قصہ نے اس واقعہ کو خود (نرالا) یعنی حیرت انگیز مانا ہے یعنی وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ (نیولے کا سانپ دکھانا) خلاف واقعات ہے۔ پس اس حالت میں

سیاق کلام کو نظرانداز کرکے درمیان سے اک شعر چن لینا اور اُسپر اعتراض کرنا آئین تنقید کے خلاف ہے اور لفظی شعبدہ پردازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

۵۳ سُن کے قیدی کے زارنالے زنجیر کے پیچ سے نکالے

اعتراض ہے کہ (نا کر زنجیر کے ایسے پیچ نکال ڈالے ۔ مگر اس سے یہ مطلب کیونکر نکلا کہ بکاولی کے پاؤں میں سے زنجیر نکال لی۔ سچ ہے یہ شعر یوں ہے ؎

سُن کے قیدی کے زارنالے زنجیر کے پیچ سے نکالے

زارنالے چاہیے غلط ہو مگر مصنف نے اس سے رونے دھونے کے معنی لیئے ہیں۔ یائے معروف کے بدلے یائے مجہول یا اسکے برعکس لکھدینا کاتبوں کی عام غلطی ہے چنانچہ یہ شعر بھی کاتب کی تیغ اصلاح کا زخمی ہے۔ واقعی اصل شعر یوں ہو ؎

سُن کے قیدی کے زارنالی زنجیر کے پیچ سے نکالی

چونکہ اس حالت میں حضرت شررؔ دبی زبان سے فرماتے ہیں کہ زارنالی چاہیے غلط ہوا اسلئے حضرت موصوف کے اطمینان کے لئے ذیل کی مثالیں غالبًا کافی ہونگی۔

درد و الم میں سب جاتے ہیں روز و شب یاں ؎ میر دن اشک ریزیاں ہیں شب زار نالیاں

فقرہ ۔ میر تقی میر اور خواجہ میر دردؔ نے زارنالی افسردہ دلی ... ... کے مضامین کو خوب ادا کیا (آب حیات مصنفہ آزاد)

۵۵ واں پھانس چبھی ہو اسکو غم کی یاں سانس نہیں ہو ایکدم کی

اعتراض ہے کہ (ایک دم کی سانس نہونا) ایسا محاورہ ہے کہ جس کے کوئی معنے نہیں مجھ کو اس اعتراض کے معنی سمجھ میں نہیں آتے اس مصرع (یاں سانس نہیں ہے ایکدم کی) کے معنی چشمۂ آفتاب کی طرح روشن ہیں اور اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئیں تو یہ نسیمؔ کا گناہ نہیں۔ غالبًا حضرت شررؔ نے اس مصرع میں (دم) سے بھی (سانس) مرادلی ہے اس صورت میں واقعی یاں سانس نہیں ہے ایک سانس کی کے کچھ معنی نہیں ہوئے۔ لیکن (دم) یہاں

(سلمحے یا لحظے) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ نسیم کا یہ مطلب ہو کہ دیاں ایک لمحے کی سانس نہیں باقی ہے یعنی موت کا وقت قریب ہے ممکن ہے حضرت شررکہیں کہ (دم) سے لمحے کے معنے لینا کہاں کی زبان ہے واسلئے اشعار ذیل سنداً درج ہیں۔ آتش ؎

غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا ۔۔۔ سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہو اس خرابے ہیں

کہتے ہیں زاہد خدا کی یاد ہر دم چاہیے ۔۔۔ ناسخ ۔۔۔ ایک دم فرصت نہیں مجھ کو بتوں کی یاد سے

پوچھا کہ نگیں جو لے کہاں لے ۔۔۔ چاہا گلچیں کا امتحان لے ؎

اعتراض ہے کہ جبتک کسی خاص نگیں کو دکھا کے یہ نہ کہا جائے کہ اس نگیں کو لے تو کہاں سے اسوقت تک اس عام سوال کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے اس مقام پر بھی حضرت شرر نے سیاق کلام پر غور نہیں کیا ورنہ آپکو اس اعتراض کی تکلیف گوارا نہ کرنی پڑتی۔ بکاولی نے دفرخ کے بھیس میں) عمداً یہ سوال ایک مبہم طریقے پر پیش کیا تھا اسکا مطلب یہ تھا کہ اگر ان چاروں شہزادوں میں سے کوئی اسکا گلچیں ہوگا تو وہ اسکی انگوٹھی ہی اپنے پاس رکھتا ہوگا۔ لہٰذا ممکن ہو کہ اسکی زبان سے نکل جائے کہ اگر نگیں لینا ہو تو بکاولی کی انگوٹھی کا نگیں لے اگر ایسا نہو یعنی ان چاروں شہزادوں میں کوئی اسکا گلچیں نہو تو اس عام سوال کا ایک عام جواب بھی ملجائیگا کہ نگیں خریدے تو فلاں شہر میں خریدے چنانچہ ایسا ہی ہوا ؎

بتلانے لگے وہ چاروں ناداں ۔۔۔ کوئی یمن اور کوئی بدخشاں

اس جواب سے بکاولی نے نتیجہ نکالا کہ ان میں سے اسکا گلچیں کوئی نہیں ہو۔ کیونکہ ؎

جانا کہ جو گل یہ لائے ہوتے ۔۔۔ خاتم کے نگیں بتائے ہوتے

رکنا ہوا اس پری کا مشکل ۔۔۔ یہ دل لگی اب لگائے گی دل ؎

اعتراض ہے کہ مصنف تو یہ مضمون ادا کرنا چاہتا تھا کہ اس پری (روح افزا) کے ٹھہر جانے سے دشواریاں پیش آئیں مگر زبان پر قدرت نہونے سے مطلب یہ ہو گیا کہ اسکا ٹھہرنا مشکل ہوا یعنی ٹھہر نہ سکی (حضرت معترض کا غالباً یہ خیال ہے کہ (مشکل) سے صرف کسی امر کا غیر ممکن ہونا

مراد لیا جاتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے لفظ مشکل سے وہ حالت بھی مراد لیجاتی ہے جس سے بحیثیت مجموعی کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے جیسا کہ خواجہ حافظ کے ذیل کے مصرع سے ثابت ہے مشکل این ست کہ ہر روز تبر می بینم ظاہر ہے کہ اس مصرع میں دہر روز تبر دیدن) جس حالت کا اشارہ کرتا ہے وہ حالت (مشکل) ہے یعنی باعث پیچیدگی ہے۔ اسی طرح نسیم کا مطلب ہے کہ اس پری کا رکنا باعث پیچیدگی ہوا۔ عام گفتگو میں بھی لفظ مشکل اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اگر وہ چلے جاتے تو سب بات بن گئی تھی مگر مشکل یہ ہے کہ وہ لوگ رک گئے) چونکہ زبان کا رنگ بدل گیا ہے لہذا نسیم کے مصرع کی بندش اس زمانے میں کسی قدر الجھی ہوئی نظر آتی ہے لیکن نسیم کے زمانے میں اس قسم کی ترکیب جائز سمجھی جاتی تھی آتش کا شعر ہے ؎

عشق نے حال کیا مردۂ بے وارث کا میرے اوپر ہے یقیں قبضۂ سلطاں ہونا

اس شعر میں (یقین) کا لفظ بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے جیسے کہ نسیم کے شعر میں (مشکل) کا لفظ اب اس ترکیب متروک سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آتش و نسیم کو زبان پر قدرت نہ تھی انصاف کا خون کرنا ہے۔ میر حسن کا شعر ہے ؎

جو اس کے طویلے کے ادنیٰ تھے خر انھیں نعلبندی میں ملتا تھا زر

اس شعر کا مطلب تو یہ ہے کہ نعلبندوں کو اجرت میں زر ملتا تھا۔ لیکن زبان کا رنگ بدل جانے سے اب یہ معنی نظر آتے ہیں کہ خروں کو زر ملتا تھا اس بنا پر اگر کوئی کہے کہ میر حسن کو زبان پر قدرت نہیں تھی تو اسکا جواب سوائے خاموشی کے کیا ہے۔

؎ شہزادے نے ایکدن پھر آکر شادی کو کہا حیا اٹھاکر

اعتراض ہے کہ (پردہ حیا اٹھاکر) کی جگہ (اٹھاکر) نظم تو کر دیا گیا ہے مگر کوئی معنی نہیں رکھتا یہ اعتراض کسی قدر تشریح طلب ہے لکھنؤ اور دہلی میں تو اس قسم کے فقرے زبان زد عام ہیں کہ فلاں شخص نے حیا اٹھا دی یا فلاں شخص کی حیا اٹھ گئی چنانچہ لکھنؤ کے مستند زباندان مرزا محمد مرتضیٰ عاشق (عرف مرزا مچھو بیگ) شاگرد جناب نسیم دہلوی نے اپنی مشہور لغت

بہار ہند میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ (حیا اُٹھانا) بے حجابی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے بہار ہند مطبوعہ ۱۸۸۸ء صفحہ ۲۶۷ (حیا اُٹھانا) پر کیا موقوف ہے (حیا اُڑا دینا) (حیا اُٹھ جانا) آنکھوں سے (حیا ٹپکنا وغیرہ) بولا بھی جاتا ہے اور نظم بھی ہوتا آیا ہے اس موقع پر مجھے مومن خاں کا ایک شعر یاد آگیا ہے۔

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

حضرت شرر کے خیال کے مطابق (شیرۂ حیا ٹپکی) ہونا چاہیئے محض حیا ٹپکنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

۵۹ ع دختر جو پسند مہ لقا ہے۔ اعتراض ہے کہ (صرف ترکیب کی خرابی سے مطلب خبط کر دیا کہنا یہ تھا کہ مہ لقا دختر جو پسند ہے) جس شخص کی نظر سے گلزار نسیم کے علاوہ کسی اور شاعر کا کلام بھی گذرا ہے وہ اس اعتراض کی وقعت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے ہر زبان کی شاعری میں ترتیب الفاظ میں اس قسم کا الٹ پھیر جائز سمجھا گیا ہے اُردو شعرا کے کلام میں بھی اس طرز کی سیکڑوں بندشیں ملجائیں گی چند شعر تمثیلاً لکھے جاتے ہیں آتش سہ

صبح تک دیدۂ تر سے نہیں آنسو تھمتے پانی کرنے کو شب ہجر لہو آتی ہے

دم اخیر تصور بندھا ترے رُخ کا طرف کو کعبے کے کروٹ مجھے قضا نے دی

ہماری آنکھ سے دریائے اشک جاری ہو ناسخ خیال ہے ترے بازو کی یا نہ مچھلی کا

ذبح وہ کرتا ہے پر یہ چاہیئے ای مرغ دل دم پھڑک جائیے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

ان اعتراضات کے بعد حضرت شرر نے گلزار نسیم کے وہ اشعار لکھے ہیں جنہیں آپ کے نزدیک لفظی غلطیاں ہیں ۱۰ ع بولا کہ بچھونگا میں یہ انساں، بڑے پچھے پان ... دیدار ...

اعتراض ہے کہ (ناسخ و آتش کے زمانے سے پہلے اس وقت تک (چکھوں گا) اور (پچھے) کی جگہ (چکھوں گا) اور (پچھے) غیر فصیح ہی نہیں غلط ہے) میں حضرت شرر سے نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ اس موقع پر آپ نے لفظ (غلط) کن معنی میں استعمال کیا ہے

---

۱۰ تعقید لفظی بصورت عیوب شاعری میں شمار ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ معنی میں بھی پیدا ہوتا ہو جیسا ار ... ... ایڈیٹر

ظاہر ہے کہ سودا[۱] وغیرہ نے (چکھا) کی جگہ (چکھا) برابر نظم کیا ہے ۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نسیم کے طبقے کے شعرا نے (چکھا) نہیں نظم کیا ہے ۔ اس صورت میں نسیم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے ایک ایسا قدیم محاورہ نظم کیا جو انکے زمانے میں غیر فصیح سمجھا جاتا تھا اور ایسا کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں مثلاً شیخ ناسخ نے سودا و میر کی طرح لفظ (زور) بہت کے معنی میں استعمال کیا ہو[۲] آتش نے اس محاورۂ قدیم کو متروک قرار دیا ہے لہذا یہ کہا جا سکتا ہو کہ ناسخ نے ایک غیر فصیح محاورہ نظم کیا ہے ۔ لیکن یہ کہنا کہ لفظ (زور) کو بہت کے معنوں میں استعمال کرنا غلط ہے کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ خیر اس اعتراض سے زیادہ مزیدار اعتراض حضرت شرر کا (پان کے بیڑے) پر ہے آپ فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع (بیڑے چکھے پان کے مزیدار) میں صرف بیڑے کافی تھا (پان کے بیڑے) محاورہ میں اچھا نہیں) اس اعتراض کا انصاف بھی میں سخن شناسوں پر چھوڑتا ہوں دو شعر درج ذیل ہیں ناظرین تفنن طبع کے طور پر ملاحظہ فرمائیں ۔ جان صاحب ؎

پھٹکی میری کھائیگی ہرے پان کا بیڑا   منجھلی کا نہ سنجھلی کا نہ ہے بیاہ بڑی کا

بسملوں کی دم رخصت ہے مدارات ضرور   امیر مینائی   یار بیڑا تیری تلوار میں ہو پانی کا

علاوہ بریں شرفائے لکھنؤ میں یہ فقرہ مثل کے طور پر بولا جاتا ہے کہ (ایسی شادی تھی کہ کسی کو پان کا بیڑا بھی نہ ملا) غالباً حضرت شرر کو آتش کی اصلاح دیکھ کر یہ اعتراض کرنے کا خیال پیدا ہوا مگر آپ کو اس امر پر بھی غور کر لینا تھا کہ نسیم نے جو یہ اصلاح نہ مانی تو کچھ سمجھ کر نہ مانی ہوگی اور آتش ایسے نازک مزاج شخص نے اپنے شاگرد کا یہ اختلاف گوارا کیا تو کوئی وجہ معقول ضرور ہوگی [۳] ع کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا) (۲) وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی) اعتراض یہ ہے کہ (ان مصرعوں میں حمل کی جگہ حمل نظم کر دیا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے) یہ اعتراض اس اصول سے

[۱] چکھا اُنھوں نے جو اسے یار دوستی کا شہد + وہ تلخ کام کبھی زہر دشمنان نکرے + بجائے سرمہ کرون میل گرم ہیں اس میں + نمک سے اشک کے حسن چشم نے مزا نہ چکھا ۱۲ [۲] ع اب تو ناسخ زور رندلاؤ بالی ہوگیا ۱۲

نیچری ظاہر کرتا ہے کہ شاعر الفاظ اسی صورت پر نظم کرتا ہے جس صورت سے کہ وہ اہل زبان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں محض لغت کی پیروی شاعر کے لئے ضروری نہیں ہوتی یہ مانا کہ لغت کی رو سے حمل درست ہے لیکن شرفائے لکھنؤ کی زبان پر اس لفظ کا یہی تلفظ جاری ہے۔

واجد علیشاہ (آخری فرمانروائے اودھ) سے ایک مثنوی موسوم بہ دریائے تعشق یادگار ہے اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ گلزار نسیم کی تصنیف کے زمانے سے بہت قریب ہے (دریائے تعشق) میں بھی حمل ہی نظم ہے ؎

گھر میں میرے بھی اے خوش اطوار
آثار حمل کے ہیں نمودار

اس مثنوی میں جا بجا اور شاعرانہ محاسن نہوں لیکن جہاں تک زبان اور محاورے کا تعلق ہے اسکا ہر شعر سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ اُس زمانے میں واجد علیشاہ سے بڑھ کر کس کی زبان مستند ہو سکتی تھی علاوہ بریں جانصاحب نے بھی حمل نظم کیا ہے جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ع دائی یقین دل کو ہے کہ جائیگا حمل + ننھا سا لڑکا خواب میں کل پیٹ کل دگیا +

متقدمین کے یہاں بھی حمل (ہی نظم ہوا ہے چنانچہ سودا کہتے ہیں ؎

استقاط حمل ہو تو کہیں قرب ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

لفظ حمل پر کچھ موقوف نہیں متعدد الفاظ ایسے ہیں جن کا تلفظ لغت کے رو سے کچھ اور ہے اور نظم عام محاورے کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مثلاً اصل لفظ کلمہ ہے یعنی لام بالکسر ہے۔ لیکن محاورے میں چونکہ بسکون لام بولتے ہیں اس لئے شعرا نے اسی طرح نظم کیا ہے ؎

۱۳۔
بادل سا بھرا آسمان جوش
بجلی سے لہر سے تھا ہم آغوش

اعتراض ہے کہ (لہر کی جگہ) لہر یعنی ہ کے متحرک کے ساتھ نظم کر دیا گیا ہے جو اردو میں غلط ہے۔

دبیر ؎ ارے خدا کا غضب تیری جان پر ٹوٹے + تو کلمہ پڑھ کے رسول خدا کا گھر لوٹے +

صبا ؎ خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ واعظ + زبان تر ہے ابھی اختیار باقی ہے۔

جرأت ؎ کلمہ بھرے تیرا مجھے دیکھے جو اک نظر + کافر ہے یہ تری کافرنگاہ میں ۱۲

اس اعتراض کے لئے بھی ایک حد تک وہی جواب ہے جو اس سے پیشتر کے اعتراض کے بارے میں لکھا گیا ہے اور دو شعر نسیم کی تائید میں سنداً درج ذیل ہیں میر ؎

شب نہاتا تھا جو وہ رشک قمر پانی میں ۔۔۔ گئیے مہتاب سے اُٹھتی تھی لہر پانی میں

نواب مرزا شوق

پھر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی ۔۔۔ بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

ﷺ جاگی تو سب اسکے جوڑ کی تھیں، ۔۔۔ اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں

اعتراض ہے کہ اسمیں پری کی جگہ (پریاں) چاہیئے جو نہایت ہی ذلیل قسم کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ بیشک اس زمانے میں یہ ترکیب کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوتی ہے لیکن نسیم کے وقت میں اسکا رواج ضرور تھا۔ آتش ؎

کیا کیا پری اُتاری ہیں شیشے میں آہ نے ۔۔۔ جن کون ہے جو سائے سے اپنے نہیں جلا[1]

کس کے چار ابرو کے نظارے نے دم بھر کا دیا ۔۔۔ دھیان پاتا ہوں دل کو چار سو تلوار کو

شراب کیوں نہ پیئے فصل گل میں اے زاہد ناسخ ۔۔۔ کہ نہر جاری ہوئیں موسم بہار آیا

ﷺ خوش لہجہ بہت بکاؤلی تھی ۔۔۔ گاتی اور ناچتی بڑی تھی

پہلا مصرعہ یہ اعتراض ہے کہ (خوش گلو یا خوش آواز کی جگہ غلطی سے خوش لہجہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (خوش لہجہ، خوش گلو اور خوش آواز کے معنوں میں برابر استعمال ہوتا ہے حافظ ؎

دلم از پردہ بشد حافظ خوش لہجہ کجاست ۔۔۔ تا بقول و غزلش ساز و نوائے بکنیم

گل و گلچیں کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کر ۔۔۔ تو گرفتار ہوئی اپنی نوا کے باعث

---

[1] سند صحیح نہیں ہے کیونکہ اس شعر میں (پری) مذکر ہے اور اسلئے (اُتارے) بیاے مجہول لکھا گیا ہے لفظ پری محبوب اور حسینوں کے معنوں میں مذکر بھی آتا ہے باقی دو شعروں کی سند بھی کمزور ہے ۱۲ اڈیٹر ۔ [2] یہ مصرعہ گلزار نسیم کے اس نسخے ایڈیشن میں غلط چھپ گیا ہے یعنے کاتب نے گاتی کے بدلے گاتے اور ناچتی کے بدلے ناچتی بنا دیا ہے گو کہ ایک نقطے کا بڑھا دینا اور گھٹا دینا کاتبوں کی معمولی سی غلطی ہے۔ مگر حضرت معترض نے اس قرین قیاس بات کو نظر انداز کر کے مجھ کو تصرف بیجا کا ملزم ٹھہرایا ہے خیر اسکا جواب اس مضمون کے آخری حصہ میں دیا جائیگا ۱۲

دوسرے مصرع کی نسبت شرر کا اعتراض ہے کہ (گائن کی جگہ گانی اور ناچنے والی کی جگہ ناچنی غلط ہے اس موقع پر پھر حضرت شرر نے ایک قدیم محاورے کو (غلط) ٹھہرانے میں تکلف نہیں کیا ہے۔ گلزار نسیم کی زبان وہ زبان ہے جو کہ لکھنؤ میں ۶۶ سال پیشتر مروج تھی۔ گانی اور ناچنی کی ترکیب اس زمانے میں ضرور غیر فصیح معلوم ہوتی ہے۔ مگر نسیم کے زمانے کے شعراء کے کلام میں اسکی مثالیں مل سکتی ہیں مثلاً میر انیس صاحب فرماتے ہیں ؎

دنیا بھی عجیب سرائے فانی دیکھی | ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا | جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

اس رباعی کے دو مصرع میں آنیوالی کی جگہ (آنی) اور جانے والی کی جگہ (جانی) نظم کیا گیا ہے یہ ویسا ہی ہے جلیسا کر (گانے والی اور ناچنے والی) کے بدلے (ناچنی) استعمال کرنا دونوں کی ترکیب میں سر مو فرق نہیں ہے۔ حضرت شرر کا ایک اعتراض یہ ہے کہ گلزار نسیم میں چنگل اور چنگال کا لفظ تین جگہ استعمال ہوا ہے۔ اور تینوں جگہ بے موقع اور غلط۔ اس اعتراض کی تشریح کے لئے ذیل کے تین مصرعے لکھے گئے ہیں (۱) پہونچا لبِ حوض سے نہ چنگل۔ (۲) شہزادے پہ اس نے مارِ چنگال (۳) پیارے یہ نہیں حنائی چنگال۔ پہلے مصرع کے معنے حضرت شرر نے لکھدیئے ہیں یعنی رہا تھ نہیں پہونچا) اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تحریر فرمایا ہے دوسرے مصرع کی نسبت یہ لکھا گیا ہے کہ دیہاں اگر یہ کہا جائے کہ پرند کی طرح پری کے پنجے بھی تھے تو شاید صحیح ہو جائے تیسرے مصرع پر یہ اعتراض ہے کہ منہدی لگے ہاتھوں کو حنائی چنگال کہنا لکھنؤ کی زبان نہیں ہے ان اعتراضات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت شرر کا یہ خیال ہے کہ چنگل اور چنگال محض پنجۂ جانور کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے جس شخص نے فارسی کی درسی کتابیں بھی پڑھی ہیں وہ جانتا ہے کہ فارسی شعراء نے (چنگال) ہاتھ کے معنوں میں برابر استعمال کیا ہے شیخ سعدی بوستاں میں کہتے ہیں ؎

مرا در صفاہاں یکے یار بود | کہ جنگ آور و شوخ و عیار بود

پلنگ کانش از زور وسر پنجہ زیر فرو بردہ چنگال در مغز شیر

تیسرے مصرع پر جو اعتراض ہے وہ بالکل خارج از آہنگ ہے (حنائی خچگال) فارسی کا محاورہ ہے اس کے نسبت یہ کہنا کہ یہ لکھنؤ کی زبان نہیں ہے کوئی معنی نہیں رکھتا اگر یہ کہا جائے کہ دست حنائی کے بدلے حنائی خچگال کہنا درست نہیں تو اعتراض کے کچھ معنے ہو بھی سکتے ہیں مگر یہ اعتراض بھی بیجا ہے ملا شہیدی فرماتے ہیں ؎

بستۂ رنگ حنا بر خچگل خود اسے نگار یا بخون عاشقاں تر کردہ چنگال را۔

غیاث اللغات صفحہ ۱۳۶ (خچگل وخچگال پنجۂ آدمی وغیرہ از مؤید و بہار عجم و جہانگیری وغیرہ۔

علہ بیجا وہ ہوا کہا کہ جا جا کیسی رانی کہاں کا راجا

اعتراض ہے کہ (برہم ہوا کی جگہ پر بیجا ہوا کہنا بہت ہی مبتذل بازاری زبان ہے) میں نے دیباچے میں خود تسلیم کر لیا ہے کہ نسیم سے بھی اکثر موقعوں پر تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہیں نبھ سکا ہے اور تمثیلاً دو تین شعر بھی لکھدیے ہیں چنانچہ یہ شعر بھی اسی طرز کا ہے۔ اس میں (جا جا) کے لئے (بیجا) نظم کر دیا ہے۔ حالانکہ برہم نہایت آسانی سے نظم ہو سکتا تھا اب رہا یہ کہ (بیجا) بازاری زبان ہے اس کی نسبت میں صرف اسقدر کہوں گا کہ بیشک اس زمانے کے لحاظ سے حضرت شرر کا کہنا بیجا نہیں ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا نسیم کے زمانے میں بھی (بیجا) بازاری میں داخل سمجھا جاتا تھا کہ نہیں۔ میر تقی کا شعر ہے ؎

جنگ[لہ] اس زمانے میں تو مبحث ہے عشق ہی کا بیجا ہوا دل اپنا جب وہ مقام نکلا

بیجا کے علاوہ اکثر الفاظ ایسے ہیں جو زمانہ گذشتہ میں ضرور فصیح سمجھے جاتے ہونگے لیکن اب وہ بازاری زبان میں داخل ہو گئے ہیں مثلاً میر انیس صاحب نے (جگہ) کے بالعوض (جاگہ)[لہ] نظم کیا ہے جس کی مثال ان کے معاصرین کے کلام میں مشکل سے ملے گی اور اس زمانے میں تو (جاگہ) بالکل

لہ کلیات میر تقی صفحہ ۳۴۴ دیوان چہارم ۱۲ لہ وسواس کا مقام ہے جاگہ قلق کی ہے + بیجا تنی ہوں میں یہ صدا شرح کی ہے + جلد اول صفحہ ۹۸ بند ۵۴ ۱۲

(مبتذل بازاری) زبان میں داخل ہے جسکا استعمال قصباتی لوگ بھی معیوب سمجھتے ہیں اس بنا پر یہ کہنا کہ میر انیس صاحب نے بازاری اور مبتذل زبان نظم کی ہے بالکل بیجا ہے ؎

علہ جھنجھلا کے ڈرا کے غل مچا کے سمجھا کے بجھا کے دست پا کے

اعتراض ہے کہ اردو میں دسترس پانا کہہ سکتے ہیں مگر (دست پانا) قابو پانا کی جگہ ہرگز جائز نہیں ہے (حضرت معترض کو غالبًا معلوم ہو گا کہ دست یافتن) فارسی کا محاورہ[1] ہے اور قابو پانیکے معنی میں استعمال ہوتا ہے نسیم نے اس محاورہ کا ترجمہ کر دیا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے نسیم کے زمانے میں اس صورت پر فارسی محاوروں کا ترجمہ کر دینا جائز سمجھا جاتا تھا مثلاً دوش دادن فارسی کا محاورہ ہے رند نے اس محاورہ کا ترجمہ بالکل نسیم کی طرح کیا ہے ؎ :

تیرے کوچے سے بڑھے گا نہ جنازہ میرا بعد مُردن نہ دیا تو نے اگر دوش مجھے

ظاہر ہے کہ جس طرح آج کل کوئی قابو پانے کے بدلے (دست پانا) نہیں کہتا اسی طرح (کاندھا دینے) کی جگہ (دوش دینا) نہیں استعمال کرتا اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں اُردو میں انعام دینا محاورہ ہے مگر چونکہ (انعام کردن) فارسی کا محاورہ ہے لہذا آتش نے یہ کہنے میں تکلف نہ کیا ؎

باغباں خیر چمن کا بھی کوئی کام کریں سرو قمری کو عنادل کو گل انعام کریں

علاوہ بریں سودا وغیرہ نے تو (دست) قدرت کے معنی میں اکثر استعمال کیا ہے سودا ؎

کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیدا

للہ ع تجھ پاس گرا اک عصا ہے جانی ۔ اس مصرع پر دو اعتراض ہیں اول یہ کہ (اُردو میں جانی) کا لفظ سوائے معشوقہ کے اور کسی کی شان میں اور وہ بھی خلوت کے سوا دیگر موقعوں پر استعمال کرنا بدتمیزی ہی نہیں غلطی ہے ۔ مگر گلزار نسیم میں تاج الملوک اپنی معشوقہ

---

[1] ظہیر فاریابی ؎ شبی کہ وسوسۂ عقل دست یافت ظہیر ÷ بنوش بادہ کہ ایں رنج آں ملال کند ۔

سعدی ؎ چو اقبالش اندوستی سر بتافت ÷ بنا کام دشمن بر و دست یافت ۱۲

نہیں بلکہ روح افزا سے پہلے ہی ملاقات میں کہتا ہے (جی بجھانہ جانی) اور وہ جواب دیتی ہے کہ (تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی) اس نیم اخلاقی اور نیم شاعرانہ اعتراض کے جواب میں میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت شرر نے اس کلمۂ شفقت (جانی) کے استعمال کے لئے جو حدود قائم رکھے ہیں ممکن ہے کہ ان کی پیروی آیندہ نسلیں کریں لیکن نسیم کے زمانے میں شرفا لکھنؤ (جانی) کا لفظ سوائے معشوقہ کے دوسروں کی شان میں بھی استعمال کرتے تھے محض خلوت میں نہیں بلکہ دو چار کے سامنے بلکہ اب بھی جو بزرگ اُس زمانے کے یادگار باقی ہیں انکا یہی دستور ہے (جانی) کا لفظ بلا کسی رکیک خیال کے محض پیار اور محبت کے اظہار کے لئے بولا جاتا تھا ذیل کی مثالیں سنداً درج ہیں (دریائے تعشق) میں ماں لڑکے سے کہتی ہے ؎

یہ تم سے امید تھی نہ جانی — دے جاؤ گے داغ دل نشانی

طلسم الفت (تعلق) میں جب شہزادہ سفر کو جاتا ہے تو ماں کہتی ہے ؎

کیا یہی دل میں ٹھان لی جانی — ماں کی ہوتی ہے خانہ ویرانی

پھر آخری رخصت کے وقت دعا دیتی ہے ؎

جانی اللہ کی پناہ تھیں — ہو نہ زنہار رنج راہ تھیں

(زہر عشق میں) بھی ماں لڑکے سے کہتی ہے ؎

پالا کس کس طرح تمھیں جانی — کون منت تھی جو نہیں مانی

علاوہ بریں اگر اس زمانے میں (جانی) کا مفہوم کسی قدر بھی غیر تہذیب سمجھا جاتا تو یہ لفظ مرثیوں میں ہرگز استعمال نہ ہوتا مگر ایسا نہیں ہے انیس ؎

عباس نے رو کر کہا کیا چاہیئے جانی — شرما کے سکینہ نے یہ کی عرض کہ پانی

جلد اول صفحہ ۲۱۳ بند ۳۵ دبیر ؎

اکبر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی — نوشہ میں گھرا ہے وہ یداللہ کا جانی

جلد دوم صفحہ ۱۹، بند ۵ ۵

یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مندرجۂ بالا مثالیں ان موقعوں کی ہیں جہاں ہجوم عام تھا اور خلوت کا ذکر نہ تھا مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت شررؔ نے اس محاورے کے استعمال پر بدتمیزی کا الزام لگا کر کتنے بزرگوں کی روح کو صدمہ پہونچایا ہے

اس مصرع (تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی) پھر دوسرا اعتراض یہ ہے (تجھ پاس) کا لفظ بھی تیرے پاس کی جگہ کہاں کی زبان ہے (تیرے) کے بدلے (تجھ) اور (میرے) کے بدلے مجھ استعمال کرنا آج کل ضرور ناجائز سمجھا جاتا ہے لیکن سوداؔ اور میرؔ کے زمانے سے لیکر آتشؔ و رندؔ و نسیمؔ و نواب مرزا شوقؔ کے زمانے تک یہ محاورہ عام تھا میرؔ ۔

اب اشک حنائی سے جو تر نہ کرے آنکھیں ۔۔۔ وہ تجھ کف رنگیں کا مارا نہ ہوا ہوگا

نگر آباد میں بستے ہیں گا نزل ؟ ؟ ۔۔۔ سوداؔ تجھ بن اُجری پڑی ہے اپنی ٹھانؤں

شام سے تا صبح نیند آئی نہ اک دم تجھ بغیر ۔۔۔ آتشؔ آگ نالوں نے لگائی اشک نے طوفاں کیا

آنکھ تجھ بن جو کسی پر بت عیار پڑے ۔۔۔ رندؔ عوض سُبحہ گلے میں مرے زنار پڑے

عاشق روے حسیناں ہو نہیں بیمار اجل ۔۔۔ بن کے صورت حُور کی مجھ پاس آیا چاہیئے

پھر یہ منھ لے کے آئے ہو مجھ پاس ۔۔۔ دُور ہو سامنے سے نفرت ہے

چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن ۔۔۔ اب کے بچھڑے ملینگے حشر کے دن

کیا افسوس کا مقام ہے کہ (تجھ پاس) کی ایسی عام ترکیب پر حرف رکھا جاتا ہے اور ایسے اعتراض سے اساتذۂ لکھنؤ کا دامن آلودہ کیا جاتا ہے ۔

۲۰ ۔۔۔ نکلا جیسے ہی مٹھ کے باہر ۔۔۔ پتھرا گئی چشم حلقۂ در

اعتراض ہے کہ (فارسی میں (حلقۂ در) کنڈی کو کہتے ہیں اور یہاں جب ہی معنے صحیح ہو سکتے ہیں کہ حلقۂ در سے دروازے کا پورا چوکھٹا مراد لیا جائے غالباً حضرت شررؔ نے ہندوؤں کا وہ قدیم ساخت کا شیوالہ نہیں دیکھا ہے جسے (مٹھ) کہتے ہیں ورنہ آپ ایسا

اعتراض نہ کرتے (مٹھ) کی ساخت گنبد نما ہوتی ہے۔ اس میں دروازے کے چوکھٹے وغیرہ کنڈی کو مطلق دخل نہیں ہوتا اسکے تین جانب ایک گول دیوار ہوتی ہے اور ایک جانب ایک محراب دار در ہوتا ہے۔ نسیم نے حلقۂ در سے محراب در مراد لی ہے۔ فارسی شعرا نے بھی حلقۂ در کو محراب در کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ بدر چاچ نے قلعۂ دہلی کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا ہے اُسکا ایک شعر محراب در کی تعریف میں درج ذیل ہے ؎

چہ حلقۂ ایست کہ توسے زحلقۂ درِ اُو　　محیط تر ز نص ہفت طارم اعلیٰ است

یہ بھی خیال رہے کہ فارسی شعرا نے (کنڈی) کے لئے حلقۂ بیرون در زیادہ تر استعمال کیا ہے اور حلقہ در سے عموماً محراب در مراد لی ہے ؎

اک دن پنجر اُڑا کے لائی　　حُسن آرا کو وہ کل سجھائی

حضرت شررؔ نے پیشتر اس شعر کی تشریح اسطرح کی ہے کہ یہ (تدبیر بتائی کہ یہ آدمی کیونکر قمری بنایا گیا ہے) مگر باوجود اصلی مطلب سمجھ جانے کے آپ نے ایک ایسا اعتراض کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس شعر کا مفہوم نہیں سمجھے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ اُردو میں صرف مادی مشینوں کی نسبت کل کا لفظ مستعمل ہے۔ طلسم اور جادو اور عمل کی نسبت اس کا استعمال ہرگز جائز نہیں ہے اگرچہ حضرت شررؔ نے یہ کلیہ قائم کر دیا ہے کہ اُردو میں کل کا لفظ صرف مادی مشینوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ (ترکیب) کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے[1] نسیم نے اس شعر میں (کل) سے (ترکیب) مُراد لی ہے یعنی حُسن آرا کو وہ ترکیب بتائی) اور چونکہ پنجرے میں بھی کل ہوتی ہے۔ لہذا تناسب لفظی کا بھی لطف پیدا ہو گیا ہے اس سلسلے میں لکھنا بھی ضرور ہے کہ حضرت شررؔ کا یہ دعوٰے کہ جادو اور عمل کی نسبت (مشین) کے معنی میں کل کا استعمال جائز نہیں ہے بالکل بے دلیل ہے۔ میر حسن کی رہیلی اعلیٰ اور مقبول عام اُردو مثنوی (میں بدر منیر جب بے نظیر کو جادو کا گھوڑا پرستان میں دیتی ہے تو کہتی ہے ؎

[1] جیسا کہ ذیل کے فقروں سے ثابت ہے (میں کل جاؤنگا) (اونٹ کس کل بیٹھتا ہے) (انکو کسیطرح کل نہیں پڑتی) (وغیرہ وغیرہ)

یہ گھوڑا میں دیتی ہوں کل کلنگ تجھے　　دلیکن یہ دے تو مجلکا سنگ مجھے

یا دوسرے موقع پر کہتی ہے ؎

جو اترے تو کل سکی یوں موڑ یو　　جو برعکس چاہے تو دوں موڑ یو

۲۲ ھ　　دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی　　شب کو اُسے آدمی بناتی

حضرت شرر کا طوطی فکر اس شعر کی نسبت یوں لغمہ زن ہے (طوطا پڑھایا جاتا ہے مینا پڑھائی جاتی ہے) فاختہ کا پڑھایا جانا ایک بالکل نئی بات ہے) حضرت شرر کو معلوم ہوگا کہ یہ (طلسمی فاختہ) تھی اور اسکو پڑھانے والی ایک پری تھی جو کہ جادو کے زور سے بہت سی ایسی نئی باتیں کر سکتی تھی جو حضرت شرر کے خیال کے مطابق قابل اعتراض تصور کی جا سکتی ہیں علاوہ بریں فقیر اکثر فاختہ پالتے ہیں اور اُسے پڑھاتے بھی ہیں اگر بفرض محال یہ مان بھی جائے کہ حضرت شرر کا اعتراض صحیح ہے تب بھی اسکا الزام اُس شخص کے سر ہے جسنے قصہ کے واقعات کو ترتیب دیا ہے نہ کہ نسیم کے سر آخر میں میں یہ عرض کرونگا کہ کسی نئی بات کو قابل اعتراض قرار دینا واجب نہیں ہے عام طور سے کبوتر اڑائے جاتے ہیں مگر خلیل خاں فاختہ اُڑا گئے یہ (بالکل نئی بات ہے) خدا جانے یہ اعتراض (اساتذہ لکھنؤ) میں سے کن صاحب کی پرواز فکر کا نتیجہ ہے مجھکو تعجب ہے تو اسقدر کہ اس زمرے میں حضرت شرر نے گلزار نسیم کی اس حکایت پر کیوں نہ اعتراض کیا جسمیں ذکر ہے کہ ایک طائر نے اپنے صیاد سے جواب و سوال کیے یہ (بالکل نئی بات ہے) ؎

۲۳ ھ　　سوجھا تو نہ تھا صلاح اُلجھنا　　دانائی تھی بات کا سمجھنا

اس شعر پر ایک بہت مختصر سا اعتراض ہے کہ (دانائی تھی) کتنا برا اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے) چونکہ اس اعتراض کی زیادہ تشریح نہیں کی گئی ہے لہذا چند اشعار (اساتذہ لکھنؤ کے کلام سے لکھے جاتے ہیں جن کی بندش اس مصرع (دانائی تھی بات کا سمجھنا) کی بندش کے مطابق ہے

طلسم الفت تاق

شب نہ تھی دود آہ عاشق تھا　　جلوۂ نور صبح صادق تھا

عمر بھر مضموں طلائی رنگ کے بندھتے رہے آتش سرنوشت اپنی بھی نسخہ تھا کوئی اکسیر کا
مسجد سے میکدے میں مجھے نشہ لے گیا موجِ شراب جادہ تھی راہِ صواب کا
وادیِ ایمن میں تھی برقِ تجلی بے حجاب امینائی حسرت موسیٰ تھی پردہ جلوۂ دیدار کا

اب اس عام بندش کو کس طرح بھونڈا کہیے۔ میں نے گلزارِ نسیم کے دیباچے میں یہ خود تسلیم کر لیا ہے کہ نسیم سے بھی اکثر تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہیں نبھ سکا ہے اور تمثیلاً دو تین شعر بھی لکھ دیے ہیں لیکن حضرت شرر نے غالباً اعتراضات کی تعداد بڑھانے کے لیے اس قسم کے شعر بھی اپنے مضمون میں لکھے ہیں جن میں آپ کے نزدیک نسیم سے تناسب لفظی اچھی طرح نہیں نبھ سکا ہے مگر جن اشعار پر آپ نے اس پہلو سے اعتراض کیے ہیں وہ ایسے اعتراضات سے بری ہیں اب اس رنگ کے اعتراضات ملاحظہ ہوں ؎

سلا داغا تو چلے تفنگ سے وہ چھوٹے قیدِ فرنگ سے وہ

اعتراض ہے کہ (تفنگ کی چال سے انسان کی چال کو کیا علاقہ ہے) اول تو میں عرض کروں گا کہ (تفنگ چلنے) سے گولی کا چلنا مراد لیا جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی چال کو تیزی کے لحاظ سے گولی کی (چال) سے تشبیہ دی ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ (تفنگ چلنا) گولی کے چلنے کے معنوں میں نہیں استعمال کیا جاتا تب بھی حضرت شرر کے اعتراض کا جادو چلتا نہیں نظر آتا ذو معنی الفاظ کو اس طرح استعمال کرنا جس طرح نسیم نے اس شعر میں (چلنے) کو نظم کیا ہے۔ نزاکت شاعرانہ میں داخل ہے اور شعرائے لکھنؤ نے اس قسم کے تکلفات کو بہت رواج دیا ہے چند مثالیں درج ذیل ہیں آتش ؎

ایسی وحشت نہیں دل کو کہ سنبھل جاؤں گا صورتِ پیرہن تنگ نکل جاؤں گا

ظاہر ہے کہ پیرہن کے نکل جانے سے آدمی کے نکل جانے کو منطقی طور پر کوئی علاقہ نہیں ہے۔ مگر شاعری میں ایسا کرنا جائز ہے اس رنگ کی اور مثالیں بھی ہدیۂ ناظرین ہیں۔ وزیر ؎

ضعف ہو جائیں گی کیا خون کی چھینٹیں اڑ کر آستیں کا ہے تیری کو بس انھیں منزل قاتل

ساقی ہوا ہے عشق کسی خانہ جنگ کا — مانگوں گا میکشی کو پیالہ تفنگ کا

حضرت شرر کہیں گے کہ میکشی کے پیالہ سے اور تفنگ کے پیالہ سے کیا علاقہ تعلق ہے

اس کی تلوار کے رومال کا پھاہا تو نہیں — آب شمشیر کی تاثیر جو تیزاب میں ہے

ایسا کاٹتا ہے خار مژگاں کا — وزن کرلیتا ہے زر جان کا

دور ہوتا روح طائر سے کثافت جسم کی — زندگھاٹ پر اس کی سردہی کے نہانا چاہیے

۵۲۵ وہ پوربی کرکے جوگیا بھیس — جنگلے کی راہ سے چلا دیس

اعتراض ہے کہ سب راستے چھوڑکر تاج الملوک جنگلے کی راہ محض اسلئے بھیجا گیا کہ مصنف گلزار نسیم کو اس لفظ کی ضرورت تھی (حضرت شرر نے اس مقام پر بھی سیاق کلام سے چشم پوشی کی ہے۔ یہ شعر اس موقع کا ہے کہ جبکہ تاج الملوک گل لیکر وطن کی طرف کشتی پر چلا ہے اور جب وطن کے متصل آگیا ہے تو اس مقام پر یہ صورت پیش آئی ہے

سوچا کہ میں خود ہوں خانہ برباد — کیا جانئے کیا پڑے گی اُفتاد
لازم ہے کہ گل اپنے ہاتھ رکھئے — موقع نہیں بھیڑ سا تھ رکھئے
لشکر کا کیا انھیں اشارا — خود کشتی سے کر گیا کنارا
وہ پوربی کرکے جوگیا بھیس — جنگلے کی راہ سے چلا دیس

اس سلسلے میں آخری شعر کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ تاج الملوک کو بھیڑ ساتھ رکھنا منظور نہ تھی اسلئے وہ دریا کی راہ چھوڑکر فقیروں کے لباس میں جنگل کے راستے سے وطن کی طرف چلا نیز وہ چھپ کر چلا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی پہچانے اسلئے وہ بھی شاہراہ سے کنارہ کشی کرکے جنگلوں میں ہوتا ہوا وطن کی طرف سدھارا ہے

۵۲۶ نقش اس کو ہوا کہ بس وہی ہے — ان سادوں سے کندہ کب ہوئی ہو

اس شعر پر دو اعتراض ہیں اولاً یہ کہ داستکے دل پر نقش ہوا اور کہ بد سے نقش اس کو ہوا کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا اس زمانے کے لحاظ سے حضرت شرر کا اعتراض بہت بجا ہو لیکن

نسیم کے وقت میں یہ اختصار جائز سمجھا جاتا تھا شیخ ناسخ فرماتے ہیں ؎

سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں نقش ہیں نقش و نگار لکھنؤ

(یعنے دل پر نقش ہیں ہمارے)+ دوسرا اعتراض حضرت شرر نے (سادوں) پر جڑا ہے آپ فرماتے ہیں) (اصل تو سادہ مزاج) (سادہ لوح) ہے (سادے آدمی) اور سادے لوگ بھی سہی) مگر محض (سادوں کا) لفظ تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس اعتراض کے لئے وہی جواب ہے جو اس کے پیشتر کے اعتراض کے لئے لکھا گیا ہے اور دو شعر سنداً پیش ہیں

ترک کرتا ہے عشق سادہ رو ناسخ زاہد بے دیں بھی کتنا سادہ ہے

(یعنے سادہ لوح ہے یا سادہ آدمی ہے) جان صاحب ؎

کتنے سادہ ہو کہ میں بھبوکا لعل منگوا دوں تمہیں دو چار سرخ

جس زمانے میں (محض سادہ) سادہ لوح کے بدلے بولا جاتا تھا تو اس کی جمع سادوں بھی ضرور فصیح سمجھی جاتی ہوگی ؎

۲۷؎ دیووں نے ادھر محل بنایا کشتی سے وہ دختِ رز کو لایا

اعتراض ہے کہ نسیم نے محمودا کو (بغیر خیال کئے) دختِ رز کہہ دیا اور یہ یاد نہیں رہا کہ دختِ رز شراب کو کہتے ہیں۔

حضرت شرر کا غالباً یہ خیال ہے کہ (دختِ رز) سے کوئی معشوقہ عورت مراد لینا جائز نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے آتش کا شعر ہے ؎

دختِ رز میری مونس ہو میری ہمدم ہو میں جہانگیر ہوں یہ نور جہاں بیگم ہے

یا آتش کہتے ہیں ؎

لبالب بادۂ گلرنگ سے دل کا پیالہ ہے وہ میکش ہوں کہ میں نے دختِ رز کو گھر میں ڈالا ہے

ظاہر ہے کہ نہ آتش محض (شراب کو) نور جہاں بیگم کہہ سکتے تھے نہ آتش یہ کہہ سکتے تھے کہ (میں نے شراب کو گھر میں ڈالا ہے لیکن (دختِ رز) نور جہاں بیگم بن سکتی ہے۔ تو محمودا کیوں نہیں

بن سکتی اور چونکہ محمود اکشتی پر بیٹھی اور کشتی درخت زن سے بھی خاص تعلق رکھتی ہے اسلئے تشبیہ اور بختہ ہو گئی جس شخص کو شعر و سخن کا کچھ بھی مذاق ہو وہ اس قسم کی شاعرانہ نزاکتیں بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

۵۲۹ وہ گندم جو نما تھی بالی۔ حضرت شرر اس مصرع کی نسبت فرماتے ہیں کہ رعایت لفظی سے مضمون کی مٹی خراب کی ہے امیری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مصرع میں کیا عیب ہے بہتر ہوگا اگر حضرت موصوف کسی آیندہ موقع پر اپنے اس مختصر مگر ناموزوں اعتراض کی تشریح فرمائیں۔

۵۲۹ نوارہ ترکم خزانہ باقی . . . . . . اس شعر کی نسبت حضرت شرر نہایت حیرت سے فرماتے ہیں کہ بھلا فحش و ابتذال کی کوئی حد ہے اجس طرح حضرت شرر نے گلزار نسیم کی زبان پر بحث کرتے ہوئے تمام قدیم محاوروں کو جو کہ اب متروک ہو گئے ہیں غلط کہتے ہیں تکلف نہیں کیا ہے اسی طرح اس موقع پر تنقید سخن کے اس اصول اولیں سے بے خبری ظاہر کی ہر کہ کسی شاعر کے کلام کے اخلاقی پہلو پر اس زمانے کی تہذیب کا معیار پیش نظر رکھ کر بحث کرنی چاہیئے جس زمانے میں کہ وہ شاعر پیدا ہوا تھا۔ نسیم کے زمانے میں ان فحش محاوروں کا نظم کرنا ناروا نہیں سمجھا جاتا تھا جن کا زبان پر لانا اب خلاف تہذیب سمجھا جاتا ہے چونکہ شاعر کا کلام اسکے زمانے کی تہذیب کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسلئے گلزار نسیم بھی فحش کے کانٹوں سے پاک نہیں ہے۔ نسیم اس حالت میں ضرور قصوروار تھے جبکہ انکے کلام میں فحش محاورے ملتے اور انکے معاصرین کا کلام ایسے محاوروں سے پاک ہوتا مگر ایسا نہیں اس زمانے کے اکثر شعرا کے کلام میں فحش محاورے موجود ہیں ۵

۵۳۰ باہم زن و مرد نے کیا سیل دریا سے ملا وہ قطرہ زن سیل

اعتراض ہے کہ (یہاں سیل کے معنی ہی کچھ نہیں باقی رہے) غالباً حضرت شرر (قطرہ زن) کے معنی (قطرہ بار) سمجھتے ہیں جبھی آپ فرماتے ہیں کہ (یہاں سیل کے کچھ معنی باقی نہیں رہے) مگر ایسا نہیں ہے (قطرہ زن) فارسی کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کے معنے (شتابندہ) کے ہیں۔ یہاں قطرہ زن سیل سے (شتابندہ سیل) مراد ہے جو کسی صورت میں

بے معنی نہیں ہے (قطرہ زن) کے معنوں کی نسبت حضرت شرر کوئی لغت دیکھ کر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں ۔

ک ۳۵ غربت میں وطن کی دُھن سمائی اس فیل کو یاد ہند آئی

اعتراض ہے کہ فیل سے تشبیہ صرف ہند کی ضرورت سے دیگئی ہے ۔ مگر کس قدر بُرا معلوم ہوتا ہے ۔ حضرتِ شرر کا اس مصرع کی نسبت کچھ ہی خیال کیوں نہو مگر اسکو قبول عام کی سند مدت ہوئی مل چکی ہے ۔ یہ مصرع ضرب المثل ہوگیا ہے کہ ع اس فیل کو یاد ہند آئی ۔

ک ۳۶ خواہش جولائی جان ہوئی وہ ہلکا ہوا وہ گراں ہوئی وہ

اعتراض ہے کہ خیر بکاؤلی تو چونکہ آدھی تیھر کی ہوگئی تھی اسلیئے گراں ہوئی مگر ایسی حالت میں تاج الملوک صاحب کیونکر ہلکے ہوئے ۔ تعجب ہے کہ حضرت شرر لکھنؤ کے اس معمولی محاورے سے واقفیت نہیں رکھتے کہ (ہلکا ہونا) ذلیل ہونے کے معنوں میں بولا جاتا ہے نسیم نے (ہلکا ہوا) سے یہ مراد لی ہے کہ وہ بھری محفل میں ذلیل ہوا اور شعرائے اُردو نے بھی یہ محاورہ نظم کیا ہے ۔ قلق سہ

بیتابیٔ الفت نے کیا ہے شبک ایسا خاطر پہ گراں یار کی نظروں میں ہوں ہلکا

جانصاحب کی دوگانہ ۔ بیحیائی کیا کہوں جانصاحب کردیا ہلکا مجھے منجھلی بوا کے سامنے

حضرت شرر اس شعر میں (گراں ہوئی) کے معنی بھی غلط سمجھے ہیں (گراں ہوئی) کے معنے اس مقام پر یہ ہیں کہ بکاؤلی اہل محفل کی طبیعت پر گراں ہوئی ۔ حضرت شرر یہی فرماتے ہیں کہ (گلزار نسیم کے بہت سے اشعار میں افعال کا استعمال ایسی بُری طرح سے ہوا ہے کہ جو نہ لکھنؤ والوں کے نزدیک جائز ہو نہ دہلی والوں کے نزدیک اس اعتراض کی تائید میں حضرت موصوف اس قسم کے مصرعے پیش کرتے ہیں ع خاتم کے نگیں بتائے ہوتے (خاتم کے نگین انھوں نے بتائے ہوتے) یا خاتم کے نگین کو بتایا ہوتا) ع حیلہ کر کے چھپائی گیند (بجائے) اسکو چھپایا) ع اس شب کو بغل میں آکے جاگا (یعنی اس رات جب وہ آئی تب جاگا ۔

ع بیداری کا وہ ماہ پیکر (یعنی اس ماہ پیکر کو بیدار کیا وغیرہ وغیرہ۔ بیشک آج کل جو زبان کا رنگ ہے اسکے لحاظ سے افعال کا استعمال اس صورت پر غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نسیم کے معاصرین کے کلام میں اس قسم کی ترکیبیں عام نظر آتی ہیں ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں ناسخ ؎

کیا اتحاد ہے کہ وہ پیٹا جو گاڑ کر
مدفن میں ہو گیا ہے ہمارا بدن سفید

(یعنے اُس نے اپنے تئیں پیٹا) کے بدلے وہ پٹیا استعمال ہوا ہے) ناسخ ؎

کیوں نہو وہ نوجواں برسات میں رنگیں لباس
پیر گردوں تک شفق کا لال جوڑا چاہیئے

(یعنی) پیر گردوں تک کو شفق کا الخ ناسخ ؎

گھر میں ترے پاس سے جاتا نہیں
اب تو سیکھا ہے میرے ڈھنگ آئنہ

(یعنے ابتو آئینہ نے میرے ڈھنگ سیکھے ہیں) ناسخ ؎

بوسہ مانگا میں نے دو بوسے مرے گھر سے نکل
جو کہ سائل ہو وہ دروازے کے باہر چاہیئے

(یعنے اس کو دروازے کے باہر ہونا چاہیئے۔ آتش ؎

وحشت میں جو لی زنداں سے میں نے راہ دشت
کردکاں مجھکو خدا حافظ پکارے شہر سے

(یعنی) کردکاں نے مجھکو خدا حافظ پکار کر کہا۔ آتش ؎

باغ عالم میں یہی میری دعا ہے روز و شب
خار خار عشق گل رُخسار توڑا چاہیئے

(خار خار عشق گل رخسار کو توڑا چاہیئے۔ آتش ؎

ہو گیا ہے ایک مدت سے دل نالاں خاموش
باغ میں جا کر اُسے بلبل سُنانا چاہیئے

(اُسے نغمۂ بلبل سنوانا چاہیئے۔ رند ؎

حاضر اگر ہے دن کو تو غائب ہے رات کو
غمزہ یہ کس حسین سے سیکھا ہے آفتاب

(یعنے آفتاب نے یہ غمزہ کس حسین سے سیکھا ہے) رند ؎

رند ہجرت میں ہوئے زیست تنگ
اپنے اللہ کو پکارتے ہیں

(یعنی ہم نے اپنے اللہ کو پکارا ہے۔

دریائے تعشق (واجد علی شاہ)

پایا نہ مگر وہ ماہ طلعت پوشیدہ رہا برنگ نکہت

(یعنی اس ماہ طلعت کو نہ پایا) یہ بجنسہ ویسے ہی ہے جیسے کہ بیدار کیا وہ ماہ پیکر قلق سے

خواہش جستجوئے یار حد سے بھی کچھ ہے بیشمار بعد فنا میسر اغبار ڈھونڈھ پھرا گلی گلی

(یعنی اُسے ڈھونڈھتا پھرا گلی گلی) اُس زمانہ میں نظم کے علاوہ نثر میں بھی افعال کا استعمال اس صورت پر جائز سمجھا جاتا تھا۔ فسانۂ عجائب سے ذیل کا اقتباس تمثیلاً درج ہے (دولھا نے سہرا سر سے لپیٹ دولھن گود میں اُٹھائی الخ (یعنی دلھن کو گود میں اُٹھایا) حضرت خضر نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ تنافر گربہ کے عیب سے بھی یہ مثنوی خالی نہیں اور اس اعتراض کی تائید میں ایک شعر پیش کیا ہے جو کہ درج ذیل ہے سے

ہے پاکہ نہیں خطا تمہاری فرمائیے کیا سزا تمہاری

افسوس ہے کہ حضرت خضر اس شعر کی نزاکت کو نہیں سمجھے ورنہ یہ اعتراض نہ کرتے۔ یہ شعر اس موقع کا ہے جبکہ بکاؤلی تاج الملوک پر اپنے غصہ کا اظہار کر رہی ہے اور یہ سب پر روشن ہے کہ جس وقت کوئی شخص عالم غیظ میں کسی کو خطاب کرتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ میری تقریر اس وقت (تنافر گربہ) کے عیب سے پاک رہے وہ کبھی (تم) کہتا ہے کبھی طنزاً (آپ) کہتا ہے چنانچہ اس شعر میں نسیم نے بکاؤلی کے غصے کی تصویر کھینچی ہے اور وہ کبھی (تم) کہتی ہے کبھی طنزاً (فرمائیے) کہتی ہے الفاظ سے اس قسم کی مصوری کرنا کمال شاعری میں داخل ہے۔ اگر اس شاعرانہ نزاکت کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر اس شعر کو محض ایک ملائے مکتبی کی نگاہ سے دیکھیے تب بھی حضرت خضر کا اعتراض بیجا نظر آتا ہے کیونکہ نہ تو فارسی کے شعرا نے (تنافر گربہ) سے پرہیز کیا ہے نہ قدیم اساتذہ اُردو نے محض طبقۂ حال کے شعرا نے (تنافر گربہ) کو ناجائز قرار دیا ہے۔ نسیم کے معاصرین کے کلام میں (تنافر گربہ) کی پچاسوں مثالیں مل سکتی ہیں طوالت مضمون کے خیال سے ہر شاعر کے کلام سے دو ایک مثالیں دینے پر اکتفا کیا ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا — حافظ — بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
بسرت گر ہمہ عالم بسرم تیغ زنند — ؍ — نتواں برد ہوائے تو بروں از سر ما
ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ — آتش — جامہ زیبی کے بادشاہ ہو تم
تم تو غریب خانہ میں آئے نہ ایک روز — فرمایئے تو شب کو کسی وقت آؤں میں
میں جاں بلب ہوں گلا کاٹو یا گلے سے ملو — ناسخ — جو اس میں آپ کو منظور ہو وہ جھٹ پٹ ہو
ہاتھ سے رند کو کھوتے ہو عبث — رند — کہیں ایسا نہو پچھتایئے آپ
آپ کو کچھ نہیں خیال اپنا — قلق — دیکھو آئینے میں تو حال اپنا
تیز دستی کی پایئے گا سزا — ؍ — شامت آجائیگی تمہاری بجا
شکل دکھلاؤ کبریا کے لیئے — [illegible] — بام پر آ ذرا خدا کے لئے — زہر عشق
پڑی ہے سینہ میں جو میرا اب ایسی کہ زخم ہو جینے سے دل ہمارا — جان صاحب — ماما انا ہی سر میں ڈالوں منگا دو تھوڑا سا مجھکو پارا

اس اعتراض کے بعد حضرت شرر فرماتے ہیں کہ دو ایک جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے چھپنے میں غلطی ہوگئی ہے اور وہ ابتک چلی آتی ہے مسٹر چکبست نے ان غلطیوں کی طرف بھی توجہ نہیں کی ۔ اس دعوے کی تائید میں آپ ذیل کے دو شعر پیش کرتے ہیں ۔

صفحہ ۲۵ — رہرو کو دیا یہ لطف و اکرام — آتے آرام جاتے پیغام
صفحہ ۳۳ — دیکھا تو تمام دشت گلزار — دائیں بائیں دو رستہ بازار

پہلے شعر کی نسبت آپ فرماتے ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ پیغام کی جگہ انعام کا لفظ کیوں ہوا کہ سرا میں جو مسافر ٹھہرتے ہیں ان کو سرا کا مالک کسی قسم کا پیغام تو دیسکتا ہے مگر وہ انعام کیوں دینے لگا کیا اچھا ہوتا اگر اس اعتراض کی تشریح کر دیجاتی ۔ دوسرے شعر کی نسبت تحریر ہے کہ (دو رستہ) کی جگہ (دو دستہ) ہوگا ممکن ہو کہ اہل عرفان اس اصلاح کا منشا سمجھ لیں ۔ میرا فہم تو اس تصرف کا مطلب سمجھنے میں قاصر ہے شاید حضرت شرر کا یہ خیال ہو کہ دو رستہ لکھنؤ یا دہلی کا محاورہ نہیں اس شبہہ کے مٹانے کے لئے دو شعر تمثیلاً درج ذیل ہیں ؎

طلسم الفت (قلق)

سب دوکانیں دورستہ ہوں رنگیں، حد سے افزوں ہو شہر کی تزئیں
گھر سے نوشہ کے تا مکانِ عروس یوں دو رستہ تھے جھاڑ اور فانوس
دو رستہ جو روشن چراغاں ہوئے پیر حسن تپتنگے خوشی سے غزل خواں ہوئے

مضمون کے آخری حصے میں حضرت شرر کا اشہب قلم بالکل بے قابو ہو گیا ہے چنانچہ بلا وجہ آپ نے اکثر ذاتی حملے مجھ پر کئے ہیں۔ مثلاً متعدد جگہ آپ نے مجھے تصرف بیجا کا ملزم ٹھہرایا ہے اور اس رنگ کے فقرے لکھے ہیں کہ "ہمارے دوست نے بہت سی اور نئی غلطیاں پیدا کر دیں" "اہل زبان سے پوچھئے کہ اس اصلاح سے شعر بنا یا بگڑا اس اصلاح نے شعر کی مٹی خراب کر دی" "غرض اس اصلاح میں بھی ناسمجھی سے مثنوی پر ظلم ہوا ہے" "بے تکلفی کو خاک میں ملانے کے بعد شعر کو کیا غارت کر دیا" "افسوس ان اصلاحوں سے مثنوی کو کیسے گہرے اور بڑے زخم لگے ہیں اور جس بنیاد پر آپ نے ان ہوائی تیروں کا نشانہ بنانا چاہا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ "مسٹر چکبست صاحب نے اس نئے ایڈیشن کو خود مصنف صاحب کے اصلی ایڈیشن (یعنی وہ ایڈیشن جو نسیم کی زندگی میں مطبع حسینی میں ۱۸۴۳ء شایع ہوا تھا) کے مطابق درست کر کے شایع کیا ہے میں نے اسکا اندازہ کرنے کے لئے مطبع نامی کی آخر ۱۹۱۰ء کی چھپی ہوئی گلزار نسیم منگوائی اور اس سے مقابلہ کر کے دیکھا واقعی تحقیق اور تنقید کے معنی یہی ہیں" میں کہتا ہوں کہ اگر حضرت شرر اور کسی مطبع کی چھپی ہوئی مثنوی سے اس نئے ایڈیشن کا مقابلہ کرتے تو ان کو بہت سی اور اصلاحیں اور تصرفات مل جاتے۔ خیر جو کچھ حضرت شرر نے میری نسبت تحریر فرمایا ہے اسکا ترکی بترکی جواب دینا میں تہذیب مضمون نگاری کے خلاف سمجھتا ہوں میرا جواب صرف اسقدر ہے۔

ع بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی + جن اشعار میں حضرت شرر کو تصرف بیجا کا شک پیدا ہوا ہے اُن میں سے اکثر میں واقعی کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔

عہ جس حالت میں کہ حضرت شرر نے ایک نقطے یا شوشے کے گھٹ جانے یا بڑھ جانیکو تصرف بیجا قرار دیا ہے ۱۲

غلط	صحیح
بولی وہ جمیلہ کہہ کر دن کیا	بولی وہ جمیلہ پھر کروں کیا
پو پھٹتے ہی جگ اُنھوں کا ٹوٹا	پَو پھٹتے ہی جگ ان کا ٹوٹا
جنتی تھی ہمیشہ دختر اس کو	جنتی تھی ہمیشہ دختر اس کو
قاصد نے رخ پری دکھایا	قاصد نے جو رُخ پری دکھایا
قسمت سے مقر ہے اب یہ مالن	قسمت سے مضر ہے اب نہ مامن
صیاد تھی لائی پھانس کر صید	صیادنی لائی پھانس کر صید
چلیئے گا تو ساتھ ہیں بلا عذر	چلیئے گا تو ساتھ ہیں بلا عذر

ان مصرعوں کے علاوہ اور جن اشعار پر حضرت شرر کو (اصلاح) (یا تصرف) کا شک ہوا ہے وہ اسی حالت پر ہیں جس حالت میں کہ وہ اصلی اڈیشن میں پائے گئے تھے۔ ان میں ایک لفظ کا تغیر یا تبدل نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے اصلی اڈیشن پر اگر کہیں تصرف کیا ہے تو صرف اس قدر کہ یائے معروف کے بدلے یائے مجہول یا اکثر یائے مجہول کے بدلے یائے معروف بنا دیا ہے کیونکہ پرانے زمانے کے کاتب یائے معروف اور یائے مجہول کا فرق نہیں مانتے تھے۔ نامی پریس کی مثنوی کو جس شخص نے ترتیب دیا ہے اُس نے اکثر قدیم محاوروں کے بدلے اس زمانے کے محاورے لکھ دیے ہیں غالبًا اسی بنا پر حضرت شرر فرماتے ہیں کہ (بازاری پریس نے مثنوی کو بگاڑا نہیں بلکہ بنا دیا) میری رائے میں اس قسم کا تصرف کرنا طالبان فن زبان کے حق میں ظلم کرنا ہے چاہے عامیانہ مذاق کے لوگ

سلہ متعلق صفحہ ۱۱۳۔ اس حالت میں آپ سے یہ امید نہیں ہو سکتی کہ آپ کسی لفظی تغیر کو کتابت کی غلطی تسلیم کریں۔ لیکن کاتبوں کے لئے ایسی غلطی کرنا کوئی ذہنی بات نہیں ہے۔ حضرت شرر کے اسی اعتراضات والے مضمون میں گلزار نسیم کا ایک مصرع اس طرح چھپا ہے ع داغا تو چلے تفنگ سے وہ جہل نے بیٹا تھا تو یہی ہو کہ میں بھی کہوں کہ حضرت شرر نے (تو) بڑھا کر ناسمجھی سے مصرع کی بے تکلفی اور سادگی کو خاک میں ملا دیا ہے (یا) ناموزوں کر دیا لیکن عقل سلیم کہتی ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے نہ کہ مضمون نگار کی۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ایسی کتابت میں غلطی ہو جانا (فاختہ کے پڑھنے) کی طرح ناممکن نہیں ۱۲

ایسے تصرفات کو پسند کریں کیونکہ انکی نظر وسیع نہیں ہوتی ہے مگر نقادان سخن جانتے ہیں کہ مرتب کا فرض یہ ہے کہ وہ کسی گنجینہ دار معانی کی چھوڑی ہوئی امانت میں کسی طرح کی خیانت نہ کرے۔

آخر میں حضرت شرر اپنے مضمون کی نسبت فرماتے ہیں کہ بعض حضرات کو یقیناً یہ تحریر ناگوار گذرے گی اور میں بھی خدا سے چاہتا ہوں کہ انھیں سخت ناگوار گذرے، کیونکہ ایسی صورت میں وہ شاید زیادہ جوش سے جواب لکھیں گے، مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ علمی مباحثوں میں ایسے جوش بیجا کا اظہار جسکے حضرت شرر طالب ہیں اصل کو خبط کر دیتا ہے اور صرف سخن پروری پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اگر حضرت شرر کے مضمون کے جواب لکھنے میں کوئی صاحب اس قسم کا جوش صرف کرینگے کہ جس سے کہ مضمون مذکور کا ایک ایک حرف معمور ہے تو سوائے اسکے کہ انصاف کا خون ہو اور کچھ نہ حاصل ہوگا نقاد سخن کا فرض یہ ہے کہ وہ اس بات کے لئے دست بدعا نہ رہے کہ دوسروں کو اسکی تحریر ناگوار گذرے بلکہ اس بات کی کوشش کرے کہ اسکے مخالف اسکے دلائل پورے طور سے سمجھ جائیں۔

برج نرائن چکبست لکھنوی

از اودھ پنچ جلد ۲۹ - نمبر - ۳۳ - مطبوعہ ۱۷ - اگست ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم

(جواب اعتراضات شرر از پنڈت برج نرائن چکبست

گذشتہ اپریل کے دلگداز میں جو اعتراضات حضرت شرر نے گلزار نسیم پر شایع کئے تھے انکا جواب اُردوئے معلےٰ میں لکھدیا گیا تھا۔ لیکن اُردوئے معلےٰ کے وقت پر نہ شائع ہونے سے اکثر تعجیل پسند طبیعتوں کو مختلف افواہیں اُڑانے کا موقع ملا۔ لہٰذا یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس مرتبہ ۱۱ مئی ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں جو تازہ اعتراضات حضرت شرر کے نام سے شائع ہوئے ہیں انکا جواب اودھ پنچ میں دیا جائے۔ اور جو اعتراض پیشتر کیے گئے تھے انکی نسبت کسی اخبار نے یہ لکھدیا کہ (جو اعتراضات شرر نے کئے ہیں گو موجودہ زمانے میں اُن کا حرف حرف صحیح ہے مگر جس زمانے میں نسیم تھے اُسوقت کی زبان اور طرز کلام دیکھتے ہوئے ہم نسیم کی کوئی خطا نہیں دیکھتے اسکی تردید میں حضرت شرر تحریر فرماتے ہیں کہ نسیم کو اتنا زمانہ نہیں گذرا کہ اُن کی طرف سے ایسی عذرداری جائز سمجھی جائے۔ زہر عشق۔ بہار عشق۔ اور طلسم الفت اُنھیں کے زمانے کی یا اُن سے پہلے کی مثنویاں ہیں اور وزیر۔ رند۔ صبا۔ اور خلیل وغیرہ کا جو دور تھا اس کے آخری شخص نسیم ہیں) مجھ کو حیرت ہے کہ حضرت شرر نے تاریخی واقعات کی ترتیب بدلنے کی جرأت کس طرح فرمائی۔ ابھی ایسے کہن سال بزرگ زندہ ہیں جو آتش۔ ناسخ۔ رند۔ صبا نسیم وغیرہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں اور جن کے سامنے اُن اساتذہ کامل فن نے وفات پائی حضرت شرر ان سے اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ نسیم۔ رند۔ صبا۔ وزیر خلیل وغیرہ کے دور کے آخری یادگاروں میں نہ تھے بلکہ اس دور کے اولیں شعرا میں سے تھے۔ رند۔ صبا

وغیرہ تو درکنار نسیم کا انتقال آتش کے سامنے ہوا ہے اس دعوی کی تائید میں ان تمام شعرا کی تاریخہائے وفات ذیل میں درج ہیں جن سے کہ اصل حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے۔

تاریخ وفات نسیم مصنفۂ عاشق لکھنوی،

مصرع کشیدہ آہ و بگفتہ نسیم باغ جناں۔ ۱۲۶۱ھ

تاریخ وفات آتش مصنفۂ اسیر لکھنوی ؛

دلم از مرگ آتش بود غمکش — زغم تا والف خود راستہ ساخت

ز آتش یافتم تاریخ آتش — تپش از دامن شیس نقطہ انداخت ۱۲۶۴ھ

(تاریخ وفات خواجہ وزیر)

بحر تاریخ رحلتش این گفت — وائے خواجہ وزیر عالی قدر

(تاریخ وفات صبا مصنفۂ بحر لکھنوی) ۱۲۷۰ھ

بحر ازیں مصرع جانسوز گل سال امید — چمن ہستی موہوم صبا شد برباد ۱۲۷۱ھ

علاوہ بریں صبا کے ذیل کے شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ نسیم ان کے سامنے اس دار فانی سے رحلت کر گئے تھے ؎

اٹھ گئے ہیں نسیم جس دن سے — اے صبا وہ ہوائے باغ نہیں

رند کی کوئی تاریخ وفات دستیاب نہ ہو سکی لیکن ان کے ایک شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ آتش نے انکے پیشتر وفات پائی وہ شعر یہ ہے ؎

صحبت شعر و سخن ہو گئی برہم اے رند — بعد آتش نہ نظر ایک بھی استاد آیا

اور یہ امر طے شدہ ہے کہ نسیم آتش کے سامنے مر گئے تھے۔ لہذا رند نے بھی ان کے بعد ہی وفات پائی۔ خلیل کی بھی کوئی تاریخ وفات نہ ملی لیکن کہن سال بزرگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ نسیم اُن سے پہلے اس دنیا سے اُٹھ گئے تھے۔ ان تاریخی شہادتوں پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شرر کا دعوی بالکل بے بنیاد ہے بر عکس اسکے قدامت کے

لحاظ سے مذکورۂ بالا شعرا کے نام ذیل کی صورت پر ترتیب دیے جاسکتے ہیں۔

نسیم	سال وفات	۶۰ ۱۲ھ	رند خلیل نے
آتش	"	۶۳ ۱۲ھ	بھی نسیم کے
خواجہ وزیر	"	۷۰ ۱۲ھ	بعد وفات پائی
صبا	"	۷۳ ۱۲ھ	

اب ان تاریخی واقعات سے چشم پوشی کرکے کہنا کہ وزیر۔ رند۔ صبا۔ خلیل وغیرہ کا جو دور تھا اسکے آخری شخص نسیم ہیں) انصاف کی آنکھوں میں خاک [1] ڈالنا ہے۔

نیز حضرت شرر کا یہ دعویٰ کہ زہر عشق بہار عشق۔ اور طلسم الفت انھیں کے یعنے نسیم کے زمانے کی یا اُن سے پہلے کی مثنویاں ہیں) بالکل خلاف واقعات ہے۔ گلزار نسیم کے آخر میں نسیم کی کہی ہوئی تاریخ تصنیف موجود ہے۔

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد
توقیع قبول روز پیشش باد

طلسم الفت کی لوح پر لکھا ہوا ہے کہ مثنوی طلسم الفت اسکا تاریخی نام ہے (۱۲۶۶ھ) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گلزار نسیم کے بارہ برس بعد مثنوی طلسم الفت تصنیف کی گئی یا یوں کہئے کہ مثنوی گلزار نسیم محمد علی شاہ کے ابتدائے دور میں تصنیف ہوئی ہے اور طلسم الفت واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ زہر عشق۔ بہار عشق۔ لذت عشق۔ وغیرہ حکیم نواب مرزا شوق سے یادگار ہیں یہ مثنویاں بھی واجد علی شاہ کے زمانے میں تصنیف ہوئی ہیں کیونکہ ان میں اکثر مقامات پر واجد علیشاہ کا حوالہ دیا گیا ہے بہار عشق میں ایک شعر ہے ؎

نہ سمجھنا کہ کوئی اور ہے یہ
شاہِ واجد علی کا دور ہے یہ

[1] افسوس مولانا شرر تو ہزار برس ادھر کی عرب کی تاریخ جانتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں چین سے بردہ آیا مگر لکھنؤ کی پچاس برس ادھر کی تاریخ نہیں جانتے اور انشاء اللہ سے المورخ کے اڈیٹر مستقل ہونیکا دعویٰ رکھتے ہیں ع این کار از تو آید و مردان چنیں کنند"

لذتِ عشق کے آخر میں یہ شعر موجود ہے ؎

دعا پر ہوئی ختم یہ مثنوی — سلامت رہے شاہ واجد علی

پس ثابت ہوا کہ نواب مرزا شوق کا شمار گلزار نسیم کے بیشتر کی تصانیف میں نہیں ہو سکتا کیونکہ غالباً حضرت شرر کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ واجد علی شاہ کی سلطنت کا زمانہ محمد علی شاہ کے بعد آیا ہے^۱۔ مجھ کو سخت افسوس ہے کہ علمی مباحثوں میں اس قسم کے ناجائز تاریخی تصرفات سے کام لیا جاتا ہے ممکن ہے کہ کم استعداد اور جاہل لوگوں پر یہ تدابیر کارگر ہو جائیں۔ لیکن سخن فہم اور سخن سنج حضرات جنھوں نے گلزار نسیم کے علاوہ اور شعرا کا کلام بھی پڑھا ہے اور جو اردو شاعری کی تاریخ سے واقف ہیں وہ مانا کہ اس خاص موقع پر مصلحتاً زبان سے کچھ نہ کہیں مگر ایسے تصرفات وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔

آخر میں میں حضرت شرر سے بصد ادب پوچھتا ہوں کہ جس حالت میں آپ اپنا یہ عقیدہ ظاہر کر چکے ہیں کہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اگر آتش نے اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انھیں نوعمر شاگرد سے تھی اسی کی تحریک سے یا اسکی مشق اولیں دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو۔ پھر اسمیں متعدد لغزشیں دیکھ کے اسے بجائے اپنے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہو (دلگداز بابت ماہ مارچ ۱۹۰۵ء) پھر آپ کسطرح فرماتے ہیں کہ گلزار نسیم کی زبان بہت پرانی زبان نہیں ہے کیونکہ اسکا مصنف وزیر۔ رند۔ صبا۔ اور خلیل وغیرہ کے دور کا آخری شخص ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ آتش اپنے شاگردوں کے دور کے آخری شخص ہیں بہتر ہوتا کہ حضرت شرر قبل اعتراضات پیش کرنے کے ان متضاد بیانات کی تشریح فرما دیتے۔

---

۱ اودھ پنچ۔ یہ کہاں سے آپنے فرض کر لیا کہ مولانا شرر کو انکار نہوگا جسطرح کہ مولانا کے پاس ایک جانصاحب کا پرانا لکھا ہوا دیوان موجود ہے جسمیں حمل کی جگہ یہ حمل لکھا ہوا ہے ممکن ہے اسیطرح مولانا کے پاس کوئی پرانی لکھی ہوئی تاریخ اودھ موجود ہو جسمیں یہ لکھا ہو کہ محمد علی شاہ کا دور واجد علی شاہ کے بعد آیا ہمارا ظن غالب ہے کہ مولانا کے پاس ایسی تاریخ ضرور ہے اور اسی کی بنیاد پر یہ لکھا گیا کہ نسیم لکھنوی رند۔ صبا کے دور کے آخری شاعر تھے ۱۲

خاص اعتراضات ملاحظہ ہوں۔

ع - جس گل کی ہوا لگی تھی لائے۔

اعتراض ہے کہ (شوق تھا) یا ہوس تھی کے محل پر ہوا لگی تھی غلط محاورہ ہے۔ ہوا لگنا اس شعر میں طبیعت پر اثر پڑنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جس گل کا انکی طبیعت پر اثر پڑا تھا وہ لے آئی یہ محاورہ اس موقع پر اسیطرح استعمال ہوا ہے جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ کو بھی کرسی کی ہوا لگ گئی۔ جسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کیا آپ کی طبیعت پر بھی کرسی کی آب و ہوا کا اثر پڑا ہے۔

ع لازم ہے گل اپنے ہاتھ رکھیئے۔

اعتراض ہے کہ (اپنے ہاتھ میں رکھیئے ہونا چاہیئے تھا) اس محل پر لفظ (میں) کو حذف کر دینا ناجائز ہے حضرت شرر اس مصرعے کے یہی معنی میں سمجھے (ہاتھ رکھیئے) سے مراد نہیں ہے کہ گل اپنی مٹھی میں رکھیئے یہاں (ہاتھ) استعارۃً (اختیار کے) معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار میں قلق ؎

جس نے نقش درم نہیں پایا عمل دست غیب ہاتھ آیا

طلسم الفت وزیر ؎

اچھا ہے منھ کو برسنا اپنے ہاتھ آستینیں ابر دریا بار ہیں

کیا کہوں گا اگر اس بت نے کہا محشر میں داغ داور حشر ترے ہاتھ ہے عزت میری

اور ہاتھ (جب اس صورت پر (اختیار) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اسکے بعد (میں) لانا ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ حضرت شرر سے اس موقع پر میری یہ استدعا ہے کہ اگر آپ پھر کبھی کسی محاورہ پر اعتراض فرمائیں تو جس صورت پر آپ اس محاورے کا استعمال جائز سمجھتے ہوں اسکی تشریح کیلئے کسی استاد کا شعر بھی سند اً درج کر دیں۔ ورنہ ایسی فضول بحث سے کنارہ کشی کیجائیگی۔

ع (معروض کیا کہ بادشاہ)

اعتراض ہے کہ (معروض کیا) غلط ہے عرض کیا) چاہیے۔ اس میں محاورہ ہی نہیں غلط ہے بلکہ نحو و صرف کی جاہلانہ غلطی ہے) (معروض نمودن) فارسی کا محاورہ ہے نسیم نے اپنے محاورے[1] کا ترجمہ کر دیا ہے۔ اورنگ زیب اپنے رقعات میں لکھتا ہے۔ دراں مقام بخشیان عظام احوال نو سرفرازان منصب معروض نمودہ حکم عرض مکرر و نظر ثانی حاصل می کردند الخ (مجھ کو حیرت ہے کہ حضرت شررؔ کے قلم سے ایسا اعتراض کس طرح نکلا جس سے فارسی کے معمولی محاوروں سے عدم واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ میں اس کو تجاہل عارفانہ[2] کہوں گا۔ افسوس ہے تو صرف اس قدر کہ نسیم کی بدولت حضرت شررؔ نے اورنگ زیب کی روح کو بھی صدمہ پہونچایا کیونکہ حضرت شررؔ کے کلیہ کے مطابق (معروض نمودن) لکھنا صرف و نحو کی جاہلانہ غلطی ہے۔

ع دیکھ آ جو تجھے دہل نہ ہووے)

اعتراض ہے کہ (ڈر نہ ہووے) کی جگہ دہل نہ ہووے خدا جانے کہاں کی زبان ہے اہل لکھنؤ تو نہ بولتے تھے نہ بولتے ہیں)

یہ اعتراض بالکل بے محل ہے حضرت شررؔ کو اس سے تو انکار نہ ہوگا کہ (دہل) خوف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر اگر نسیم نے خوف کی جگہ (دہل) استعمال کیا تو کیا گناہ کیا محض اس بنا پر (دہل) ہونے کو غلط ٹھہرایا کہ اہل لکھنؤ کے روزمرہ کی بول چال سے اسے تعلق نہیں ہر کوئی معنی نہیں رکھتا بقول منشی امیر احمد صاحب مینائی متعدد لغات ایسے ہیں جو

---

[1] اردوئے معلیٰ (جولائی ۱۹۰۵ء) میں جو میرا مضمون حضرت شررؔ کے اعتراضات کے جواب میں شائع ہوا ہے اس میں متعدد مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے لکھدی گئی ہیں کہ نسیم کے زمانے میں فارسی محاوروں کا لفظی ترجمہ ناجائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً زند نے (دوش دادن) کا ترجمہ دوش دینا کر دیا ہے۔ حالانکہ اردو میں کاندھا دینا کہتے ہیں ۱۲

[2] اودھ پنچ۔ اڈیٹر مستوفی العرفان کے لئے (تجاہل عارفانہ) بھی کیا خوب ۱۲

صرف شاعرانہ خیال ادا کرنے میں مستعمل ہیں اور روزمرہ کی بول چال سے اُنکو چنداں تعلق نہیں ہو۔
(امیر اللغات حصہ اول صفحہ ۷ دفعہ ۱)

مثلاً آتش۔ ٹھوکریں کھائی ہیں جو ہمنے بتوں کے عشق میں آپ ہو جاتے جو یہ آزار پتھر کھینچتے

(آزار کھینچنے کو روزمرہ کی بول چال سے تعلق نہیں ہے۔ عام طور پر صدمہ اُٹھانا یا ایذا کھینچنا بولتے ہیں آزار کھینچنا اہل لکھنؤ نہ بولتے تھے نہ بولتے ہیں۔ داغ سے

نہ کھایا تھا کبھی خون جگر ہم نے مگر کھایا نہ پایا تھا کبھی آزار الفت میں مگر پایا

(آزار پانا) اہل دہلی نہ بولتے تھے نہ بولتے ہیں۔ اسکے بدلے مصیبت اُٹھانا اذیت پانا عموماً زبانوں پر جاری ہو۔ اس قسم کی سیکڑوں مثالیں دیجا سکتی ہیں مگر طوالت مضمون مانع ہو۔

ع قاصد سے کلام لطف بولا۔

اعتراض ہے کہ کلام بولنا۔ صاحب لوگوں کے بیرا اور خانساماں لوگوں کی زبان ہے اگر حضرت شرر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتے تو آپکو نسیم کی شان میں ایسے کلمے زبان پر لانے کی ضرورت نہوتی (کلام بولنا) کلام گفتن کا ترجمہ ہو اور کون کلمہ گو نہیں جانتا کہ کلام گفتن فارسی کا محاورہ ہے قدیم زمانے میں اکثر محاورے ایسے استعمال ہوتے تھے جو کہ اب بیرا اور خانساماں استعمال کرتے ہیں مثلاً قلق طلسم الفت میں کہتے ہیں سے

تمکنت کو نہ کام فرماؤ اک نظر مڑ کے دیکھتے جاؤ

اب کوئی اہل زبان کام فرماؤ) نہ کہے گا لیکن بیرا اور خانساماں اپنے (صاحب سے) اکثر ایسا کہتے ہیں۔ یہ بھی کار فرمودن کا ترجمہ ہے۔ یا ایک مقام پر طلسم الفت میں ذیل کا شعر ملے گا سے

بولی گھبراؤ نا سمجھ لیں گے ہم صفائی تمہاری کر دینگے

(اب گھبراؤنا) کوئی نہیں بولتا اہل زبان اسکے بدلے نہ گھبراؤ کہیں گے۔ لیکن قلق پر آجکل کی زبان کے لحاظ سے اعتراض کرنا حماقت ہے۔

۵۶ ع ہوش اسکے ہوا ہوئے کہہ تو

اعتراض ہے کہ (کہہ تو) فارسی کے بگوئی کا ترجمہ ہے ...... چنانچہ مثنوی میرحسن میں بھی جابجا موجود ہے۔ مگر ناسخ و آتش کے وقت سے یہ الفاظ متروک ہیں اور نسیم کے لئے انکا موزوں کرنا ہرگز جائز نہ تھا)

اِس موقع پر بھی حضرت شرر کا عتاب نسیم مرحوم پر بیجا ہے نواب مرزا شوق اپنی مثنوی مسموم بہ لذت عشق میں کہتے ہیں ؎

امیروں کی پیچھے سواری چلی — کہے تو کہ باد بہاری چلی
مصفا وہ نہر اسمیں اک بیدلی — کہے تو کہ ہے موجزن سلسبیل

غالبًا حضرت شرر کو اس سے انکار نہو گا کہ (لذت عشق) کا اور میرحسن کی مثنوی کا زمانۂ تصنیف ایک نہیں ہے اور نواب مرزا شوق مرحوم آتش ناسخ و نسیم کے دور کے بعد کے شعرا میں ہیں

۵۷ ع مشہور ہے ضد انس وجانی۔

اعتراض ہے کہ (ضد انس وجاں) کی جگہ پر (ضد انس وجانی) جاہل کے سوا پڑھے لکھے کی زبان سے نہ نکلے گا۔ بیشک اس زمانے میں کسی پڑھے لکھے کی زبان سے (ضد انس وجانی) نہ نکلے گا۔ لیکن نسیم کے دور کے شعرا اس قسم کے تصرفات جائز سمجھتے تھے طلسم الفت میں قلق کہتے ہیں ؎

اک طرف خیمۂ حباب استادہ — فرش قالین موج حسب مراد
جبکہ یہ سماں سنے کی بیداد — گھاٹ پر نخے جو اہل شہر استاد

لہ او دعوانیخ۔ یہ آپ نے کسطرح فرض کر لیا کہ حضرت شرر کو اس سے انکار نہ ہوگا حضرت شرر تو اُلٹے چلتے ہیں جسطرح یہ لکھدیا گیا کہ ہند و صبا دزیر کے دور کے آخری شخص نسیم تھے اسی روش پر یہ ثابت کر دیا جائے گا کہ لذت عشق میرحسن کی مثنوی کے قبل تصنیف ہوئی ہے اور نواب مرزا شوق آتش و ناسخ کے دور کے اولین شخص تھے غالبًا رسالہ المورخ میں یہ سب باتیں ثابت کر دی جائیں ۱۲

یا فریب عشق میں نواب مرزا شوق لکھتے ہیں ؎

دیکھ یہ آدمی سے میں نے کہا　　نام و گھر پوچھ لے کہاری کا

یا آتش کہتے ہیں ع در در وہاں سے المضاف ہوا ع کوئی نہیں چھوڑتا حلوۂ بے دودھ کو،
اس زمانہ میں (استادہ) بدلے استاد (نام و نشان) بدلے نام و گھر (المضاعف کے بدلے)
المضاف حلوائے بے دود کے بدلے حلوۂ بے دودھ) جاہل کے سوا کسی پڑھے لکھے کی
زبان سے نہ نکلے گا۔ لیکن اگر اس زمانے کے لحاظ سے کوئی شخص آتش قلق اور شوق
کو جاہل مطلق قرار دے تو اُسکی عقل کا خدا ہی حافظ ہے۔

۵۸ج مشتاق کو خوش خبر سُنائی۔

حضرت شرر فرماتے کہ بھلا کوئی بھی (خوش خبری) کی جگہ (خوش خبر) کہہ سکتا ہے شاید
کہا جائے کہ (خوش خبر) خبر خوش کی ترکیب مقلوب ہے مگر یہ اُردو میں اس سے بدتر ہے۔
کوئی خوشخبری کی جگہ۔ خوش خبر کہہ سکے یا نہ کہہ سکے مگر حافظ نے کہا ہے۔ جیسا کہ اس کے
ذیل کے شعر سے ثابت ہے ؎

مژدہ اے دل کہ دگر باد صبا باز آمد　　ہُدہد خوش خبر از طرف سبا باز آمد

اس شعر میں (خوش خبر) کے معنی (خوشخبری) اور مژدہ کے ہیں جسکو استعارتًا ہدہد کہا ہے
اب رہا یہ دعویٰ کہ ترکیب مقلوب کا استعمال اُردو میں بدترین افعال میں سے ہے اِسکا جواب
اساتذہ زبان اُردو کے اشعار ذیل زبان حال سے دے رہے ہیں۔ آتش ؎

ہجر کی شب کی مصیبت کس طرح تحریر ہو　　جمع کر سکتا نہیں کوئی پریشاں خواب کو

یعنی خواب پریشاں کو ناسخ ؎

لپٹیں گے آکے حال میں ہم صوفیوں کی طرح　　بیٹھے ہیں گرچہ بزم میں مطرب پسر سے دُور

یعنی پسر مطرب سے دور ناسخ ؎

مزار عنا غزال اگر لحد پر جا نہیں سکتا　　کہ ہے گُل دام کا عالم یہاں پھولوں کی چادر میں

اغزال رعنا کے بدلے رعنا غزال اور دام گل کے عوض گل دام ملاحظہ ہو قلق طلسم الفت ؎

یہ تو کیا دخل ہے کہ عذر کریں — کہیئے تو سب غلامی خط لکھ دیں

دل فگاروں کو چھیڑتے ہو عبث — دوختہ زخم اُدھیڑتے ہو عبث

(خط غلامی) کے بدلے غلامی خط اور زخم دوختہ کے عوض دوختہ زخم ملاحظہ ہو۔

۹ واں جوڑا جست و تنگ بدلا — یاں جوڑے کے منھ کا رنگ بدلا

اعتراض ہے کہ اگر دوسرے مصرع میں جوڑے کے عوض (مادہ) کا لفظ استعمال کیا جاتا تو میں خیال کرتا ہوں کہ زیادہ فصیح ہوتا)

اس اعتراض کی نسبت میں صرف اسقدر عرض کرونگا کہ اس موقع پر نسیم نے میر حسن کی تقلید کی ہے اُردو کی پہلی اعلیٰ اور مقبول عام مثنوی سحر البیان میں بدر منیر کی رقیب یوں بے نظیر سے کہتی ہے ؎

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا — کہ اس مالزادی کو جوڑا دیا

حضرت شرر کے اصول کے مطابق میر حسن کے اس شعر میں (جوڑے) کے بدلے (نرماده) فصیح[1] معلوم ہوگا۔

۱۰ ع دیکھا تو وہ دونوں کرتے تھے خواب)

اعتراض ہے کہ (خواب کردن) فارسی کا محاورہ ہے۔ اُردو میں سونے کے محل پر (خواب کرنا) کہنا غلط ہے اور اگر اسمیں کسی صاحب کو عذر ہو تو ناسخ و آتش کے زمانے سے اسوقت تک کسی مستند شخص کے کلام سے ثبوت پیش کریں۔ مجکو عذر ہے (خواب کرنا) اُردو کا محاورہ ضرور ہے دو شعر مثیلاً درج ذیل ہیں — آتش ؎

انتظار ملک الموت میں بیدار ہوں میں — بخت خفتہ کو مرے خواب گراں کرنے دو

کریں شوق سے آج اس جادہ خواب — میں خط کا لکھونگا اُسے خود جواب

---

[1] اودھ پنچ۔ حضرت شرر نے اعتراض تو بڑے زوروں میں کیا تھا۔ مگر مادہ بند آمد ۱۲

اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت شررؔ کے نزدیک آتش و شوقؔ (مستند شخص) ہیں کہ نہیںؔ[1]

ااا ع اُس نقش مراد کو جگایا (یعنی بکاؤلی کو)

اعتراض ہے کہ جب اسی (یعنی بکاؤلی کو) نقش مراد دیا تھا تو فعل بھی اسکے مناسب لاتے۔ حالانکہ جگایا صرف جادو جاتا ہے۔ نقش نہیں جگایا جاتا اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ نقش جگانا) اُردو کا محاورہ نہیں ہے۔ تب بھی حضرت شررؔ کا اعتراض کوئی معنی نہیں رکھتا اس وضع کے شعراُردو شعرا کی تصانیف میں بہت مل جائینگے۔ مثلاً قلقؔ طلسم الفت میں شہزادی کیطرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں ؎ کہ یہ سرو ریاض رعنائی + باغ سے کوئی گل کھلا لائی + چونکہ تمام شعرائے اُردو فارسی نے سرو کو بے گل و ثمر) قرار دیا ہے۔ لہذا حضرت شررؔ کے کلیئے کے مطابق قلقؔ نے جب شہزادی کو سرو قرار دیا تھا تو فعل بھی اُسکے مناسب لاتے۔ سرو کے لئے گل کھلانا) بالکل خلاف واقعات ہے۔ مگر حضرت شررؔ کا کلیہ صحیح نہیں ہے نہ قلقؔ کا شعر قابل اعتراض ہے نہ نسیمؔ کا۔ طوالت مضمون کے لحاظ سے صرف ایک مثال دینے پر اکتفا کیا۔ ورنہ متعدد سندیں پیش کی جاسکتی تھیں (نقش مراد) پر کیا منحصر ہے نسیمؔ اگر یہ کہتے ع اُس ماہ کو خواب سے جگایا تب بھی غلط نہوتا۔ لیکن چونکہ جادو جگایا جاتا ہے اور نقش کو جادو سے ایک خاص تعلق ہے۔ لہذا شعر میں ایک خاص لطافت پیدا ہوگئی جس شخص کو شعر و سخن سے مذاق ہے وہ شعر کی نزاکت اور خوبی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

۱۱۲ ع وہ نقش وفا عمل میں پائی۔

اعتراض ہے کہ (چاہیئے تو یوں تھا کہ اس نقش وفا کو عمل میں پایا) لیکن خیر اگر خلاف محاورہ زبان اختیار کی تھی تو تذکیر و تانیث کا لحاظ رکھتے۔ بکاؤلی کو قرار دیا نقش اور پھر اسکے ساتھ فرماتے ہیں (پائی) زباندان[2] کو یہ کسقدر ناگوار گذرتا ہے) اس اعتراض کے پہلے حصے کا جواب اُردوئے معلی

---

[1] ادھر تو یہ ہے ہرگز نہیں (مستند شخص) وہی ہو جو آنکھیں بند کرکے یہ لکھدے کہ حضرت شررؔ کے اعتراضات کسی کے اٹھائے نہیں اٹھ سکتے اور جو اسکے خلاف کہے وہ شہدا ہے ۱۲ [2] غالباً حضرت شررؔ کا مطلب کانوں سے ہے ۱۲

(جولائی ۱۹۰۵ء) میں دیدیا گیا ہے) یعنی جس صورت پر فعل کا استعمال اس مصرع میں ہوا ہے وہ نسیم کے وقت میں جائز تھا۔ اس موقع پر بھی چند مثالیں درج ہیں۔ آتش ؎

تمھارے روبرو پھیکا رُخ شمس و قمر دیکھا وہ نان بے نمک پایا یہ شیر بے شکر دیکھا

(اس شعر کے دوسرے مصرع میں وہ نان بے نمک پایا) سے مراد یہ ہے کہ (اس کو نان) بے نمک پایا۔ واجد علی شاہ دریائے تعشق ؎

پایا نہ مگر وہ ماہ طلعت پوشیدہ رہا برنگ نکہت

(یعنے اُس ماہ طلعت کو نہ پایا) رجب علی سرور (فسانۂ عجائب) دو لھانے سہرا سرسے لپیٹ دلھن گود میں اُٹھائی (یعنی دلھن کو گود میں اُٹھایا) اسی طرح اور مثالیں دیجا سکتی ہیں۔

اس مصرع پر دوسرا اعتراض ہے کہ (نقش) کے ساتھ پائی استعمال کرنا نا جائز ہے۔ اسکی نسبت پھر یہ میں عرض کرونگا کہ جس شخص نے نسیم کے علاوہ کسی اور شاعر کا کلام بھی پڑھا ہے وہ ایسا اعتراض نکرے گا اس قسم کی ترکیب اُردو میں عام ہے۔ چند مثالیں طلسم الفت سے سنداً درج ذیل ہیں ؎ بولیں سب جو ہیں اُتری وخورشید نکل آیا کہیں سے لو خورشید حضرت شرر کے اصول کے مطابق (خورشید) کے ساتھ (اُتری) استعمال کرنا زباں کو ناگوار گذرتا ہے اس ؎

کہ وہ سرو ریاض رعنائی باغ سے کوئی گل کھلا لائی

(حضرت شرر کہیں گے کہ شہزادی کو قرار تو دیا سرو) اور پھر اسکے ساتھ فرماتے ہیں گل کھلا لائی (زبان کو یہ کس قدر ناگوار گذرتا ہے) ؎

فرصت وقت وہ قمر پا کر گود میں بیٹھی اُس کی اٹھلا کر

(قمر کے لئے بیٹھی ملاحظہ ہو)

۱۳؎ ع شعلے سے زیادہ پاک داماں۔

اعتراض ہے کہ (بکاؤلی راجہ اندر کی محفل میں جل چکنے کے بعد پھر زندہ ہوئی اور ناچنے کو کھڑی ہوئی۔ تو چونکہ کثافت سے پاک وصاف ہو گئی تھی۔ لہذا اسکی تعریف کرتے ہیں

(شعلے سے زیادہ پاک داماں) بھلا یہ پاک دامانی کا کون محل تھا۔ کہنا چاہئے تھا پاک وصاف)
اور کہہ گئے (پاک داماں) کتنا معقول[1] تصرف شاعرانہ ہے۔

اس اعتراض سے یہ تو مترشح ہوتا ہے کہ اس مصرع کی لطافت تو درکنار حضرت شرر اس کا مطلب بھی نہ سمجھ سکے ورنہ ایسا اعتراض نہ فرماتے۔ بکاؤلی کی (کثافت) اخلاقی کثافت تھی یعنی اسکا دامن ایک غیر جنس کی صحبت سے آلودہ ہوگیا تھا۔ وہ اسلئے جلائی گئی کہ از سرِ نو جو میں آئے کر شیر کی سی پاک داماں ہوجائے جیسا کہ راجہ اندر کے حکم سے ظاہر ہے ؎

بو آتی ہے آدمی کی لے جاؤ ناپاک ہے آگ اسے دکھلاؤ

اگر محض جسمانی کثافت دور کرنا مقصود ہوتا تو محض پانی سے غسل کافی تھا اور اس موقع پر (پاک و صاف) کہنا درست ہوتا۔ مگر جو واقعات نسیم نے نظم کئے ہیں انکے مطابق (پاک داماں) ہی کہنا مناسب تھا اس موقع پر یہ لکھدینا بھی مناسب ہے کہ شعلے کو شعرا نے (پاک دامن) قرار دیا ہے کسی فارسی اُستاد کا مشہور شعر ہے ؎

عبث دعوائے خوباں بر پروانہ بر شعلہ ہمی دارد چو از آلائش آں دامنش را پاک می بیند

صفحہ ۵ ع معمول سے پھر بزم ہوئی جمع۔

اعتراض ہے کہ (حسب معمول یا معمول کے موافق کی جگہ (معمول سے) نسیم کی اُن فصاحتوں میں سے ہے جنسے سارا لکھنؤ محروم ہے۔

اس اعتراض کی نسبت میں صرف اسقدر عرض کرونگا کہ اگر قلق لکھنوی کی زبان لکھنؤ کی زبان ہے تو حضرت شرر کو اس اعتراض کی نسبت پھر کچھ تحریر نہ فرمانا چاہئے۔ طلسم الفت کا شعر ہے ؎

ساتھ اُس آفتاب کو لے کر آئی معمول سے مسہری پر

اگر محض ابلہ فریبی مدِ نظر نہو تو اس قسم کے اعتراضات سے کوئی ظاہر افائدہ نہیں معلوم ہوتا۔

صفحہ ۵ ع جام اس نے بھر اکہا پیا لے۔

---

[1] اور دھن ہے۔ اور یہ اعتراض کتنا نامعقول ہے ۱۲

حضرت شرر فرماتے ہیں۔ سُبحان اللہ! (پیا لے) کیا خوب رعایت تو اچھی ہو مگر بکاؤلی ہو یا تاج الملوک کے گھر میں کوئی گوارن پڑ گئی ہے! مجھ کو تو گوارن کی زبان کی شناخت نہیں۔ مگر اسقدر جانتا ہوں کہ (پیا) کا لفظ اہل لکھنؤ کی زبان پر بھی جاری ہے۔ رنگیلے پیا جان عالم۔ شاہ عالم پیا دلی کا مشہور فقرہ ہے۔ علاوہ بریں۔ بکاؤلی نے یہ لفظ خلوت[1] کے موقع پر اختلاط کی گفتگو کے سلسلے میں استعمال کیا ہو۔ اور یہ ظاہر ہو کہ اختلاط کی گفتگو میں زیادہ فصاحت و بلاغت سے کام نہیں لیا جاتا ہے بلکہ اصلی جذبات دلی کا اظہار پرجوش الفاظ میں کیا جاتا ہے یہ حالت تو خیر مستثنیٰ حالتوں میں سے ہے بے تکلفی کے اور موقعوں پر بھی اس قسم کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً طلسم الفت میں ایک ایسے موقع پر قلق نے شہزادی اور اسکی سہیلی کی گفتگو کی تصویر یوں کھینچی ہے ؎

مسکرا کر وہ حور غمزے سے
انگلی چمکا کے بولی ٹھینگے سے

غالبًا ٹھینگے سے عربی یا فارسی کا محاورہ نہیں ہو اور نہ لکھنؤ کی شریف زادیاں عام طور پر ایسے الفاظ زبان پر لاتی ہیں۔ یہ محاورہ خاصکر (گنواروں) کی زبان سے سنا جاتا ہے علاوہ بریں متقدمین کے کلام میں ہندی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں

میر حسن (سحر البیان) ؎ مسافر سے کہتا ہے کوئی بھی بیت + مثل ہے کہ جوگی جُٹے کسکے میت
واجد علیشاہ (دریائے تعشق) ؎ ہم تینوں تمھاری چیریاں ہیں + بن داموں خریدی لونڈیاں ہیں
قلق (طلسم الفت) وہ بھی جب راضی ہو تو کر دینا + حسب خواہش اُسے بھی بر دینا۔
قلق ایضاً ؎ آپ نے اچھے گھر دیا مجھ کو + خوب بر ڈھونڈھ کر دیا مجھکو +
قلق دیوان ؎ گل شمع کا جو مہکے گلزار انجمن میں + بلبل ابھی جنم لے پروانے کے برن میں +
نواب مرزا شوق (لذت عشق) علاوہ بریں اور اے خوش سیر + نصیبوں سے ملکہ نے پایا یہ بر +

---

[1] اودھ پنچ۔ واہ مولانا شرر واہ آپ نے اپنی زبان خوب پہچانی ۱۲ [2] اودھ پنچ خلوت کے موقع پر حضرت شرر نے (پیا) کی گرفت خوب کی ۱۲۔

۱۶ ع کف میں نمکیں کباب لیکر چھڑکا نمک ان جراحتوں پر

حضرت شرر فرماتے ہیں کہ اگر باورچی خانہ سے خاص ضرورت کے لئے نمک منگوایا تھا تو کباب کیوں ہاتھ میں لیئے۔ کیا یہ بھی کوئی ٹوٹکا تھا۔ اگر انھیں کبابوں کا نمک تھا تو چھڑکا کیونکر گو کہ اس اعتراض کا سنجیدگی کے ساتھ جواب دینا سخن فہم حضرات کی توہین کرنا ہے۔ لیکن حضرت شرر نے چونکہ اس شعر کے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ لہذا اس غلطی کا رفع کرنا ضرور ہے۔ حضرت شرر کو غالبًا معلوم ہوگا کہ (زخموں پر نمک چھڑکنا) اردو کا مشہور محاورہ ہے۔ جو کہ رنج و تکلیف ایزاد کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے پس اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ تاج الملوک نے اپنے زخمی ہاتھوں میں کباب لیکر اپنی تکلیف اور بڑھائی (نمک چھڑکنا) اس شعر کے دوسرے مصرع میں استعارتًا استعمال کیا گیا ہے۔ اور چونکہ تکلیف زخم کی وجہ سے تھی اور (نمک سے) اسمیں زیادتی ہوئی لہذا اس خاص موقع پر اس محاورے کی لطافت دوبالا ہوگئی ہے یہاں باورچی خانے کا خیال بے محل ہے

۱۷ ع پہونچا اس بزم میں سماں پر۔

اعتراض ہے کہ (اگر سماں یہاں وقت کے معنوں میں ہے تو خلاف محاورہ ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ جسوقت سماں بندھا ہوا تھا پہونچا تو یہ خیال ان الفاظ میں ادا کرنا کہ سماں پر پہونچا نا بالکل غلط ہے۔

حضرت شرر کا یہ اعتراض اس زمانے کے لحاظ سے درست ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں عمومًا سماں بندھنا بولا جاتا ہے اور (سماں) کا لفظ بجائے خود (کیفیت) کے معنوں میں نہیں استعمال ہوتا ہے۔ مگر قدما کے کلام میں اس لفظ کا استعمال اسطرح پر جائز سمجھا جاتا تھا چند مثالیں درج ذیل ہیں میر ؎

اے چرخ سمت حریف اندوہ بیکساں ہو کیا جانے منھ سے نکلے نالے کا کیا سماں ہو

یعنی نالے کی کیا کیفیت ہو۔ نواب مرزا شوق (لذتِ عشق) ؎

لے اودھ پنچ۔ شرر نے اگر باورچیخانہ کا خیال کیا تو ع دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست ۱۲

سماں تو یہ تھا نور کا ہو رہا   یہ شہزادہ منہ کھولے تھا سو رہا

اب اس زمانے میں اگر کوئی اس شعر کے پہلے مصرع کے خیال کو ادا کریگا تو وہ کہے گا کہ وہاں تو یہ نور کا سماں بندھا ہوا تھا۔ مگر نواب مرزا شوق نے (سماں کیفیت کے معنوں میں الگ استعمال کیا ہے اور پہلے مصرع کے معنے یہ ہیں کہ ایک نور کی کیفیت طاری تھی (صبا (مثنوی شکارگاہ) سے

کرم ہے یہ بندوں پہ اللہ کا   زمانہ ہے واجد علی شاہ کا
سماں روز پریوں کے گانے کا ہے   سلیماں یہ اپنے زمانے کا ہے

سماں روز پریوں کے گانے کا ہے۔ یعنی روز پریوں کے گانے کی کیفیت پیش نظر رہتی ہے اس زمانے میں یہ خیال اسطرح ادا کیا جائیگا کہ روز پریوں کے گانے کا سماں بندھا رہتا ہے نسیم نے بھی سماں اسی صورت پر کیفیت کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ع پہونچا اس بزم میں سماں پر کے معنے یہ ہیں کہ اس بزم میں عین کیفیت کے موقع پر پہونچا۔

شاہ   دی آنکھ جو شہ نے رونمائی   چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی

اعتراض ہے کہ (کیا چیز نہ بھائی) بادشاہ کا رونمائی میں آنکھ دینا) تو پھر بھایا چاہیئے۔ اس شعر کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ (بادشاہ کی رونمائی میں آنکھ دینی بھائیونکو نہ بھائی) مگر حضرت شرر کی اصلاح کے مطابق یہ شعر یوں ہونا چاہیئے سے دی آنکھ جو شہ نے رونمائی + چشمک سے نہ بھائیوں کو بھایا + اب اسکا فیصلہ سخن سنج خود ہی کرلیں گے کہ اصلاح کس پایہ کی ہے۔

چکبست لکھنوی

از اودھ پنچ جلد ۲۹ نمبر ۳۷ مطبوعہ ۱۴ ستمبر ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم

(از چکبست لکھنوی)

گلشن میں مُنے کے زمزمہ پردازیاں مری
دم بند ہو گیا ہے مرے ہمصفیر کا

اتفاقیہ ایک دوست کی عنایت سے یکم اگست ۱۹۰۵ء کا اتحاد مجھ تک پہونچ گیا۔ اسمیں خلاف امید گلزار نسیم کے متعلق چند سطریں نظر سے گذریں خلاف امید میں نے اس لیئے لکھا کہ میرا یہ خیال تھا کہ اتحاد کو ان جھگڑے کی باتوں سے کیا مطلب اتحاد تو ایک اخلاقی اور تمدنی رسالہ ہر علمی مباحثوں سے اور اس سے کیا سروکار۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ خیر اب اطناب محل کو چھوڑکر۔ وہ چند سطریں ملاحظہ ہوں جو کہ حضرتِ شرر نے اتحاد میں اس بحث کے متعلق لکھی ہیں حضرت موصوف فرماتے ہیں۔

گلزار نسیم پر جو اعتراضات جولائی ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں کیئے گئے تھے اُنکا جواب سُنتے ہیں کہ مسٹر چکبست نے اپنے نام سے اودھ پنچ میں شائع کرایا ہے۔ مگر ہم ایسے بازاری اور کم حقیقت پرچوں کی طرف خطاب کرنا خلاف شان خیال کرتے ہیں اگر وہ تحقیقی جواب چاہتے ہیں تو کسی مہذب و باوقعت پرچے میں لکھیں۔

حضرت شرر کے اس ارشاد کی نسبت چند باتیں دریافت طلب ہیں۔ اولاً یہ کہ حضرت شرر کو میرے جوابات سے مطلب ہے نہ کہ اودھ پنچ سے اور اگر حضرت موصوف میرے مضمون کا تحقیقی جواب عنایت فرماتے تو وہ میری طرف خطاب کرتے نہ کہ اودھ پنچ کی طرف اودھ پنچ تو

در کنار اگر میں واقعی کسی بازاری اور کم حقیقت پرچہ میں مثلاً کسی دوکان کے اشتہار وغیرہ میں اپنا مضمون شائع کراتا تب بھی کوئی ایسا شخص جسے کچھ بھی عقل سلیم سے بہرہ ہو یہ کہنے کی جرأت نکرتا کہ چونکہ مضمون مذکور ایک کم وقعت پرچے میں شائع ہوا ہے لہذا اسکا جواب دینا خلاف شان ہو اگر کوئی بات کسی مضمون کے جواب لکھنے میں ہارج ہوسکتی ہے تو وہ اُس خاص مضمون کی وقعت وحقیقت ہے نہ کہ اس پرچے کی (حقیقت و وقعت) جسمیں کہ وہ مضمون شائع ہوا ہو اگر حضرت شرر یہ عذر پیش کریں کہ اُنھوں نے اودھ پنچ سے اپنی نگاہ لطف[لہ] وکرم پھیرلی ہے اس صورت میں وہ مضامین انکی نظر سے کیونکر گذر سکتے ہیں جو کہ اسمیں شائع ہوتے ہیں اسکی نسبت میں یہ عرض کرونگا کہ جن حضرات سے آپ نے یہ سنا تھا کہ میرا مضمون اودھ پنچ میں شائع ہوا ہے اُن سے آپ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ وہ حضرات آپکی خدمت میں صرف اسقدر حصہ اودھ پنچ کا لے آئیں جسمیں کہ اعتراضات کا جواب درج ہے۔ اور اگر زیادہ احتیاط منظور تھی تو آپ اس خاص حصہ کی نقل طلب کرا سکتے تھے القصہ حضرت شرر کا عذر ایسا عذر ہے جسکی معقولیت تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ اور میں کیا جسکی نظر سے یہ چند سطریں گذرینگی وہ یہی خیال کریگا کہ عذر تو بیجا ہے۔ حضرت شرر کا اصل منشا یہ ہے کہ (عام پبلک (آپ کے تحقیقی جواب) کے فیض سے محروم رہے۔

میرا دوسرا سوال حضرت شرر سے یہ ہے کہ اودھ پنچ کس لیئے بازاری اور کم حقیقت پرچہ ہو اور کب سے یہ ایسا (بے وقعت) ہو گیا کہ اسکی طرف خطاب کرنا خلاف شان ہے۔ ظاہر ہو کہ اخبار کی وقعت کا اندازہ اُسکے مضامین سے ہوتا ہے اودھ پنچ کو جیسے نامہ نگار ملے انکے کمال میں داغ لگانا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے۔ مرزا نسیم ظریف۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ احمد علی کسمنڈوی وغیرہ کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ اللہ اللہ کیسے ظریف و نکتہ سنج وسخن فہم وسخندان حضرات تھے ع ترس رہی ہیں یہ آنکھیں محال ہے دیدار۔

یہ جنت نصیب بزرگ اسی اودھ پنچ ہی کے مضمون نگار تھے جیسے حضرت شرر بازاری اور

لہ اودھ پنچ۔ ہم تو یہ ہرگز نہ کہینگے۔ غیر دینہ عنایت ہے محبت کی نظر بھی + پر دیکھتے جاتے ہیں کنکھیوں سے ادھر بھی ۱۲

رکم حقیقت، یہ پرچے کے نام سے یاد فرماتے ہیں یا اب بھی اودھ پنچ کے ستون اعظم احمد علی صاحب شوق و سید اکبر حسین صاحب۔ اکبر اور دوسرے باکمال حضرات زندہ ہیں جن کی ذات پر اُردو کے ادب کو فخر ہے۔ ان میں سے اکثر حضرات کی شہرت کا آفتاب اودھ پنچ ہی کے اُفق سے طلوع ہوا ہے اور اب تک اودھ پنچ کو اُن پر ناز ہے اور اُنھیں اودھ پنچ پر خود اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کے کمال کی نسبت میں کچھ عرض نہ کرونگا محض اسلئے کہ ع مبادا بار خاطر ہو کسی طبع گرامی کا آج کون اخبار یا رسالہ ہے جسکو ایسے باکمال نامہ نگار ملے ہوں کہ جن کا شمار ملک کے اعلے لکھنے والوں میں ہوا ہو اور جنکے زور قلم کے طفیل سے ایک نئی قسم کا لٹریچر پیدا ہو گیا ہو۔ میرے لکھنے کی ضرورت نہیں ہر سخن شناس اور منصف مزاج شخص جانتا ہے کہ اُردو زبان کبھی اودھ پنچ کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

اودھ پنچ کی وقعت کا اندازہ تو محض اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اسکا سکہ تقریبًا تیس برس سے اخباری دنیا میں جاری ہے حضرتِ شرر تو خود ایک کہنہ مشق اڈیٹر ہیں اور مختلف رنگ کے رسالے اور اخبار نکال چکے ہیں آپ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہ بغیر کسی اعلی جوہر کے کوئی پرچہ تیس برس تک نہیں قائم رہ سکتا جو اخبار یا رسالے بدلیاقت اڈیٹروں کے زیر اہتمام شائع ہوئے اور جن کی اشاعت میں محض ذاتی نفع کا خیال دامنگیر رہا وہ دو تین برس سے زیادہ نہ چل سکے اور آخر کار اُن پرچوں کے بدلے اُنکے اڈیٹروں کی زبان پر پبلک کی ناقدردانی کے شکوے جاری رہے۔ مگر یہ شکوے کوئی معنی نہیں رکھتے زمانہ ایک زبردست محک حق و باطل ہے یہ اسی شے کی مدد کرتا ہے جسمیں کوئی جوہر عالی موجود ہے اور اُس شے کو فنا کر دیتا ہے جو کہ ایسے جوہر سے خالی ہو اودھ پنچ میں اگر کوئی خاص جوہر نہوتا تو وہ اس عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا تھا اور جہاں تک میں خیال کر سکتا ہوں دو تین ماہ پیشتر تو حضرت شرر بھی اسکی وقعت کے قائل تھے دلگداز جب مکرر جاری ہوا تو اودھ پنچ کی خدمت میں تبادلہ کی غرض سے حاضر ہوتا رہا۔ حضرت شرر نے مہذب نکالا اس سے بھی اودھ پنچ سے تبادلہ ہوتا رہا اگر اودھ پنچ بازاری اور رکم حقیقت

پرچہ تھا تو کم سے کم مہذب سا سے اسکا نیا دلہ موزوں نہ تھا مہذب کے بند ہونے پر حضرت شرر نے اپردۂ عصمت نکالا پردۂ عصمت مرحوم) کو خدا بخشے اسکا میں بھی خریدار تھا اسمیں اودھ پنچ اکثر مخاطب کیا جاتا تھا اور تو اور ابھی تین ماہ کا عرصہ ہوا کہ جون ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں صفحہ ۱۵ پر اودھ پنچ مخاطب کیا گیا تھا خدا جانے دفعتہً یہ کیا بلا نازل ہوئی کہ اودھ پنچ ایسا بازاری اور کم حقیقت پرچہ ہو گیا کہ حضرت شرر اس مضمون کا پڑھنا خلاف شان سمجھتے ہیں جو کہ اس میں شائع ہوا ہو بیشک اگر اودھ پنچ سے اس عرصہ میں کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہوا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس نے ایک ہندو شاعر لکھنوی کی تائید اور حضرت شرر کی تردید میں پر زور مضامین لکھے ہیں اور اسکے قدیمی دوست احمد علی صاحب شوق نے بھی اس گناہ سے اپنا دامن آلودہ کیا ہے حضرت شرر کے نزدیک یہ گناہ اس قابل نہیں ہے کہ معاف کر دیا جائے۔ لیکن اسقدر اطمینان ضرور ہے کہ یہ لوگ قیامت میں ضرور بخشدیے جائینگے کیونکہ ع یہ اُسکے بندے ہیں جسکو کریم کہتے ہیں۔

ممکن ہے کہ حضرت شرر کہیں کہ جو مضامین انکے خلاف نکلے وہ (سخت تھے) اور ایسا ہونا ممکن ہے کیونکہ فطرت کا تقاضہ ہے کہ انسان کو اپنے خلاف موم بھی آہن معلوم ہوتا ہے مگر اس موقع پر چند امور غور طلب ہیں اولاً یہ کہ حالی و سرشار و داغ وغیرہ کے خلاف جو مضامین پنچ میں نکل چکے ہیں اُن سے زیادہ سخت یہ مضامین نہ تھے۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ آخر میں دو تین سال اُدھر جو مضامین جلوۂ داغ کی نسبت نکلے ہیں ان میں اکثر بد تہذیبی کا پہلو لئے ہوئے تھے اگر حضرت شرر کی طبع ادب آموز اُن مضامین کا بار اُٹھا سکی تو اب اپنے خلاف جو محققانہ و ظریفانہ مضامین نکل رہے ہیں اُنسے حضرت موصوف کیوں اسقدر ناخوش ہیں۔

حضرتِ شرر کو دیکھنا چاہیے کہ اُنھوں نے بھی عظیم الشان پیشوایان بنی نوع انسان کی طرح ایک نیا دعویٰ کیا ہے یعنی یہ کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے یہ بالکل نئی بات

لہ اودھ پنچ سے نجات اپنی ہے دیہاتیوں کے ہاتھ نہیں + بڑا کریم ہے جسکے گناہگار ہیں ہم + حضرت شرر کہیں گے کہ (ہاتھ) کے بعد (ہیں) ہونا لازمی ہے ۱۲

ہے۔ اس صورت میں اگر حضرت شرر کے معاصرین اُنکے مقولے پر ایمان لانیکے لیئے تیار نہیں ہیں تو تعجب نہیں۔ جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے لیکن جسطرح بقراط و منصور و دلیتھر وغیرہ نے کبھی اپنے مخالفین کو سخت و سست نہ کہا اسیطرح حضرت شرر کو بھی منشی سجاد حسین اور منشی احمد علی شوق کا قصور معاف کر دینا چاہیئے یہ دیکھتے ہیں کہ منشی امیر احمد مینائی نے گلزار نسیم سے شعر زبان و محاورے کی بحث میں سند کے طور پر پیش کیئے ہیں یہ بھی اسی روش پر چلتے ہیں اور گلزار نسیم کی زبان کو لکھنو کی مستند زبان تسلیم کرتے ہیں۔ یہ لوگ گمراہ ہیں مگر عتاب کے مستحق نہیں ہیں۔

نیز حضرت شرر سے میری یہ عرض ہے کہ انسان کو اپنے خلاف مضامین دیکھنے سے پرہیز نہ کرنا چاہیئے۔ انگلستان کے مشہور مقرر بریڈلا کا قول تھا کہ جب کوئی بحث درپیش ہو تو انسان کا یہ فرض ہے کہ ہمیشہ اُن مضامین کے دیکھنے کی کوشش کرے۔ جو کہ اسکے دلائل کی تردید میں شایع ہوتے ہوں محض اپنے موافق دلائل دیکھنے سے تحقیق کا مادہ نہیں بڑھتا اس اصول کو پیش نظر رکھ کر حضرت شرر کو اودھ پنچ سے اجتناب اچھا نہیں ہے جس قسم کے جوش سے حضرت شرر کام لے رہے ہیں۔ یہ جوش علمی مباحثوں کا لطف خاک میں ملا دیتا ہے۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ جادۂ اعتدال سے قدم نہ بڑھائے اگر حضرت شرر خود تھوڑی دیر کے لئے غور و فکر سے کام لیں تو آپ پر یہ روشن ہو جائیگا کہ اودھ پنچ کی وقعت اُن کلمات سے کم نہیں ہو سکتی جو کہ آپ نے اسکی شان میں استعمال کیے ہیں ہاں اس طعن و تشنیع کا یہ نتیجہ ضرور ہوگا کہ اودھ پنچ کے ظریفوں کے توسن طبع کو ایک اور تازیانہ ہوگا جب پیشتر حضرت شرر نے اڈیٹر پنچ کی شان میں ایک ناموزوں کلمہ استعمال کیا تھا تو آپ شاید یہ سمجھے ہونگے کہ یہ اسم اعظم اودھ پنچ کے مضامین کا طلسم توڑ دے گا مگر یہ جادو نہ چلا اور اسکا الٹا اثر یہ ہوا کہ اور گرمجوشی کے ساتھ حضرت شرر کے دلائل کی تردید میں ظریفانہ مضامین نکلنے لگے۔ اور اودھ پنچ کا ہمیشہ یہی رنگ رہا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادہ تیغ از دویدنہا کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

مجھ کو امید ہے کہ حضرتِ شرر آیندہ سے نقادانہ متانت سے درگذر نہ کریں گے اور اس عارضی جوش کو دباتے رہیں گے۔ جو کہ اپنے خلاف مضامین دیکھنے سے ہر انسان کے دل میں پیدا ہوا کرتا ہے۔ تلخ گفتاری کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا فارسی کا اُستاد کہہ گیا ہے ؎

دہن خویش بدشنام میالا صائب ... ایں زرِ قلب بہ ہر کس کہ دہی باز دہد

آخر میں میں حضرتِ شرر کی خدمت میں بصد ادب عرض پرداز ہوں کہ اگر حضرت موصوف مجھے اودھ پنچ میں لکھنے سے اسوجہ سے روکتے ہیں کہ وہ ایک بازاری اور کم حقیقت پرچہ ہے، تو میں خانہ ساز[1] اور باحقیقت پرچہ کہاں تلاش کروں حضرت شرر نے تو کسی ممتاز پرچہ کا نام نہیں لکھا ظاہر ہے کہ اگر اودھ پنچ بازاری پرچہ اور کم حقیقت ہے اور اس قابل نہیں کہ کوئی مرد شریف اسکی طرف مخاطب ہو تو جو اخبار یا رسالے اسکے تبادلے میں آتے ہیں یا اُسے مخاطب کرتے ہیں یا اسکے مضامین نقل کرتے ہیں اور اسکے صفحات کو زریں صفحات کے لقب سے مزین کرتے ہیں۔ وہ بھی اسی کے ایسے ہیں اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ کوئی ایسا ممتاز رسالہ یا اخبار نہیں ہو کہ جو اودھ پنچ کے تبادلہ میں نہ آتا ہو یا جو اودھ پنچ کا نام ادب کے ساتھ نہ لیتا ہو۔ پھر میں لکھوں تو کس پرچہ میں لکھوں بیشک حضرت شرر کے تینوں پرچے ایوان ادب کے تین کنگرے ہیں اور چند روز سے اودھ پنچ کے تبادلہ میں نہیں آتے مگر ان پرچوں کی حالت کچھ اور ہے اور ان تک میرے مضامین کی رسائی دشوار ہے۔

العرفان آسمانی مسائل کی ہوائیں اڑتا ہے۔ گلزار نسیم کی بحث عالم میں ہے۔ العرفان کو اس سے کیا بحث؟ اتحاد ایک تمدنی اور اخلاقی رسالہ ہے۔ یہ ان جھگڑوں میں کاہے کو پڑنے لگا۔ یہ اور بات ہے کہ دو چار سطریں تفنن طبع کے طور پر اس بحث کے متعلق اسمیں لکھدی جایا کریں۔ اب رہا دلگداز یہ بیشک ایسی بحث کے لئے موزوں ہے اور اخباری دنیا کی عام تہذیب بھی یہی ہے کہ جس پرچہ میں کوئی بحث چھیڑی جائے تو اسکے اڈیٹر کا یہ فرض ہے

[1] اودھ پنچ۔ خانہ ساز نہیں خانگی کہیئے اودھ پنچ بازاری پرچہ ہے۔ اور دلگداز اور اتحاد وغیرہ خانگی ہیں ۱۲

کہ اس بحث کے متعلق اپنے خلاف و موافق تمام مضامین شایع کرے۔ لیکن حضرت شرر نے اس عام اصول کی پابندی سے درگذر کر کے یہ اعلان شایع کر دیا ہے کہ اعتراضات شائع کرنے کے بعد گلزار نسیم کے بارے میں کچھ لکھنا دلگداز کی شان و وضع کے خلاف ہے (چنانچہ میرے اردوئے معلی والے مضمون کے جواب میں جو مضمون حضرت شرر نے تحریر فرمایا ہے وہ بھی دلگداز میں نہیں چھپا ہے۔ بلکہ اردوئے معلی میں بھیجا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت شرر کسی خاص مصلحت کے سوائے اعتراضات کے دلگداز میں گلزار نسیم کے متعلق کسی دوسری قسم کی بحث شایع نہیں کرنا چاہتے چنانچہ آپکو خود جو کچھ لکھنا ہوتا ہے وہ آپ اتحاد میں لکھتے ہیں جسکو قدرتی طور پر ان علمی جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے پس دلگداز کا در بھی میرے لیے بند ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ کسی آیندہ موقع پر حضرت شرر اُس (باوقعت) پرچے کا نام تبلا دینگے جسکو مخاطب کرنا آپ خلاف شان نہ تصور فرماتے ہونگے اور اگر حضرت موصوف نے یہ تکلیف گوارا نہ فرمائی تب بھی میرا کچھ ہرج نہ ہوگا کیونکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ میں نے آج تک حضرت شرر کے اعتراضات کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت کچھ اس غرض سے لکھا ہے کہ ناواقفان سخن دھوکا کھانے سے محفوظ رہیں۔

میرا منشا یہ ہرگز نہ تھا کہ میں حضرت شرر کو قائل کروں کیونکہ روز بروز حضرت شرر کے انداز تحریر سے یہ آئینہ ہوا جاتا ہے کہ آپ گلزار نسیم پر تحقیق و تنقید کی نگاہ سے اعتراضات نہیں کرتے ہیں بلکہ آپ کا مطلب کچھ اور ہے ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

مگر حضرت شرر اطمینان رکھیں کہ جہاں تک میری ذات سے تعلق ہے۔ میرے قلم سے ایک فقرہ بھی ایسا نہ نکلے گا جس سے کسی بندۂ خدا کی توہین مقصود ہو ؎

ادب آموز ہے ہر ایک ذرہ اپنے وادی کا ۔ نہیں ممکن کہ گرد اُڑ کر پڑے رہرو کے دامن پر

اپنا اصول تو یہ ہے کہ ؎

محبت سے بنا لیتے ہیں اپنا دوست دشمن کو ۔ جھکاتی ہے ہماری عاجزی سرکش کی گردن کو

چک بست لکھنوی[لہ]

نوٹ ۔ جن صاحب نے میرے پہلے مضمون کا ذکر خیر حضرت شرر سے کر دیا تھا مہربانی کر کے وہی صاحب اس مضمون کی خبر بھی حضرت موصوف تک پہونچا دیں ۔ چک بست لکھنوی ۔

لہ اودھ پنچ ۔ پنڈت صاحب آپ نے جو لکھا ہے بہت صحیح ہے ۔ لیکن ایک بات آپ نہیں سمجھے اودھ پنچ خاص طور سے اسلئے کم حقیقت اور بازاری پرچہ ہو گیا کہ آپ کا مضمون لاجواب تھا اگر مضمون کا جواب ممکن ہوتا تو یہ لکھدیا جاتا کہ ہمنے آنکھیں بند کر کے اودھ پنچ ایک صاحب سے پڑھوالیا اور پھر جواب لکھا اس موقع پر ہمیں ایک نقل یاد آئی ۔ سوامی دیانند سے ایک پنڈت نے اس بنا پر مناظرہ کرنے سے انکار کیا کہ سوامی جی ملکش تھے اور وہ ملکش کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا تھا سوامی جی نے کہا کہ اچھا ایک پردہ ڈالدیا جائے تم میری صورت نہ دیکھو مگر مجھ سے بحث کرو مگر وہ اس پر بھی راضی نہوا ۔ ہم بھی حضرت شرر سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ پردہ کے پیچھے بیٹھکر اودھ پنچ کسی سے پڑھوالیا کیجئے ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ حضرت شرر پردے کے خلاف ہیں ۱۲

از اودھ پنچ مطبوعہ ۱۱۔ مئی ۱۹۰۵ء

نسیم کی رنگین بیانی اور حضرتِ شرر کی شرر فشانی

(از منشی سجاد حسین صاحب)

اللہ ہے نگہباں اعلیٰ کی آبرو کا   منہ پر پڑا اسی کے جس نے فلک پہ تھوکا

گلزارِ نسیم کا ایک نیا اڈیشن پنڈت برج نرائن صاحب چک بست نے از سرِ نو ترتیب دیکر شائع کیا ہے۔ اور شروع میں ایک بسیط دیباچہ بھی لکھا ہے جسمیں نسیم کے حالات زندگی لکھے ہیں اور نسیم کی شاعری پر بحث کی ہے پنڈت ترلوکی ناتھ صاحب کول کشمیری محلہ لکھنؤ سے بقیمت ۸؍ مل سکتی ہے۔

گلزارِ نسیم کے آجکل سیکڑوں نسخے شائع ہوتے ہیں مگر سب میں کچھ نہ کچھ کاتب کی اصلاح ضرور ہوتی ہے۔ حضرت چک بست کو ایک ایسا نسخہ دستیاب ہوا جو نسیم کی تصحیح سے شایع ہوا تھا لہذا عقل سلیم کا اشارہ یہ ہے کہ یہ نسخہ ضرور مستند نسخہ ہوگا ہم نے صرف اشارہ کا لفظ اس لیے لکھا کہ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ بازاری پریس نے مثنوی کو بگاڑا نہیں بلکہ بنایا اب ممکن نہ تھا کہ گلزارِ نسیم کا نیا اڈیشن نکلے اور کوئی گل نہ کھلے۔ اجی کھلے اور پھر کھلے چنانچہ مارچ اور اپریل کے دلگداز میں مولانا عبد الحلیم صاحب شرر سابق اڈیٹر پردہ عصمت و اڈیٹر حال دلگداز و اتحاد نے گلزار نسیم پر کچھ گلفشانی کی ہو اور کچھ کیا معنی پندرہ صفحہ رنگین کئے ہیں۔ مولانا چونکہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد کرانے کی دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں لہذا گلزار نسیم کا نہایت توجہ کے ساتھ ریویو کیا گیا تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ مولانا مسلمان ہیں ایک

ہندو شاعر کی تصنیف کو نظر انداز کر کے ایسا کب اور کیونکر ہو سکتا تھا عرفی کہہ گیا ہے ؎

چناں با نیک و بد عرفی بسر کن تا پس مردن
مسلمانت بزمزم شوید و ہندو بسوزاند

مگر مولانا کی نظر ایسی دقیق واقع ہوئی ہے کہ جو نکتے تنقید گلزار نسیم میں لکھے گئے ہیں وہ معمولی سمجھ کے آدمی کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ قریب الفہم نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً مولانا کا ارشاد ہے کہ گلزار نسیم ایسی نظم ہے کہ اسکے پایہ کی نظمیں اُردو میں دو چار ہی ہونگی۔ مگر اسی مقام پر فرماتے ہیں کہ غلطیوں کے لحاظ سے اس سے بدتر نظم اُردو میں نہ ملیگی اور پھر فرماتے ہیں کہ اُردو شاعروں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جسکے کلام میں ایک غلطی نکل آتی ہے اُسکی تمام خوبیاں اس ایک لغزش پر قربان کر دیتے ہیں مگر گلزار نسیم کو باوجود اس قدر معائب کے کہ جنکی نظیر اُردو نظموں میں کم ملیگی اسقدر شہرت حاصل ہے یہ اجتماع ضدین واقعی سمجھ میں نہیں آتا یہ تو وہی ہے جیسے کہ صوفیوں اور ویدانتیوں کے مقولے ہیں کہ سب کچھ ہے اور کچھ نہیں دنیا ماتم سرا بھی ہے اور عشرت سرا بھی مگر اس سب کا ایک مطلب تو صاف ہو کہ گلزار نسیم کی نسبت جو مولانا کو سوجھی ہے وہ آجتک کسی کو نہیں سوجھی۔ ممکن ہے کہ مولانا کسی موقع پر اس اجتماع ضدین کی تشریح کر دیں اُسوقت اُسکے متعلق کچھ لکھا جائیگا بالفعل اس تمہید کو چھوڑ کر زیادہ قریب الفہم تنقید کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ کیا۔ یعنی مولانا کا پہلا اعتراض تو یہ ہے۔ کہ گلزار نسیم۔ نسیم کی تصنیف ہی نہیں حالانکہ اس موقع پر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اس اعتراض میں وہ جدت نہیں ہے جو تمہید مضمون میں تھی یہ اعتراض بے دلیل ہے اور لکھنؤ کے بھنگیڑ خانوں میں اسکا اکثر ذکر ہوا کرتا ہے مگر جسقدر جدت ہو سکتی ہے وہ مولانا نے اس اعتراض کی تائید میں صرف کر دی ہو یعنی پہلے تو مولانا فرماتے ہیں کہ گلزار نسیم اصل میں نسیم ہی کی تصنیف تھی۔ لیکن اصلاح کے وقت انتخاب واختصار کا آخری عمل و تصرف خواجہ آتش کے قلم سے ہوا اس دعوی کی تائید میں مولانا فرماتے ہیں کہ منشی اشرف علی صاحب اشرف کمنڈوی مرحوم نے خود مولانا موصوف سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ مولانا کے بزرگوں سے میر وزیر علی صبانے بھی

یہی کہا تھا علاوہ سلسلے اور تواتر کے شکست اور راویوں کے مجروح ہونیکے ہم اس موقع پر اس قدر کہیں گے کہ ہم سے ایک معتبر نائی کہتا تھا کہ یہ مثنوی اصل میں مصحفی کی کہی ہوئی تھی مصحفی نے یہ مثنوی آتش کو دیدی تھی کہ تم اپنے نام سے چھاپ دو مگر آتش نے خدا جانے کس وجہ سے یہ مثنوی اپنے نام سے شائع کرنی مناسب نہ سمجھی اُنھوں نے باری باری اپنے سب شاگردوں سے کہا کہ بھئی تم اپنے نام سے چھاپ دو بلکہ خلیل سے باصرار کہا کہ اسکا نام گلزار خلیل اچھا ہوگا مگر سب نے اس مثنوی کا لینا نامنظور کیا نسیم چونکہ ہندو تھے اُنھوں نے اس مثنوی کو اپنے نام سے چھپوانا قبول کرلیا یہ نائی (خدالیش بیامرزد) آتش کا خاص حجام تھا ایک دن مصروف اصلاح تھا کہ آتش نے کل واقعہ بیان کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ مصحفی نے یہ مثنوی اپنے ہمعصر میر حسن کی مثنوی کے جواب میں کہی تھی مگر چونکہ اسمیں اور اُسمیں باعتبار شاعری اور خوبی زبان کے کوئی نسبت نہ تھی لہذا امید نہ تھی کہ میر حسن کے مقابلہ میں کوئی اسکا نام لیگا لہذا اُنھوں نے یہ مثنوی آتش کو دیدی اور آتش نے اسی خیال سے اپنے شاگردوں کے حوالہ کرنا چاہی۔ خیر یہ تو ہمارے معتبر نائی کا بیان ہے مگر اسے کون مانتا ہے اور خصوصًا کشمیری پنڈت تو کبھی نہ مانیں گے۔ لہذا ہم تھوڑی دیر کے لئے مولانا شرر ہی کی تاریخی تحقیقات مانے لیتے ہیں کہ مثنوی اصل میں نسیم ہی کی تصنیف ہے لیکن آخری انتخاب واختصار کا عمل اور تصرف آتش کے قلم سے ہوا۔ مگر خرابی یہ ہے کہ آگے چلکر مولانا موصوف وہی اجتماع ضدین کا جدت آمیز اصول پیش نظر رکھکر فرماتے ہیں کہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ آتش نے خود اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو اور پھر اسمیں متعدد لغزشیں دیکھ کر اُسے بجائے اپنے اسی کی طرف (یعنی نسیم کی طرف) منسوب کردیا ہو اب ہم ناظرین پر چھوڑتے ہیں کہ مولانا کا جو بیان پسند آئے اُسکا اعتبار کرلیں ہاں ہم مولانا کی طبیعت داری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ کس سانی سے مولانا موصوف ایسے تاریخی واقعات پیدا کرلیتے ہیں جن کے لئے تاریخی شہادت ملنا ممکن نہیں مگر مولانا کی قوت خیال ایسی زبردست ہے کہ اُسکے سانچے میں کوئی عجیب وغریب واقعہ ڈھال لینا مشکل نہیں ناظرین کو یاد ہوگا کہ جب

مولانائے موصوف پردۂ عصمت نکالتے تھے تو آپنے تاریخی واقعہ ایجاد کیا تھا کہ ہندوستان میں پردہ کی رسم چین سے آئی اور پھر مسلمانوں نے پردہ کی رسم ہندوؤں سے سیکھی افسوس ہے کہ پردۂ عصمت اس دنیا سے جلدی اُٹھ گیا اور اس ایجاد تازہ کی خبر اہل یورپ تک نہ پہونچی ورنہ وہ لوگ مولانا کی جدّت طبع کی قرار واقعی داد دیتے مولانا نے وہ واقعہ ایجاد کیا تھا جسکی شہادت کسی ملک کی تاریخ سے نہیں ملتی تھی۔ مراد اس کہنے سے یہ ہے کہ جس جدّت پسند طبیعت سے ایسے ایسے واقعہ ڈھلکر نکلے اُسکے نزدیک اس امر کا ثابت کرنا کیا مشکل ہے کہ آتش نے تفنن طبع کے طور پر گلزار نسیم کہی اور نسیم کو دیدی خصوصًا تفنن طبع نے تو اس تاریخی ایجاد میں جان ڈالدی۔ خیر ہم اب اس عالمانہ بحث کو ختم کرتے ہیں کیونکہ اسمیں تاریخی تحقیقات وغیرہ کی سخت ضرورت ہے۔ اب ہم معمولی سمجھ کے آدمیوں کے لیے کچھ لکھتے ہیں۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ بقول حضرت چک بست کے آتش کے دیوان میں (یا مصحفی کے دیوان میں) ایسے شعر اس رنگ کے نہیں جو کہ گلزار نسیم کا رنگ خاص ہے اور نسیم کے دیوان میں بھی مثنوی کا رنگ ہے جس شخص کو کچھ بھی شاعری کی مس ہے وہ ہمارا انشا سمجھ جائیگا علاوہ بریں گلزار نسیم میں کئی ایسے خصوصیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سوائے ہندو (اور ہندو بھی کون کہ کشمیری پنڈت) کے یہ مثنوی کسی دوسری قوم والے کی ہو ہی نہیں سکتی ہے مثلاً ایک مصرعہ ہے ع شب کی پوشاک بدلی ساری)

اس مصرع میں پوشاک اور ساری میں تناسب لفظی ہے ساری کشمیری خاتونوں کی پوشاک ہے مسلمان شاعر کو یہ تناسب خیال ہی میں نہیں آسکتا تھا کیونکہ یہاں ساری مسلمان عورتوں کی پوشاک نہیں۔ شاعر وہی باتیں نظم کرسکتا ہے جو اسکے خیال میں رہتی ہیں اسیطرح اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے خصوصیات بہت ملجائیں گے۔ یہ داستان تو یہاں ختم ہوئی۔ اب دیکھیے کہ حضرت شرر کیا فرماتے ہیں۔ مسٹر چک بست نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ امانت کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجہ تک پہونچ گیا ہے" مولانا شرر کو یہ فقرہ بہت ناگوار

گذرا ہے چنانچہ فرماتے ہیں" کہ امانت کے یاں ایسے معیوب اشعار جنہیں تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہ قائم رہ سکا وہ دو فی صدی سے زیادہ نہ ملیں گے" اور پھر کہتے ہیں کہ تعجب نہیں کہ اتنے بھی نہ نکل سکیں" لیکن فوراً ہی پھر فرماتے ہیں کہ "سچ یہ ہے کہ امانت نے تناسب لفظی کی فکر میں اپنے تئیں بدنام بہت کیا اور اس صنعت کے پیچھے پڑ کے ٹھوکریں بہت کھائیں لیکن (دہی اجتماع ضدین) کا جدت آمیز اصول پیش نظر کرکے پھر ملیٹ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تناسب لفظی کی صنعت میں جو کامیابی امانت کو حاصل ہوئی وہ کسی اور شاعر کو حاصل نہیں ہوئی ہم میں اتنی جرأت نہیں کہ ہم مولانا کی اس ہمت کی تردید کر سکیں ہم محض چند اشعار امانت کے تمثیلاً ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں ؎

پریوں نے کیا جانوروں تک کو مسخر
چڑیا کھو کس مور کی انگیا نہیں ہے

جو حسن سبز کی تاثیر اک ذری ہو جائے
ترے ذو پٹہ کی گھاس ای صنم ہری ہو جائے

کرے خرام جو فرش چمن پہ شک قمر
تو چاندنی سے سوا کیک کو دری ہو جائے

شیریں سے کیا میں اپنے شکر لب کو دوں مثال
میٹھا برس ہے یار کو وہ کہنہ سال ہے

نفرت کا دل کی گلبدنوں سے یہ حال ہے
اپنے کبوتروں میں گلی خال خال ہے

لات دی میں نے ہنسی سے تو یہ اس بُت نے کہا
ایڑی چوٹی پہ ترے صدقے اتارے تلوے

تری جالی کی کرتی کے تصور میں یہ روتا ہوں
مبتصر دیکھ کر آنکھوں کو کہتے ہیں کہ جالا ہے

پیٹتے ہیں سر کو ہم سودے میں زلف یار کے
عشق میں دانتوں کے کیا روتے ہیں ڈاڑھیں مار کے

محرم میں ہوا تری انگیا سے باغ میں
صیاد ذبح ہو گیا چڑیا کے سامنے

اللہ رے فرق غسل کو اترا جو وہ صنم
جمنا ملا کسی کو نہ گنگا کے سامنے

وہ نازک منہ پھر سوجے میرے بوسوں کی جو شدت سے
کھی پٹیتی لب شیریں پہ بیٹھے کی مٹھائی کی

نرگس کا اشارہ ہے کہ جوشِ یرقاں ہے
گل پھول کے کہتا ہے کہ شدت سے ورم کی

سوتے بیچ سے الفت کا کروں سلسلہ پیدا
دھاگوں میں نہ وہ آئے تو ڈورا ئیے گلے

پتھر پڑیں اس ٹھنڈی لگاوٹ پر صنم کی بھیجے ہیں مجھے خط کے عوض قند کے اولے
اور یہ مصرع کہ ع بیروں میں بھی میرا نازک بدن ملتا نہیں۔ امانت کا نام قیامت تک
زندہ رکھے گا اگر تناسب لفظی میں کامیابی اسی کا نام ہے تو واقعی کسی اُردو شاعر کو ایسی کامیابی
نہ حاصل ہوئی ہوگی جو امانت کا حصّہ ہے۔

امانت کو کامیابی کا خلعت پہنانے کے بعد مولانا نے ریویو نویسی پر وعظ دیا ہے۔ کیا
اچھا ہوتا اگر اس کا ترجمہ یورپ کی کسی زبان میں ہو جاتا کہ اہل یورپ بھی مولانا کی اصول تنقید
سے مستفیض ہو سکتے۔

اسکے بعد مولانا نے گلزار نسیم کے خاص خاص اشعار پر اعتراض جڑے ہیں۔ اگرچہ ایک
سرسری نظر سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراضات مولانا ہی کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں لیکن
مولانا موصوف نے انکسار سے کام لیا ہے کہ یہ اعتراضات عام اساتذہ لکھنؤ کی جانب سے وارد
کیے ہیں ہمارے خیال میں اساتذہ لکھنؤ کی اس سے بڑھکر ذلت نہیں ہو سکتی کہ انکی جانب یہ اعتراضات
منسوب کیے جائیں جن سے فارسی محاوروں سے عموماً اور لکھنؤ کی زبان اور شاعری
سے خصوصاً عدم واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

چونکہ مولانا کے دل میں لکھنؤ کے لیئے درد محبت ہے اسلئے آپ نے اُردو شاعری کے سرپرست
کی حیثیت سے بہ بانگ دہل یہ اعلان شائع کیا ہے کہ اسوقت تک جو سارے ہندوستان کا خیال
ہے کہ گلزار نسیم کی زبان خاص لکھنؤ کی زبان ہے یہ محض غلط خیال ہے " گلزار نسیم میں اہل لکھنؤ کے
نزدیک صدہا غلطیاں ہیں اور اس مثنوی کی زبان لکھنؤ کی زبان نہیں ہے "

یہ تو سب صحیح مگر مولانا کے حافظہ کی کوتاہی نے عجب غضب ڈھایا مولانا کو یہ یاد نہیں رہا کہ وہ
شروع میں نہایت زور سے لکھ چکے ہیں کہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ آتش نے یہ مثنوی تفنن طبع
کے طور پر کہی ہو اور پھر نسیم کو دیدی ہو ہائے بیچارے آتش پر کیا ظلم ہوا جسکی زبان پر اہل لکھنؤ
ناز کریں اسکے مثنوی کے لئے دگو کہ اس نے تفنن طبع ہی کے طور پر کہی ہو) یہ اعلان شائع کیا جائے

کہ اسکی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں۔ اگر ہمارے معترض کا بیان صحیح ہے تب بھی آتش جس مثنوی میں (انتخاب اور تصرف) نہ مانیں اسمیں ایسی غلطیاں رہ جائیں جو مولانا شرر کو سوجھ جائیں۔

ع۔ عبرت کی ہے جا فاعتبروا یا اولی الابصار

آہا ہا وہی مولانا شرر کا اجتماع ضدین، کا جدت آمیز اصول یہاں بھی رنگ دکھا رہا ہے۔

اب وہ اعتراض ملاحظہ ہوں جو مولانا شرر نے باوجود پردہ کے خلاف ہونے کے اساتذہ لکھنؤ کی آڑ میں پیش کیے ہیں۔

عموماً اعتراضات ایسے ہیں کہ جس شخص نے سوائے گلزار نسیم کے کسی اور اردو شاعر کا کلام بھی پڑھا ہے وہ انکی تردید نہایت آسانی سے کر دیگا اُسکا ذکر کرنا فضول ہے کیونکہ اہل لکھنؤ تو اہل لکھنؤ دیہات والے بھی ان اعتراضات کو تسلیم نہ کریں گے۔ ہم اس موقع پر انھیں اعتراضات کا ذکر کرتے ہیں جو زبان کے متعلق ہیں اور جنکی نسبت دیہات یا بیرونجات کے رہنے والے دھوکا کھا سکتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ نسیم کا یہ مصرع کہ ع شادی کو کہا حیا اُٹھا کر۔ قابل اعتراض ہے کیوں صاحب یہ محض اسلیئے کہ حیا اُٹھا کر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپ کے نزدیک پردۂ حیا اُٹھا کر ہونا چاہیئے۔ سبحان اللہ کیا اعتراض ہے۔ حیا اُٹھانا۔ حیا اُڑا دینا۔ حیا اُٹھ جانا۔ یہ لکھنؤ کی فصاحت زبان ہے اور شعرائے اردو کے کلام میں اس محاورے کی متعدد مثالیں ملجائینگی برعکس اسکے دیہات وغیرہ میں ممکن ہے کہ "پردۂ حیا اُٹھا کر" مع اضافت بولتے ہوں لکھنؤ کا روزمرہ حیا اُٹھانا۔ شرم اُٹھانا عام محاورہ ہے۔ آمیر مینائی فرماتے ہیں ع

کچھ تری شرم نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں۔ مولانا کہیں گے کہ یوں ہونا چاہیئے تھا کہ۔ کچھ ترا پردۂ شرم نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں۔ ہماری رائے میں چونکہ مولانا پردے کے سخت خلاف ہیں لہذا ان کو موقع بے موقع پردہ ہی اُٹھانے کی فکر لاحق رہتی ہے نسیم کا مصرع ہے ع بیڑے چکنے پان کے مزیدار۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "چکنے" کے بدلے "چکنے

غیر فصیح ہی نہیں بلکہ غلط ہے۔

شعرائے دہلی ولکھنؤ تو برابر (چکھے) کی جگہ چکھے اور رکھے کی جگہ (رکھے) اسیطرح اور الفاظ اس زمانے میں جب مثنوی مذکور لکھی گئی نظم کرتے آئے ہیں خدا جانے مولانا کس زبان کو لکھنؤ کی زبان سمجھے ہوئے ہیں۔ خیر یہاں تک تو غنیمت تھا آگے چل کر مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ بیڑے کافی تھا۔ پان کے بیڑے محاورے میں اچھا نہیں۔ بیشک پان کے بیڑے آپ کے دیہاتی محاورے میں نہ اچھا ہو لکھنؤ میں صرف (بیڑے) دوسرے ہی معنی پیدا کرتا ہے نسیم کا مصرع ہے ع کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا) مولانا فرماتے ہیں کہ حمل کی جگہ حمل نظم کر دیا گیا ہے لہذا غلط نہیں بلکہ قطعاً غلط ہے بیشک جہاں تک لغت کا تعلق ہے ہم بھی کہیں گے کہ نسیم نے حمل غلط نظم کیا ہے لیکن لغت کا لفظ دیہات والوں کے لئے سند ہے نسیم نے (حمل) نظم کیا تو بہت ٹھیک نظم کیا کیونکہ نسیم کے زمانے میں بھی اور اب بھی اہل زبان شل بہت سی لفظوں کے حمل ہی بولتے ہیں دیکھئے جانصاحب فرماتے ہیں ؎ دائی یقین دل کو ہے گر جائیگا حمل + ننھا سا لڑکا خواب میں کل پیٹ مل گیا۔

زبان و محاورہ میں عموماً اس لفظ حمل کے لیے خصوصاً جانصاحب سے بڑھ کر کس کا کلام فصیح مانا جا سکتا ہے مولانا شرر کو پہلے زبان لکھنؤ حاصل کر لینی تھی۔

ع بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے نسیم کا مصرع ہے ع بجلی سے لہر سے تھا ہم آغوش مولانا فرماتے ہیں کہ لہر کی جگہ لہر اردو میں غلط ہے اگر زہر عشق مصنفہ نواب مرزا شوق لکھنوی اردو ہی زبان کی مثنوی ہے تو یہ اعتراض ہے۔ زہر عشق کا شعر ہے ؎

پھر لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی
تو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

نسیم کا ایک اور مصرع ہے ع تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی۔ مولانا فرماتے ہیں (جانی) کا لفظ سوا معشوق کے اور کسی کی شان میں اور وہ بھی خلوت کے سوا دیگر موقعوں پر استعمال کرنا بدتمیزی ہی نہیں بلکہ غلطی ہے۔ مگر روح افزا تاج الملوک سے پہلی ہی ملاقات میں

کہتی ہے کہ ع تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی۔ ہم مولانا سے صرف اسقدر پوچھتے ہیں کہ (بابا جانی) جو لکھنؤ کا عام محاورہ ہے اسکی وجہ کیا ہے کیا (معشوقہ) کو بابا بھی کہتے ہیں اور خلوت ہیں کہتے ہیں کہ جلوت ہیں۔ بہرحال لکھنؤ کی زبان تو یہی ہے دیہات کا حال آپ جانیں اور اگر روح افزا نے تاج الملوک کو محبت سے جانی کہا تو برا کیا کیا جو لفظ باپ کیلئے استعمال ہو وہ دوست یا مرئی کے لیے خاص موقع پر استعمال ہو سکتا ہے۔ دوسرا اعتراض اس سے بڑھکر ہے۔ مولانا نہایت طنز سے فرماتے ہیں کہ مصرع مذکور میں تجھ پاس کا لفظ بھی تیرے پاس کے بدلے کہاں کی زبان ہے۔ ہر طفل مکتب جسنے نسیم کے علاوہ کسی اُسکے ہمعصر کا کلام بھی پڑھا ہے اس اعتراض کا جواب دیسکتا ہے۔ تجھ پاس اُس وقت کا عام محاورہ تھا۔

اسکے علاوہ جو اور اعتراضات مولانا نے ایجاد کیئے ہیں وہ طرفہ معجون ہیں حضرت چکبست نے اپنے دیباچے میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ گلزار نسیم میں اکثر ایسے محاورے موجود ہیں جو اس وقت متروک ہیں حضرت موصوف نے دو ایک شعر تمثیلاً لکھ بھی دیے تھے علاوہ اسکے حضرت چکبست نے یہ بھی تحریر کر دیا تھا کہ اکثر مقامات پر نسیم سے تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نبھ نہیں سکا ہے اسکی بھی دو ایک مثالیں دیدی تھیں۔ مولانا شرر نے متروک محاوروں کو اعتراض کے پیرایہ میں پیش کیا ہے (تجھ پاس) پر اعتراض تو ملاحظہ ہو چکا علاوہ اسکے مثنوی میں اکثر اس قسم کے مصرعے ہیں (ع حیلہ کرکے چھپائی ایک جند) (اسکو چھپایا) یا (ع مردانہ لباس سے نکالی) (یعنی نکالا) یہ ترکیب اب متروک ہے نسیم کے وقت میں جائز تھی اس پر اعتراض کرنا سراسر کمی نظر کا ثبوت دینا ہے۔ یہ تو وہی ہے کہ جیسے کوئی کہے آتش کا مصرع۔ بیڑیاں منت کی بھی پہنی تو میں نے بھاریاں۔ غلط ہے۔ زبان کا رنگ ہر وقت اور ہر زمانے میں بدلا کرتا ہے متروک محاوروں کو غلط کہنا معترض کی کمی معلومات کا ثابت کرتا ہے اسکے بعد مولانا نے وہ پانچ سات شعر ڈیڑھ ہزار شعر کی مثنوی سے چنکر رکھ دیے ہیں جن میں نسیم سے تناسب لفظی لطافت کے ساتھ نہیں نبھ سکا ہے۔ مگر امانت کے کلام سے

یہ شعر بھی ایسے ہیں ایک شعر شتر گربہ کے عیب کا بھی لکھ دیا ہے۔ یہ اعتراض بالکل گرز شتر ہے بلکہ ہم کہیں گے کہ اس سے بڑھ کر کیا گرز شتر ہو سکتا ہے کہ حضرت شرر نسیم پر اعتراض کریں۔

آخری وار مولانا شرر کا غضب کا ہے یعنی مولانا موصوف نے حضرت چکبست کو اس بات کا ملزم ٹھہرایا ہے کہ انھوں نے جا بجا مثنوی میں تصرف بیجا کیا ہے اسکی مثالیں ملاحظہ ہوں مثلاً گلزار نسیم کا شعر ہے ؎

قسمت سے مفر ہے اب نہ ہامن   پتھر کے تلے دبا ہے دامن

اس نئے اڈیشن میں پہلا مصرع اس صورت پر ہے۔ قسمت سے مقر ہے اب نہ امن۔ اس موقع پر اگر حضرت چکبست کو احمق سا احمق معترض بھی ہو تو وہ اس تصرف بیجا کا ملزم نہ ٹھہراتا کہ آپ نے مفر کو مقر بنا دیا جسکو کچھ اردو چھپائی کا تجربہ ہے وہ جانتا ہے کہ کاتب مصرعے کے مصرعے بدل لیتے ہیں۔ لہذا ایک نقطہ بڑھانا یا گھٹا دینا کاتبونکی نہایت معمولی غلطی ہے مگر شرر صاحب نہایت بھولے پن کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خدا جانے کس مصلحت سے یہ لفظ (مفر) اصلاح دیکر (مقر) بنا دیا گیا۔ واقعی تنقید اسی کا نام اور ریویو نگار کا فرض یہی ہے۔ یا ایک مصرعہ ہے۔ قاصد نے جو رخ پری دکھایا یہ شامت اعمال سے اسطرح چھپ گیا ع قاصد نے رخ پری دکھایا۔ مولانا نے اس کاتب کی غلطی پر آدھا صفحہ رنگ ڈالا ہے اور آخر میں یہ فرمایا ہے کہ اس اصلاح میں بھی ناسمجھی سے مثنوی پر ظلم ہوا ہے۔

یائے معروف کے بدلے یائے مجہول اور یائے مجہول کے بدلے یائے معروف اکثر کاتب لکھ دیتے ہیں مولانا نے ان غلطیوں کا بھی خاکہ اڑایا ہے اور حضرت چکبست کو تصرف بیجا کا ملزم ٹھہرایا ہے اور طرہ یہ کہ حضرت چکبست نے تو صاف صاف لکھدیا ہے کہ یہ ایڈیشن اس ایڈیشن کے مطابق ہے جو نسیم کی زندگی میں مطبع حسینی میں شائع ہوا تھا مگر مولانا ممدوح نامی پریس کے زمانہ حال کے اڈیشن سے حضرت چکبست کے اڈیشن کا مقابلہ کرتے ہیں اور اعتراض جڑتے چلے جاتے ہیں ابتدا سے انتہا تک شرر صاحب کا یہ مضمون عجب گھبراہٹ کا ثبوت دیتا ہے خدا جانے مولانا نے کس کیفیت میں یہ مضمون لکھا

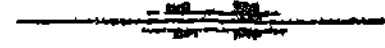
یہ تو اعتراضات کا رنگ اور پھر مولانا اپنا خلوص اور نیک نیتی ظاہر کرنے کے لئے جا بجا مضمون میں ایسے فقرے لکھتے ہیں کہ (میرا قصد اعتراض کرنا نہیں ہے) ہم ہمیشہ سے گلزار نسیم کے معرف ہیں ہاں ذرا یہ نشتر کر یہ بھی ملاحظہ ہو ایک ہی مضمون کے دو فقرے اور ان میں ایک میں پیرا اور دوسرے میں ہم) آخر میں ہم مولانا سے بصد عجز یہ پوچھتے ہیں کہ انھوں نے ایسے بے تکے اعتراض کیوں کئے اور اگر کئے بھی تھے تو یہ کیوں لکھا کہ یہ اعتراض اساتذہ لکھنؤ کی جانب سے وارد کئے جا رہے ہیں۔ یہ لکھنؤ کی بدنامی ہے۔ اساتذہ لکھنؤ تو درکنار جو شخص لکھنؤ کے زبان دانوں کی صحبت میں رہا ہے اور جسکو اُردو شاعری سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ ایسے اعتراض نہ کرتا اور نہ شرفا لکھنؤ جن کی زبان مستند ہے ان اعتراضات سے خوش ہونگے۔ ہاں جو دیہاتی لکھنؤ میں آکر بس گئے ہیں اور اپنے تئیں لکھنوی کہنے لگے ہیں وہ ان اعتراضات کو مانیں تو مانیں۔ الحاصل یہ تو ان اعتراضات کے جوابات تھے جو ہمارے دوست مولانا شرر صاحب اتحاد نے اپنے دوسرے رسالے دلگداز کے صفحات میں مثنوی گلزار نسیم پر تحریر فرمائے ہیں۔ مگر ہم کو ایک لٹریری رسالے کی اُس عامیانہ رائے پر تعجب ہے جو اس قصہ پر قائم کی گئی اور اس سرسری نظر پر اعتراض ہے جو اس قدیم قصہ پر (جو پہلے سنسکرت ہندی میں بھی تھا اور سرور نے شگوفۂ محبت نثر اُردو میں تحریر کیا ہے) ڈالی گئی اور نفس قصہ پر محققانہ عالمانہ مورخانہ رائے کا اظہار نہ کیا گیا اشخاص قصہ پر کوئی حکیمانہ نکتہ سنجی نہ کی گئی اور اس کاٹ چھانٹ پر مطلق توجہ نہیں کی گئی کہ کس قدر اور کیوں اور کیسی ترمیم اور اصلاح ساخت قصہ میں نسیم نے کی ہو اور اس ترمیم نے کیا اثر پیدا کیا ہے کیونکہ لٹریچر کا تقاضہ ہے کہ اگر کسی کو اسکی درستی اصلاح ترقی مدنظر ہو تو اسکے قصص اور افسانوں کی تحقیق و تدقیق اور تصحیح موجودہ تعلیم و رجحان کے مطابق بتاتا رہے۔ ورنہ زبان اور شاعری ہی کے لئے تعریف یا تقریظ کرنا ایک چھتنارے اور ہر لحظہ پھیلنے والے درخت کی ایک ہی شاخ کو تراش خراش کرکے رونق چمنستان بنانے کی سعی میں تضیع اوقات کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ غالباً اگر کوئی حیلہ اس فروگذاشت کا ہو سکتا ہے تو پنڈت برج نرائن صاحب کا دیباچہ ہے

جنہے شرر صاحب ناولسٹ کو اور طرف متوجہ نہیں ہونے دیا ورنہ اور کسی سے امید ہو یا نہ ہو
ان سے بدرجہ اولےٰ ہو سکتی ہے۔

رُباعی

جب غیظ سے گرما کے بگڑتے ہیں شرر — پھولوں کے عوض دہن سے جھڑتے ہیں شرر
لیکن یہ نسیم سے بگڑنا کیا خوب — سبحان اللہ ہوا سے لڑتے ہیں شرر

دبیر (از جنت)



از اودھ پنچ مطبوعہ ۳۰ اگست ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم پر قول فیصل

گلزار نسیم سے متعلق آج ہم جناب منشی احمد علی صاحب قبلہ شوق کی ایک تحریر شایع کرتے ہیں۔ اس اظہار کی ضرورت نہیں کہ ہم بتائیں کہ جناب موصوف پرانے تجربہ کار محقق واقف کار رموز و لطافت فن کہنہ مشق شاعر باکمال نثار بے مثال اور مغتنمات ملک سے ہیں آپکا کلام ملک میں ہمیشہ نظر قبول سے دیکھا گیا ہے۔ آپ کی قابلیت کے سکے مدت سے بیٹھے ہیں۔

منجملہ دیگر اصناف سخن کے آپنے خود بھی ایک مثنوی **ترانۂ شوق** بطرز نسیم تحریر فرمائی ہے جسکی خوبیونکا یہی اندازہ کافی ہے کہ ملک جان گیا کہ اگر اس رنگ میں کوئی اور مثنوی لکھی جاسکتی ہے تو یہی ہے مگر پھر بھی آپ جو کچھ اس بارے میں انصاف و تدین سے فرماتے ہیں وہ مضمون سے ظاہر ہے۔

ایک مدت تک آپ اخبار آزاد کے مالک اور اڈیٹر بڑی ناموری کے ساتھ رہ چکے ہیں اور اعلیٰ نثاروں میں نام کر چکے ہیں۔ آپ کی رائے اوروں کی طرح خدانخواستہ نہ تعصب مذہبی کی عفونت سے گندہ ہے اور نہ صرف نثر کے تخلص کیطرح بودی اور دکھادے کی ابلہ فریبی ہے۔ بلکہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ اُن بزرگوار کی منصفانہ بے لوث رائے ہے جو ایک ہی فن میں نسیم سے دوش بدوش مسابقت کے میدان میں قدم زنی کر چکے ہیں۔

پس اب ان لوگوں کی بیہودہ سرائی پر جو ایسے منصب اور قابلیت سے خلقی محروم ہیں اور جن کو سوا بڑھیوں کی طرح قصے کہانیاں سناتے اور بازاریوں کی طرح گالیاں دینے اور بے دلیل دعادی پیش کرنے کے اور کچھ نہیں آتا انسے بجز نفرین اور تبسم اور تحقیر اور کیا سلوک کیا جاوے مضمون یہ ہے

از اودھ پنچ مطبوعہ ۳ اگست ۱۹۰۵ء جلد ۲۹ نمبر ۳۱

گلزار نسیم اور مرحوم نسیم

(از احمد علی صاحب شوق)

مائی ڈیر اودھ پنچ - گلزار نسیم پر نکتہ چینیوں سے مرحوم نسیم کی روح بہت کشمکش میں ڈالی گئی جانبین سے یہ بحث بہت طوالت کو پہونچی - اگر نسیم یا آتش زندہ ہوتے تو فیصلہ ممکن تھا اور اب اگر اس بات کا فیصلہ مد نظر ہے کہ یہ مثنوی نسیم کی نہیں ہے تو نسیم اور آتش کی زندگی واپس لانے کے واسطے خواجہ خضر علیہ السلام کی تلاش کیجائے بشرطیکہ وہ زندہ اور آبحیات کہیں موجود ہو یہ کام حضرت نکتہ چین کو کرنا چاہئے میں تو یہی کہونگا کہ یہ مثنوی نسیم مرحوم کی ہے - اسکے خلاف صرف قصوں اور کہانیوں سے کوئی دلیل اس بات پر نہیں قائم ہو سکتی کہ یہ مثنوی کسی اور کی ہے اگر گلزار نسیم حضرت نسیم کی نہیں ہے تو گلستاں شیخ سعدی کی نہیں ہے اور خمسہ نظامی کا نہیں ہے اسکے لئے بھی حضرت نسیم کی جانب سے چند قصے تصنیف ہو سکتے ہیں۔

نسیم مرحوم لکھنؤ کے رہنے والے تھے اہل زبان تھے جب باہر والے لکھنؤ میں رہ کر زباندان ہو سکتے ہیں تو وہ شخص جسنے لکھنؤ میں پیدا ہو کر یہیں آنکھیں کھولی ہوں یہیں زبان کھولی ہو. یہیں عمر بھر رہا ہو- اسکا فصیح البیان ہونا کیا تعجب کی بات ہے بعض لوگوں نے اسی بحث میں ترانۂ شوق کی جانب اشارہ کرکے میری جانب یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ میں نے گلزار نسیم کا جواب کہا ہے - حاشا میں نے جواب نہیں کہا ہے - ہاں اسی بحر میں ایک مثنوی کہی ہے جس بحر میں گلزار نسیم ہے اور یہ کوئی بات نہیں مثنوی کہنے کیواسطے آخر یہاں نہیں بحروں میں سے کوئی نہ کوئی بحر اختیار کرتا جو مثنوی

اسکے واسطے مختص ہیں پھر میں نے یہی بحر پسند کی تو کیا قصور کیا۔ ڈیر تیج میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ گلزار نسیم کی خوبیوں کو میرا ہی دل جانتا ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ نسیم مرحوم نے جس فصاحت کے ساتھ گلزار نسیم کو نظم فرمایا ہے میں اُسکو نہیں پہونچ سکا۔ میں نے اپنی قوت شاعرانہ ایک حد تک (ترانۂ شوق) میں صرف کی اور اس قدر صحیح ہے کہ ترانۂ شوق کی تصنیف کے وقت گلزار نسیم میری نگاہوں کے سامنے تھی حاشا اس غرض سے نہیں کہ میں اُسکا جواب کہوں بلکہ اس غرض سے کہ بحر ایک ہی ہے مضامین لڑ نہ جائیں۔ لیکن نسیم کی فصاحت بیانی نے میری یہ حالت کی کہ جابجا دانتوں پسینا آگیا اور پھر بھی میں کامیابی کی حد تک نہ پہونچ سکا مثلاً نسیم مرحوم نے فرمایا ہے ؎

چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں   کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں

ترانۂ شوق میں بھی یہ رنگ ایک مقام پر آگیا ہے اور میں نے اس جگہ بہت شعر نکالے مگر نسیم مرحوم کے اس شعر کی لطافت اور فصاحت اور تناسب الفاظ کو میرا کوئی شعر نہیں پہونچ سکا میں نسیم مرحوم کی روح کو (گلزار نسیم) کی داد کہاں تک دوں جس رنگ میں یہ مثنوی ہے اپنی مثال آپ ہی ہے اور سچ یہ ہے کہ حضرت آتش مغفور کا یہ رنگ ہی نہیں اگر وہ مثنوی فرماتے بھی تو شاید گلزار نسیم کی سی نہ ہوتی۔

ایک عنایت فرما نے عجیب مذاق کیا یعنی گلزار نسیم پر ریویو کرتے ہوئے (ترانۂ شوق) کے دو شعر لکھ دیے کہ نسیم کے ہیں وہ ریویو نقلاً میں نے ایک جدید پرچہ میں دیکھا تھا ایک شعر تو یہ تھا ؎ ایک شب کہ تھی خال روے ندامت + یا مردم دیدۂ قیامت + دوسرا شعر اس وقت مجھے یاد نہیں رہا۔ میں اپنے عنایت فرما کا شکر گزار تو ضرور ہوں کہ انھوں نے نسیم مرحوم کی نظم کے پلے پر میری نظم کو تولا لیکن میں تعجب کرتا ہوں کہ نسیم مرحوم کی سلاست کا رنگ اُن کی طبیعت سے شاید اُتر گیا تھا اور یہ کہ گلزار نسیم کو سامنے رکھ کر وہ ریویو فرماتے تو یہ سہو نہ ہوتا اور نہ ہونا بہتر تھا۔

نسیم مرحوم سے اگر کہیں چوک ہوئی ہو تو اس سے اُنکی فصاحت اور شاعری پر حرف نہیں آسکتا

مثل میں کہ جو احباب حضرت نسیم مرحوم کی خوبیوں کو اور اُن کی خوش کلامی کو مانتے ہوئے ہیں اُن کو
ایسی حرف گیریوں اور نکتہ چینیوں پر ترجیح و تاب کی ضرورت ہی کیا ہے نسیم مرحوم انسان تھے
اور انسان سے سہو اور خطا ممکن ہے حضرت حافظ شیرازی نے تا بہ کجا کی بے کو مفتوح فرمایا ہو
تو اس سے اُن کا پایۂ سخن نہیں گرا دیا گیا شعرا انسان تھے فرشتہ نہ تھے مسلمان تو قائل ہیں کہ
ہاروت اور ماروت دو فرشتے انسان کے لباس میں نازل ہوئے تو اُن سے بھی خطائے
انسانی ہو گئی - پھر نسیم مرحوم تو فطرتی انسان تھے - بہر حال انسانی سہو و خطا سے نہ نسیم مرحوم
مستثنیٰ ہو سکتے ہیں نہ میں نہ اور کوئی - مثل ہے کہ شہسوار ہی گرتا ہے اس سے میری
غرض یہ ہے کہ شاعر ہی سے خطا ممکن ہے نہ کہ اُس سے جو شعر ہی نہ کہے آپ شعرائے فارس کے
دیوانوں کو ملاحظہ فرمایئے کتنے شعرا ایسے ملیں گے جنھوں نے الف کے دھوکے میں عین کو
تقطیع سے گرا دیا ہے تو کیا اس سے اُنکی اُستادی اور فصاحت بیانی مٹ گئی - تو یہ البتہ ایسے قدر
ہم کہیں گے کہ دھوکا ہوا خطائے انسانی کی مثالیں میں پیش کرتا ہوں شاید میرے ان دوستوں کو
جو نسیم مرحوم پر نکتہ چینی فرما رہے ہیں ان مثالوں سے تسکین ہو جائے محتشم کاشی فرماتے ہیں ع
خندند بر من نو خطان طفلان مکتب خانہ ہم ۔ ہم مکتب خانہ ملاحظہ ہو - حکیم ہمدانی فرماتے ہیں ع
بہ کف مسودۂ زلف یار میخواہم - مسودہ تشدید واو ملاحظہ ہو شیخ سعدی فرماتے ہیں ع
زمین را از کمالیت شرف بر آسمانستے - کمالیت ملاحظہ ہو - نظیری نیشاپوری فرماتے
ہیں ع ظہور حسن تو امنیتی بہ دوران داد - امنیت ملاحظہ ہو - یہی نظیری فرماتے ہیں ع
کز عجائب ہائے دوران دیدہ را خاتم رسید - عجائب ہائے ملاحظہ ہو - خلاق المعانی کمال
اسمٰعیل اصفہانی فرماتے ہیں ع باد صبا بروخواند یا ایہا المزمل - یا ایہا المزمل - قرآن شریف کا
جملہ ہے اور بہ تشدید زا ہے - مگر حضرت اسمٰعیل اصفہانی بلا تشدید زا اس جملے کو اپنی نظم میں
لائے - اب میں پوچھتا ہوں کہ ان میں سے کس کو شعرا نے دائرۂ اُستادی سے خارج
فرما دیا - حاشا ایسا خیال بھی گناہ ہے - میں اس قسم کی مثالیں بے شمار پیش کر دوں جن کو

آپ سوا اسکے کہ سہو انسانی فرمائیں اور نہ کچھ فرما سکیں گے لیکن یہ چند الفاظ اسبات کے سمجھ لینے کے واسطے کافی ہیں کہ جب ایسے ایسے جلیل القدر باکمال اساتذہ سہو سے نہیں بچے تو بیچارہ نسیم مرحوم اور احمد علی شوق یا اور کوئی اگرچہ کے تو آخر انسان ہی ہے میری آخری عرض اپنے دوستوں سے اسقدر اور ہے کہ اگر نسیم مرحوم کی روح کو اب بھی فاتحہ معکوس سے ثواب پہونچایا جائے تو ان سب اساتذہ کی روحیں بھی ثواب کی محتاج ہیں۔

(راقم احمد علی شوق)

از اودھ پنچ مطبوعہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء نمبر ۳۲ جلد ۲۹

گلزارِ نسیم اور مرحوم نسیم

(از احمد علی صاحب شوق)

ڈیر پنچ ۔ میرا مضمون اسی سُرخی کے ساتھ جو میں نے اوپر لکھی ہے اودھ پنچ مطبوعہ ۳ اگست ۱۹۰۵ء میں چھپ کر شائع ہوا میں ڈرتا ہوں کہ میرے بعض دوست مجھ سے کشیدہ خاطر ہوں کہ میں نے ایسا مضمون جو مرحوم نسیم کی جانب جھکتا ہوا پلہ لئے ہوئے ہے کیوں لکھا ۔ میں اُن سے معافی چاہتا ہوں ۔ میں اُس مضمون میں جو کچھ لکھ گیا ہوں اُس سے ایک ذرہ معافی کی ضرورت بھی پاتا ہوں شاید سہو سے بجائے ترانۂ شوق کے میں نسیم کا شعر لکھ گیا ہوں میرے سامنے نہ اس وقت گلزار نسیم ہے نہ ترانۂ شوق دونوں مثنویوں کے اشعار اکثر میری زبان پر اور میرے دماغ میں ہیں (ترانۂ شوق کے اشعار اس سبب سے کہ میں خود اس کا مصنف ہوں اور گلزار نسیم کے اشعار اس سبب سے کہ وہ مجھے پسند ہے اور میں نے ترانۂ شوق کی تصنیف میں اُس کی تقلید کی ہے)

مجھے واقعی یاد نہیں ہے کہ اک شب کہ تھی الخ یہ شعر ترانۂ شوق کا ہے یا گلزار نسیم کا کسی نے ترانۂ شوق کے دو شعر ضرور لکھے تھے اخبار معمولی سا تھا میں اُن شعروں کو بھول گیا اور دھوکے سے یہ شعر لکھ دیا ۔

میں اپنے معزز دوست حضرت چک بست سے رشک کروں تو درست ہے ۔ غالباً

میرے معزز دوست بابو جوالاپرشاد صاحب برقؔ کو یہ بات یاد ہو کہ میں نے قیام لکھنؤ کے زمانے میں ایک بار قصد کیا تھا کہ میں مرحوم نسیمؔ کی لائف لکھوں اور اسکا ذکر بھی کیا تھا۔

مجھے زمانہ کی گردش نے لکھنؤ سے دور پھینک دیا اور حضرت چکبستؔ میرے دلکی تمنا کو اُڑا لے گئے۔ خیر تمنا تو نکل گئی گو میرے قلم سے نہیں حضرت چکبست کے قلم سے سہی۔

میں نے جھگڑے کی بحثوں میں یہ ذکر دیکھا کہ (گلزار نسیم) میں ترمیم کی گئی ہے یہ اعتراض یقیناً میرے اُن دوستوں کی جانب سے ہے جو گلزار نسیم کی خوبیوں کے خلاف مضامین تحریر فرما رہے ہیں میں نے اُنکا کوئی مضمون پورا پورا نہیں دیکھا لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کثرت اشاعت اور اختلاف مطابع نے گلزار نسیم کی اصلی حالت ہی کو بدل دیا اور وہ اغلاط کتابت سے بھر گئے اگر ارباب فراست نے قوت ممیزہ سے کام لیا اور اغلاط کتابت کی تصحیح کر دی تو اچھا کیا ایسی مداخلت تعریف کے قابل ہے نہ کہ حرف گیری کے قابل۔

جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک بڑے اُستاد کا دیوان چھپ رہا تھا دیوان میں ایک شعر تھا جس میں بجائے (طائر کے) جانور کا لفظ اُستاد نے کہا تھا یہ سہو کا ہو گیا تھا۔ ترتیب دیوان کے وقت میرے اُستاد مرحوم یعنی حضرت اسیرؔ صاحب دیوان کے بہت سے شاگرد موجود تھے سبھوں نے لفظ (جانور) کو کاٹ کر لفظ طائر بنا دیا آپ خیال فرمائیے کہ یہ نیک نفسی تھی یا نہیں۔

حضرت غالبؔ مرحوم کا دیوان فارسی جب منشی نولکشور مرحوم کے مطبع میں چھپنے کو آیا تب مولوی محمد ہادی علی اشکؔ مرحوم مصحح تھے اُنھوں نے حضرت غالبؔ کو تحریر فرمایا کہ آپ سے دھوکا ہو گیا ہے یعنی آپ فرما گئے ہیں ع (چونکہ لب ززمزمہ یا ابوالحسن)

یہ مصرعہ حضرت غالبؔ مرحوم کے ایک قصیدہ فارسی کا ہے دراصل حرف ندا کے ساتھ ابا الحسن فرمانا چاہیئے تھا۔ حضرت غالبؔ نے جواب تحریر فرمایا کہ میں نے کہا اسیطرح ہی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غلط لفظ اپنی غلط حالت کے ساتھ چھپ گیا اور اب بھی اُسی طرح دیوان میں

موجود ہے۔ لیکن ہندوستان میں کون کہہ سکتا ہے کہ اسوجہ نے حضرت غالب کو احاطۂ استادی سے باہر کردیا۔ اب میں کہتا ہوں کہ استاد نظامی جنکا خمسہ ہے اور جن کی مثنویوں کا لوہا آجتک ملک فارس مانے ہوئے ہے وہ لفظ (آزنی) کو بسکون را فرما گئے سکون جائز نہیں ہوا مگر اُستادی کے دائرے سے نہیں خارج کئے گئے۔

میں آپ کو اس انتخاب کی جانب متوجہ کرتا ہوں جو حضرت مصحفی مرحوم کے متعدد دیوانوں سے حضرتِ اسیر و امیر مرحومین نے فرمایا اور وہ چھپ گیا ہے۔ آپ اُس کو اور حضرتِ مصحفی کے اصلی دیوانوں کو ملاحظہ فرمائیے تو یہ عقدہ حل ہوجائے کہ دیوانوں کے اغلاط کتابت کی تصحیح کس حد تک انتخاب میں کی گئی ہے اب جو اعتراض گلزار نسیم کی تصحیح کے متعلق حضرت چکبست پر عائد کیا جائے وہی اعتراض اُن دونوں اُستادوں پر بھی عائد ہوگا جو انتخاب کے بانی تھے سوانح عمری کا لکھنے والا اسیجائے قلم کے تعصب کا نشتر لیکر نہ بیٹھے جہانتک نیک نفسی کام دے وہاں تک حملے کی ضرورت کیا ہے۔ حملہ اور پھر مردے پر تصحیح نہو سکے تو تاویل اور تاویل غیر ممکن ہو تو تسلیم۔ بہتر روش یہی ہے میرے معزز دوست جو گلزار نسیم کو نسیم مرحوم کی تصنیف نہیں قرار دیتے آخر اسکی وجہ کیا ہے۔ اُردو زبان جہاں رواج پائی ہوئی ہے۔ وہاں فطرتاً ہندو اور مسلمانوں میں مشترکہ ہے۔ ہندو اسکے مقلد نہیں ہیں بلکہ جس طرح مسلمانوں کو اس پر دعوی کا حق حاصل ہے اُسی طرح ہندوؤں کو بھی حاصل ہے اُردو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی جہاں کے رہنے والے ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔ فارسی جو خاص مسلمانوں کی زبان تھی اور ہنود جسکے مقلد تھے اس میں بھی تو ٹیک چند صاحب بہار عجم، رائے رایان انند رام مخلص۔ عوض رائے، عشرت چندر بھان برہمن، بھوبت رائے بنعیم نیز اور ارباب کمال نے کیسی کیسی بلند نامیاں حاصل کیں ہیں آخر کس کس کے کمال پر پردہ ڈالا جائیگا۔

اودھ پنچ کی جلدوں میں پنڈت ترہون ناتھ مرحوم کے مضامین موجود ہیں وہ ہندو ہی تو تھے اور کشمیری بھی ان کی پاکیزہ زبان سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مثنوی بہار اور اتھیلو ڈرامہ کے

ترجموں میں جو زبان بابو جوالا پرشاد صاحب برقؔ نے لکھی ہے وہ کیسی پاکیزہ ہے آخر وہ ہندو ہی تو ہیں یقیناً بہت سے مسلمانوں کی کتابوں سے ان کتابوں کی زبان لطیف ہے نسیم مرحوم اگر زندہ ہوتے تو وہ اہل زبان ہونیکا دعویٰ کر سکتے تھے اور انکا دعویٰ بھی صحیح تھا اسلئے کہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے پلے پسے جیسے

ڈیر پنچ میں کسی کی طرف کشی نہیں کرتا بلکہ میرا خیال صرف اسقدر ہے کہ نسیم کی لائف لکھکر اگر حضرت چکبست نے اردو کی شاعری اور زبان پر احسان کیا ہے تو اس کا شکرگزار ہونا مناسب ہے تاکہ حوصلے بڑھیں اور لائف سے مردوں کے نام زندہ ہوں۔ آخر میں اور حضرت شررؔ سب مرنے کو آئے ہیں اگر میں زندگی میں یہ خیال کروں کہ مرنے کے بعد مجھے گالیوں سے یاد کرینگے تو کس قدر میری روح کو اس زندگی ہی میں تکلیف ہو۔ اے حضرت جو شخص شعر کہتا ہے اسی کا دماغ اسی کا دل اسی کا کلیجا جانتا ہے فی نفسہ (حسن اور گلزار نسیم) یہ دونوں مثنویاں ایسی ہوئی ہیں جنکی خوبیوں تک کلام کو پہونچانا اگر ممتنع نہیں ہے تو اسقدر مشکل ضرور ہے کہ جسکا آسان ہونا ہی مشکل قرار دیا جائے (ترانہ شوق) کی تصنیف کے وقت جو خون جگر میں نے کھایا ہے اسکا یقین ارباب فہم کو خود ہی ہو سکتا ہے اور گو میری جانب سے مقابلہ نہیں تھا بلکہ تقلید تھی لیکن نسیم کی سلاست فصاحت نے حوصلے کو اسقدر پست کیا کہ اب ایک نئی مثنوی جو حسن کی بحر میں میں نے کہی ہے اسکو (حسن) کے رنگ ہی سے بچایا ہے اور بالکل علحدہ روش اختیار کی ہے۔ شاید قریب زمانے میں چھپ جائے روش کے بدلنے کی خاص وجہ یہی ہے کہ نسیم مرحوم کے رنگ کو اختیار کرکے میں پشیمان ہو چکا تھا۔

میں اسبات پر کچھ حرف نہیں رکھتا کہ نسیم کی لائف پر کیوں نکتہ چینی کی گئی اگر نکتہ چینی نہ ہوتی تو کتاب خاموشی کے لباس میں نامقبول رہتی۔ نکتہ چینی اسکے مقبول ہونے کی دلیل اور گویا حضرت مصنف کو مبارکباد ہے۔ البتہ اسقدر میں جانبین کے دوستوں سے عرض کرونگا کہ تحریر میں تعصب سے دور اور اخلاص سے ہم بغل رہیں تو لطف کی بات ہے اور عام دیکھنے والوں کو تحقیقی فائدہ بھی پہونچے۔

(راقم احمد علی شوقؔ)

از کشمیری درپن بابت ماہ اگست ۱۹۰۵ء جلد ۳ نمبر ۸

گلزار نسیم اور مرحوم نسیم

(از احمد علی شوق)

نائی ڈیراودھ پنچ گلزار نسیم پر نکتہ چینیوں سے مرحوم نسیم کی روح بہت کشمکش میں ڈالی گئی۔ جانبین سے یہ بحث بہت طوالت کو پہونچی اگر نسیم یا آتش زندہ ہوتے تو فیصلہ ممکن تھا اور اب اگر اس بات کا فیصلہ مدنظر ہے کہ یہ مثنوی نسیم کی نہیں ہے تو نسیم اور آتش کی زندگی کو واپس لانے کے لیئے خواجہ خضر علیہ السلام کی تلاش کیجائے۔ بشرطیکہ وہ زندہ اور آبحیات کہیں موجود ہو۔ یہ کام حضرت نکتہ چیں کو کرنا چاہیئے۔

میں تو یہی کہوں گا کہ یہ مثنوی نسیم مرحوم کی ہے اس کے خلاف صرف قصوں اور کہانیوں سے کوئی دلیل اس بات پر نہیں قائم ہو سکتی ہے کہ یہ مثنوی کسی اور کی ہے۔ اگر گلزار نسیم حضرت نسیم کی نہیں ہے تو گلستان شیخ سعدی کی نہیں ہے۔ اور خمسہ نظامی کا نہیں ہے اسکے لئے بھی حضرت نسیم کی جانب سے چند قصے تصنیف ہو سکتے ہیں۔

نسیم مرحوم لکھنؤ کے رہنے والے تھے اہل زبان تھے جب باہر والے لکھنؤ میں رہ کر زباں داں ہو سکتے ہیں تو وہ شخص جسنے لکھنؤ میں پیدا ہو کر یہیں آنکھیں کھولی ہوں یہیں زبان کھولی ہو یہیں عمر بھر رہا ہو اُسکا فصیح البیان ہونا کیا تعجب کی بات ہے بعض لوگوں نے

اسی بحث میں ترانۂ شوق کی جانب اشارہ کر کے میری جانب یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ میں نے گلزار نسیم کا جواب کہا ہے۔ حاشا میں نے جواب نہیں کہا ہے ہاں اُسی بحر میں ایک مثنوی کہی ہے جس بحر میں گلزار نسیم ہے اور یہ کوئی بات نہیں۔ مثنوی کہنے کیواسطے آخر میں انھیں بحروں میں سے کوئی بحر اختیار کرتا جو مثنوی کے واسطے مختص ہیں۔ پھر میں نے یہی بحر پسند کی تو کیا قصور کیا۔

ڈپٹی صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ گلزار نسیم کی خوبیوں کو میرا دل ہی جانتا ہے اور میں سچ کہتا ہوں کہ نسیم مرحوم نے جس فصاحت کے ساتھ گلزار نسیم کو نظم فرمایا ہے میں اسکو نہیں پہونچ سکا میں نے اپنی قوت شاعرانہ ایک حد تک (ترانۂ شوق) میں صرف کی اور اسقدر صحیح ہے کہ (ترانۂ شوق) کی تصنیف کے وقت گلزار نسیم میری نگاہ ہونکے سامنے تھی حاشا اس غرض سے نہیں کہ میں اسکا جواب کہوں بلکہ اس غرض سے کہ بحر ایک ہی ہے، مضامین لڑنہ جائیں لیکن نسیم کی فصاحت بیانی نے میری یہ حالت کی کہ جابجا دانتوں پسینہ آگیا اور پھر بھی میں کامیابی کی حد تک نہ پہونچ سکا۔ مثلاً نسیم مرحوم نے فرمایا ہے ؎

چھالے پڑیں گال اگر چھوے ہوں ۔۔۔ کالے ڈسیں بال اگر چھوے ہوں

ترانۂ شوق میں بھی یہ رنگ ایک مقام پر آگیا ہے اور میں نے اس جگہ بہت شعر نکالے مگر نسیم مرحوم کے اس شعر کی لطافت اور فصاحت اور تناسب الفاظ کو میرا کوئی شعر نہیں پہونچ سکا۔ میں نسیم مرحوم کی روح کو گلزار نسیم کی داد کہاں تک دوں جس رنگ میں یہ مثنوی ہے اپنی مثال آپ ہی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ حضرت آتش مغفور کا یہ رنگ ہی نہیں اگر وہ مثنوی فرماتے بھی تو شاید گلزار نسیم کی سی نہوتی۔

ایک عنایت فرمانے عجیب مذاق کیا یعنی گلزار نسیم پر ریویو کرتے ہوئے ترانۂ شوق کے دو شعر لکھدیے کہ نسیم کے ہیں وہ ریویو نقلاً میں نے ایک جدید پرچہ میں دیکھا تھا ایک شعر تو یہ تھا ؎

اک شب کہ تھی خیال روئے شامت ۔۔۔ یا مردم دیدۂ قیامت

دوسرا شعر اسوقت مجھے یاد نہیں رہا۔ میں اپنے عنایت فرما کا شکر گزار تو ضرور ہوں کہ انھوں نے نسیم مرحوم کی نظم کے پہلے پہیری نظم کو تولا لیکن میں تعجب کرتا ہوں کہ نسیم مرحوم کی سلاست کا رنگ انکی طبیعت سے شاید اتر گیا تھا اور یہ کہ گلزار نسیم کو سامنے رکھکر وہ ریویو فرماتے تو یہ سہو نہوتا اور نہونا بہتر تھا۔

نسیم مرحوم سے اگر کہیں چوک ہوئی ہو تو اس سے ان کی فصاحت اور شاعری پر حرف نہیں آسکتا مثل میرے جو احباب حضرت نسیم مرحوم کی خوبیوں کو اور انکی خوش کلامیونکو مانے ہوئے ہیں، ان کو ایسی حرف گیریوں اور نکتہ چینیوں پر پیچ و تاب کی ضرورت ہے نسیم مرحوم انسان تھے اور انسان سے سہو اور خطا ممکن ہے حضرت حافظ شیرازی نے زنا بکجا ای کی بے کو مفتوح فرمایا تو اس سے اُنکا یہ سخن نہیں گرا دیا گیا۔ شعرا انسان تھے فرشتہ نہ تھے مسلمان تو قائل ہیں کہ ہاروت و ماروت دو فرشتے انسان کے لباس میں نازل ہوئے تو اُن سے بھی خطائے انسانی ہوگئی پھر نسیم تو فطرتی انسان تھے۔ بہر حال انسانی سہو و خطا سے نسیم مرحوم مستثنیٰ ہو سکتے ہیں نہ میں نہ اور کوئی۔ مثل ہے کہ شہسوار ہی گرتا ہے اس سے میری غرض یہ ہے کہ شاعر ہی سے خطا ممکن ہے نہ کہ اُس سے جو شعر ہی نہ کہے۔ آپ شعرائے فارس کے دیوانوں کو ملاحظہ فرمائیے کتنے شعرا ایسے ملیں گے جنھوں نے الف کے دھوکے میں عین کو تقطیع سے گرا دیا ہے۔ تو کیا اس سے انکی اُستادی اور فصاحت بیانی مٹ گئی تو بہ! البتہ ہم اسقدر کہیں گے کہ دھوکا ہوا۔

خطائے انسانی کی مثالیں میں پیش کرتا ہوں شاید میرے ان دوستوں کو جو نسیم مرحوم پر نکتہ چینی فرما رہے ہیں۔ ان مثالوں سے تسکین ہو جائے محتشم کاشی فرماتے ہیں۔

خندند بر من نو خطان طفلان مکتب خانہ ہم، مکتب خانہ ملاحظہ ہو۔ کلیم ہمدانی فرماتے ہیں

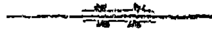
ع بکف مسوّدۂ زلف یار میخواہم۔ (مسوّدہ بہ تشدید دال ملاحظہ ہو) شیخ سعدی فرماتے ہیں

زمیں را از کمالیّت شرف بر آسمانستے، کمالیّت ملاحظہ ہو نظیری نیشاپوری فرماتے ہیں،

ع ظہور حسن تو منّتی بہ دوراں داد ۔ امنیت ملاحظہ ہو۔ نظیری فرماتے ہیں ع کز عجائب ہائے دوراں دیورا خاتم رسید۔ عجائب ہائے ملاحظہ ہو۔ خلاق المعانی کمال اسمٰعیل اصفہانی فرماتے ہیں ع باد صبا بروخواند یا ایہا المزمل ۔ یا ایہا المزمل ۔ قرآن پاک کا جملہ ہے اور بہ تشدید زا ہے مگر حضرت اسمٰعیل اصفہانی بلا تشدید زا اس جملہ کو اپنی نظم میں لائے ۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ ان میں کس شعر کو شعرا نے دائرہ اُستادی سے خارج فرما دیا۔ حاشا ایسا خیال بھی گناہ ہے ۔ میں اس قسم کی مثالیں بیشمار پیش کر دوں ۔ جن کو آپ سوا اس کے کہ سہو انسانی فرمائیں اور نہ کچھ فرما سکیں گے لیکن یہ چند الفاظ اس بات کے سمجھ لینے کے واسطے کافی ہیں کہ جب ایسے ایسے جلیل القدر باکمال اساتذہ سہو سے نہیں بچے تو بیچارہ نسیم مرحوم اور احمد علی شوق یا اور کوئی اگر چوکے تو آخر انسان ہی ہے ۔ میری آخری عرض اپنے دوستوں سے اسقدر اور ہے کہ اگر نسیم مرحوم کی روح کو اب بھی فاتحہ معکوس سے ثواب پہونچایا جائے تو ان سب اساتذہ کی روحیں بھی ثواب کی محتاج ہیں ۔

(راقم احمد علی شوق)



از رسالہ زمانہ نمبر ۳ جلد ۲ بابت ماہ جون ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم

(از نقاد لکھنوی)

اردو زبان کی یہ مرصع اور مقبول عام مثنوی ہماری شاعری کے اُس ترقی یافتہ دور کی یاد دلاتی ہے جو ہندوستان مدت العمر نہ پیدا کر سکے گا۔ مبارک تھا وہ زمانہ جسنے آتش سا جادو بیان اور انیس سا خدائے سخن پیدا کیا اور لکھنؤ کو دلی کی مطابعت سے آزاد کر کے چار دانگ عالم میں اُسکی زبان دانی کا سکہ بٹھا دیا یہی وہ زمانہ تھا جب اردو نے ایک سنجیدہ زبان کی حیثیت پیدا کی اُسپر سے اسکی ابتدائی خامیوں اور بے ترتیبوں کا بوجھ اُتار گیا اور وہ زبان کے خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئی۔ اسی زمانہ میں ایسے ایسے شیران بیشۂ سخن پیدا ہوئے جنکا نام لیتے ہوئے عام دلوں پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے یہی وہ زمانہ تھا جب ایسی ایسی تصانیف شائع ہوئیں جن پر باد حوادث کے زبردست جھونکے بھی کوئی اثر نہ کر سکے اور جو باوجود اختلاف مذاق و انقلاب خیالات بھی اب تک اپنی شہرت پر حرف نہیں آنے دیتیں۔

گلزار نسیم بھی اسی قبیل کی ایک نظم ہے جسے جتنی مرتبہ اور جتنے غور سے پڑھیے ایک نیا لطف ملتا ہے اور جب ذہن اُسکے دقائق اور نزاکت فن تک پہونچتا ہے تو ایک جداگانہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے درحقیقت اسمیں ایسے ایسے نازک استعارے اور بلند خیالی کے نمونے موجود ہیں جو اردو شاعری کی انتہائی ترقی کا پتہ دیتے ہیں۔ اور مجموعی حیثیت سے اسمیں اعلیٰ شاعری کے

اتنے ارکان جمع ہوگئے ہیں جو نہ صرف مثنویاں بلکہ اردو کی کل تصانیف میں کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں۔

قاعدہ ہے کہ جب کوئی فن ترقی کرتا ہے تو اُسمیں ایسی ایسی باریکیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو بادی النظر میں محسوس نہیں ہوتیں اور ناواقفان فن اُنکے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن جب ذہن اُن باریکیوں تک پہونچ جاتا ہے تو دوسری معمولی اور سادی چیزوں میں کوئی لطف نہیں ملتا خصوصًا شاعری کے لئے تو سخت ضرورت ہے کہ اُسکے دقائق تک پہونچنے اور لطف اُٹھانے کے لیئے خاص قابلیت پیدا کی جائے۔ شاید اسی خیال سے اعلےٰ درجے کے شعرا نے (سخن دلپذیر) کے ساتھ (دل سخن پذیر) کی بھی قید لگادی ہے گویا یہ دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں جنکے بغیر نہ شاعری ہوسکتی ہے نہ شاعری کی قدر۔

خود شاعری ایک ایسی چیز ہے جسے دنیا میں آج تک بہت تھوڑے لوگ سمجھے ہیں عام طور پر نظم اور شاعری دونوں ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں حالانکہ دونوں کے مفہوم اور نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے دلی جذبات اور خیالات مقررہ وزن و قافیہ میں نظم کر دینا اور چیز ہے اور (شاعری) اور چیز ایک مصور اپنی تصویر میں کوئی ایسی ادا دکھاتا ہے جسپر طبیعت بے اختیار لوٹ جاتی ہے اور یہی شاعری ہے۔ ایک گویا اپنے گانے میں کوئی ایسی تان لگا جاتا ہے کہ لوگ کلیجہ تھام لیتے ہیں۔ یہ بھی شاعری ہے۔ اسیطرح ہر اہل فن اور صنّاع اپنے فن میں شاعری کرتا ہے۔ گویا شاعری اُس ما بہ الامتیاز چیز کا نام ہے جو ایک ادائے خاص رکھتی ہے اور وہ ہر شخص کا حصہ نہیں اسلیئے شاعری کو وہبی کہا گیا ہے یہی سبب ہے کہ ایک شاعر کیسا ہی زبردست اُستاد کیوں نہو مگر وہ اُسوقت تک نہ مانا جائیگا۔ جبتک اُسکا کلام کوئی ادائے خاص نہ رکھتا ہو البتہ اُسکی موزونی طبع اور اُستادی میں کلام نہیں ؎

زباں تو غنچوں کے بھی منھ میں ہے یہ کیا لازم　　کہ جسکے منھ میں زباں ہو سخنوری جانے

جسطرح زمانۂ جاہلیت میں سادی شاعری مزا دیتی ہے اسیطرح زمانۂ تہذیب میں شایستہ کلام

لطف خاص رکھتا ہے۔ صرف اتنا فرق ضرور ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں سب کے سب ہم مذاق ہوتے ہیں اور زمانۂ تہذیب میں تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ غیر تعلیم یافتہ اشخاص کی بھی ایک تعداد باقی رہ جاتی ہے۔ اور اس لیئے ترقی یافتہ شاعری عام دلوں کو اسقدر نہیں لبھا سکتی جس قدر سادی شاعری اپنے زمانۂ جاہلیت میں۔ اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے (ملٹن) اور (کارلائل) کی معیار شاعری پر غور کرنا چاہیئے۔ دونوں نے اپنے اپنے خیال و مذاق کے مطابق رائے دی ہے اور دونوں کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ملٹن کے زمانے تک انگریزی شاعری اگرچہ تھوڑی بہت ترقی کر چکی تھی تاہم سوسائٹی پر سادگی خیال کا گہرا اثر باقی تھا اور اصول میں کوئی نزاکت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اسلیئے اسنے شاعری کے لیئے سادگی اور تاثیر ضروری جزو خیال کیئے ہیں۔ لیکن کارلائل جو متاخرین میں ایک بے نظیر نقادِ فن گذرا ہے اور جسکے وقت میں انگریزی شاعری معراجِ کمال پر پہونچ گئی تھی وہ جدت اختصار نازک خیالی اور جودتِ طبع کو اعلےٰ ارکانِ شاعری قرار دیتا ہے۔

دونوں کے معیار میں جو فرق ہے وہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اگلے وقت میں کسی سادے شعر میں بھی تاثیر کا پیدا ہو جانا غنیمت سمجھا جاتا تھا لیکن زمانۂ مابعد میں صرف تاثیر سے تسکین نہیں ہوتی تھی لہٰذا ان صناعیوں کی بھی ضرورت لاحق آئی جو عروسِ سخن کا زیور ہیں۔ اُن زیوروں سے جو دلکش ادائیں پیدا ہوتی ہیں اُنھیں کا نام تاثیر ہے۔ ورنہ طعام بے نمک سے لذت آشنا طبائع کی مہمانی نہیں ہو سکتی اور تہذیب کا یہ اقتضا ہے کہ اسمیں تکلفات کو ترقی ہو انھیں تکلفات کو عرفِ عام میں صنائع و بدائع شعری سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال اگر آخر الذکر معیار کو پیش نظر رکھ کے گلزارِ نسیم کو جانچا جائے تو اسمیں ترقی یافتہ شاعری کے کئی ارکان مکمل طور پر ملتے ہیں اختصار پر تو اس نظم کی بنیاد ہی قائم ہے اور یہ التزام اول سے آخر تک یکساں حالت میں پایا جاتا ہے۔ نازک خیالی اور جودتِ طبع کے نمونے بھی ہر جگہ

موجود ہیں اگر کمی ہے تو جدت خیال کی مگر اسکے لیے شاعر معذور ہے کیونکہ اصل قصہ کی تصنیف سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ وہ بہت قدیم تصنیف ہے جسے اُس نے صرف نظم کیا ہے تاہم تشبیہ و استعارہ کی صورت میں ایک حد تک جدت سے بھی کام لیا گیا ہے۔

زبان کو تاریخی حیثیت سے جانچنے کے لئے قدیم و جدید تصانیف کا موازنہ نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک ایک چیز کے دو نمونے سامنے نہوں اس میں اچھے بُرے کی تمیز محال ہے۔ اس خیال کو پیش نظر رکھ کے اگر اُردو کی قدیم مثنویوں پر نظر ڈالی جائے تو میر تقی میر کی چھوٹی چھوٹی مثنویوں اور میر تقی ہوس کی لیلی مجنوں سے میر حسن کی مثنوی البتہ عمدہ ہے۔ میر صاحب کے دو حرفی قصے زبان حال سے بتاتے ہیں کہ واقعات کی ترتیب میں جو وسعت او پیچیدگی و غرابت سے تعلق رکھتی ہے اُس وقت اُردو میں اُسکی گنجائش نہیں پیدا ہوئی تھی میاں ہوس نے اس میدان میں ایک قدم اور بڑھایا مگر قصے کی تصنیف میں نہیں بلکہ ترجمہ میں۔ میر حسن نے اپنا قصہ خود تصنیف کیا ہے اور گو اس میں بھی اصول فن کے مطابق کوئی جدت نہیں بلکہ سارا مسالہ فارسی سے مستعار لیا گیا ہے تاہم وہ اتنی بڑی مثنوی کا مصنف ضرور ہے جو اُس سے پہلے اُردو میں موجود نہ تھی گو اسوقت اور بھی کئی مثنویاں لکھی گئیں جنمیں بعض طبعزاد اور بعض مشہور قصوں کے نظم کرنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن چونکہ اُردو کے ابتدائی دور میں میر حسن کی مثنوی سحر البیان سے بہتر کوئی مثنوی موجود نہ تھی لہذا اُسکی شہرت نے سب کی روشنی ماند کردی۔

ان تصنیفات کے بعد گلزار نسیم کی نوبت آئی۔ مگر اسوقت زبان اپنی مقررہ حد سے بہت آگے بڑھ چکی تھی اور اسمیں لطف بندشوں نازک استعاروں اور جدید محاوروں سے ایک خاص خوبی پیدا ہوگئی تھی لہذا مصنف گلزار نسیم کو وہ باتیں قدرتی طور پر حاصل ہوگئیں جو متقدمین کے لئے ناممکن تھیں اب بجائے ٹوٹی پھوٹی زبان میں زور بلیغ دکھانے کے ہر قسم کے ادائے خیال کیلئے زبان کی شستگی اور سنجیدگی خود ہی زبردست قوت تھی یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی کے شائع ہوتے ہی تمام قدیم مثنویوں کے چراغ ایک دم سے گل ہوگئے۔

تاہم (سحر البیان) میں اس قدر قوت باقی تھی کہ وہ برسوں گلزارِ نسیم کا ناکام مقابلہ کرتی رہے اور اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مثنویوں کے مختصر موازنہ سے مذکورۂ بالا مسئلے پر کسی قدر روشنی ڈالی جائے اور وہ طلسم توڑ دیا جائے جو ہی تنقید کی راہ میں پورٹ آرتھر سے کم سدِ راہ نہیں۔

اُردو شاعری چونکہ ہمیشہ سے فارسی شاعری کی تابع رہی ہے لہٰذا اُس کی ہر تصنیف میں فارسی مذاق غالب رہا ہے۔ چنانچہ اُردو کے دورِ اوّلین سے لیکر آخر زمانے تک کے شعرا کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنی ہر تصنیف کو التزاماً حمد و نعت سے شروع کرتے رہے ہیں حتّٰی کہ مسلمان شعرا کے علاوہ ہندو شعرا بھی اسے اپنا فرضِ منصبی جانتے تھے اور ان باتوں کو شاعری کا جزوِ اعظم خیال کرتے تھے۔ اِس بیان کی تصدیق کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ابتدا سے انتہا تک کسی ہندو شاعر کا کلام حمد و نعت سے خالی نہیں مل سکتا اور اگر کہیں شاذ و نادر مل جائے تو اُسے مستثنیات میں داخل سمجھنا چاہیئے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم نے بھی اپنی مثنوی میں ان باتوں کا التزام کیا ہے اور میر حسن نے بھی لیکن جن مطالب کو نسیم نے صرف چار شعروں میں ادا کیا ہے۔ حسن نے اُن کے لئے ایک سو اشعار لکھے ہیں دونوں کے اشعار دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ قادر الکلامی جو ترقی یافتہ دور کا حصّہ ہے ابتدائی دور میں نہیں پیدا ہو سکتی۔ حسن بار بار ایک بات کو بیان کرتا ہے اور کوئی چول نہیں بیٹھتی وہ ایک تشبیہ دینے کے بعد ہی دوسری تشبیہ دیتا ہے اور جب کافی اطمینان نہیں ہوتا تو پھر وہی ناکام کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ نسیم نے جو بات ایک مرتبہ کہدی اُسے دُہرانے اور بار بار بیان کرنے کی ضرورت نہیں باقی رہی دیکھئے شروع کے چار شعروں میں حمد و نعت منقبت اور قلم کی عام تعریف کس شاعرانہ لطافت کیساتھ بیان کی گئی ہے نہ ایسے جامع و مانع خیالات شاعری کی انتہائی ترقی پر محمول ہیں۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر — حمدِ حق و مدحتِ پیمبرؐ
پانچ انگلیوں سے یہ حرف زن ہے — یعنے کہ مطیعِ پنجتنؑ ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی — کرتا ہے زباں کی پیش دستی

جب مثنوی کا نام (گلزارِ نسیم) ہے تو بہار یہ تمہید کی ضرورت تھی ساتھ ہی یہ مشکل بھی کہ تمہید و تحمید دونوں دست و گریباں ہوں۔ دیکھئے شاعر نے پہلے ہی شعر میں اس شوار گذار گھاٹی کو کیونکر طے کیا ہے۔ قلم ایک درخت کی شاخ ہے اور شاخ کے لئے شگوفہ ایک لازمی چیز ہے جس سے بہار کی طرف اشارہ ہوگیا۔ لیکن یہ مشکل باقی رہ گئی کہ شاخ قلم کے لئے ثمر کہاں سے آئے۔ کیونکہ وہ ایک بے ثمر درخت کی شاخ ہے۔ یہیں پر شاعر اپنی خداداد طبیعت کا اعجاز دکھاتا ہے یعنی اس شاخ کے لیے ایسا ثمر (حمد باری) پیدا کیا گیا جو نزول بھی اور انمول بھی۔

دوسرے شعر میں قلم کی دو زبانوں سے دو کام لیئے گئے جو مناسبت کے لحاظ سے لاجواب ہیں۔ اگر ان دونوں زبانوں سے کوئی ایک کام لیا جاتا تو شعر کی جامعیت میں کسر رہجاتی اور اسلئے شاعر نے ایک جزو اعظم کو بیکار نہیں چھوڑا۔

تیسرا شعر قلم کی گرفت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ اب لکھنے والے کی پانچ انگلیاں بھی اسکی معین ہیں۔ اس اعانت کی بدولت اس نے پانچ کام اور کیئے یعنی پنجتن کی اطاعت کتنی نازک تخیل ہے۔

چوتھا یا آخری شعر جو محض قلم کی تعریف میں ہے ایسا بلند مرتبہ شعر ہے جسکی نظیر دنیا اُردو میں آسانی سے نہیں مل سکتی۔ قلم پر سخن پرستی کا ختم ہونا اور زبان کی پیش دستی کرنا واقعۂ نفس الامری کے اسقدر مطابق ہے کہ نیچرل شاعری اس سے زیادہ کوئی خوبی نہیں پیدا کرسکتی ایک شاعر کا یہ کام نہیں کہ وہ عام اور معمولی باتوں کو نظم کرکے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوجائے بلکہ وہ ایسے خیالات پیدا کرتا ہے جو انسانی معلومات سے بالاتر ہوں اور اُسمیں کوئی مفید اضافہ کریں

یہ بات ہمیں نسیم نے بتائی کہ قلم زبان کا قائم مقام ہے اور جو کام تم زبان سے لیتے ہو وہ قلم سے اُس سے بہتر حالت میں لے سکتے ہو۔ بلکہ جہاں تمھاری آواز کی رسائی نہیں وہاں تمھاری تحریر تمھارے مقاصد کی وکیل بن سکتی ہے۔

چاروں شعروں میں سلسلۂ بیان۔ مدارج خیالات۔ تناسب لفظی۔ لطفِ زبان۔ جدتِ خیال۔ جودتِ طبع، اختصار اور نزاکت فن کے ساتھ صنائع بدائع شعری بھی اس حد تک موجود ہیں کہ اگر یہ خوبی آخر تک قائم رہتی تو گلزار نسیم ابھی دنیا کی چند منتخب نظموں میں شمار ہونے کے قابل تھی تاہم جس حد تک یہ اوصاف اس مثنوی میں موجود ہیں اُردو کی کسی دوسری نظم میں نہیں ملتے۔

میر حسن نے صرف حمد میں چالیس نعت میں ۷۰ منقبت میں ۲۵۔ اور تعریفِ سخن میں دس شعر کہے ہیں۔ یہ طول بیان ہی اُردو شاعری کی ابتدائی خامیوں کی کافی دلیل ہے ان اشعار کو بالاستیعاب پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت۔ جدت، نازک خیالی، اختصار اور جودتِ طبع شاعری کے چاروں اعلیٰ اوصاف سے معرا ہے یہاں تمام اشعار نقل کرنے کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ صرف تعریفِ سخن کے اشعار قلمبند کیے جاتے ہیں پرکھنے والے پرکھ لیں گے اور سمجھنے والے سمجھ جائیں گے کہ انمیں شاعری کا جوہر مفقود ہے جسکی ہم تصریح کر چکے ہیں۔

پلا مجھکو ساقی شرابِ سخن — کہ مفتوح ہو جس سے بابِ سخن
سخن کی مجھے فکر دن رات ہے — سخن ہی تو ہے اور کیا بات ہے
سخن کے طلبگار ہیں عقلمند — سخن سے ہے نام نکویاں بلند
سخن کی کریں قدر مردانِ کار — سخن نام اُن کا رکھے برقرار
سخن سے وہی شخص رکھتا ہے کام — جسے چاہیئے ساتھ نیکی کے نام
سخن سے سلف کی بھلائی رہی — زبانِ قلم سے بڑائی رہی

کہاں رستم و گیو افراسیاب — سخن سے رہی یادیہ نقل خواب
سخن کا صلہ یار دیتے رہے — جواہر سدا مول لیتے رہے
سخن کا سدا گرم بازار ہے — سخن سنج ان کا خریدار ہے
رہے جب تلک داستانِ سخن — الٰہی رہیں قدردانِ سخن

زبان کی ابتدائی خامیوں اور خیالات کی کمزوریوں سے قطع نظر کرکے اگر طرزِ بیان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حسن نے شیخ سعدی کی کریما کی نقل کی ہے۔ کریما میں بھی بعض بعض مقامات پر ان خشک نصائح میں شاعری کا اعلیٰ جوہر موجود ہے لیکن ان اشعار میں اسکا کہیں پتہ نہیں۔ وہی فرسودہ خیالات ہیں جو فارسی میں عام طور پر موجود تھے اور انہیں بھی سلسلۂ بیان اور مدارج خیالات کے ساتھ نظم کرنا دشوار ہوگیا۔

حمد و نعت وغیرہ کی طرح مناجات بھی اگلے زمانے میں ایک تصنیف کا ضروری جزو خیال کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ایشیائی شاعروں کے علاوہ قدیم شعرائے انگلستان میں ملٹن نے بھی نطق کی دیوی سے مدد مانگی ہے۔ حسن اور نسیم دونوں نے اسکا التزام کیا ہے۔ نسیم کی مناجات یوں شروع ہوتی ہے۔

یارب مرے خامہ کو زباں دے — منقار ہزار داستاں دے
افسانۂ گلِ بکاؤلی کا — افسوں ہو بہار عاشقی کا
ہرچند سنا گیا ہے اس کو — اردو کی زبان میں سخن گو
وہ نثر تھا داد نظم دوں میں — اس مے کو دو آتشہ کروں میں
ہرچند جو اگلے اہل فن تھے — سلطانِ قلمروِ سخن تھے
آگے ان کے فروغ پانا — سورج کو چراغ ہے دکھانا
پر بحرِ سخن سدا ہے باقی — دریا نہیں کار بند ساقی
طعنہ سے زبانِ نکتہ چیں روک — رکھ لے میری اہل خامہ میں نوک

خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر
نیرنگ نسیم باغ کشمیر

نقطے ہوں سپند خوش بیانی
جدول ہو حصار سحر خوانی

جو نقطہ لکھوں کہیں جو حرف آئے
مرکز کشش میری پہونچ جائے

ان اشعار میں مذکورۂ بالا اوصاف کے علاوہ محاورات کی پختگی اور بلاغت ترقی زبان اور بلندی خیال کی کافی شہادت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جب زبان ترقی کرتی ہے تو اس میں کونسی خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔

زور نظم بھی تدریجاً بڑھتا گیا ہے جو ایک مثنوی کے لیے ضروری چیز ہے لیکن سلسلۂ بیان میں ایک جگہ گتھی پڑ گئی ہے یعنی تیسرے اور پانچویں شعر میں تسلسل نہیں قائم رہ سکا اور دو جملہ معترضہ معلوم ہوتے ہیں۔ کم از کم ان دونوں شعروں کا پیرایۂ نظم مختلف ہونا چاہئے تھا۔

میر حسن کی مناجات حسب ذیل ہے۔

الٰہی بحق رسولؐ امیں
بحق علیؓ و باصحابؓ دیں

بحق بتول و بآل رسولؐ
کروں عرض جو میں سو ہووے قبول

الٰہی میں بندہ گنہگار ہوں
گناہوں سے اپنے گرانبار ہوں

مجھے بخشیو میرے پروردگار
کہ تو ہے کریم اور آمرزگار

مری عرض ہے یہ کہ جبتک جیوں
شراب محبت کو تیری پیوں

سوا تیری الفت کے سب کچھ ہے ہیچ
یہی ہو نہو اور کچھ اپیچ پیچ

جو غم ہو تو ہو آل احمد کا غم
سوا اس الم کے نہو کچھ الم

رہے سب طرف سے مرے دلکو چین
بحق حسنؓ اور بحق حسینؓ

کسی سے نہ کرنی پڑے التجا
تو کر خود بخود میری حاجت روا

صحیح اور سالم سدا مجھ کو رکھ
خوشی سے ہمیشہ خدا مجھ کو رکھ

میری آل اولاد کو شاد رکھ
میرے دوستوں کو تو آباد رکھ

میں کھاتا ہوں جنکا نمک اے کریم — سدا اُن پہ کر رحم تو اے کریم
جیوں آبرو اور حرمت کے ساتھ — رہوں میں عزیزوں میں عزت کے ساتھ
بر آویں سبھی کے دین و دنیا کے کام — بحقِ محمدؐ علیہ السّلام

غرض کیا کہ اس مناجات خضوع و خشوع کے جذبات بہت زیادہ ہیں مگر اسے ایک مثنوی سے کیا تعلق ایسی دعا تو ہر مسلمان نماز پڑھنے کے بعد مانگ لیا کرتا ہے۔ مگر وہ سب سے کہتا نہیں پھرتا اگر پنڈت نسیم بھی اپنی مناجات میں ایشور پر ارتھنا لے بیٹھتے تو انپر بھی سخت اعتراض واقع ہوتا مگر انھوں نے جو کچھ دعا مانگی ہے وہ اپنی تصنیف کے متعلق۔ غیر متعلق ایک حرف بھی نہیں کہا علاوہ بریں نسیم کے کلام میں جو زور طبیعت اور محاسن شعری موجود ہیں حسن کے اشعار میں انکا شائبہ تک نہیں۔

ان تمہیدی مضامین کو چھوڑ کر نفس قصّہ پر غور کیا جائے تو حسن و نسیم دونوں کسی تعریف کے مستحق نہیں ہیں۔ مانا کہ میر حسن کا قصّہ طبعزاد ہے لیکن اس میں کوئی جدّت نہیں قدیم مثنویوں کے طرز پر دیو پری کے افسانے نظم کر دیے گئے ہیں جو فارسی اور بھاشا میں موجود تھے تاہم ایک شاعر اُن پرانی باتوں میں بھی ایک جدّت پیدا کر سکتا ہے مگر جدّت زمانۂ جاہلیت کا حصّہ نہیں۔ اس زمانے میں انسانی خیالات دوسروں کے تابع رہتے ہیں۔ چنانچہ حسن کے خیالات بھی شعرائے فارسی و بھاشا کے تابع رہے اُسے اپنے قصّہ کے لیے پلاٹ بھی کم ملا ہے۔ ناچار مثنوی کو اُن فضولیات سے بھر دیا ہے جو قصّے سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں مثلاً حمد و نعت منقبت اور ممدوح کی تعریف جسکے لیے قصیدہ ہی موزوں ہے۔ قصّے کی عام تعریف یہ ہے کہ اسمیں رنج و خوشی۔ راحت و مصیبت اور مختلف واقعات کے ساتھ انسانی زندگی کے نزدیک دکھائے جائیں اور عجائبات عالم کی دلکش تصویریں کھینچ کے انسانی معلومات میں اضافہ کی کوشش کی جائے۔ ورنہ دنیا وی شان و شوکت اور وہ معمولی باتیں سنتے سنتے زمانہ کے کان پک گئے ہیں کوئی لطف خاص نہیں رکھتیں۔ بہر نوع

قصے کے لئے غرابت ایک ضروری چیز ہے اور یہی وہ جوہر ہے جو ایک قصہ کو حسن قبول بخشتا ہے میر حسن کے قصے میں یہ جوہر عنقا کا حکم رکھتا ہے۔ نسیم کے قصے میں گو غرابت کا ایک معتد بہ حصہ موجود ہے مگر وہ اس قصے کا اصلی مصنف نہیں اس نے میر تقی ہوس وغیرہ کی طرح ایک مشہور قصے کو نظم کیا ہے اور جو کچھ کمال دکھایا ہے وہ صرف نظم میں۔ لہذا گلزار نسیم صرف باعتبار نظم جانچی جا سکتی ہے ورنہ اصل قصہ جو منجھی ہوئی زبانوں سے لیا گیا ہے۔ اسمیں کوئی جھول کیونکر رہ سکتا تھا۔

میر حسن نے اپنا قصہ اسطرح شروع کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے اولاد نہ ہوتی تھی آخر مایوس ہو کے تارک الدنیا ہونا چاہا اسے وزیروں نے تسلی دی کہ نجومیوں اور پنڈتوں کو بلاتے ہیں اس مقام پر بادشاہ اور وزرا کی گفتگو دائرۂ تہذیب اور داب سلطنت سے قطعًا خارج ہے۔ مثلاً وزرا بادشاہ اور اپنے ولی نعمت سے کہتے ہیں ؂

عجب کیا کہ ہووے تمھارے خلف　　کرو تم نہ اوقات اپنی تلف

اسی قسم کی بے تمیزانہ گفتگو کے بعد نجومی اور پنڈت بلائے گئے اور انھوں نے اپنے اپنے اصول کے مطابق بتایا کہ بادشاہ کے اولاد ہوگی اور وہ بہت آسانی سے ہوگی۔

اسی سال میں یہ تماشا سنو　　رہا حمل اک زوجۂ شاہ کو

نہیں معلوم اسمیں تماشے کی کونسی بات ہے اور یہ کون ایسا عجیب وغریب واقعہ تھا جسے شاعر نے اس شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے نجومیوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس مولود یا شاہزادہ کو بارھویں سال میں خطرہ ہے تاہم جس روز بارھواں سال ختم ہونے والا تھا اسی شب کو لوگ شاہزادے کیطرف سے اسقدر غافل ہو گئے کہ پری اُسے اڑا لیگئی۔

ایک دو حرفی قصہ ہے جسے میر حسن نے باغ کی تعریف سواری کے جلوس شادی کی دھوم دھام اور وصل و ہجر کے طولانی بیانات سے ایک مثنوی کی حیثیت دی ہے۔

رہیں نظم کی خصوصیات ان میں جہاں کہیں کوئی سماں دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں میر حسن کا قلم قدرتی طور پر زوردار ہو گیا ہے۔ وجہ یہ کہ مشاہدات کی تصویر کھینچنا اسقدر مشکل کام نہیں ہے جسقدر کسی مضمون کا طبیعت سے پیدا کرنا اور اُسے واقعات کے مطابق بنانا میر حسن کے وقت میں گودتی تباہ ہو چکی تھی تاہم اُسکی گذشتہ شان و شوکت کے افسانے بہت تازہ اور ہر شخص کی زبان پر تھے لیکن جہاں کہیں ذہانت اور طباعی دکھانے کی ضرورت لاحق آئی ہے وہاں میر حسن کو قدم قدم پر لغزش ہوئی ہے۔ ان لغزشوں کی بہت بڑی ذمہ دار تو زبان کی ابتدائی خامیاں ہیں تاہم شاعر کی طبعی کمزوری کو بھی کچھ نہ کچھ دخل ہے۔ کیونکہ اُردو اگرچہ اُسوقت ابتدائی حالت میں تھی تاہم مرزا سودا وغیرہ نے اُسے اتنی وسعت ضرور دیدی تھی کہ وہ ادائے مطلب کے لئے قاصر نہ تھی اور اُسمیں اتنی غلطیاں نہ تھیں جتنی (سحر البیان) میں موجود ہیں۔ دیکھئے میر حسن نے اپنے ہیرو بے نظیر کی تعریف میں کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں ؎

دیا تھا زبس حق نے ذہن رسا — کئی سال میں علم سب پڑھ لیا
معانی و منطق بیان و ادب — پڑھا اُسنے منقول معقول سب
خبردار حکمت کے مضمون سے — غرض جو پڑھا اُسنے (قانون) سے

علم حکمت میں شیخ بو علی سینا کا قانون بہت مشہور ہے۔ آخری مصرع میں یہی رعایت لفظی مدنظر رکھی گئی ہے ورنہ قانون سے پڑھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

لگا ہیئت و ہندسہ تا نجوم — زمین آسماں میں پڑی اسکی دھوم
کئیے علم ذوک زباں حرف حرف — اسی (نحو) سے عمر کی اُسنے (صرف)

اس آخری مصرع میں بھی اگرچہ (نحو) کی جگہ طرح۔ طرز۔ طور۔ تین فصیح الفاظ نظم ہو سکتے تھے لیکن (صرف) کی رعایت سے ایک غیر مانوس لفظ لانا ضروری سمجھا گیا۔

عطارد کو آنے لگی اُسکی ریس — ہوا (سادہ لوحی) میں وہ خوشنویس

ایک ایسے شاہزادے کو جو تھوڑی دیر پہلے حد کا ذہین و طباع ثابت کیا گیا ہے

محض خوشنویسی کی رعایت سے (سادہ لوح) (بیوقوف) کا خطاب دیدیا گیا رعایت لفظی کی اس سے زیادہ بدنما مثال شاید امانت کے یہاں بھی نہ مل سکے گی۔

ہوا جبکہ (نوخط) وہ شیریں رقم بڑھا کر لکھے سات سے نو قلم

(نوخط) سے سبزۂ آغاز مراد ہے مگر بے نظیر تو اپنی عمر کے بارھویں سال میں مفقود الخبر ہوگیا تھا اس سن میں سبزۂ آغاز ہوتا کجا۔ خدا رعایت لفظی کا بھلا کرے جس نے شاعر کو خواہ مخواہ غلط بیانی پر مجبور کیا ؎

(لیا ہاتھ) جب خامۂ مشکبار لکھا نسخ و ریحان و خطِ غبار

(لیا ہاتھ) یعنی ہاتھ میں لیا۔ یہ زبان کی ابتدائی خامیوں کا نمونہ ہے ؎

عروس الخطوط اور ثلث الرقاع خفی و جلی مثل خطِ شعاع

دوسرے مصرع میں نہایت پُر لطف تشبیہ ہے۔ افسوس کہ سحر البیان میں یہ تشبیہیں نادرات سے ہیں ؎

شکستہ لکھا اور تعلیق جب ہوئے دیکھ حیران اتالیق سب

میر حسن کے کلام میں اگر کوئی خوبی ہے تو یہی کہ اسمیں ہر فن کی اصطلاحیں بڑی فصاحت کے ساتھ ملتی ہیں اگرچہ شاعر کو انکا محل استعمال بہت کم معلوم ہے۔ چنانچہ پری نے جو طلسمی گھوڑا بے نظیر کو دیدیا تھا وہ ضرور ہے کہ لکڑی یا کسی دھات کا بنا ہوا ہوگا لیکن میر حسن نے اُسے ایک اصلی گھوڑا خیال کرکے حشری، کمری، منہ زور، کہنہ لنگ، شب کور وغیرہ سب اصطلاحیں صرف کر دیں ؎

کیا خطِ گلزار سے جب فراغ کیا صفحۂ قطعہ (گلزار باغ)

شاید (گلزار باغ) دہلی کا کوئی مشہور باغ ہوگا جسنے رعایت لفظی میں مدد دی ورنہ قاعدے کے مطابق تو دو ہم معنی الفاظ مل کے ایک بے معنی جملہ ہو جاتا ہے۔

کروں علم اسکا کہاں تک بیان کہ ہے مختصر خوب یہ داستاں

مگر یہ داستان لایعنی ابھی مختصر نہیں ہوئی۔ علوم کے بعد فنون کی باری آتی ہے۔ جنکے بغیر ایک طفل دوازدہ سالہ کی کمالیت میں کسر رہی جاتی تھی کیونکہ اسوقت کے علاوہ پھر اُسکے تمام عمر میں اُنکی تکمیل کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان علوم و فنون سے اُس نے اپنی تمام عمر میں کوئی کام بھی لیا یا نہیں اسکا جواب مثنوی کی طرف سے منفی کے سوا اثبات میں نہیں مل سکتا پھر اس فضول بکواس سے کیا نتیجہ۔

کمان کے جو درپے ہوا بے نظیر ۔۔۔ دلیا کھینچ) چلّہ میں سب فنِّ تیر

کسی فن کا کھینچ لینا ایک نہایت عجیب بات ہے۔ اس ترقی یافتہ دوربین میں بھی اس مطلب کے لئے کوئی مشین نہیں ایجاد ہوئی لیکن کمان کی رعایت سے کھینچنے کی ضرورت تھی۔ کمان نہ کھینچی فن تیر کھینچ لیا اور وہ بھی چلّہ (چالیس دن) میں کیونکہ کمان کیلئے چلّہ بھی لازمی چیز ہے۔

صفائی میں (سوفار پیکاں کیا) ۔۔۔ گیا جبکہ تو وہ یہ طوفاں کیا

(سوفار پیکاں کیا) نہیں معلوم کیا معمّہ ہے۔

رکھا چھوٹتے ہی جو لکڑی پہ من ۔۔۔ کیا اپنے قبضہ میں سب اسکا فن،

ایک جگہ فن کھینچ لیا گیا دوسری جگہ قبضہ میں کیا گیا۔ مگر وہاں تو کمان کی رعایت سے کچھ تک بھی ملتا تھا یہاں اتنی بات بھی نہیں یعنی لکڑی میں قبضہ ہی نہیں ہوتا تو رعایت کیسی پھکیتی کی ایک مشہور اصطلاح (چھوٹ) ہے میر حسن نے (چھوٹتے ہی) سے یہی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

ہوئیں دست و بازو کی سرسائیاں ۔۔۔ اُڑائی گئیں ہاتھ میں گھائیاں

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ میر حسن کو اصطلاحیں نظم کرنے میں خاص کمال حاصل ہے عام اس سے کہ وہ کسی فن کی کیوں نہوں اور اگرچہ ایک شاعر کے اوصاف اُس میں موجود نہ تھے تاہم وہ ایک ہمہ داں شخص ضرور تھا۔

رکھا موسیقی پر جو کچھ کچھ خیال ۔۔۔ سکے قید سب اُسنے ہاتھوں میں تال

گو شاعر کا مطلب یہ ہے کہ فن موسیقی میں کمال حاصل کر لیا مگر صرف تالونکو قید کر لینے سے کمال نہیں حاصل ہو سکتا۔ کیونکہ تال۔ سم موسیقی کے بہت معمولی اور ابتدائی مدارج ہیں۔

طبیعت گئی کچھ جو تصویر پر ۔۔۔ رکھے رنگ سب اُسکے مدِ نظر

پہلے شعر کی طرح اسمیں بھی ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ یعنی فن مصوری میں صرف رنگ کی شناخت ہو سکی اور کچھ نہیں۔ کئی دن میں سیکھا یہ (کسب تفنگ) کہ حیراں ہوئے دیکھ اہل فرنگ، (کسب) کے معنے خود سیکھنے اور حاصل کرنے کے ہیں پھر ا کسب تفنگ سیکھا ا کیا معنی رکھتا ہے۔ ہم نے اس خیال سے کہ شاید بازاری مطبعوں کی بے پروائی سے کسی بامعنی لفظ کی جگہ (کسب) کا لفظ چھپ گیا ہو گا ۱۲۴۷ھ ہجری کی ایک قلمی مثنوی بھی دستیاب کی مگر افسوس کہ اسمیں بھی یہ مصرع اسی طور پر درج ہے۔

مندرجۂ بالا اشعار کو بالاستیعاب پڑھنے سے شاعر کی مبالغہ پسندی اور رعایتِ لفظی کی ناکام کوشش کے ساتھ زبان کی ابتدائی خامیوں پر نہایت صاف روشنی پڑتی ہو مبالغہ کی تو یہ حد ہے کہ جو شاہزادہ بارہ برس کی عمر تک نہایت احتیاط کے ساتھ محلونمیں بند رہا وہ باوجود اس زودعمری اور دیگر موانع دنیا کے ہر علم و فن میں یگانۂ آفاق یا سچ مچ بے نظیر ہو گیا مگر یہ علوم و فنون تمام عمر میں کبھی اسکے کام نہیں آئے رعایت لفظی میں جو کمزوریاں ہیں وہ محتاج تصریح نہیں۔ زبان کی خامیاں نہ صرف اسی سبجکٹ میں بلکہ مثنوی کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ نمونتہً چند اشعار درج ذیل کیئے جاتے ہیں۔

کھڑے سرو کی طرح چینی کے جھاڑ ۔۔۔ کہے تو کہ "خوشبوئیوں" کے پہاڑ

اول تو چینی کے جھاڑوں میں خوشبو کہاں دوسرے قاعدے کے مطابق خوشبو کی جمع "خوشبوئیں" ہو گی نہ کہ "خوشبوئیوں"۔

کہیں چاہ نبع کہیں حوض و نہر ۔۔۔ ہر اک جا پہ "آبِ لطافت" کی نہر

لطافت اسم ہے نہ کہ صفت پس آب لطیف کو آبِ لطافت کہنا قطعاً غلط ہے۔

کنیزان مہ رو کی (ہر طرف) ریل   چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل

اگر (طرف) کی جگہ (سمت) نظم کر دیا جاتا تو ایک لغوی غلطی دور ہو سکتی تھی مگر شاعر کو اس کا احساس ہی نہ ہوا۔ کیونکہ یہ لفظ اس مثنوی میں کئی جگہ اسی طرح نظم ہوا ہے۔

لئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں   چمن کو لگیں دیکھنے بھالنے

(مالنیں) اور (بھالنے) قافیہ نہیں ہو سکتا۔ ایک شاعر کے لیے اس سے زیادہ شرمناک غلطی ناممکن ہے۔

طویلے کے اُسکے جو ادنیٰ تھے خر   (اُنھیں) نعلبندی میں ملتا تھا زر

شاعر کا مطلب تو یہ ہے کہ اُسکے فیاض ممدوح کے طویلے میں ادنیٰ خروں کی نعلبندی میں بھی بجائے روپے پیسے کے اشرفیاں دیجاتی تھیں۔ اور زبان کی کمزوری نے یہ مطلب پیدا کر دیا کہ شاہی طویلے کے ادنیٰ خر نعلبندی کرتے تھے اور اشرفیاں پاتے تھے۔ کیونکہ "اُنھیں" کی ضمیر براہ راست (خر) کی طرف راجع ہے۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

(وحوشوں طیوروں) تلک بےخلل   پڑے آشیانوں سے اپنے نکل

وحشی اور طائر کی جمع (وحوش وطیور) ہے (وحوشوں طیوروں) میں جمع الجمع کی ترکیب واقع ہوئی ہے جو قطعاً غلط ہے۔

گلزار نسیم میں بھی چند غلطیاں واقع ہوئی ہیں مگر ان کی شان نزول اور ہے مثلاً معنوی یا ادبی غلطی کی مثال جو حسب ذیل ہے دونوں میں ایک طرح پر واقع ہوئی۔ نسیم نے آغاز قصہ میں زین الملوک کے بیٹوں کی اسطرح تعریف کی ہے۔

خالق نے دیے تھے چار فرزند   دانا عاقل ذکی خردمند

لف ونشر مرتب کے لحاظ سے تو شعر لاجواب ہے۔ لیکن یہ چاروں فرزند بجائے عاقل ہونے کے حد کے سادہ لوح تھے جیسا کہ قصے سے واضح ہے۔ میر حسن نے بھی ایک جگہ مبالغہ کے ایسے ہی جوش میں شاہزادۂ بے نظیر کو (شہ بے نظیر) کہدیا ہے، حالانکہ وہ اُسوقت تک

حالت شہزادگی میں تھا بلکہ ولیعہد بھی مقرر نہ ہوا تھا۔

گیا حوض میں جب شہ بے نظیر — پڑا آب میں عکس ماہِ منیر

اس شعر میں اس ادبی غلطی کے علاوہ جو اوپر بیان کی گئی ایک اور سخت غلطی ہے قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص حوض میں اترتا ہے تو اسکے پانی میں تموج پیدا ہوجاتا ہے اور عکس نہیں دکھائی دیتا۔ پھر یہ عکس کیونکر پڑ سکتا تھا۔ وہ کوئی طلسمی حوض بھی نہ تھا بلکہ معمولی حوض تھا جسمیں بے نظیر اپنی سالگرہ کی تقریب میں غسل کے لیئے اترا تھا۔

ایک اور سبجکٹ پر دونوں شاعروں نے مصوری کی ہے مگر حسن کے قلم کو اسمیں بھی لغزش ہوگئی میر حسن نے اسوقت کی تصویر جب پری بے نظیر کو اٹھا لیگئی ہے یوں کھینچی ہے۔ پری کے جذبات قابل ملاحظہ ہیں۔

قضارا ہوا اک پری کا گذر — پڑی شاہزادے پہ اسکی نظر
بھبوکا سا دیکھا جو اسکا بدن — جلا آتشِ عشق سے اسکا تن
ہوئی لاکھ جی سے وہ اسپر نثار — وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اتار
جو دیکھا تو عالم عجب ہے یہاں — منور ہے سارا زمیں آسماں
(ڈوپٹہ) کو اس مہ کے منھ سے اٹھا — دیا۔۔ سے ۔۔۔ اپنا ملا
اگرچہ ہوئی تھی زیادہ ہوس — ولیکن حیا نے کہا اسکو بس
ئے عشق میں پھر یہ سوجھی ترنگ — کہ لے چلیئے اسکا اٹھا کے پلنگ
محبت کی آئی جو دل میں ہوا — وہاں سے اسے لے اڑی دلربا
ہوا جب زمیں سے وہ شعلہ بلند — ہوا میں ستارا سا چمکا دو چند
شب مہ میں وہ یوں زمیں سے اٹھا — چلے تیر جس طرح سے جوش کھا
جلے رشک سے اسکے شمع و چراغ — کہ اس مہ کا پہونچا فلک پر دماغ
غرض لے گئی آن کی آن میں — اڑا کر وہ اس کو پرستان میں

سین کے پر زور ہونے میں شک نہیں زور قلم بھی معمول سے زیادہ ہے لیکن خیالات کی کمزوری اور مذاق کی پستی نے وہ لطف نہیں پیدا ہونے دیا جسکی ضرورت تھی شہزادے کے منھ پر ڈوپٹہ کسقدر معیوب معلوم ہوتا ہے پری کے جذبات کسقدر غیر مہذب ہیں؟ اسکی تشریح کی ضرورت نہیں البتہ تشبیہہ کے لحاظ سے وہ شعر لا جواب ہے جو جلی لکھوا دیا گیا ہے۔

نسیم نے بھی اس سین کی تصویر کھینچی ہے۔ اس میں تشبیہہ و استعارات کی بلندی محاورات کی برجستگی اور خیالات کی نزاکت کسی اور ہی عالم کا پتہ دیتی ہے تاہم پری کی ادا دکھاتے ہوئے نسیم کا مذاق بھی غیر مہذب ہو گیا ہے۔ خصوصاً دوسرا اور تیسرا شعر نہ ہوتا تو اس سین میں اور بھی حسن پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ ادائے خواب کی جیسی خوبصورت تصویر چوتھے شعر میں کھنچ گئی ہے وہ ان شعروں میں نہیں ہے۔

پردہ جو حجاب سا اُٹھایا — آرام میں اُس پری کو پایا
بند اُسکی وہ چشم نرگسی تھی — ...... کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی
سمٹی تھی جو ..... اس قمر کی — بر جوں پہ سے چاندنی سی سرکی
لپٹے تھے جو بال کروٹوں میں — بل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں
چاہا کہ بلا سے گلے لگائے — سوتے ہوئے فتنے کو جگائے
سوچا کہ یہ زلف کف میں لینی — ہے سانپ کے منھ میں انگلی دینی
یہ پھول انھیں اژدھوں کا ہے من — یہ کالے چراغ کے ہیں دشمن
گل چھین کے ہنسی ہوئے بالکل — خندہ نہو برق حاصل گل
پھر سمجھیں گے ہے جو زندگانی — کچھ نام کو دکھ چلو نشانی
انگشتری اپنی اس سے بدلی — مہر خط عاشقی سند لی

پری کے خفا ہونے کی حالت میر حسن نے بھی دکھائی اور نسیم لکھنوی نے بھی سنجیدگی اور پھوہڑپن میں جو فرق ہوتا ہے وہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا۔

حسن دہلوی

غضبناک بیٹھی تھی یہ تو اُدھر
کہ اتنے میں آیا وہ رشکِ قمر

اُسے دیکھ غصّے میں یہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

بلا سے وہ دیکھ اُسکے پیچھے پڑی
کہا سُن تو اے موذی و مدّعی

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا
کہ اُس (مالزادی) کو جوڑا دیا

الگ ہم سے یوں رہنا اور چھوٹنا
یہ اودھر ہی ادھر مزے لوٹنا

چھلکا دیا تھا نہ تونے یہی
بھلا اسکا بدلا نہ لوں تو سہی

پھر اپنے جیسے (راتوں) کو دلشاد تو
کرے گا (دونوں) کو بہت یاد تو

مزا (چاہ) کا دیکھ اپنی ذرا
جھکاتی ہوں کیسے (کنوئیں) رہ بھلا

نسیم لکھنوی

تو باغ ارم سے لے گیا گُل
تو مجھ سی پری کو دے گیا جُل

بیر رُخ ترے واسطے ہوئی ہیں
فرّخ ترے واسطے ہوئی ہیں

تجھ کو ترے باپ سے ملایا
مجھ کو یہ ملا کہ تجھ کو پایا

جو جو اسرار تھے نہانی
سب تجھ سے سُنے تری زبانی

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

چاہا تھا کروں سر تیرے پامال
کر شکر سمجھ کہ تھا خوش اقبال

کیا کہیئے کہ صورت اور کچھ تھی،
وقت اور ضرورت اور کچھ تھی

ابتک ہیں وہ خارجی کے جی ہیں
جلد آ کہ ہے مصلحت اسی میں

بکاولی کا یہ غصّہ ندو بدو میں ہے جیسا کہ میر حسن نے ماہرخ کے جذبات میں دکھایا ہے۔ نیچرل کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ چاہے کتنا ہی غصّہ کیوں نہو مگر معشوق کے سامنے سب فرو ہو جاتا ہے مگر حسن کے وقت میں ان نازک جذبات کا احساس محال تھا اور نسیم

کے زمانہ میں اسکی صلاحیت خود بخود پیدا ہوگئی تھی کیونکہ اسوقت پوری سوسائٹی عاشقانہ جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی اور اُسمیں نزاکتیں پیدا کر رہی تھی۔

نسیم نے اس سے زیادہ حیرت انگیز کام اس مقام پر کیا ہے جہاں تاج الملوک اور بکاؤلی میں رمز و کنایہ کی گفتگو ہوئی ہے۔

جب پردۂ صبح ہو گیا فاش — خنداں خنداں ہوا وہ بشاش
اس غنچہ دہن کا مسکرانا — بے رنگ بکاؤلی نے جانا
ہنستے ہنستے کہا ہنسی کیوں — ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں
بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا — آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر — دلسوزی کرے گا کوئی دلگیر
بولا وہ کہ رات کو اُفق میں — خورشید تھا آتش شفق میں
بولی وہ کہ پھر ساں شب و روز — عالم میں رہو گے رونق افروز
بولا وہ کہ اک مقام ہو تھا — گلزار خلیل روبرو تھا
بولی وہ بشر ہو تم دلاور — سرسبز ہو قوم آتشی پر
بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں — شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں
بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں — جو ناچ نچاؤں ناچتی ہوں
بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا — بخشا مہ انجمن نے ہالا
ہالہ مہ انجمن کا کیا تھا — وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا
گھبرائی پری کہیں یہ کیا ہے — بولا وہ کہ ہار نولکھا ہے
کاندھے پہ تھا جسکے رات ڈالا — پہچانتی ہو وہ طبلے والا

رمز و کنایہ میں اشارات کی پختگی کے ساتھ خیالات میں برجستگی اور طرز بیان میں شوخی بھی لازمی ہے ساتھ ہی یہ باتیں طرفین کی گفتگو میں مساوی ہونا چاہئیں کیونکہ عاشق و معشوق

قریب قریب ہم مذاق اور یکساں ذہین ہوتے ہیں مندرجۂ بالا اشعار میں ان باتوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ایک پر دوسرے کی ذہانت فوق نہ لے جائے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو دُنیائی اُردو میں اب تک نایاب ہیں۔ نسیم نے ان قیود کے ساتھ ہر شعر میں تشبیہہ و استعارہ اور محاورات کی روح پھونک کے اور بھی محوِ حیرت کر دیا ہے۔

محاورات اور ضرب الامثال میں میر حسن نے بھی کچھ زورِ طبع دکھایا ہے اور اپنے وقت کے بہت اچھے اچھے محاورے نظم کیئے ہیں۔ لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ اُسوقت روزمرہ کی طرح محاورات میں بھی کوئی ندرت نہیں پیدا ہوئی تھی مثال کے طور پر نسیم اور میر حسن کے دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

میر حسن

مصیبت میں انسان مجبور ہے　　زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

نسیم

قسمت سے مفر ہے اب نہ امن　　پتھر کے تلے دبا ہے دامن،

حسن کے کلام کی ساری خوبی اسمیں ہے کہ وہ مشاہدات کی تصویر بہت سچی کھینچتا ہے اور اپنے زمانے کی تاریخ پر اتنی روشنی ڈالتا ہے کہ دوسرے شعرا نہیں ڈال سکتے۔ جتنا دموم دعامی زمانہ اُس نے اپنی نظر سے دیکھا تھا یا تذکرہ کے طور پر سُنا تھا سب کی تصویر اُسکی مثنوی میں موجود ہے اس حیثیت سے وہ ایک بے مثل ناظم ہے۔ لیکن شاعری میں ایک شاعر کے لیئے جسقدر فطری ذہانت اور مذاق سلیم کی ضرورت ہے وہ اُسمیں نہیں پائی جاتی نسیم کی مثنوی میں بھی اُسوقت کی سوسائٹی کا کچھ رنگ آیا ہے مگر یہ تصویر مکمل نہیں۔ البتہ جسقدر ذہانت و طباعی کی ضرورت ہے اور ایک نظم میں جسقدر شاعرانہ خوبیاں ہونا چاہئیں وہ گلزار نسیم میں کامل طور پر موجود ہیں اور ان دونوں نامور شعرا کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمارا یہ فیصلہ ہے کہ ایک ناظم ہے دوسرا شاعر!

گلزارِ نسیم کے بعد چند اور مثنویاں بھی شائع ہوئیں۔ ان میں حضرت واجد علی شاہ کی مثنوی (دریائے تعشق) جو اُنھوں نے اپنے زمانۂ ولیعہدی میں تصنیف کی تھی مرحوم کی تمام مثنویوں میں عمدہ ہے۔ اسی زمانہ میں آفتاب الدولہ قلق کی مہتم بالشان مثنوی (طلسم الفت) تصنیف ہوئی مگر جتنی اسکی شہرت ہوئی اُسقدر خوبیاں اسمیں موجود نہیں۔ اسی سلسلہ میں نواب مرزا شوق کی تین مثنویاں (بہارِ عشق) (زہرِ عشق) اور (فریبِ عشق) بھی قابل الذکر ہیں۔ چوتھی مثنوی (لذتِ عشق) اس طباع شاعر کی تصنیف نہیں ہے نہ اس میں اسکا رنگ ہے نہ خصوصیات حتّٰی کہ اُسکی بحر بھی بدلی ہوئی ہے بہرکیف اول الذکر تینوں مثنویاں اگر فحش مذاق پر مبنی نہوتیں تو کہا جاتا کہ اُردو زبان کے صحیفے یہی ہیں درحقیقت یہی اس پاکیزہ زبان کے نمونے تھے جن سے مرزا داغ مرحوم نے اپنی فصاحت کا چراغ جلایا ہے آخر میں (ترانۂ شوق) بھی اچھی مثنوی کہی گئی۔ اسکا رنگ بالکل گلزارِ نسیم کا عکس ہے حتّٰی کہ بحر بھی وہی پسند کی گئی ہے۔ مگر وہ بات کہاں۔

گلزارِ نسیم میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اول سے آخر تک ایک رنگ میں ڈوبی ہے اور اسکا ہر شعر بتا دیتا ہے کہ میں کس باغ کا پھول ہوں دوسری مثنویوں میں یہ بات نہیں اور انکے مصنف یہ قدرت نہیں رکھتے کہ ہر قسم کے مذاق کو ایک ہی رنگ میں کھینچ لیں مثلاً میرحسن نے بے نظیر کی تعلیم و تدریس کے بیان میں جسقدر تناسب لفظی کی کوشش کی ہے اگرچہ وہ بھی ناقص ہے تاہم مثنوی کے دوسرے حصوں میں اُسکا شائبہ تک نہیں ملتا۔ مصنف گلزارِ نسیم نے جس رنگ کو اول سے اختیار کیا ہے اُسے آخر تک نباہ دیا ہے مثلاً اختصار کو لیجئے جو بسم اللہ سے تمت تک یکساں طور پر قائم ہے۔ اسی طرح تناسب لفظی کی بھی یہ حد ہے کہ مثنوی کا کوئی شعر اس صنعت سے خالی نہیں حتّٰی کہ اسکے سادے شعروں میں بھی اسکی جھلک موجود ہے۔

ہاتھ آسکے آگر پڑا نہیں ہے ۔۔۔ بو ہو کے تو گُل اُڑا نہیں ہے

خیالات کو تشبیہ و استعارات کی صورت میں بیان کرنا شاعری کی آخری منزل ہے اور یہ فخر بھی گلزار نسیم ہی کو حاصل ہے کہ اسکے تمام مطالب اسی پیرایہ میں نظم ہوئے ہیں مثلاً فراق و وصال کے سین جنکی بنا صرف جذبات پر قائم ہے گلزار نسیم میں تمام اردو مثنویوں کے خلاف اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں بلکہ ان مقامات پر جادو نگار شاعر کا قلم زیادہ طرارے بھرنے لگتا ہے۔

(وصل)

کاوش پہ ہوا گہرے الماس غنچے نے بجھائی اوس سے پیاس

(ہجر)

صورت میں خیال رہگئی وہ ہیئت میں مثال رہگئی وہ

ایسی مرصع اور رنگین فرد مثنوی پر یہ سخت ظلم تھا کہ بازاری مطبعوں کے ہاتھوں اسکی حالت تباہ ہو رہی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست بی، اے۔ لکھنوی کی عنایت سے اس مثنوی کا ایک نیا اڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ اس اڈیشن کی ترتیب میں قابل مؤلف نے جدید مذاق کو جس خوبی سے ملحوظ رکھا ہے وہ قابل داد ہے۔ یعنی سب سے پہلے ایک انگریزی رنگ کا دیباچہ ہے جسمیں نسیم کے سوانحی حالات انکی شاعری پر محاکمہ اور بہت سے متفرق امور پر بحث کی ہے۔ اسکے بعد اصل مثنوی ہے جو ایک قدیم نسخے کے مطابق صحیح کر کے شائع کی گئی ہے۔ آخر میں دیوان نسیم کا کچھ انتخاب بھی شامل ہے۔ اور اسی طرح یہ اڈیشن اپنے مقاصد میں ایک حد تک مکمل ہو گیا ہے۔ ہم اس اڈیشن کو صرف (گلزار نسیم) نہیں بلکہ کلیات نسیم کہنا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں جو اس جوانمرگ شاعر کی ایک دلچسپ یادگار ہے۔

پنڈت برج نرائن صاحب اپنی کوشش میں بہت بڑی تعریف کے مستحق ہیں جنھوں نے قدیم تصانیف کو جدید مذاق کے مطابق بنانے کی ایک قابل تقلید راہ سجھادی ہے اور

مغربی تعلیم کی روز افزوں ترقیوں سے اُمید ہے کہ اس طرز تالیف سے پُورا فائدہ اُٹھایا جائیگا اسی لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دیباچہ کی بعض کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے مثلاً گلزار نسیم کی تصنیف کے متعلق اُن بے معنی گپوں کو اتنی وقعت دینا فضول تھا کہ اس دیباچہ میں اُنکا ذکر کیا جائے کیونکہ زمانہ اُنھیں خود ہی فنا کر چکا تھا جو ایک زبردست جج ہے اسی طرح مولانا حالی مدظلہ العالی کے اُن اعتراضات کا جواب بھی بیکار تھا جسے او وہ پیچ میں کامیابی کے ساتھ طے کر دیا گیا تھا اور جو محض بازاری مطبعوں کی غلطی پر پیدا ہوئے تھے۔ اسکے لئے صرف غلط اشعار کی تصحیح ہی ایک شافی جواب تھا۔ رہا وہ اعتراض جو ممدوح نے ایک معیار خاص کے مطابق تمام قدیم تصانیف پر وارد کیا ہے اسکا فیصلہ بھی نقادانِ فن کر چکے ہیں اور اس دیباچہ میں اُسکا کوئی ذکر بھی نہیں۔

دیوان نسیم سے جو اشعار انتخاب کئے گئے ہیں اُنکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت ہر رنگ میں اپنا جلوہ دکھا جاتی ہے نسیم کا قلم غزل کے میدان میں بھی وہی طرارے بھرتا ہے جو مثنوی میں اور جن غزل گو شعرا کے کلام سے اسکا موازنہ کیا گیا ہے وہ اُسکی بلندی خیال تک پہونچنے کے لیئے زبان حال سے کہہ رہے ہیں:۔

اگر یک سر موے برتر پرم | فروغ تجلی بسوزد پرم

نسیم کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

جب ہوچکی شراب تو میں مست مرگیا | شیشہ کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

دوسرا مطلع اس سے زیادہ زوردار ہے ؎

قرص خور کو دیکھ کر تسکین رکھ اے مہمان صُبح | تا دہان شام پہونچتا ہے رازق نان صُبح

زند وصبا وغیرہ کے کلام میں یہ بلند خیالی عنقا کا حکم رکھتی ہے نسیم کے مندرجہ شعر میں شاعر کی روح کھنچ گئی ہے کتنا سچا شعر ہے۔

پیری میں طرز عشق جوانی وہی رہا | صورت کے ساتھ دل کا بدلنا محال ہے

اس نئے اڈیشن کی اشاعت پر گلزار نسیم کی مقبولیت بدرجہا بڑھ گئی ہے تاہم اُسپر چند اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ ان اعتراضات پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کے لئے ایک جُداگانہ مضمون درکار ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ان اعتراضات کے متعلق ایک جداگانہ مضمون تیار کریں لہذا یہ مضمون یہیں پر ختم کیا جاتا ہے۔

بہرکیف گلزار نسیم ایک ایسی مثنوی ہے جسکی مہک مذاق آشنا دلوں کو تازگی اور شگفتگی بخشتی ہے اور وہ ایسی بہار بیخزاں رکھتی ہے جسپر باد حوادث کے جھونکے ہمیشہ بے اثر ثابت ہونگے۔ جبتک دنیا میں انصاف اور طبیعتوں میں شاعرانہ مذاق موجود ہے اسکی شُہرت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔

نقّاد لکھنوی

دبدبۂ آصفی نمبر ۴ جلد ۹، ۶، رجب المرجب ۱۳۲۳ھ

گلزار نسیم

(از حافظ جلیل حسن صاحب جلیل

مسٹر چکبست نے اچھا شگوفہ چھوڑا کہ مثنوی گلزار نسیم پر مقدمہ لکھا آجکل اخباروں اور رسالوں میں اُسی کے گل کھل رہے ہیں۔ ایک مقدمہ مولانا حالی نے لکھا تھا مسٹر موصوف نے بھی وہی روش اختیار فرمائی اور وہی نتیجہ اس مقدمہ کا بھی ہوا جو اُسکا ہوا تھا۔

اس مقدمہ میں پنڈت دیا شنکر نسیم کو بعض اساتذہ لکھنؤ پر فی الجملہ ترجیح دیگئی ہے وہ ترجیح زہر ہو گئی۔ اب مسٹر چکبست معذرت کرتے ہیں کہ میرا منشا بمقابلہ نسیم شعرائے لکھنؤ کی تنقیص نہیں ہے۔ بلکہ میں نے صرف تناسب لفظی میں نسیم کو اور شعرا سے بڑھایا ہے مگر یہ عذر زخم دل کا مرہم نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے وہ آگ نہیں بجھ سکتی جو چار طرف مشتعل ہو گئی ہے ممدوح کی ستائش میں جسقدر مبالغہ کیا جائے جائز ہے، مگر یہ طریقہ اچھا نہیں کہ اس کے مقابل دوسروں کا پہلو دبایا جائے۔ آپ کو اسکا حق کیا ہے کہ اپنی رائے سے ایک دوسرے کا مدمقابل بنا کے آپس میں لڑا دیجیئے اور پھر جس کو چاہیئے اپنے زور قلم سے پچھاڑ ڈالیے۔

ہم نے میر مجروح کے ایک مداح کو دیکھا کہ ایک طرف سے مجروح مرحوم کو بڑی آن بان سے نکالا اور دوسری طرف سے امیر و داغ کو سامنے لا کھڑا کر دیا پھر دیر تک زور آزمائی ہوتی آخر اس بہادر پانی پتی نے دونوں پہلوانوں کو گرا دیا جسمیں ایک لکھنوی تھا دوسرا دہلوی اس قسم کی

بیہودہ تحریروں کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ واقعی جنگ و جدل کی نوبت آ جاتی ہے۔

مولانا حالی کے مقدمہ کا جواب یوں دیا گیا تھا کہ انکی زبان و بیان و دیوان کی دھجیاں اڑادی گئیں یہاں مقدمہ کے جواب میں مثنوی گلزار نسیم کے پھول روندے جاتے ہیں حیرت ہے کہ مسٹر چکبست کی بحث شاعرانہ پر قابل حضرات نے اسقدر توجہ کیوں فرمائی سکوت سے بہتر کوئی جواب نہ تھا اور اگر جواب ہی دیا تھا تو مقدمہ پر نظر کی جاتی اور نسیم کے وہ اشعار دیکھے جاتے جو مقابلہ میں لائے گئے تھے مثنوی کو بے خطا نشانۂ ملامت بنانا انصاف سے بعید ہے۔ جس حالت میں کہ مثنوی کا کوئی شعر مقابلہ میں پیش نہیں کیا گیا۔ مثنوی میر حسن دہلی کے لیئے سرمایۂ فخر ہے تو گلزار نسیم لکھنؤ کے لئے وجہ ناز ہے۔ اور کچھ آج کی تصنیف نہیں انپر کئی دور گذر چکے اور ہر دور میں دونوں مقبول رہیں اب اگر اہل دہلی سحرالبیان کی برائی کریں یا اہل لکھنؤ گلزار نسیم کی ہجو فرمائیں تو یہی کہا جائیگا کہ اپنے عیوب آپ کھولتے ہیں ان مثنویوں کی مقبولیت اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ جو فاضل نثر نگار گلزار نسیم پر معترض ہیں وہ خود لکھتے ہیں کہ مثنوی گلزار نسیم اُردو کی ایک عجیب و غریب معرکہ آرا نظم ہے۔

اغلاط سے پاک کوئی تصنیف نہیں ہو سکتی کہا جاتا ہے کہ گلزار نسیم میں بہت زیادہ نقصانات ہیں ممکن ہے کہ ایسا ہو اور ممکن ہے کہ مثنوی میر حسن میں بھی اسی قدر نقصانات ہوں۔ مگر اسوقت ان نظموں کی تنقید کی حاجت نہیں ہے۔ اور نہ اس سے انکی مقبولیت کو کچھ ضرر پہونچ سکتا ہے۔

گلزار نسیم کے متعلق طرح طرح کے مباحث درپیش ہیں۔ گلزار نسیم میں شاعری کیسی ہے زبان لکھنؤ کی ہے یا نہیں۔ نسیم کا شعرا میں کیا رتبہ ہے حقیقت اتنی ہے کہ مثنوی گلزار نسیم کے ایک کہنہ مشق نقاد سخن کی تصنیف ہے آتش نے کہی ہو یا کسی اور نے ہمکو اس سے بحث نہیں۔ لکھنؤ کی خاک سے صدہا آتش و ناسخ پیدا ہوئے زمانے نے جنکا کلام اچھالا وہ مشہور ہوئے اور باقی شعرا کا نام و کلام پردۂ گمنامی میں رہ گیا۔ انھیں میں ایسے بھی لوگ تھے،

کہ مثنوی اور دیوان کہہ کر دوسروں کو دیدیا کرتے تھے۔ اپنے نام کو ملک کے سامنے پیش کرنا پسند نہیں فرماتے تھے اس جگہ ایک نواب عاشور علی خاں مرحوم کا نام لے دینا ثبوت کے لیئے کافی ہے جو اعلے درجہ کے شاعر و شاعر گر تھے جنھوں نے کتنوں کو شاعر بنا دیا صاحب دیوان کر دیا اور اپنے نام سے ایک شعر نہ رکھا۔ اگر کہا جائے کہ مثنوی گلزار نسیم بھی اس قسم کی تصانیف میں داخل ہے تو اسپر ذرا بھی تعجب نکرنا چاہیئے قاعدہ ہے کہ پرائی چیز کو جب کوئی اپنا کرنا چاہتا ہے تو اُسمیں کچھ نہ کچھ تصرف بھی کرتا ہے چاہے وہ تصرف دخل در معقولات ہی کیوں نہو نظر بر آں یہ سمجھنا چاہیئے کہ پنڈت دیاشنکر صاحب نسیم لکھنوی سے علاقہ مثنوی گلزار نسیم کے اُنھیں اشعار کو ہے جن میں زبان یا بیان کی کمزوری یا شاعرانہ استقام ہیں۔

نسیم کا نام اساتذہ لکھنؤ کے ساتھ کبھی نہیں سُنا گیا۔ گلزار نسیم کو دنیا جانتی ہے اور نسیم کو کوئی نہیں جانتا۔ تحریر و تقریر میں مثل در مقولہ کے طور پر گلزار نسیم کے شعر لائے جاتے ہیں اور نسیم کا نام نہیں لیا جاتا۔

امیر اللغات میں جس کتاب کا شعر لکھا گیا ہے خواہ دیوان ہو یا مثنوی یا مرثیہ یا قصائد یا سلام اُسکے ساتھ مصنف کا تخلص لکھا گیا۔ مگر بخلاف اسکے گلزار نسیم کا شعر جہاں دیا ہے وہاں گلزار نسیم لکھا ہے نسیم نہیں لکھا۔ یہ بھی دلیل قوی اسکی ہے کہ صاحب امیر اللغات کے نزدیک گلزار نسیم نسیم کی تصنیف نہ تھی۔ جناب مولوی عبد الحلیم شرر سے اسکی ابتدا ہوئی کہ اُنھوں نے گلزار نسیم پر ریویو فرمایا اور نقائص کو چُن چُن کر دکھایا۔ اُنکی بحث بڑی قابلیت کے ساتھ ہے اُنکی دیکھا دیکھی اور بھی لکھنے والے ادھر متوجہ ہو گئے اور جی کھول کر نکتہ چینی کی۔ مگر مسٹر چکبست صاحب نے جو جواب اُردوے معلے میں دیا ہے وہ بھی دیکھنے کا ہے۔ خصوصًا سند کے اشعار بہم پہونچانے میں اُنکی تلاش حیرت انگیز ہے۔ سب اعتراضات کا بیجا ہونا جسطرح دشوار ہے اسی طرح ہر ایک جواب کا با صواب ہونا بھی مشکل ہے۔

دکن ریویو نمبر ۷ جلد ۳ - بابت ماہ جولائی ۱۹۰۵ء

گلزارِ نسیم کا نیا اڈیشن

مرتبہ

پنڈت برج نرائن صاحب چکبست بی، اے لکھنوی

(از نقاد)

جس طرح نظم شاعر کی طبیعت کا پتہ دیتی ہے۔ اسی طرح شاعر کی طبیعت اُس زمانہ اور اُس سوسائٹی کے رنگ کو ظاہر کرتی ہے جس میں اُس نے نشو و نما اور تربیت پائی ہے لکھنؤ کی نوابی کا زمانہ عجیب و غریب زمانہ تھا۔ اسمیں ایک بااقبال عیش پرست اور مست اور بیخود قوم کے ادبار اور زوال کے تمام آثار پائے جاتے تھے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قوم کے دماغی اور جسمانی قویٰ کا سارا زور صرف ہو چکا تھا ہمتیں قاصر ہو چکی تھیں۔ اولوالعزمی اور جرأت کبھی کی رخصت ہو چکی تھی جس طرح بیمار اکثر سنبھالے کو صحت سمجھتا ہے اسی طرح یہ ادبار نصیب لوگ اسے عروج و اقبال و فراغ بالی کا زمانہ سمجھے ہوئے تھے سایہ کو اصل شے اور تصویر کو زندہ پری خیال کرتے تھے۔ جو جدت تھی جھوٹی۔ جو طبّاعی تھی برائے نام جو حوصلے پست تھے اس لیئے اُن کے شوق بھی ذلیل تھے۔ جوش و خروش تھا مگر کاذب ادبار کے بھنور میں پھنسے ہوئے تھے۔ مگر خواب اقبال ہی کے دیکھتے تھے۔ کو پینڈکی کی طرح اپنے محدود مقام میں مگن تھے اور اپنی سوسائٹی کو خلاصۂ عالم اور اپنے ملک کو مرکز علوم و فنون خیال

کیئے ہوئے تھے چونکہ بلند نظری اور عالی ہمتی مفقود ہوگئی تھی اسلئے کسی حقیقی جذبات یا حقیقی قابلیت کی قوت نہیں رہی تھی۔ لکیر کے فقیر تھے اور اسی میں نئی شگوفہ کاریاں کرکے اپنی مردہ طبیعتوں کو جسے وہ زندہ دلی کہتے تھے ابھارتے تھے لیکن دراصل یہ ان دماغوں کا نتیجہ تھے جو سُستی کے بیکار اور معطل ہوگئے تھے یہی وجہ تھی کہ انکے ہر کام میں تکلفات و نمود و نمائش کا جلوہ نظر آتا تھا سارے علوم کھوکر طبع آزمائی کے لئے صرف ایک شاعری باقی رہ گئی تھی اس میں انھوں نے اپنی انوکھی طبیعت کے وہ وہ کمالات دکھائے ہیں جنکی نظیر مشکل سے کسی دوسری زبان میں ملتی ہے۔ اس زمانہ کی شاعری اور لٹریچر دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ شاعری کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس لئے کہ اس میں اس زمانے کی سوسائٹی کی کامل تصویر اور صحیح خط و خال موجود ہیں رفتہ رفتہ یہ شاعری لطیفہ گوئی اور لطیفہ گوئی سے چیستان اور معما ہوگئی یہ جزو اعظم اس دور کے شاعری کی نظم میں پایا جاتا ہے اور ان سب کے بڑھ امانت اور پنڈت دیا شنکر نسیم تھے۔ ان بزرگوں نے لفظی مناسبت کے لئے ایسی بڑھائی کہ اصل شاعری تو ہوا ہوگئی فقط الفاظ کا گورکھ دھندھا رہ گیا جس پر لوگوں نے وہ داد دی اور واہ واکی کہ اچھے اچھے طباع لوگ اس دھوکے میں آگئے۔ اور اسی کو شاعری کی روح رواں سمجھنے لگے اور وہ لفظی نزاکتیں پیدا کرنی شروع کردیں کہ اس سے بڑھ کر خیال میں نہیں آسکتیں یہاں تک کہ یہ طرز خاص اہل لکھنؤ کا حصہ ہوگیا۔

پنڈت برج نرائن صاحب چکبست نے گلزار نسیم کا نیا اڈیشن مرتب کرکے اس شاعری کو پھر زندہ کرنا چاہا ہے۔ مثنوی کے شروع میں ایک زبردست دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں نسیم کی شاعرانہ خوبیوں کو بہ تفصیل بیان کیا ہے اور ناظرین سے داد چاہی ہے۔ ہم ہرگز اسپر قلم نہیں اُٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن کچھ تو اپنے شفیق اڈیٹر دکن ریویو کے اصرار سے اور کچھ اس خیال سے کہ ان تحریروں کا اثر اہل ملک کے مذاق پر بُرا ہوتا ہے مجبوراً اس مثنوی پر نظر تنقید ڈالتے ہیں اور خصوصاً نسیم کے کلام کا دوسرا پہلو

دکھانا چاہتے ہیں تاکہ اہلِ نظر پورے طور پر برائی بھلائی کا موازنہ کر سکیں۔

میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ ظاہری صورت بھی بڑی چیز ہے اور سب سے پہلے نظر اسی پر پڑتی ہے لیکن اصل شے جو شعر کی جان ہوتی ہے وہ کچھ اور ہے خیال اور الفاظ الگ الگ نہیں ہیں ممکن ہے کہ ایک بچے کو شروع شروع میں اپنے خیالات کے ادا کرنے میں کافی الفاظ نہ ملنے کی وجہ سے دقت واقع ہوتی ہو مگر ایک مدت کے بعد خیال اور الفاظ دونوں ایک ساتھ ادا ہونے لگتے ہیں اور جدا نہیں رہ سکتے بعض خاص خاص حالتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ خیال الفاظ کے آگے نکل جاتا ہے یا کبھی قوتِ بیانی سے پیچھے رہ جاتا ہے مگر یہ وہ حالت ہے جبکہ ان دونوں میں اعتدال قائم نہیں رہتا۔ لیکن جوں جوں خیال میں صفائی اور پختگی پیدا ہوجاتی ہے طرزِ ادا میں بھی قوت اور بے ساختہ پن آتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا طرزِ ادا کرخت اور بھدا۔ بندش سست اور اکھڑی اکھڑی ہوتی ہے اور زبان میں صفائی اور لوچ نہیں ہوتا اُنکے خیالات میں بھی وہی نقص پائے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ خیال اور الفاظ کو دو الگ الگ چیزیں سمجھ کر انپر غور نہیں کرنا چاہیئے بلکہ جب شعر پر نظر پڑے تو اسمیں مضمون اور طرزِ ادا دونوں ایک ہی نظر میں آجائیں جو لوگ محض الفاظ کی تلاش اور بندش کی فکر میں رہتے ہیں اُن میں نہ خیال کی جدت ہوتی ہے نہ مضمون آفرینی وہ صرف الفاظ کے ہیر پھیر اور قافیہ بندی اور چند قسم کے صنائع بدائع کو شاعری سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسی شاعری نثر سے بھی بدتر ہے افسوس ہے کہ نسیم کی شاعری زیادہ تر اسی قبیل کی ہے۔ اس قسم کی شاعری سے سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہیں ہوا شاعری کی غایت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے سچی اور روحانی مسرت ہو اور ساتھ اس کے عادات اور اخلاق و خیالات پر عمدہ اثر پڑے۔ مگر اس شاعری میں یہ دونوں باتیں مفقود ہیں بلکہ بخلاف اسکے عام طور پر اسکی وجہ سے بدمذاقی پھیل گئی ہے اور طبیعتوں میں پستی۔ رذالت اور کوتہ نظری پیدا ہوگئی ہے اُردو لٹریچر کی ترقی کو اس شاعری نے بہت کچھ روکا ہے اور جبتک

ان خاص عیوب کو ہم اپنی شاعری سے نہ نکال دیں کبھی اُردو زبان کے متعلق لمبے چوڑے دعوے نہیں کر سکتے نئے تعلیم یافتہ لوگوں سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اور ہیں لیکن خصوصی تعجب ہے بعض حضرت انیس سے ایسے بھی پیدا ہوگئے ہیں جنھوں نے اس خاص بارہ میں پُرانوں کے بھی کان کاٹ لئے اصلاح تو درکنار انھیں یہ بھی گوارا نہیں کہ ان کی چہیتی شاعری کو کوئی بُری نظر سے بھی دیکھے۔ وہ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ اُردو شاعری درجۂ کمال کو پہونچ چکی ہے اور دنیا کی کوئی شاعری اسکی ٹکر کی نہیں۔ حالانکہ اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض ابتدا ہے مگر ہمارے دوست اُسے انتہا سمجھے ہوئے ہیں اور نہ معلوم یہ کب تک بسم اللہ کے گنبد میں رہیں گے مجھے اُردو شاعری کے بعض حصوں سے جو درحقیقت قابل تعریف ہیں ہرگز انکار نہیں لیکن افسوس اور رنج اس بات کا ہے کہ اس کی طرف کوئی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اُس چیز کو آسمان پر چڑھا رکھا ہے جو ہماری شاعری کا سب سے ذلیل اور پوچ حصہ ہے کوئی صحیح مذاق والا شخص ان دیوانوں اور نظموں کے چند صفحے مسلسل ہرگز نہیں پڑھ سکتا اور میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ یہ حضرات جوان نظموں کے اسقدر دلدادہ ہیں وہ بھی نہیں پڑھ سکتے وجہ یہ ہے کہ اسکے پڑھنے سے کبھی سچی مسرت نہیں پیدا ہوتی اسکا سارا لطف چند فرضی خیالات لفظی تناسب و جھوٹی نمائش پر منحصر ہے۔ اور یہی بات ہے جسنے ذوق سلیم کی بیڑھ مار دی ہے۔ اور لوگ محض نمائشی بندشوں اور لفظی ہیر پھیر پر واہ واہ کرتے ہیں۔

پنڈت چکبست صاحب جنھوں نے اس مذاق کے زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے ایک اور غضب کیا ہے کہ نسیم کی شاعرانہ خوبیاں کرتے کرتے مولانا حالی کے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے (جس کا ذکر ہم آگے کرینگے) اور صاف یہ لکھدیا ہے کہ (مولانا موصوف اصول شاعری سے بے خبر ہیں) اور اسی بحث میں آپ نے ایک ایسا کام کیا ہے کہ جسکے ہم نہایت ممنون ہیں یعنی آپ نے ازروے ہمہ دانی شاعری کی تعریف بھی فرما دی ہے۔ فرماتے ہیں شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش اور پُرتاثیر ہو۔ نثر کا اندازہ یہ ہے کہ جو مضمون

بیان کیا جائے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ اُن سے ایک خاص معنی صاف طور پہ پیدا ہوں اور بر خلاف اسکے شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اختصار کے ساتھ باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گزر جائیں (اس سارے دیباچے میں آپ نے اگر کہیں دماغ سے کام لیا ہے تو شاید وہ یہی موقع ہے۔ شاعری کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف ڈھنگ سے کی ہے۔ لیکن جو تعریف پنڈت صاحب نے تحریر فرمائی ہے وہ سب سے نرالی ہے۔ اور اگر کوئی اس پر کاربند ہو کر کوشش کرے تو شاید عمر بھر اسے نثر و نظم میں فرق نہ معلوم ہو یہ ضرور نہیں کہ نظم ہمیشہ مختصر ہو اور نثر میں ہمیشہ وضاحت سے کام لیا جائے۔ اختصار اگر کوئی نسیم کا سا کرنے لگے جس سے معنی تک خبط ہو جائیں تو ایسی نظم سے نثر بدرجہا بہتر ہے۔ اکثر مواقع ایسے پیش آتے ہیں جہاں شاعر کو نہایت وضاحت سے کام لینا اور کسی شے اور خیال کے ہر پہلو کو اس صراحت سے بیان کرنا پڑتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے اسکا نقشہ کھنچ جائے۔ اسی طرح نثر میں بعض اوقات اختصار کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ وضاحت سے لطف جاتا رہتا ہے اور سقم پیدا ہو جاتا ہے افسوس ہے کہ نسیم کے کلام اور اس کی پیروی نے پنڈت صاحب پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے اور یہ فرق جو پنڈت صاحب نے نظم و نثر میں بیان فرمایا ہے یہ محض گلزار نسیم کا طفیل ہے ورنہ جس شخص کی نظر وسیع ہوگی وہ کبھی اس قسم کے فرق کو جائز نہ رکھے گا اور محض ایک دعویٰ تعریف کر کے ناظرین کو دھوکے میں نہ ڈالے گا۔ اس برتے پر تتھ پانی۔ شاعری اور شعر فہمی کی یہ حالت اور پھر اس پر مولانا حالی جیسے قادر الکلام سخن و سخن سنج محسن اردو پر منہ آنا۔ درحقیقت حیرت انگیز ہے۔ مولانا حالی نے جو چند بجا اعتراض کر دیئے تو غضب ہو گیا۔ حالانکہ دیکھا جائے تو یہ اعتراض کچھ بھی نہیں۔ اس مثنوی میں اس کثرت سے طرح طرح کی لغزشیں موجود ہیں کہ

ایسے ایسے سیکڑوں اعتراض ہو سکتے ہیں جن کا جواب پنڈت صاحب تو کیا کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ شروع سے لیکر اخیر تک کاتب کی غلطیاں بتا دی جائیں اول ہم ان اعتراضات کو لیتے ہیں جو مولانا حالی نے فرمائے ہیں اور جنکے رفع کرنیکی پنڈت صاحب نے کوشش کی ہے اسکے بعد ہم مثنوی کی دوسری لغزشیں اور غلطیاں دکھائیں گے

پہلا اعتراض (مولانا حالی کا)

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھا اسی کو پھر دیکھ نہ سکیگا کسی کو

مولانا حالی کا یہ اعتراض ہے کہ ان دو بیتوں میں جب تک کئی لفظ بڑھائے اور جب تک کئی لفظ بدلے نہ جائیں ان کا مطلب سیدھی طرح نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ مصنف جو مطلب ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ تو اس طفل مہ جبیں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے مگر نجومیوں نے بادشاہ سے کہا کہ لڑکا آپ کو پیارا تو ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اس کو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ سکیگا۔ اعتراض اسقدر صاف ہے کہ اسکے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں ہے۔ پنڈت صاحب فرماتے ہیں کہ اگر مولانا حالی گلزار نسیم کا کوئی صحیح نسخہ ملاحظہ فرماتے تو مولانا موصوف کو اس اعتراض کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑتی۔ صحیح نسخہ میں پہلا شعر اسطرح ہے۔

خوش ہوتے ہی طفل مہ جبیں سے ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

پنڈت کے زعم میں مولانا نے مصنف گلزار نسیم پر اعتراض نہیں کیا بلکہ یہ اعتراض کاتب پر وارد ہوتا ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا لیکن ہر شخص جس کی طبیعت کو ذرا بھی شعر سے لگاؤ ہے اسے پڑھکر فوراً بول اٹھے گا (عذر گنہ بدتر از گنہ) پنڈت صاحب کو جوش حمایت میں اتنا خیال بھی نہ رہا کہ اس صحت سے شعر اور بھی خاک میں ملجاتا ہے اور اسکی رہی سہی حیثیت بھی

جاتی رہتی ہے۔ ہوتے ہی کا لفظ قابل غور ہے خوش ہوتے ہی یہ ثابت ہوا۔ یعنی خوش ہونا علت ہے ثابت ہونے کی جو بالکل مہمل ہے ایسی صحت سے جو پہلی غلطی ہے اچھی ہے۔ پنڈت صاحب نے فضول صحیح نسخوں کی تلاش میں سرگردانی و پریشانی اُٹھائی۔

دوسری بیت میں ایک اور لفظ قابل اعتراض ہے جس سے مصنف کی زبان دانی پر بڑا حرف آتا ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا کی نظر نہیں پڑی وہ بیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو اس مصرع میں (اسی) کا لفظ بڑا لطف دے رہا ہے۔ بجائے واسکے اسی کی کیا ضرورت تھی جو بالکل روزمرہ کے خلاف ہے۔ اس قسم کا استعمال شاعر تو شاعر معمولی لوگ بھی نہیں کرتے۔

دوسرا اعتراض

نُور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو چشمک تھی نصیب اِس پدر کو

اس شعر پر بھی مولانا کا یہی اعتراض ہے کہ دونوں مصرعے بے ربط ہیں جب تک دوسرے مصرع کے الفاظ نہ بدلے جائیں کلام مربوط نہیں ہو سکتا اس میں کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں دونوں مصرعے صاف ایک دوسرے سے الگ الگ معلوم ہوتے ہیں اور کوئی ربط ایک دوسرے میں نظر نہیں آتا یعنی اول مصرع ایک عام اصول کو بیان کر رہا ہے اور دوسرا ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مگر دونوں میں کوئی ربط پیدا نہیں کیا گیا مثنوی میں اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں کہ دونوں مصرعے بے جوڑ ہوں اور ان میں کوئی ربط نہ قائم کیا جائے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو مصرعوں میں ربط کے الفاظ محذوف ہوتے ہیں مگر مضمون یا موقع کے لحاظ سے وہ چنداں عیب نہیں معلوم ہوتا۔ مگر یہاں یہ بھی نہیں ہر دو مصرعے بالکل الگ الگ رکھے ہیں ایک عام اصول کو ایک خاص واقعہ کے ساتھ ربط دینے کے لئے ضرور تھا کہ چند الفاظ داخل کیے جاتے کوئی استاد یا جسے ذوق سخن ہے ایسی غلطی نہیں کرے گا۔

پنڈت صاحب اسکے جواب میں محض اسقدر فرماتے ہیں "میں اس اعتراض کی تہ کو نہیں پہونچا ۔مجھکو شعر کسی صورت میں بے ربط نظر نہیں آتا ، اسکا جواب میرے پاس نہیں ذوقِ سخن بختا نہیں ، اسکے سمجھنے کے لئے طبیعت کو لگاؤ ہونا چاہئیے ۔ شاید میری اس تصریح کے بعد سمجھ جائیں تو سمجھ جائیں ۔

تیسرا اعتراض

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

اس شعر پر مولانا کا اعتراض تھا کہ ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شاہ اور شخص ہے اور پدر اور شخص ہے حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی شخص مراد ہے اس اعتراض کے جواب میں سکتے ہیں کہ یہ کاتب کی غلطی ہے ۔ دوسرے مصرع میں بجائے (پدر نے) کے پسر کا ہونا چاہئیے ۔ اگر یہ ہے تو بیشک اب شعر کی صورت بن جاتی ہے ۔اور ہمیں اسکی غلطی پر اصرار نہیں ہے ۔لیکن مولانا حالی صحیح نسخہ لاتے کہاں سے ۔سب سے صحیح اور کمیاب نسخہ جو پنڈت صاحب نے لکھنؤ کے پرانے بزرگوں سے بڑی محنت اور کوشش کے بعد بہم پہونچایا ہے اسکی نسبت خود آپکی یہ رائے ہے ۔"گو اس پرانے نسخہ میں بھی اکثر چھاپے کی غلطیاں موجود ہیں مگر بہت کم" اس جملے میں اکثر اور بہت کم کے الفاظ قابل توجہ ہیں غالباً یہ نکتہ بھی انھوں نے نسیم سے اڑایا ہے ۔خود پنڈت صاحب کا موجودہ نسخہ جسکی صحت اور ترتیب میں آپ نے بڑی سعی اور جانفشانی فرمائی ہے اس میں بھی اکثر غلطیاں موجود ہیں پھر صحیح نسخہ آئے تو کہاں سے ۔

چوتھا اعتراض

مولانا کا بہت پرزور ہے ۔ یہ اعتراض صرف چند اشعار پر نہیں بلکہ کل مثنوی پر ہے ۔ کیونکہ اس قسم کے اشعار اس مثنوی میں جا بجا پائے جاتے ہیں اور یہ نسیم کا اصلی رنگ ہے جسپر نسیم اور اسکے ہم مذاق لوگوں کو بڑا ناز ہے ۔آپ اول

اُس حالت پر غور کیجئے جس کے بیان کرنے کے لیئے یہ اشعار کہے گئے ہیں ۔ اور پھر ان اشعار کے معانی کو ملاحظہ کیجئے خود بخود ظاہر ہو جائے گا کہ شاعر اصلی حالت دکھانے میں قاصر رہا ہے ۔ ایسے ہی مواقع پر مثلاً جہاں مظاہر قدرت ۔ کیفیات انسانی اور جذبات نفسانی کی ہو بہو تصویر کھینچنی پڑتی ہے شاعر کا کمال ظاہر ہوتا ہے ۔ سچے فراق اور ہجر کی حالت جیسی کچھ دردناک ہوتی ہے ظاہر ہے ۔ وہاں تو انسان کھانے پینے سونے پہننے ۔ یار آشنا سے کیا اپنی جان تک سے بیزار ہے اور یہاں حضرت شاعر کو لطیفہ گوئی اور صنائع بدائع کی داد دے رہے ہیں ۔ ایسا شخص کیا خاک شاعری کریگا یہ محض یاوہ گوئی اور جگت بازی ہے ۔ یہاں چاہیئے تھا کہ وہ ایسے دردناک اشعار لکھتے کہ پڑھنے والے کے دل پر چوٹ لگتی مگر وہ اپنے رنگ سے مجبور ہیں انہیں اپنے قصے کے لوگوں سے ہمدردی نہیں وہ محض اپنی شاعری دکھانا چاہتے ہیں ۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ شاعری نہیں ۔ بلکہ تب ہی ہوتی ہے جب وہ ان لوگوں کی مختلف حالتوں کی ہو بہو تصویر کھینچتے ۔ اور آنکھوں کے سامنے سماں بندھ جاتا مثلاً یہی اشعار جن پر مولانا حالی نے اعتراض کیا ہے ۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس ہیں آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

کیا پڑھنے والے کے دل میں اُس مصیبت زدہ کی دردناک حالت کا کوئی خیال پیدا کر سکتے ہیں ۔ پھر کیا حاصل ایسی شاعری سے ۔ اس سے تو نثر ہزار درجے اچھی اس پر پنڈت کی دیدہ دلیری قابل دید ہے فرماتے ہیں مولانا موصوف اصول شاعری سے بیخبر ہیں ۔ نازک خیالی اور بلند پروازی جو کہ اعلےٰ درجہ کی شاعری کے جوہر ہیں ان اشعار میں موجود ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ مولانا حالی مغربی شاعری کی پیروی کی فکر میں انگریزی نظموں کے ترجمے پڑھتے ہیں اور چونکہ غیر زبان میں ترجمہ ہونے سے ان نظموں کی نازک خیالی اور

بلند پروازی کے جوہر تشریف لیئے جاتے ہیں اور استعاروں اور تشبیہوں کی پیچیدگیاں قائم نہیں رہتیں الخ"

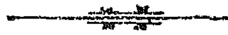
لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ایسے موقع پر بلند پروازی نازک خیالی اور استعاروں اور تشبیہوں کی پیچیدگیوں کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ ایک پُر درد حالت کے بیان کرنے میں زبان ہمیشہ پاک صاف اور سیدھی سادھی ہونی چاہیئے یہ پیچیدہ استعارات اور تشبیہات اور نازک خیالیاں کبھی اصل کیفیت کو بیان نہیں کر سکتیں۔ یہاں فن صنائع بدائع کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس شئے کی ضرورت ہے جو شاعری کی جان ہے اور جو انسان ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔ نسیم کو یہ خداداد جوہر نصیب نہوا اور اسلئے اُسکی شاعری محض لفاظی جگت بازی اور صنائع بدائع کی پیچیدگیوں میں پھنس کے رہ گئی گلزار نسیم کا وہ حصہ جو بڑے معرکہ کا ہے اور جسپر لوگ سر دھنتے ہیں اور جسکی تعریف کرتے کرتے ہونٹھ خشک ہوتے ہیں یعنی وہ مقام جب بکاؤلی کا پھول چوری گیا ہے اور اس نے اظہار رنج و ملال و اضطراب کیا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو نری لفاظی ہے۔ چونکہ باندیوں اور غلاموں کے نام ایسے رکھے ہیں جو چمن سے مناسبت رکھتے ہیں اس لیے اس مناسبت سے لوگوں کو مزا آجاتا ہے ورنہ اسمیں کچھ نہیں اور شاعر کو اس اہم مقام کے بیان کرنے میں سخت ناکامیابی ہوئی ہے۔ ان اشعار کے پڑھنے سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدمہ ایک شخص کو پہونچا ہے اور ایک غیر آدمی خاص موقع پر آکر اُسکی تضحیک کر رہا ہے کیونکہ جسکو صدمہ پہونچتا ہے وہ اپنا رنج والم اس طریقے سے ظاہر نہیں کرتا جیسا اس موقع پر کیا گیا ہے چنانچہ اکثر اشعار اسی قسم کے ہیں مثلاً

سنبل میرا تازیانہ لانا — شمشاد اسے سولی پر چڑھانا
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لےگیا کون — بیگانہ تھا بزے کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا
او باد صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا
انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا دم بخود اسکی سن کے فریاد وغیرہ

درحقیقت یہ ایسا مقام تھا کہ زور شاعری دکھایا جاتا اور اس رنج و ملال اور بیتابی اور غصے اور تاسف کی کیفیت اس طرح سے بیان کی جاتی کہ پڑھنے والے بیتاب ہو جاتے۔ مگر نسیم اس گون کا نہ تھا۔ وہ اپنے اسی رنگ میں چلا گیا چند لفظی مناسبتوں سے ایک اوپری کیفیت پیدا کردی مگر اصلی کیفیت جو صرف ایک سچا شاعر ہی دکھا سکتا ہے نہ دکھا سکا۔

(از انتقاد)



دکن ریویو نمبر ۳ جلد ۳ - بابت ماہ اگست ۱۹۰۵ء

مثنوی گلزارِ نسیم کا نیا اڈیشن (۲)

(از نقّاد)

اب ہم مصنف کی اُن غلطیوں پر نظر ڈالتے ہیں جو زبان اور شاعری اور خصوصًا ذوق سلیم کے متعلق جا بجا کی ہیں۔ پنڈت چکبست صاحب نے مثنوی کی ایک بڑی خوبی یہ بیان کی ہے کہ اسمیں اختصار بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں (اختصار جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے اس مثنوی کا عجب جوہر ہے واقعی دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے)

سچ ہے جب کوئی خوبی درجۂ کمال سے بڑھ جاتی ہے تو وہی عیب ہو جاتی ہے میرے خیال میں اس مثنوی میں بہت بڑا عیب ہے ایسے اختصار سے کیا حاصل جس سے شعر ہی مہمل ہو جائے اور شاعر اپنے عندیہ کو الفاظ کی کمی کی وجہ سے پورے طور پر ادا نہ کر سکے۔ پنڈت جی کا یہ دعویٰ ہے کہ مثنوی میں ایک شعر بھی بھرتی کا نہیں۔ بھرتی کے شعر ہونا اتنا بُرا نہیں جتنا مہمل اختصار اور جہاں مہمل نہیں وہاں معما ہے چنانچہ دو ایک شعر جن پر مولانا نے اعتراض کیا تھا اور جن کا ذکر ہو چکا ہے وہ اسی قبیل سے ہیں مثلاً اور بھی لکھے جاتے ہیں۔

شادی کے لئے ہے کلکِ شنجرف ‏ ‏ انگشتِ قبول دیدہ حرف

الفاظ سب اچھے ہیں بندش بھی خوب ہے مگر معنی ندارد۔ یہ شعر محض اختصار کی بدولت المعنی فی بطن الشاعر کا پورا مصداق ہے۔

زود دل ہوں جو جانبین راضی — یہ جان لے کیا کرے گا قاضی

یہاں جانبین بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کوئی نہیں بولتا دو دل جو جانبین راضی ہوں۔ البتہ جانبین سے لکھنا صحیح ہے ذرا سے اختصار نے مصرع کو مہمل کر دیا۔ یہ جان لے) محض بھرتی ہے حالانکہ صاحب دیباچہ فرماتے ہیں کہ بھرتی نام کو نہیں سے گھر چھوڑ کے چل بسے سب انساں۔ پھر تن میں نہ آئے صورت جاں۔ دوسرا مصرع بوجہ اختصار کے بے معنی ہوگیا ہے اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنا شہر چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے اُنکے رہنے کی جگہ تن تھی شاعر کا اصل مقصد اسکے کہنے سے یہ تھا کہ جسطرح جان جاکر تن میں نہیں آتی اسی طرح وہ لوگ پھر اپنے دیس کو گئے مگر بوجہ اختصار مطلب خبط ہوگیا اور یہ مصرع بالکل مہمل ہوگیا۔

آنکھوں میں جو چھا گیا اندھیرا — پل مارتے ہوگیا سویرا

شب فراق کا بیان ہے مگر کیا دم بھر میں صبح ہوگئی ہے۔ شاعر کو اپنے لفظی جوڑ توڑ میں اتنا بھی خیال نہ رہا کہ میں شب وصال کا حال بیان کر رہا ہوں یا شب فراق کا

نکلا جیسے ہی مٹھ کے باہر — پتھرا گئی چشم حلقۂ در

اس شعر میں دوسرے مصرع کا کوئی تعلق پہلے مصرع سے نہیں معلوم ہوتا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکے جانے سے چشم حلقۂ در کیوں پتھرا گئی یہ مصرع اس مقام پر بے موقع اور بے معنے ہے۔

بولا وہ کہ چپ ہو کیوں سبب کیا — بولیں وہ کہ کیجئے بے ادب کیا

یہ شعر اس مقام پر لکھا ہے جہاں راجہ اندر نے بکاؤلی کی کیفیت پریوں سے پوچھی، اور اُن کے خاموش رہنے پر سبب دریافت کیا ہے۔ دوسرے مصرع میں پریوں کا جواب ہے۔ نہ معلوم بے ادب کس کی شان میں واقع ہوا ہے۔ غالبًا شاعر کا مطلب یہ تھا کہ بے ادبی کی بات ہے کیا عرض کیجئے مگر ادا نہ کر سکا یا شاید پریزادوں کے محاورے میں

یوں ہی کہتے ہوں -

اسی طرح سے بہت غلطیاں زبان کی ہیں اور اکثر محض تناسب الفاظ کی جستجو اور شوق میں کی گئی ہیں - چند بطور نمونہ کے لکھی جاتی ہیں -

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی　　بینائی سکے چہرے پر نظر کی

دوسرا مصرع بالکل بے معنے ہے جہاں تک میرا خیال ہے مصنف مثنوی کے سوا دوسرا اسکی تہ کو نہیں پہونچ سکتا - کیا خوب -

وہ مرد خدا بہت کراہا　　سلطان سے ملا کہا کہ شاہا

کراہنے کے معنے ہمیشہ درد سے چلانے کے ہیں - یہاں اسکا کوئی موقع نہ تھا بادشاہ جب اندھا ہوا تو ایک پیر مرد باکمال نے بادشاہ کی خدمت میں یہ عرض کی کہ باغ بکاؤلی میں ایک پھول ہے جسکے ملنے سے نابینا بینا ہو جاتا ہے - نہ معلوم شاعر نے کس خیال سے کراہا کا لفظ لکھا ہے اسی کے ساتھ دوسرا شعر ہے -

ہے باغ بکاؤلی میں ایک گل　　پلکوں سے اسی پہ مار چھنگل

(مرد خدا) کا بادشاہ سے یہ کہنا (پلکوں سے اسی پہ مار چھنگل) کسقدر نازیبا معلوم ہوتا ہے علاوہ اسکے اسمیں کوئی خوبی بھی تو نہیں - بلکہ اس قسم کی طرز گفتگو اور طرز انشا بہت مبتذل اور ادنے درجہ کی ہے - پلکوں سے چھنگل مارنا ہر لحاظ سے کریہہ معلوم ہوتا ہے علاوہ اسکے (اسی کا استعمال بالکل خلاف روزمرہ ہے -

ایک نہر تھی شہر کے برابر　　ٹھٹکے سیارے کہکشاں پر

غالبًا سیاروں سے مطلب چاروں بھائیوں سے ہے اور کہکشاں سے مراد نہر ہے نہ تو تشبیہ میں لطف ہے اور نہ ادائے مطلب میں اور کہکشاں پر پہونچکر سیاروں کا ٹھٹکنا کیا معنی -

وہ ریگ رواں کا گرد لشکر　　یعنے تاج الملوک ابتر

ریگ رواں کا گرد لشکر بالکل سمجھ میں نہیں آتا - کہ کیا بلا ہے - اور تاج الملوک کو جو اس سے

تشبیہ دی ہے اسمیں کیا معا ہے۔

سوچا وہ کہ ابتو ہم ہیں آگاہ　　　جیتے ہیں تو جیت لیں گے ناگاہ

ناگاہ خواہ مخواہ لکھدیا ہے محض بھرتی ہے۔

دانا تو کرے کب اسطرف میل　　　ہارا ہے جوے کے نام سے بیل

یہاں صرف جوے کے لئے بیل لائے ہیں ورنہ کسی قسم کا لطف اس شعر میں نہیں مطلب یہ ہے کہ دانا جوے کی طرف کب میل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بیل بھی جوے کے نام سے بھاگتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اس قمار بازی کو بیل کے جوے سے کیا تعلق اور نسبت ہو سکتی ہے۔ مگر صرف لفظی رعایت کے لئے بلا سوچے سمجھے یہ تک لگا دی ہارا کا لفظ بھی صرف قمار بازی کی مناسبت سے ہے۔

سوجی کہ نہ اب بھی چال رہیئے　　　شادی کا مزا نکال رہیئے

اسمیں نکال رہیئے فصیح نہیں ہے۔ نکال لئے رہا۔ نکال کے رہوں گا کہتے ہیں مگر نکال لے اور نکال رہونگا غیر فصیح ہے۔ اسیطرح سے چال رہنا ہمارے خیال میں کوئی فصیح محاورہ نہیں۔ شاید اہل لکھنؤ بولتے ہوں۔

ذکر اپنے برادروں کا سُنکر　　　بولا وہ عزیز پُرسُن تو مادر

اُردو میں برادروں اور مادر کا استعمال اس طور پر مکروہ معلوم ہوتا ہے۔

چلتے تھے ادھر سے دو جواری　　　ایک ایک کی کر رہا تھا خواری

یہاں چلتے تھے خلاف محاورہ استعمال ہوا ہے۔ چلے جا رہے تھے۔ یا جا رہے تھے ہونا چاہیئے۔

سمجھا وہ کہ ہے شگون نرالا　　　نیولا پکڑا آستین میں پالا

شگون میں نون ظاہر کرنا چاہیئے تھا

کام اس کا تھا بسکہ کھیل کھانا　　　چوسر کا جما وہ کارخانہ

کھیل کھانا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ غالبًا شاعر کھیلنا کھانا کہنا چاہتا تھا۔

یہ مال یہ زر یہ جیتنے بندے | یوں ہی ہیں رکھ بجنس چندے

بجنس بجنسہ کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

بل مارنے کی ہوئی جو دیری | سبحان اللہ شان تیری

دیری بجائے دیر کے غیر فصیح ہے۔

وہ دیو لپک کے مار لایا | غراتے ہوئے شکار لایا

غراتے ہوئے صحیح نہیں ہے غرّاتا ہونا چاہیئے۔

دن پھر تو الگ تھلگ ہی تھے وہ | دو وقت سے شام کو ملے وہ

محاورہ دونوں وقت ملتے یا دونوں وقت ملتا ہے" دو وقت کی طرح ملتا" یہ بھی غلط ہے کیونکہ بجائے دونوں کے دو استعمال کرنا خلاف محاورہ ہے

انگلی لب جو یہ رکھ کے شمشاد | تھا دم بخود اسکی سن کے فریاد

شمشاد مارے حیرت کے دم بخود تھا۔ مگر ایسا حواس باختہ ہوگیا تھا کہ انگلی بجائے اپنے ہونٹوں پر رکھنے کے دوسرے کے لب پر رکھدی نسیم کو سوجھی بڑی دور کی ہے۔

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ | ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ

یہ شعر اُس مقام پر لکھا ہے جب پھول چوری گیا ہے اور بکاؤلی غم و غصہ میں پریشان پھر رہی ہے۔ مگر اس شعر سے معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔ پھولنا خوشی کے موقع پر کہا جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس جھولنا بھی خوشی ہی میں سوجھتا ہے۔ دوسرے ہر شاخ پر جھولتا پھرنا اور بھی مضحکہ انگیز ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ہر باغ میں شاعر نے تناسب کے شوق میں باغ کے لئے پھولنا اور شاخ جھولنا جمع کر دیا ہے۔

صدقے ہو کر کہا خوش آئے | جس گل کی ہوا لگی تھی لائے

پنڈت جی نے شاید یہاں خوش آمدید کا ترجمہ فرمایا ہے دوسرے مصرع میں ہوا لگی غلط

استعمال ہوا ہے۔ ہوا لگنا ان معنوں میں نہیں آتا۔

اے رہرو رہ بروہنا دہ   اے صرصر گل بباد دادہ

دوسرا مصرع بالکل مہمل ہے۔ صرصر گل کے کچھ معنے نہیں معلوم ہوتے۔

یہ کہہ کے لبوں سے قند گھولے   مستی نے دلوں کے عقدے کھولے

قند گھولنا صحیح ہے۔ مگر قند گھولے جمع میں استعمال کرنا غلط ہے۔

آکر جو ہے دیکھتی جمیلہ   روشن تھے چراغ اور فتیلہ

دوسرے مصرع میں فتیلہ واحد استعمال ہوا ہے حالانکہ فعل جمع ہے۔ چراغ اور فتیلہ روشن تھے۔ ہونا چاہیئے۔ علاوہ اسکے جب چراغ مذکور ہے تو فتیلہ کی کیا ضرورت ہے چراغ بغیر فتیلہ کے روشن کیونکر ہو سکتا ہے۔

جاگی تو سب اسکی جوڑ کی تھیں   اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں

اس شعر میں نسیم نے سخت غلطی کی ہے۔ بجائے جمع (پریاں) کے واحد (پری) لکھ گئے ہیں ایک ایسے مشاق ناظم سے ایسی غلطی ہونا تعجب ہے۔

دکھلا نہ مجھے ہرے ہرے باغ   غنچے کی گرہ میں کیا ہے جز داغ

سبز باغ دکھانا اور ہرا باغ دکھانا محاورہ ہے مگر ہرے ہرے باغ دکھانا خاص تصرف پنڈت صاحب کا ہے۔

جس وقت چلا پری کا مانوس   سایا سے پس قدم تھے جاسوس

دوسرے مصرع میں سایا کے بجائے سائے ہونا چاہیئے۔ سایا اس طور پر استعمال کرنا غیر فصیح ہے۔

حیرت زدہ چپ خموش سنسان   ٹوٹا ہوا دل بندھا ہوا دھیان

سنسان ہمیشہ مکان جنگل میدان وغیرہ کی صفت ہوتا ہے۔ آدمی کے لئے کبھی استعمال نہیں ہوتا۔

حال اس سے کہا کہ قول ہارا ‌‌ ہے پیسر یہ نوجوان ہمارا

اس شعر میں پیر کا لفظ محض نوجوان کی خاطر لایا گیا ہے۔ کسی سے قول ہار جانا اور بات ہے اور اسے پیر کہنا یا بنانا دوسری بات ہے۔

اول کہی بدنگاہی اپنی ‌‌ بعد اس کے وہ سب تباہی اپنی

یہاں بدنگاہی کا لفظ ایک نئے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جو ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ بدنگاہی سے شاعر کا مطلب اسکی آنکھوں کی نحوست سے ہے۔ یعنی ایسی منحوس آنکھیں ہیں کہ اسے دیکھتے ہی باپ اندھا ہو گیا۔

پیراہن گل کی بو تھی مطلوب ‌‌ یوسفؑ نے کہا وہ حال یعقوبؑ

اس شعر میں وہ محض بھرتی کا ہے۔ اس قسم کے لفظ بھرتی کے اس مثنوی میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے شعر میں جو بھرتی کا ہے اور خلاف قاعدہ ہے۔

سونپا مختار کو جو مجبور ‌‌ گھر پاس تھا اور وہ منزلوں دور

جو حرف شرط ہے اسکی جزا کہاں ہے۔ دوسرے مصرع کو اس سے کچھ تعلق ہی نہیں دونوں مصرع بے جوڑ ہو گئے ہیں یا مثلاً اس شعر میں۔

پشواز کنار حوض اتاری ‌‌ شب کی پوشاک پہنی ساری

یہاں ساری کا لفظ بالکل بھرتی ہے۔ شاید ساڑی کی تجنیس لفظی دیکھ کر داخل کر دیا ہو اسی طرح۔

روئی وہ بکاولی یہ سن کے ‌‌ تڑپا شہزادہ سر کو دھن کے

یہاں وہ بکاولی کے ساتھ نری بھرتی ہے۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سے شعر ہیں لیا اختصار کس کام کا جہاں بھرتی کے الفاظ اسقدر موجود ہوں افسوس پنڈت چکبست صاحب نے مثنوی کو بنظر تنقید نہ دیکھا ورنہ وہ کبھی اسکی صنعت اختصار پر فخر نہ کرتے۔

تھا داغ پسر مدام اُس کو ‌‌ جنتی تھی ہمیشہ دختر اسکو

دوسرے مصرع میں اسکو خلاف محاورہ ہے۔ اسکو دختر جنتی تھی فصیح زبان نہیں ہے
اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دختر اسکو (یعنی ماں کو) ہمیشہ جنتی تھی۔

ہر جیب، ستارہ ماں کا تھا ماند — تھا چاندنی شہرہ کردیا چاند

یہاں حضرت مصنف محض ستارہ کے خیال سے چاند اور چاندنی لائے ہیں ورنہ کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ کوئی تشبیہ ہی ایسی بھلی اور دلپذیر ہے چاندنی سے مطلب آپ کا بیٹی ہے، اور چاند سے بیٹا۔ یہ طرز کلام بھی کچھ ایسا عمدہ نہیں ہے بلکہ شعرا دنی درجہ کا ہوگیا۔

وہ گندم جو نما تھی بالی — مردانہ لباس سے نکالی

نکالی نہ معلوم کون سی زبان ہے مصنف کا اصل مطلب یہ ہے کہ اسے مردانہ لباس سے نکالا مونث کے خیال سے فعل بھی بے موقع مونث لکھ گئے۔ دکن میں البتہ اسطرح بولتے ہیں۔ تعجب ہے کہ نسیم جیسا شخص ایسی غلطی کرے اور ایک جگہ نہیں متعدد جگہ مثلاً۔

بھڑکائی جمیلہ مادر اسکی — گذرانی خبر برابر اسکی

یہاں بھڑکائی وہی غلط استعمال ہے اور اصل یوں تھا کہ جمیلہ اسکی مادر نے اُسے بھڑکایا۔

حسن آرا تھی جو نیک تدبیر — دکھلائی جمیلہ کو وہ تصویر

اس شعر میں بھی حسن آرا کے خیال سے فعل بجائے مذکر کے مونث استعمال کر گئے ہیں صحیح یہ ہے حسن آرا نے جو نیک تدبیر تھی جمیلہ کو وہ تصویر دکھائی۔

ہر پایے سنے کا شور و غل تھا — سنبل کا جھوڑ تو چتر گل تھا
گل ہے خوانوں میں زردہ لایا — اُن غنچہ دہانوں کو کھلایا
خورشید سا آفتابہ لائے — منھ ہاتھ ہر ایک کے دُھلائے

ان اشعار میں زردہ لایا کا فاعل کہیں مذکور نہیں اور نہ اوپر کے اشعار میں کہیں اسکا ذکر آیا ہے۔ یہ بالکل خلاف قاعدہ اور غیر صحیح ہے البتہ جمع غائب کے صیغہ میں اگر فاعل مذکور نہ ہو تو مضائقہ نہیں جیسا دوسرے شعر میں ہے (خورشید سا آفتابہ لائے) لیکن

افسوس ہے کہ اوپر کے شعر میں واحد کا صیغہ لاکر (یعنے زردہ لایا) انھوں نے اس شعر کو خاک میں ملا دیا۔ کیونکہ ایک شعر میں تو کہتے ہیں زردہ لایا اور اسکے متصل ہی دوسرے شعر میں فرماتے ہیں آفتابہ لائے، یہ بالکل غیر صحیح اور قواعد کے خلاف ہو ایسی لغزشیں ایک ایسے ماہر اور مشاق شخص کے قلم سے ہوں حیرت اور افسوس کا مقام ہے۔

جو گائنیں تھیں شہانے گائیں　　　لیتے ہوئے نیگ راگ لائیں
حق پاکے جو رکھتی تھیں قدامت　　　بولں اُٹھیں مبارک و سلامت

یہاں جو رکھتی تھیں قدامت۔ نہ صرف بھرتی ہے بلکہ لغو بھی ہے اور اس سے کلام کا لطف جاتا رہا ہے جب پہلے شعر میں کوئی خصوصیت نہیں ہے تو دوسرے شعر میں مبارک سلامت کہتے وقت قدامت کی خصوصیت کیوں کیگئی۔

غربت میں وطن کی دھن سمائی　　　اس فیل کو یاد ہند آئی

یہاں مصنف نے کمال کردیا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے سر پر ضلع جگت کا جن سوار ہے کسقدر بھدّا فقرہ کہا ہے۔ تاج الملوک کو فیل سے تشبیہ دینا کسقدر ناموزوں مکروہ اور سرتاپا مہمل ہے۔ نسیم کے ایسے شعروں سے بدمذاقی کی بسانداتی ہے۔

ان مختصروں نے جب دیا طول　　　بولی وہ بکاؤلی کہ معقول

یہاں حرف طول کے لئے مختصروں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے شاعر کا مطلب اُن لوگوں سے ہے جو تاج الملوک کے آنے پر مبارکباد دے رہے تھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ لفظ اُن معنوں میں کس لحاظ سے استعمال ہوا ہے حیرت ہے کہ اس قسم کی صریح غلطیاں ایسے شخص سے سرزد ہوتی ہیں جو استاد مانا جاتا ہے۔ یہ سب لفظی تناسب اور ضلع جگت کی بدولت ہو بدمذاقی کی پہلی سیڑھی ہے۔ بُرے بھلے میں مطلق امتیاز نہیں رہتا۔

بولیں کہ طلب کیا ہے چلیئے　　　جوڑا یہ خراب ہے بدلیئے
اُٹھی اُسے جی کی طرح چھوڑا　　　بدلا مانند رنگ جوڑا

دوسرے شعر میں جوڑے کے اتارنے کو جی کے چھوڑنے سے تشبیہ دی ہے یہ تشبیہ کسی طرح چسپاں اور مناسب حال نہیں ہے جی چھوڑنے کے معنی جہاں تک ہمیں معلوم ہیں ہمت ہارنے مایوس ہو جانے کے ہیں نہ معلوم جوڑے کے بدلنے کو اس سے کیا مناسبت ہے اگر محض لفظوں سے بحث ہو کہ جیسے جی کے ساتھ چھوٹ جانا مستعمل ہے ویسے ہی جوڑا بھی بدلتے وقت بدن سے چھوٹ جاتا ہو تو یہ ایک مبتذل اور ادنیٰ درجہ کا بازاری لطیفہ رہ گیا ہے دوسرا مصرع (بدلا مانند رنگ جوڑا) بھی ویسا ہی ہے۔ اگر اسکے یہ معنی ہیں کہ جیسے وہ گھڑی گھڑی رنگ بدلتی تھی ویسے ہی بار بار جوڑے بدلتی تھی تو صریحاً غلط ہے اور اگر اسکے یہ معنے ہیں کہ جیسا رنگ تھا ویسا ہی لباس بھی بدلا تو یہ کوئی بات نہیں۔ یہ شعر اسی قبیل سے ہے جسپر مولانا حالی اعتراض کر چکے ہیں۔

دائیں دیکھا نظر نہ آئی بائیں دیکھا کہیں نہ پائی

پائی غلط ہے۔ پایا ہونا چاہیئے نسیم ایسی غلطی کئی بار کر چکے ہیں۔

آتے ہی زمیں سے آسماں پر پہونچی اس بزم میں سماں پر

اول سماں غلط ہے۔ سمے ہونا چاہیئے۔ دوسرے یہاں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سماں کے معنی کیا لئے ہیں جسقدر معنی سماں کے مشہور اور معلوم ہیں اُن میں سے کوئی بھی یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اس معمے کو غالباً پنڈت چکبست صاحب حل فرمائیں گے۔

اِس گل سے نسیم زر نہیں مانگ جو چاہے وہ بیحساب دیدے

امر کے ساتھ نہیں استعمال ہوتا نہ ہونا چاہیئے۔ یا مت

روئی وہ بکاؤلی یہ سن کے تڑپا شہزادہ سر کو دھن کے

یہاں (وہ) محض بھرتی کا ہے۔ صنعت اختصار کے ساتھ یہ بھرتی کسقدر ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔ سارا قصہ کہہ گئے اور اسپر بھی بکاؤلی اسقدر غیر معروف ہے کہ اسکے لیئے وہ کی ضرورت باقی ہے۔ (نقاد)

از رسالہ زمانہ بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۰۶ء جلد ۶ نمبر ۴

گلزار نسیم اور تنقید نقاد

(جواب "نقاد" - از ضامن کنتوری)

رسائل اور اخبارات سے اتنا فائدہ تو ضرور نمایاں ہے کہ اُمنگ بھرے دلوں میں تنقید لکھنے کا چرچا ہو چلا ہے جسکا ابتک ہم میں دستور ہی نہ تھا اگرچہ تنقید نویسی کی جسقدر ضرورت ہو اور جیسی یہ تصنیفات اور مصنفین کے حق میں مفید ہو اسکے بیان کی اس موقع پر حاجت نہیں کیونکہ یہ عنوان ایک جداگانہ مضمون چاہتا ہو جو اس مختصر تحریر کے مبحث سے خارج ہو اسوقت ہمکو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آجکل جو گلزار نسیم اور مثنوی میرحسن ہمارے پرجوش نقادوں کی جولانگاہ بنی ہوئی ہیں اس سے انکا منشا کیا ہے؟ اگر ان تنقیدی کوششوں کا ماحصل قدیم اُردو لٹریچر کے محاسن و معائب پر نظر ڈالنا اور زبان اُردو کی چھان بین کرنا ہے تو کیا اُردو اور کیا اسکا لٹریچر جسمیں بجز چہار درویش فسانہ عجائب یا اور ایسے ہی چند بے سروپا قصوں کے سوا نثر کا تو کہیں پتہ ہی نہیں رہی نظم اسکا یہ حال ہے کہ ابوالشعرا۔ ولی سے لے کر شعرائے دور آخر تک کے دواوین لیکے دیکھیے اور انصاف سے دیکھیے کہ اسمیں کسقدر حصہ کارآمد یا کم از کم ایسا ہے جو مہذب سوسائیٹیوں میں پڑھنے کے لائق بھی ہو۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ ان ارواح مقدسہ کا احسان زبان اُردو پر نہیں ہے؟ ہے اور بہت کچھ ہے۔ ہر طبقے کے اساتذہ نے کچھ نہ کچھ کوشش زبان کے صاف کرنے اسکی

ترکیبوں کے سلجھانے اور طرزِ بیان میں سادگی و سلاست پیدا کرنے میں کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں اور اگرچہ الٹ پلٹ ہر زبان میں اسوقت تک ہوتی رہتی ہے جبتک کہ زبان زندہ رہتی ہے مگر پھر بھی ہم انکی مساعی جمیلہ کے مشکور ہیں۔ لیکن کیا یہ بھی لازم ہے کہ اس مشکوری کی بنا پر ہم اپنا عزیز وقت ضائع کریں استغفر اللہ اب خلیل خاں کے فاختہ اڑانے کے دن نہیں رہے۔ جو سے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے تھے وہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔ وہ زمانہ انکے ساتھ گیا ہمارا زمانہ اور ہے انکا زمانہ اور تھا ہماری ضروریات اور ہیں انکی ضروریات اور تھیں وہ جو کچھ کرتے تھے محض ہنسی مذاق اور دل خوش کرنے کے لیئے ہم کو چاہیئے کہ جو کریں اگر وہ کار بیکاری ہو جب بھی اس میں کوئی بات کام کی نکالیں اور اس فکر ہی کو گاؤ خورد کریں جو کارنامۂ بیکاری ہے۔

تاہم اگر ہمارے جوشیلے اہل قلم یہی چاہتے ہیں کہ اردو کے اس لعنت پر پوچ کلاسکل لٹریچر کی یاد تازہ رکھیں تو یہ نظیریں جو دکن ریویو اور زمانہ نے گلزار نسیم اور مثنوی میر حسن کی ہجو میں پیش کئے ہیں انکی نسبت ہم کہیں گے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اسے اعرابی   کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

میں ایک منٹ کے لیئے بھی تسلیم نہیں کرسکتا کہ نسیم ہوں یا میر حسن حضرت نقاد ہوں یا زید عمرو بکر۔ ایک سراسر عیب اور دوسرا بالکل عیوب سے مبرا ہے۔

ع اللہ بنی توان شدن آدم باش میرے خیال میں میر حسن دہلوی (مسلمان) اور نسیم لکھنوی (ہندو) دونوں آدمی تھے دونوں سے غلطیوں کا ہونا ممکن تھا اور دونوں نے غلطیاں کی ہیں چنانچہ خود یہی تنقیدیں انکے اغلاط کو ثابت کر رہی ہیں مگر ان انسانی لغزشوں سے انکے کمال میں سرِ مو فرق نہیں آسکتا تاہم یہ دیکھنا ہے کہ خود حضرت نقاد کہاں تک برسرِ غلط ہیں جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ نقاد صاحب کی تحریر یا بنائے مخاصمت ہے یا بنائے نافہمی جو اعتراضات کہ صحیح ہیں ان کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں اور انکے

ساتھ اپنی مشکوری بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر جن اشعار کو ہمارے نقاد صاحب خود نہیں سمجھے ہیں اُنکی توضیح کرکے اتنی گزارش کرنی چاہتے ہیں ع عیب مے جملہ بہ گفتی ہنرش نیز بگو۔ چاہیے یہ تھا کہ آپ ایسے بیجا اعتراض کرکے اپنی ناقدری ظاہر کرنے کے بجائے تھوڑا سا عمدہ انتخاب بھی کر دیتے تاکہ لوگ آپ کو بے تعصب اور سچا نقاد سمجھتے۔

پہلے ہم گلزار نسیم کی تنقید پر نظر ڈالتے ہیں جو زیادہ تر محتاج ریویو ہے افسوس ہے کہ اسوقت اسکا صرف ایک ہی نمبر ہمارے سامنے ہے لیکن مشتے نمونہ از خروارے بس است

شادی کے لیئے ہے کلکِ شنجرف　　　انگشت قبول دیدۂ حرف

نقاد صاحب اس شعر کو المعنی فی البطن الشاعر فرماتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے کلک شنجرف اسلئے کہا ہے کہ شادی کا مضمون سرخ کاغذ پر یا سرخی سے لکھا جاتا ہو شتر یوں ہوئی (شادی) (کا مضمون لکھنے کے لیئے) کلک شنجرف دیدۂ حرف کی (بمعنی پر) انگشت قبول ہے مطلب یہ ہوا کہ حرف نے (جسکا دائرہ چشم سے مشابہ ہے) اپنے لکھنے کی اجازت قلم کو دی (اس طور سے کہ انگشت قلم کو اپنی آنکھ پر رکھ لیا چنانچہ فارسی کا عام محاورہ ہے چشم زنخشم اٹکلف شعری ذوق سلیم سے پوشیدہ نہیں اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو مجبوری ہے۔

چپکی ہوئی پیٹھ سے وہ دلگیر　　　آئینہ کی پشت پر تھی تصویر

نقاد صاحب نے ہجے غلط کیئے اور شعر کو مہمل کہدیا! سُبحان اللہ ج پ پیش چُپ کا ف ی زیر کی چُپکی نہیں بلکہ ج پ زیر چِپ کا ف ی زیر کی چِپکی پڑھیئے مطلب سمجھ جائیگا۔

وہ دل ہوں جو جا نبین راضی　　　یہ جان لے کیا کریگا قاضی

جانبین اور جان لے کے حشو ہونے پر اعتراض ہے اور صحیح اعتراض ہے مگر اسکو حشو بتانے کے بجائے ایسی عبارت میں اعتراض کیا گیا ہے جو ایک شاعر کی سمجھ سے باہر ہے اور معترض صاحب کی لیاقت کو بتا رہا ہے پھر بھی ہم آپ کی خاطر سے اس شعر کو

یوں بنا لئے دیتے ہیں ؎

باہم دو دل اگر ہوں راضی　　بیچارہ کیا کرے گا قاضی

اک نہر تھی شہر کے برابر　　ٹھٹکے سیّارے کہکشاں پر

آپ فرماتے ہیں "کہ غالباً سیاروں سے مطلب چاروں بھائیوں سے ہے غالباً کی ضرورت نہیں یقینی شہزادے مراد ہیں۔ اس مناسبت سے کہ وہ مسافر تھے اور کہکشاں سے قطعی مراد نہر ہے وجہ شبہہ یہاں بھی موجود ہے اسکو علم بیان کے کسی رسالہ میں ملاحظہ فرمائیے دوسرا یہ اعتراض کہ (سیاروں) کا کہکشاں پر پہونچ کے ٹھٹکنا کیا معنی؟ میری سمجھ میں نہیں آیا شاید آپ مشبہ اور مشبہ بہ کے افعال و خواص میں بھی مناسبت تام ڈھونڈھتے ہیں؟ شکر ہے کہ نسیم زندہ نہیں ورنہ اُسے بھی سر پیٹ پیٹ کے "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد) کہنا پڑتا ؎

وہ ریگ رواں کا گرد لشکر　　یعنے تاج الملوک ابتر

ارشاد ہوتا ہے "کہ ریگ رواں کا گرد لشکر کیا بلا ہے علاوہ ازیں کہ کیا بلا ہے کے جملے سے اعتراض طفلانہ ہوگیا ہے لغو بھی ہے۔ سنئے ریگ رواں کو بوجہ کثرت و روانی کے لشکر سے تشبیہہ دی ہے۔ لیکن لشکر کے پیچھے گرد رہتی ہے۔ لیکن گرد کے پیچھے گرد کہاں اسلیئے تاج الملوک کو گرد لشکر کہا۔ فتدبر۔

سوچی کہ نہ اب بھی چال رہیئے　　شادی کا مزا نکال رہیئے

بلا شبہہ یہ شعر بھونڈا اور خلاف محاورہ سا ہے (اگر نسیم خود اتھارٹی ہے) مگر معترض کا یہ کہنا کہ (شاید لکھنؤ کا محاورہ ہو) اعتراض کو بے وقعت کیئے دیتا ہے (بوئے تعصب می آید)

کام اُس کا تھا بسکہ کھیل کھانا　　چوسر کا جما وہ کارخانہ

اسپر بھی اعتراض غلط کیا گیا ہے۔ محاورہ کھلنا کھاتا نہیں بلکہ کھیل کھانا ہی ہے

جسکے معنوں کی تشریح خلاف تہذیب ہے کھیلنا کھانا بچوں کے لئے کہیں غ کسبیوں کے لئے۔

سمجھا وہ کہ ہے شگون نرالا ۔ بھولا پکڑا آستین میں پالا

فرماتے ہیں کہ شگون کے ن کا اعلان نہ کرنا غلط ہے مگر شگون فارسی لفظ ہے اور فارسی میں حرف لین کے بعد ن کا اعلان ناجائز ہے۔ اگر یہ کہئیے کہ بلا اضافت ہونے کی وجہ سے آپ اسکو غلط ٹھہراتے ہیں تو ناسخ کے اس مطلع کی نسبت کیا ارشاد ہوگا۔

رفعت کسی کی دل کو گوارا یہاں نہیں ۔ رہتے ہیں اُس زمین پہ جہاں آسماں نہیں

اسمیں بھی زمین و آسمان کے ن کا اعلان نہیں کیا گیا ہے بلاشبہہ متاخرین نے اردو ترکیب میں ایسے نون کا اعلان نہ کرنا مکروہ سمجھا ہے مگر پروفیسر صاحب کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اُسے غلط کہیں غیر فصیح اور غلط میں بہت فرق ہے۔

اے رہرو رہ بر رہ نہادہ ۔ وے صرصر گل بہ باد دادہ

پروفیسر ‘بی‘ اے صاحب فرماتے ہیں کہ دوسرا مصرع بالکل مہمل ہے صرصر گل کے کچھ معنی نہیں معلوم ہوتے۔ اس اعتراض کو پڑھ کے حضرت کے مذاق فارسی دانی پر تعجب ہوتا ہے۔ صرصر گل کے واقعی کچھ معنی نہیں ہیں۔ لیکن اس کی نثر یوں فرمائیے۔ اے گل بہ باد دادہ صرصرا یعنی اے آن صرصر کہ گل را بہ باد دادہ۔ اب آپ کو معلوم ہوگا کہ صرصر موصوف ہے اور گل بباد دادہ اُس کی صفت (ترکیبی) ہے ایسی ترکیبیں فارسی میں کثرت سے ہیں آپ کہاں تک اعتراض کرینگے؟ دیکھئے مرزا بیدل فرماتے ہیں ؎

برلوح تحیر رقم گفت و شنید ۔ فہمیدیم انچہ نتواں فہمید
ایں سنگدلاں خاک اسباب بچشم ۔ یک اشک ندیدہ شرم احباب بچشم

ہاں اس شعر میں اگر کوئی عیب ہے تو یہ ہے کہ اُسکی ترکیب فارسی واقع ہوئی ہے جس سے پروفیسر صاحب کو اسکے سمجھنے میں دشواری ہوئی رہا جو تکلف تاج الملوک کی

حالت مناسبت سے صرصرگل باد دادہ کی مثال میں پیدا ہے اسکا لطف صاحب ذوق سلیم ہی حاصل کرسکتا ہے۔

یہ کہکے لبوں سے قند گھولے مستی نے دلوں کے عقدے کھولے

اعتراض یہ ہے کہ قند گھولا ہونا چاہیئے نہ کہ قند گھولے۔ ممکن ہے کہ مصنف نے قند گھولا کہا ہو اور دوسرا مصرع یوں ہو ع مستی نے دلوں کا عقدہ کھولا۔ اگر نہیں نقاد صاحب کا اعتراض اسبات پر ہے کہ جب مسٹر پلین نون (اسم مادی) کی جمع گرامر کے قاعدے سے نہیں ہوسکتی تو قند گھولے کیا معنی؟ لیکن عام اس سے کہ اردو میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں ہے یہاں معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ یہ قنادی کی دوکان نہیں ہے نقاد صاحب پھر غور فرمائیں۔

آکر جو یہ دیکھتی جمیلہ روشن تھے چراغ اور فتیلہ

اعتراض دو ہیں۔ ایک یہ کہ فاعل (فتیلہ) واحد اور فعل جمع ہے یہ غلط ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ غلط ہے۔ لیکن اس غلطی کے ذمہ دار مسٹر چکبست ہیں۔ دوسرے اڈیشنوں میں یہ مصرع یوں ہے ع روشن تھا چراغ میں فتیلہ۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جب چراغ مذکور ہے تو فتیلہ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ چراغ بغیر فتیلہ جل ہی نہیں سکتا یہ اعتراض بلحاظ موقع درست نہیں ہے۔ فتدبر۔

دکھلانہ سکے ہرے ہرے باغ غنچے کی گرہ میں کیا ہے جز داغ

نقاد صاحب فرماتے ہیں کہ ہرے ہرے باغ دکھانا غلط ہے اور ہرا باغ دکھانا اور سبز باغ دکھانا صحیح ہے، میں کہتا ہوں کہ اگر ہرے ہرے باغ دکھانا غلط ہے تو ہرا باغ دکھانا بدرجۂ اولےٰ غلط ہے محاورہ فقط سبز باغ دکھانا ہے۔

جس وقت چلا پری کا مانوس سایا سے بین قدم تھے جاسوس

ظاہرا یہ اعتراض صحیح ہے کہ سایا سے بجائے سائے کے ہونا چاہیئے اسلیئے کہ حرف معنی کے

آنے سے جن اسمائے مذکر کے آخر الف یا ہائے مختفی ہو وہ یائے مجہول سے بدل جاتی ہے لیکن پروفیسر صاحب نے تلبیس پر غور نہیں کیا۔ سے حرف تشبیہ بھی ہے اور راز کے معنوں میں بھی اسی وجہ سے شاعر نے ابہام سے بچنے کے لئے عام قاعدے کی پابندی نہیں کی۔

روزمرہ کی گفتگو میں بھی اسکی نظیر ملتی ہے اور میر انیس مرحوم کا یہ شعر بھی موجود ہے۔

پھولے سماتے تھے نہ محمد کے گلعذار دولھا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلوں کا ہار

اس شعر میں اگر دولھا کو بنے ہوئے تھے کا فاعل قرار دیں تو سخت غلطی ہو اگر مفعول قرار دیں جب بھی جمع درکار ہے البتہ حرف تشبیہ کا ساقط ہونا صحیح ہو سکتا ہے اس طور پر نسیم کا سایا اور میر انیس کا دولھا ایک قاعدے کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ اس پر بھی اگر آپ ہی کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے جب بھی میں اتنی سفارش کرتا ہوں کہ سایہ کو ہائے مختفی کے ساتھ پڑھیئے اور کتابت جدید پابندیوں سے قطع نظر کرکے اپنے پچھلے رسم الخط پر غور فرمائیے (مثلاً اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے یہ چیز دو روپیہ کو آتی ہے) اور اس قسم کے بے معنے اعتراض کرنے کی کوشش نہ کیجئے البتہ اس شعر میں مانوس محض قافیہ کی ضرورت سے بے محل استعمال ہوا ہے جو نظر انداز کر دیا گیا۔

حال اُس سے کہا کہ قول ہارا ہے پیر یہ نوجواں ہمارا

اعتراض یہ ہے کہ پیر محض نوجواں کی خاطر لایا گیا ہے کسی سے قول ہار جانا اور بات ہے اور اُسے پیر کہنا یا بنانا دوسری بات ہے۔

اگر ایسے ہی اعتراض ہیں تو ہم تمام ایشیائی شاعری کو بلا دلیل معترض علیہ مانے لیتے ہیں کیونکہ جن باتوں کو آپ عیوب کہہ رہے ہیں ہم غلطی سے انکو محاسن سمجھے ہوئے تھے۔ معاف کیجیے گا! مگر ہم آپکو لطف معنی سے بھی آگاہ کئے دیتے ہیں تاکہ شکایت رفع ہو جائے آپ جانتے ہیں کہ پیر و مرشد، پیر و مرشد، گرو گرو گھنٹال وغیرہ الفاظ محاورے میں اس موقع پر بولے جاتے ہیں جب ایک شخص دوسرے کسی امر میں سبقت لیجائے اور وہ بھی اکثر دغا بازی چالاکی

مکاری فریب وغیرہ میں یہ شعر اس موقع پر کہا گیا ہے جبکہ دیو تاج الملوک کے کھا لینے پر آمادہ ہے اتفاقاً چند اونٹ آجاتے ہیں انکو مار کر لاتا اور تھک کے لیٹ جاتا ہے تاج الملوک کو یہ چالاکی سوجھتی ہے کہ اونٹوں پر سے میدہ گھی۔ شکر لیکے حلوا پکاتا ہے اور دیو کو کھلاتا ہے اور جب دیو اس خدمت کے عیوض میں اظہار مشکوریت کرتا ہے تو فریب دیکے اس سے باغ بکاولی میں پہونچانے کا وعدہ لیتا ہے۔ اسی بنا پر دیو کہتا ہے کہ یہ لڑکا تو میرا بھی پیر نکلا) رہا الفاظ نوجوان و پیر میں جو صنعت طباق ہے اسکو آپ نے خاطر کی فلسفی یا شاید منطقی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے جس خوبی کے ساتھ محاورے میں کھپا لی گئی ہے اس نے اس شعر کو سہل ممتنع کے درجہ پر پہونچا دیا ہے جسکو ایک غیر شاعر کا دماغ نہیں محسوس کر سکتا۔

تھا داغ پسر میسر اُس کو　　　جنتی تھی ہمیشہ دختر اس کو

فرماتے ہیں دوسرے مصرع میں اُس کو خلاف محاورہ ہے۔ اُسکو دختر جنتی تھی فصیح زبان نہیں ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دختر اسکو (یعنی ماں کو) جنتی تھی یہاں بھی پروفیسر صاحب نے عبارت صحیح نہیں پڑھی جنتی کو تائے فوقانی کے ساتھ نہیں۔ بلکہ مشدد پڑھیے۔ اگر آپ ہی کے ہیجے درست سمجھے جائیں تو اسکو خلاف محاورہ نہیں بلکہ حشو قبیح ہوگا اور ردیف بیکار ہوئی جاتی ہے۔ جو معنی آپنے تجویز کیے ہیں یہ آپ ہی کی تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ نسیم بیچارے میں اتنی لیاقت کہاں تھی ہاں شعر میں ضعف تالیف ضرور ہے جس کو آپ خلاف فصاحت تعبیر فرماتے ہیں۔

ہرچند ستارہ ماں کا تھا ماند　　　کھی چاندنی شہرہ کر دیا چاند

یہ کوئی زیادہ برہم ہونے کی بات نہیں کہ ستارہ کی رعایت سے چاندنی کیوں لائے، اگر آپ ایسا ہی ایشیائی شاعری سے ناراض ہیں تو انگریزی کے خدائے سخن شیکسپیر کو ملاحظہ فرمائیے کسقدر لفظی مناسبات کا دلدادہ ہے اسپر بھی ممکن ہو کہ چاندنی لڑکی کا نام ہو۔

وہ گندم جو نما تھی بالی　　　مردانہ لباس میں نکالی

ارشاد ہوتا ہے کہ نکالی نہ معلوم کس زبان کا لفظ ہے مصنف کا اصل مطلب یہ ہو کہ مردانہ لباس سے نکالا۔ مؤنث کے خیال سے فعل بھی بے موقع مونث لکھ گئے۔ بیموقع مؤنث لکھ گئے کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا اسلئے کہ پروفیسر صاحب نے کوئی قاعدہ نہیں بتایا۔ اگر میرا خیال غلط نہ ہو تو شاید پروفیسر صاحب نے اپنے خلاف شان سمجھ کے اُردو کے قواعد بلکہ محاورات روزمرہ پر بھی کبھی غور نہیں فرمایا ہے ورنہ کبھی ایسے بیباکانہ اعتراض کی جرأت نہ فرماتے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب علامت فاعل (نے) مذکور ہو اور علامت مفعول (کو) نہو اس صورت میں فعل ہمیشہ وحدت اور جمعیت اور تذکیر و تانیث کے اعتبار سے مفعول کا تابع ہوتا ہے جیسے اس نے صندوق سے گھڑی نکالی) روپیہ نکالا آپ فرمائیں گے کہ اس شعر میں فاعل ہی مذکور نہیں تو علامت فاعل بیچ میں کھوئے دیتا ہوں اسلیئے یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ نکالی صیغۂ واحد مؤنث غائب فعل ماضی مطلق متعدی معروف ہے اور متعدی معروف کے ماضی مطلق کے فاعل کے ساتھ علامت فاعل کا ہونا لازمی ہو علامت مفعول یہ مذکور نہیں اپنی تشریف ہوئی۔ وہ گندم جو نما (جو) بالی تھی مردانہ لباس میں نکالی (نکالی) اُردو زبان کا لفظ ہے وبسٹر کی ڈکشنری میں نہیں مل سکتا۔

حسن آرا تھی جو نیک تدبیر دکھلائی جمیلہ کو وہ تصویر

اس شعر پر بھی وہی مہمل اعتراض ہے کہ فعل بجائے مذکر کے مؤنث استعمال کر گئے ہیں یعنی دکھلائی کی جگہ دکھلایا کیوں ہوا لیکن اور لطیفہ سنئے فرماتے ہیں صحیح یہ ہے کہ حسن آرا نے جو نیک تدبیر تھی جمیلہ کو وہ تصویر دکھائی۔ کیوں صاحب فعل تو اب بھی مؤنث ہی رہا۔ پھر آپ کا اعتراض کیا ہے شاید اس اعتراض سے آپ کا منشا اپنے اعتراض ماسبق کی تردید ہو گی یا یہ کہ نسیم شعر نہ کہتا نثر لکھدیتا۔ مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ اُسکے بعد ایسے ایسے نقاد سخن پیدا ہونگے۔ اگر آپ کی نثر کے مطابق نسیم کو کہنا ہوتا تو وہ پہلے مصرعے کو یوں کہتا ع حسن آرا نے جو تھی نیک تدبیر الخ لیکن اس ترکیب سے بندش کے علاوہ لطف بیان بھی

گھٹ جاتا۔ اس لئے شاعر نے بلاخوف اصلاح موجودہ ترکیب قائم رکھی اور دوسرے مصرعے فاعل (اُسنے) کو محذوف کر دیا۔ ترکیب شعر کی یہ ہوئی:۔ حُسن آرا موصول (جو ضمیر صلہ نیک تدبیر تھی۔ جو کا صلہ موصول ضمیر جمیلہ) اور صلہ مل کے مبدل منہ اسنے ضمیر فاعل پوشیدہ بدل۔ بدل مبدل منہ سے مل کر فاعل ہوئے۔ دکھلائی فعل متعدی بہ دو مفعول۔ وہ اشارہ تصویر مشار الیہ اشارہ اور مشار الیہ مل کے مفعول بہ جمیلہ مفعول ثانی کو علامت مفعول یہ سب مل کے جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔ پھر بھی اگر آپ فعل مذکر ہی کے خواستگار ہیں تو اپنے اصلاحی جملہ کو یوں پڑھیئے۔ حُسن آرا نے جو نیک تدبیر تھی جمیلہ کو اُس تصویر کو دکھایا دیکھیئے علامت مفعول ظاہر ہونے سے فعل مذکر ہو گیا۔

گل سے خوانوں میں زردہ لایا ۔۔۔ اُن غنچہ دہانوں کو کھلایا

اعتراض ہے اور صحیح ہے کہ لایا کا فاعل ظاہر نہ ہونے سے شعر خلاف محاورہ ہو گیا مگر عاقلاں در پے لفظ نہ روند۔ لایا کو آیا پڑھ لیجئے اور شعر کو درست سمجھیئے۔

دائیں دیکھا نظر نہ آئی ۔۔۔ بائیں دیکھا کہیں نہ پائی

اس اعتراض میں بھی فعل کی تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہے۔ معلوم نہیں صحیح ہو یا غلط اصل کتاب کے موجود نہ ہونے سے فعل استعمال معلوم نہ ہو سکا البتہ گذشتہ اعتراضات سے یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ ایں ہمہ بچہ شتر است۔

اُس گل سے نسیم زر نہیں مانگ ۔۔۔ جو چاہے وہ بےحساب دیدے

اس شعر میں نہیں مانگ پر اعتراض ہے لیکن اگر نہ مانگو پڑھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے تاہم معترض صاحب کی کوشش قابل داد ہے کہ ایک اتنا بڑا اعتراض ڈھونڈ نکالا اس سے بڑھ کے کیا ہو سکتا ہے۔

گھر چھوڑ کے چل بسے سب انسان ۔۔۔ پھر تن میں نہ آئے صورتِ جان

فرماتے ہیں نقاد صاحب کہ دوسرا مصرع بوجہ اختصار کے بے معنی ہو گیا ہے اُس سے

خیال ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اپنا شہر چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے تھے انکے رہنے کی جگہ تن تھی شاعر کا اصل مقصد اسکے کہنے سے یہ تھا کہ جسطرح جان تن میں نہیں آتی اسی طرح وہ لوگ پھر اپنے دیس کو نہ گئے الخ۔"

ہم بھی اعتراض کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ دوسرے مصرعے کا تمثالیہ ہونا مان لیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ مصرعے کی ترکیب یوں واقع ہوئی ہے کہ گھر کو تن سے استعارہ کیا ہے۔ استعارہ اور تشبیہ میں بھی فرق ہے کہ اول الذکر میں صرف تشبیہ کو ساقط کر دیتے ہیں پس اس شعر کی نثر یوں فرمائی گھروں کو (جو بمنزلہ) تن تھے چھوڑ کے سب انسان چلے گئے (اور پھر) بصورت جان (اُن میں واپس) نہ آئے اس تشریح کے بعد دو مطلب اس شعر سے سمجھے جا سکتے ہیں ایک تو یہ کہ مردہ تنوں میں (یعنی خالی گھروں میں) جان نہ پڑی (یعنی وہ لوگ واپس نہ آئے) دوسرا یہ کہ جسطرح جان تن سے جا کے تن میں واپس نہیں ہوتی اسی طرح وہ بھی واپس نہیں ہوئے)

نکلا جیسے ہی مٹھ کے باہر پتھرا گئی چشم حلقۂ در

ارشاد ہوتا ہے کہ دوسرے مصرع کا تعلق پہلے مصرعے سے نہیں معلوم ہوتا.... اسکے جانے سے چشم حلقۂ در کیوں پتھرا گئی؟" ہم نے ایک پرانے اُستاد سے سنا ہے کہ شاعر جب شعر کی فکر کرنے بیٹھتا ہے تو پہلے قافیہ تلاش کر لیتا ہے اُسکے بعد الفاظ ڈھونڈھ کر جمع کرتا ہے پھر اسمیں سے اچھے اچھے لفظ چنکر کسی ایک مصرعے کی بھرتی کر لیتا ہے۔ جب اس سے فارغ ہوا جھٹ سے اسکے برابر دوسرا مصرعہ بھی تراش لیا آخری درجہ ہے معنی بٹھانے کا اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ خیالات کے ہجوم میں معنی بٹھانا بھول جاتا ہے ممکن ہے کہ نسیم سے بھی یہ فروگذاشت ہو گئی ہو مگر ہمارے ذہن میں اس شعر کے یہ معنے آتے ہیں اگر آپکے ذہن نشین بھی ہو سکیں۔

شعر اس موقع پر کہا گیا ہے جب تاج الملوک نے طلسمی قید خانہ سے رہائی پائی ہے اسمیں باریک بات قید خانہ کا طلسمی ہونا ہے جسکی وجہ سے شاعر نے اس مضمون کی بنا ڈالی ہے

مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ تاج الملوک کی رہائی کے قیدخانہ کا در بند ہوگیا (پتھر کی طلسمی دیوار سے) اس مضمون کو شاعر نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ قیدی کی مفارقت کا قیدخانہ کو اسقدر رنج ہوا کہ وہ اندھا ہوگیا۔ اس خیال کے پیدا ہونیکی وجہ یہ ہوئی کہ تاج الملوک کے خیال کے ساتھ اسکے حسن وجمال کی طرف ذہن منتقل ہوا ساتھ ہی خیال یوسف اور زندان مصر کی طرف پہونچا) اور وہاں سے اُچک کر یعقوبؑ کے بیت الحزن میں داخل ہوا۔ یعقوبؑ پر مفارقت کا اثر یہ دیکھا کہ اندھے ہوگئے ہیں۔ شاعر کو ایک ذراسی تحریک کافی ہے بس نسیم نے قیدخانہ کو اندھا بنا دیا آنکھ سے استعارہ کرنے کو حلقۂ در موجود ہی تھا جسکا پتھر سے بند ہوجانا اس مصرعے کے موزوں کرنے کا باعث ہوا ع پتھرا گئی چشم حلقۂ در۔ دیکھیے شعر میں تو میں نے معنی پہنا دیے ہیں اب سمجھنا نہ سمجھنا آپ پر منحصر ہے۔

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی　　　بینائی کے چہرے پر نظر کی

اعتراض ہے کہ دوسرا مصرع بالکل بے معنی ہے مصنف کے سوا دوسرا اسکی تہ کو نہیں پہونچ سکتا۔ مصرع بالکل صاف ہے اگر کوئی نہ سمجھے تو مجبوری ہے۔ رشتۂ امید چہرۂ امید وغیرہ الفاظ تو ضرور آپنے سنے ہونگے اسی قبیل سے چہرۂ بینائی بھی ہے اسکو مجاز مرسل کہتے ہیں۔ معنے یہ ہوئے کہ بیٹے کی نظر سے نظر ملنے کے بعد جب اپنی بینائی کو دیکھا تو نہ پایا۔ یہاں اعتراض اور پیدا ہوتا ہے کہ اندھا ہونیکے بعد دیکھا کیونکر اسکی نسبت میں یہ صلاح دوں گا کہ دیکھنے کے مختلف معنی اور موقع استعمال مولوی سید احمد دہلوی سے دریافت فرما لیجیے۔

ہے باغ بکاؤلی میں اک گل　　　پلکوں سے اُسی پہ مار چنگل

فرماتے ہیں کہ مضمون مبتذل ہے مگر اُسکا کوئی جواب نہیں دوسرا اعتراض ہے کہ اُسی خلاف محاورہ ہے اُس ہونا چاہیے۔ بالکل بجا ہے ہم بھی کیوں نہ سمجھ لیں کہ شاعر نے اُس کہا مگر ہی کے نکال دینے سے مصرعے کی موزونیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

دانا تو کرے کب اس طرف میل　　　ہارا ہے جو سے کے نام سے بیل

اعتراض ہے کہ ضلع جگت کے سوا شعر میں کچھ نہیں۔ سبحان اللہ یہ بھی کوئی اعتراض ہے یہ تو غور فرمائیے کہ اُس وقت کی سوسائٹی کا مذاق کیا تھا۔ "چلتے تھے اُدھر سے دو جواری الخ" فرماتے ہیں کہ چلتے تھے غلط ہے۔ مگر خدا نے ہمکو بھی عقل دی ہے۔ بالفرض نسیم بالکل ہی کودن تھا جب بھی آتش کیونکر گوارا کرتے (جنکی نظر سے گلزار نسیم گزر چکی ہے) کہ روزمرہ کی ایسی کھلی غلطی باقی رہے۔ ہم اسکو جاتے تھے کیوں نہ پڑھیں۔

صدقے ہو کر کہا خوش آئے — جس گل کی ہوا لگی تھی لائے

پہلا اعتراض ہے کہ خوش آئے خوش آمدید کا ترجمہ کیا ہے جو خلاف محاورہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خوش آمدید کا ترجمہ ہرگز نہیں ہے بلکہ خوش رنجیدہ کے خلاف اپنے اصلی معنوں میں استعمال ہوا ہے یہ شعر غالبًا اُس موقع کا ہے جب تاج الملوک گل بکاؤلی کیلئے پلٹا ہے اور بیوا اس سے استفسار حال کر رہی ہے۔

دوسرا اعتراض ہوا لگی تھی پر ہے اور وہ صحیح ہے۔ بیشک نسیم ہوا سمائی تھی۔ کی جگہ کہ گئے

بالآخر مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ پروفیسر نقاد صاحب بی۔ اے نے اس تنقید کے پیچھے جسقدر وقت ضائع کیا اسکا حاصل بجز اسکے اور کچھ نہ نکلا کہ کارہر بی۔ اے نیست نقادی۔ کیا اچھا ہوتا اگر پروفیسر صاحب بجائے اس نقادی کے کوئی مفید کام کرتے۔ ہم اوپر بھی لکھ چکے ہیں کہ نہ ہمکو نسیم سے کوئی خصوصیت ہے اور نہ نقاد صاحب سے ہم اس سے زیادہ واقف ہیں کہ وہ دکن ریویو کے نامہ نگار ہیں اور اُنکے نام کے ساتھ اکثر پروفیسر اور بی۔ اے لکھا رہتا ہے۔ ہم نے جو کچھ لکھا وہ محض اس بنا پر کہ تنقید زیر بحث میں جسقدر اعتراضات کئے گئے ہیں ان سے پبلک کہیں مغالطے میں نہ آجائے کیونکہ ان میں سے ایک اعتراض بھی قابل التفات نہیں ہے ورنہ ہم یہ [illegible] کہ نسیم دائرۂ انسانیت سے خارج تھا اور اُسکا کلام بالکل غلطیوں سے مملو ہے۔

(شامن کنتوری)

(از رسالہ تہذیب بابت ماہ اپریل ۱۹۰۶ء نمبر ۴ جلد ۲)

گلزار نسیم

(ہوا خواہ نسیم)

جب سے مسٹر چکبست نے گلزار نسیم کا نیا اڈیشن شایع کیا ہے اُسوقت سے اس یادگار زمانہ مثنوی کے محاسن و معائب پر مختلف پہلوؤں سے بحث ہو رہی ہو اس بحث میں اکثر سحر البیان اور گلزار نسیم کا موازنہ بھی کیا جاتا ہے اور اکثر حضرات یہ کہنے میں تکلف نہیں کرتے کہ میر حسن کی مثنوی گلزار نسیم سے شاعری کے اعتبار سے بہتر ہے میرے خیال میں ایسا کہنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ میر حسن کی مثنوی کو جو کچھ شہرت حاصل ہے وہ محض تبرکاً حاصل ہے چونکہ سحر البیان اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں مقبول رہی لہذا لوگ اب تک اسکی یاد دل سے بھلانا پسند نہیں کرتے حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو شاعری کے اعتبار سے میر حسن کی مثنوی گلزار نسیم کی گرد کو بھی نہیں پہونچتی قبل اسکے کہ دعوی کی تائید میں دلائل پیش کیئے جائیں یہ دیکھنا لازمی ہے کہ سچی شاعری کا معیار کیا ہے کارلائل انگلستان کا ایک مشہور فلسفی گذرا ہے اُس نے لکھا ہے کہ جدت اختصار۔ باریک خیالی اور بلند پروازی شاعر کے جوہر خاص ہیں اس معیار کو سامنے رکھکر اگر ہم گلزار نسیم اور سحر البیان کا موازنہ کریں تو ہم پر یہ آئینہ ہو جائیگا کہ متاخر مثنوی میں

یہ جوہر معدوم ہیں۔ برعکس اسکے گلزار نسیم میں یہ جوہر کمال پہونچے ہوئے ہیں۔ پہلا جوہر جدت ہے اگر دیکھا جائے تو میر حسن کی مثنوی میں جدت کا نام نہیں۔ مثلاً حمد و نعت میں سکندر نامہ و بوستاں کی نقل کی گئی ہے ہر داستان کے آغاز میں ساقی نامہ کو بھی فارسی مثنوی کا ساتبع سمجھنا چاہئے چند شعر تمثیلاً درج ذیل ہیں۔

کروں پہلے توحید یزداں رقم — جھکا جسکے سجدہ کو اوّل قلم
سر لوح پر رکھ بیاض جبیں — کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا — ہوا حرف زن یوں کہ ربّ العُلا
نہیں کوئی تیرا نہ ہوگا شریک — تیری ذات ہے وحدۂ لاشریک
پرستش کے قابل ہے تو اے کریم — کہ ہے ذات تیری غفور رحیم

وغیرہ وغیرہ ان اشعار میں نہ کسی قسم کی لطافت ہے نہ تازگی نہ جدت جو شخص حمد و نعت کہتا وہ ایسی ہی کہتا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی مثنویوں کی حمد یہ اشعار کا ترجمہ کر دیا ہے برعکس اسکے گلزار نسیم میں حمد و نعت میں وہ جدت پائی جاتی ہے کہ بارک اللہ۔

ہر شاخ پہ ہے شگوفہ کاری — ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے اکثر — نعت حق و مدحت پیمبرؐ
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنے کہ مطیع پنجتنؐ ہے
ختم اسپہ ہوئی سخن پرستی — کرتا ہے زبان کی پیشدستی

ناظرین ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ نسیم کے چاروں شعر جدت و تازگی کا نمونہ ہیں اس ڈھنگ کی کسی مثنوی میں حمد و نعت نہ ملے گی اسی طرح کل مثنوی میں۔ میر حسن نے کہیں جدت سے کام نہیں لیا ہے۔ اگر گھوڑے کی تعریف کی ہے تو گھوڑے کے متعلق سب اصطلاحیں نظم کر دی ہیں۔ اگر گیسو کی تعریف کی ہے تو بیش پا افتادہ تشبیہوں کے انبار لگا دیے ہیں طوالت مضمون کا خیال مانع ہے ورنہ سیکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جدت کے علاوہ اختصا

شاعری کا اعلیٰ جوہر ہے اور اختصار گلزار نسیم کا خاص جوہر ہے نسیم نے اکثر مقامات پر دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ اور بقول محمد حسین آزاد مصنف آبحیات "اس کی کل مثنوی میں ایک شعر بیکار نہیں ہے۔ اگر درمیان سے ایک شعر نکال ڈالیے تو کل داستان برہم ہو جاتی ہے"۔ برعکس اسکے میر حسن کی بیجا طوالت ہر منصف مزاج شخص کی نگاہ میں کھٹکتی ہو دیکھئے بادشاہ کی تعریف میں میر حسن فرماتے ہیں۔

بہت حشمت و جاہ و مال و منال
بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال
کئی بادشاہ اسکو دیتے تھے باج
خطا و ختن سے وہ لیتا خراج
کوئی دیکھتا آکے جب اسکی فوج
تو کہتا کہ ہے بحر ہستی کی موج
جہاں تک کہ سرکش تھے اطراف کے
وہ اس شہ کے ہتے تھے قدموں لگے

نسیم نے ان تمام مضامین کو جو کہ میر حسن نے چاروں شعروں میں نظم کئے ہیں ایک شعر میں کس خوبی و لطافت کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔

لشکر کش و تاجدار تھا وہ
دشمن کُش و شہریار تھا وہ

اور پھر جو چُستی اور تازگی اس شعر میں ہے وہ میر حسن کے چاروں اشعار میں نہیں اسی طرح ہر ایک مقام کا موازنہ ہو سکتا ہے میر حسن نے ہر جگہ اپنی خشک بیانی کو ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے اور نسیم نے ہر سین کو نہایت اختصار اور لطافت کے ساتھ نظم کیا ہو باریک خیالی شاعری کا تیسرا زبردست جوہر ہے۔ میر حسن کی مثنوی میں نازک خیالی اور باریک خیالی کا مطلق دخل نہیں ہے۔ ہر جگہ پیش پا افتادہ تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے۔ برعکس اسکے گلزار نسیم کی باریک خیالی سے زینت ہے۔

مثلاً نسیم و میر حسن دونوں نے وصال کا مضمون نظم کیا ہے میر حسن کا طرز بیان بالکل بھدا اور لطافت سے معرا ہے چند شعر تمثیلاً درج ہیں۔

لگی ہونے بے پردہ جو چھیڑ چھاڑ
در حسن کے کھل گئے دو کواڑ

لبوں سے ملے لب دہن سے دہن دلوں سے ملے دل بدن سے بدن
لگی آنکھ سے آنکھ خوش حال ہو گئیں حسرتیں دل کی پامال ہو
لگی جا کے چھاتی جو چھاتی کے ساتھ چلے ناز و غمزے کے آپس میں ہاتھ

وغیرہ وغیرہ نسیم نے اس مضمون کو کس کس لطیف و نازک پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

طومار حجاب کو کیا طے ساغر پہ جھکا وہ شیشۂ مے
کاوش پہ ہوا گہر سے الماس غنچہ سے بجھائی اوس نے پیاس

اس وضع کی متعدد مثالیں دونوں کے کلام سے دیکھا سکتی ہیں۔ اب رہی بلند پروازی ایسا جوہر شاعرانہ ہے جو کہ نسیم کا حصہ ہے اور جو میر حسن کے کلام میں عنقا کا حکم رکھتا ہے نسیم کے کلام سے چند بلند پروازی کے نمونے تمثیلاً درج ہیں۔

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر فانوس خیال بن گیا گھر
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ کپڑے بدلے عوض بدلتی تھی رنگ
سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا عنقا تھا نام جانور کا
مرغان ہوا سے تھے ہوش راہی نقش کف پا تھے ریگ ماہی

اس مختصر پر معنے موازنہ سے ثابت ہوا ہوگا کہ شاعری کے جوہر خاص میر حسن کے کلام میں معدوم ہیں لہذا یہ کہنا بیجا نہوگا کہ میر حسن شاعر کے لقب کے مستحق نہیں ہو سکتے وہ محض ایک ناظم تھے جو کہ واقعات نظم کر دیتے تھے انکے کلام میں شاعرانہ لطافت نہیں ہے جو شاعری کو معمولی نظم سے جدا کرتی ہے برعکس اسکے شاعری کے تمام ارکان نسیم کے کلام میں درجہ تکمیل پر پہونچے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب جو شخص مثنوی کہتا ہے وہ نسیم کی تقلید کرتا ہے اور میر حسن کی طرف رخ بھی نہیں کرتا۔ منشی احمد علی صاحب شوق، محسن کاکوروی امیر اللہ صاحب تسلیم وغیرہ نے اپنی مثنویوں میں نسیم کا انداز سخن اڑانے کی کوشش کی ہے آخر میں ہم اُن متعدد لغزشوں میں سے چند تمثیلاً پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے

کہ میر حسن سے تناسب واقعات بھی نہ نبھ سکا اور نیز انھیں زبان پر قدرت کاملہ نہیں حاصل ہے جتنی لغزشیں زبان کی انکے کلام میں ہیں وہ انکے معاصرین کے کلام میں نہیں پائی جاتیں میر حسن نے پہلے تو یہ بیان کیا ہے کہ بدر منیر قبل بارہ برس کی عمر پانے کے تمام علوم و فنون میں مشاق ہو گیا تھا جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ثابت ہے۔

دیا تھا زبس حق نے ذہن رسا — کئی سال میں علم سب پڑھ چکا
معانی منطق بیان و ادب — پڑھا اسنے منقول و معقول سب
لگا ہیئت و ہندسہ تا نجوم — زمیں آسماں میں پڑی اسکی دھوم
کئے علم نوک زباں حرف حرف — اسی نحو سے عمر کی اسنے صرف

وغیرہ وغیرہ اس خلاف عقل مبالغہ کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

ہوا سادہ لوحی میں وہ خوشنویس — عطارد کو آنے لگی اسکی ریس

یہ عجب پریشاں خیالی کا نمونہ ہے۔ ابھی جس شہزادہ کی نسبت اس مقام پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سادہ لوح تھا محض اس سے کہ لوح اور خوشنویسی میں تناسب لفظی ہے اس سے بڑھ کر کسی شاعر کے کلام میں قوت خیالی کی سستی کا نمونہ نہ ملے گا (باقی آئندہ)

(راقم ہوا خواہ نسیم)

(از رسالہ تہذیب بابت ماہ جون ۱۹۱۰ء نمبر ۶ جلد ۲)

گلزارِ نسیم و سحر البیان نمبر ۲

اسی طرح کی سیکڑوں لغزشیں میرحسن کے کلام میں موجود ہیں۔ ذیل میں مختصراً چند ایسی غلطیاں پیش کی جاتی ہیں جو کہ سوائے بتدی کے کسی اُستاد کامل سے سرزد نہیں ہوسکتیں۔

کیا حق نے نبیوں کا سردار اُسے   بنایا نبوت کا حقدار اُسے

اس شعر میں حق اور سر کا قافیہ بالکل غلط ہے ایسی غلطی تو ایک نومشق سے بھی ناممکن ہے بادشاہ کی سخاوت میں فرماتے ہیں۔

سخاوت یہ ادنی اسی اک اُسکی ہو   کہ اکدن دوشالے دیے سات سو

واقعی سات سو دوشالے دینا حاتم کی قبر پر لات مارنا ہے۔ اور سوائے اولوالعزم بادشاہ کے کون دیسکتا ہے۔

پلنگوں کا بھی بلکہ جیتا یہی   کمر آ بندھا وے ہماری کوئی

اس شعر میں محض پلنگ کی رعایت سے لایا گیا ہے اور علیٰ ہذا القیاس کمر کا بھی یہی حال ہے یہ شاعری ہے کہ ضلع جگت۔

ملو پیلے سکے اسکے جو آدے نظرِ خر   انھیں نعل بندی میں ملتا تھا زر

میرحسن کا مطلب تو یہ تھا کہ نعلبندوں کو اجرت میں زر ملتا تھا مگر زبان پر قدرت نہونے سے یہ کہہ گئے کہ (خردوں کو زر ملتا تھا)۔

عجب شہر تھا ایک مینو سواد　　　کہ قدرت خدائی کی آتی تھی یاد

خدا کی قدرت تو سب کہتے ہیں۔ مگر چونکہ مصرع ناموزوں رہتا تھا اسلئے میر صاحب نے ئی اور بڑھا دی۔ دیوار کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

صفا پر جو اس کی نظر کر گئے　　　اسے دیکھ کر سنگ مر مر گئے

اس سے بدتر ضلع جگت کی مثال امانت کے یہاں بھی نہ ملیگی۔ سنگ کے لیئے یہ کہنا کہ مر گئے۔ میر حسن ہی کا کام ہے۔

کروں اسکی وسعت کا میں کیا بیاں　　　کہ جوں اصفہاں تھا وہ نصف جہاں

کس جغرافیہ میں لکھا ہے کہ اصفہاں نصف جہاں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

گئے نو مہینے جب اس پر گذر　　　ہوا گھر میں شہ کے تولد پسر

اس شعر میں۔ اس پر۔ کی کیا ضرورت تھی یہ دو لفظ اس لیے ٹھونس دئے گئے ہیں کہ مصرع موزوں ہو جائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میر حسن کو مصرع موزوں کرنے میں عجز تھا۔

دیا چوب کو پہلے نم سے ملا　　　لگی چھپنے ہر طرف کو صدا

کہا زندگی نے ہم سے بہر نگوں　　　کہ دوں میں خوشی کی خبر کیونکر یوں

سبحان اللہ کیا کیا دل دولت ہے۔ واقعی تناسب الفاظ کی صفت کو نسیم نے کیا صرف کی ہے اور میر حسن نے اس صنعت کی کیا مٹی خراب کی ہے۔

کھڑے سرو کی طرح چینی کے جھاڑ　　　کہے تو کہ خوشبوئیوں کے ہیں پہاڑ

اول تو خوشبو کی جمع خوشبوئیوں۔ کیا خوب اور خوشبوئیوں کے پہاڑ۔ تو اپسر بھی طرہ ہیں واقعی خیالات کی ندرت اسکا نام ہے۔

گلوں کا لب نہر پر جھومنا　　　اسی اپنے عالم میں منھ چومنا

جس وقت کہ لب نہر کھڑا تھا پھر "بر" لانے کی کیا ضرورت تھی اس قسم کی بھرتی کے الفاظ میر حسن کے پچھتر فیصدی اشعار میں موجود ہیں اور اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ میر صاحب موصوف محض خیالات کے نظم کرنے میں عاجز تھے۔

لیے ہاتھ میں تھیلے مالنیں — چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں

بھلا اس سے بڑھکر مبتدیانہ غلطی کسی شاعر کے کلام میں مل سکتی ہے۔ بھالنیں اور مالنیں قافیہ رکھنا میر حسن ہی کا کام تھا۔

لب جو پہ آ بیٹھنا میں کچھ قد — اکڑنا کھڑے سرو جلد بہ جلد

لب جو پہ ویسا ہی ہے جیسا کہ لب نہر پر۔

کمان کے چورسے ہوا بے نظیر — لیا کھینچ چلّے میں سب فن تیر

کمان کے لیے چلّے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اگر امانت نے یہ کہا ہے
"نہر لب میں بھی مرا نازک بدن کٹتا نہیں" تو کیا برا کہا ہے۔

کہ سرگرم حمام ہے بے نظیر — گیا ہے نہانے کو بدر منیر

اس شعر میں بے نظیر اور بدر منیر دونوں سے ایک ہی شہزادہ مراد ہے مگر انداز سخن سے یہ پیدا ہے کہ بدر منیر کوئی اور شخص ہے اور بے نظیر کوئی اور شخص ہے۔ اس قسم کی بندش شاعری میں سخت معیوب ہے۔

ہوا قطرۂ آب یوں چشم پوش — کہ تو پڑی جیسے نرگس پہ اوس

اوس پڑنا تباہ اور برباد ہو جانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کیا اس شعر میں میر حسن کی یہ مراد ہے کہ پانی کا قطرہ پڑنے سے شہزادہ کی آنکھ پھوٹ گئی۔

گیا حوض میں جب وہ بے نظیر — پڑا آب میں عکس ماہ منیر

جس وقت حوض میں کوئی شخص نہانے اترتا ہے تو پانی میں تموج کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس حالت میں عکس پڑنا ناممکن ہے۔ میر حسن کی نگاہ مطلق شاعرانہ نہ تھی ورنہ وہ ایسا

خلاف تجربہ واقعہ نہ نظم کرتے۔

زمیں پر تھا اک موجۂ نور خیز ۔۔۔ ہوا جب وہ فوارہ ساں آب ریز

یہ اس موقع کا شعر ہے جبکہ شہزادہ حوض میں نہانے کو اترا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ فوارہ کیطرح آب ریز ہونے سے کیا مراد ہے۔ کیا اسپر نہانے کا خوف بیطرح طاری تھا افسوس کہ ذم کے پہلو سے بھی میر حسن کا کلام خالی نہیں ہے۔

بندھیں پگڑیاں طاش کی سر اوپر ۔۔۔ چکا چوند میں جیسے آئے نظر

سبحان اللہ و بحمدہ۔ کیا اختصار ہے اول تو سر اوپر۔ ہی لطافت سے معمور تھا مگر جب دیکھا کہ اسپر بھی مصرع نہیں موزوں ہوتا تو سر اوپر نظم کر دیا۔

وحوشوں طیوروں تلک آب بی غلل ۔۔۔ پڑے آشیانوں سے اپنے نکل

وحوش و طیور خود صیغۂ جمع ہیں ۔ اسکی جمع وحوشوں و طیوروں بنانا صرف و نحو کے معمولی قواعد سے لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔

لب بام پر جب یہ سوئی صنم ۔۔۔ کریں سورۂ نور کو اس پہ دم

لب بام کے بعد۔ پر بالکل فضول ہے۔

وہ سویا جو اس آن سے بے نظیر ۔۔۔ رہا پاسباں اسکا بدر منیر

وہ مہ اسکے کوٹھے کا ہالا ہوا ۔۔۔ غرض واں کا عالم دوبالا ہوا

ان دونوں شعروں میں ابتدا میں (وہ) محض برائے وزن بیت ہے۔

گئیں لے وہ شہ کو لب بام پہ ۔۔۔ دکھایا کہ سویا تھا یاں سیمبر

یہ اور لب بام پہ۔ ملاحظہ ہو۔ افسوس کہ ایک ایک قسم کی غلطیاں کس کثرت سے ہیں۔

لگے تھے جو خوشے درختوں کے ساتھ ۔۔۔ وہ ہل ہل کے ملتے تھے آپس میں ہاتھ

پہلا مصرع کسقدر مہمل ہے۔

نہ جنگلوں کا عالم نہ وہ قرقرے ۔۔۔ نہ وہ آب جو میں سبزے ہرے

سبزے ہرے کی ترکیب محض غلط ہے۔

حسن نزاں کا الم دل میں جو آگڑا | جگر برگ گل کی طرح جھڑ پڑا

جگر جھڑ پڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا خدا جانے میر حسن کیا کہنا چاہتے تھے اور کیا کہہ گئے۔

کسی کو ہو جس چیز کا اشتیاق | نظر آئی وہ چیز بالائے طاق

میر حسن کا مطلب تو یہ ہے کہ مختلف چیزیں طاق پر رکھی ہوئی تھیں مگر بالائے طاق محاورہ میں بالکل اس سے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

زبس تھا وہ لڑکا تو سہما بھی کچھ | ہوا کچھ دلیر اور حیراں بھی کچھ

سہما اور حیراں کا قافیہ کرنا میر حسن ہی کا کام ہے۔

کبھی یوں بھی ہے گردش روزگار | کہ معشوق عاشق کے ہو اختیار

کہنا چاہتے تھے کہ معشوق عاشق کے اختیار میں ہو مگر چونکہ مصرع موزوں نہیں ہوتا تھا لہٰذا میں حذف کر گئے سبحان اللہ۔

وہ شفقت جو ہاں باپ کی یاد آئے | تو راتوں کو رو رو کے دریا بہائے

اصل لفظ شفقت ہے بفتح۔ فا۔ بالفتح ہے مگر میر حسن نے جہلا کی زبان پر اعتبار کر کے شفقت نظم کر دیا۔

غرض یا ہر رخ اس پری کا تھا نام | پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام

میر حسن کا مطلب تو یہ ہے کہ باپ سے خفیہ رکھ کے یہ کام کیا تھا مگر مصرع کی ترکیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ باپ سے یہ پوشیدہ فعل کیا تھا افسوس کہ میر حسن کو ایسا ذم کا پہلو نظر آیا۔ زبان پر قدرت نہ ہونے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی غم سے گھل گھل کے مرتا تھا وہ | سدا شمع ساں آہ کرتا تھا وہ

شمع کے لئے رونا سب نے نظم کیا ہے اور واقعی اس کے قطرے اشک سے مشابہ بھی ہوتے ہیں۔ مگر آہ کرنا شمع کے لئے سوائے میر حسن کے کلام کے کہیں نہ ملے گا۔ یہ شاعری

نہ ہو مگر ایجاد بندہ تو ضرور ہے۔

یہ گھوڑا جو اس گل کے تھی بخشش کا — فلک سیر تھا نام اس رخش کا

کہنا چاہیئے تھا کہ اس گل کا بخشا ہوا گھوڑا تھا مگر گو۔ سے گیر کہ اس گل کی بخشش کا گھوڑا سبحان اللہ بحمدہ۔ کیا اختراع ہے۔

فقط موتیوں کی پڑی پاکھر زیب — کہ جسکے قدم سے گہر پائے زیب

اس شعر میں بھی قافیہ کی غلطی ہے۔

غرضکہ جن بزرگوں نے جناب میر حسن کو حضرت نسیم کے مقابلہ میں آسمان شاعری پر پہونچایا ہے۔ وہ انصافاً دونوں کا مقابلہ کر کے کھرے کھوٹے کی پرکھ کریں اور دیکھیں کس کے کلام میں عامیانہ لغزشوں کی بھرمار ہے۔ یوں آنکھ بند کر کے اعتراض کرنا اور کسی قابل فخر و تعظیم بزرگ کے کلام پر ناانصافی کے خنجر چلانا معمولی کانشنس کے آدمی کا کام ہے اس قسم کے علمی مناظرات میں قومی خیالات سے قطع نظر کر کے سچائی اور ایمانداری سے تنقید کرنا ملک و قوم کے لیئے زیادہ مفید و کارآمد ہے۔ بمقابلہ اسکے کہ لیسے امور کو قومی نگاہ سے دیکھا جائے۔ باقی آیندہ

(راقم ہواخواہ نسیم)

از رسالہ تہذیب بابت ماہ جنوری ۱۹۱۶ء جلد ۲۔ نمبر ۱۔ مرتبہ منشی سعید اللہ خاں صاحب منیجر و پروپرائٹر
ریاست رامپور

سحر البیان و گلزار نسیم پر ریویو

(از مظہر الحق صاحب دہلوی)

اس سے پہلے کہ سحر البیان اور گلزار نسیم کے مختلف مضامین کی سیر صاحبان ذوقِ نظر و دقیقہ رس کو کرائی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اول بطور تمہید و مقدمہ کچھ تحریر کر دیا جائے۔ بموجب تقسیم آزاد میر حسن صاحب سحر البیان دورِ چہارم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور نسیم دورِ پنجم سے۔ نسیم کا ذکر آبِ حیات کے دورِ پنجم میں کہیں نہیں ہے مگر چونکہ وہ آتش مرحوم کے شاگرد تھے اسلئے انکا شمار دورِ پنجم میں کیا گیا ہے۔ موجد نظم اردو یعنی شمس ولی اللہ سے لیکر انیس مرحوم تک تین سو برس ہوئے ہیں اس زمانہ کو آزاد نے پانچ دوروں پر تقسیم کیا ہے اور شعرا کے طرز کلام کو مدنظر رکھکر یہ دور قائم کیے گئے ہیں جہاں سے اردو کا رنگ ڈھنگ جدا پایا گیا۔ ایک دور قائم کرکے دوسرا دور شروع کر دیا گیا اور قائمی دور کا فیصلہ کثرت پر قرار دیا۔ رد و بدل ترک و تحریک کا جھگڑا ہر زمانہ کے ساتھ لگا رہتا ہے جو زبانیں کہ زمانہ دراز سے موجود ہیں اور صفائی و شستگی میں ملاء اعلیٰ پر پہونچ چکی ہیں اُن میں بھی تغیر و تبدل کچھ نہ کچھ آئے دن ہوتا رہتا ہے انگریزی زبان ہی کو ملاحظہ فرمایئے کہ پہلی زبان اور حال کی زبان میں

ذرا بھی تو کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اب بھی باوجودیکہ عرصہ سے علمی زبانوں کے ہم پلہ ہو گئی ہے تاہم کوئی نہ کوئی بات گھٹتی بڑھتی رہتی ہے پس جس زبان کا نشو و نما ہوئے ایک قلیل زمانہ گذرا اسمیں ترک متروک بدرجۂ غایت ہوتا رہیگا۔ چنانچہ دور چہارم میں زبان اُردو نے ایسی شستگی و صفائی حاصل نہیں کی تھی جیسے کہ دور پنجم کی نظر سے گذری دور چہارم کے شعرا کا کلام اگر دیکھیے تو ہر صفحہ میں بہت سے الفاظ اور ترکیبیں ایسی ملیں گی کہ آج متروک سمجھی جاتی ہیں۔ مگر میر صاحب کا کلام باستثناے چند الفاظ اور چند اشعار کی بندش کے جیسا کہ تب تھا ویسا ہی آج دلپذیر و دلکش ہے۔

زمانہ سے دو قدم آگے رہنا کچھ آسان نہیں جبکہ برابر ہی چلنا دشوار ہے۔ نسیم کو دور پنجم نصیب ہوا۔ مگر اُنکے کلام میں بلاغت کا پتہ نہیں خیالات کا تسلسل مفقود فطرت۔ عادات انسانی کی تصویر تو ظاہر وہم و گمان سے بھی زیادہ عنقا۔ ہاں تشبیہ و استعارات نئے طرز سے باندھے گئے ہیں۔ اور فصاحت کلام میں بھی نسیم میر صاحب کی برابری کا دعوے نہیں کر سکتے۔ جو دلکش بیان مثنوی کے لئے لازم ہے وہ سحر البیان میں موجود ہے مگر گلزار نسیم میں مفقود شعرا ماسبق کے کلام میں جو الفاظ یا بندش متروک یا مکروہ پائی جاتی ہے اُن پر ہرگز اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ اُس زمانہ میں وہی فصیح سمجھی جاتی تھی جواب خارج ہو گئی ہے۔ البتہ اگر ایسے الفاظ پائے جائیں جو اُسوقت متروک تھے تو بیشک کلام پر غیر فصیح ہونے کا اطلاق ہوگا۔ لہذا اس سے معلوم ہوا کہ ہر زمانہ کی فصاحت جُدا ہے جو الفاظ آج فصیح خیال کیے جاتے ہیں کچھ عرصہ کے بعد وہی ثقیل ٹھہرا دیے جاتے ہیں لہذا اسی زمانہ کی فصاحت کا لحاظ چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے جس سے وہ تعلق رکھتا ہے۔ یہ رعایت صرف زبان کے ساتھ ہے معنی کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ خیالات کی صحت و سقم پر برتری کا دارومدار ہے جسقدر وسیع اور بلند خیالات معنی کے متعلق ہونگے اُتنا ہی اعلےٰ درجہ اُنکے لئے تجویز کیا جائیگا اس سے بہت کم بحث کیجائیگی کہ وہ کس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے شکسپیر اکثر شعرا

وہ گلستان خیالات تصحیح ہی کی وجہ سے آج بھی درجۂ اول رکھتا ہے حالانکہ جو زبان اسنے لکھی ہے وہ بہت زیادہ متروک ہوگئی ہے اُسکے کلام کی جانچ مسئلۂ بالا کی رو سے ہوتی ہے یعنی کسی لفظ پر گرفت نہیں کیجاتی اور فطرت و عادت سے جہاں اسنے بحث کی ہے اُن تصورات کا وزن اس زمانہ کی میزان خیال میں پیدا ہوتا ہے۔

مثنوی سحر البیان از سرتا پا فصاحت و بلاغت سے مملو جسکا ذکر ہے اُسکے متعلق جو کچھ چاہیئے شستہ الفاظ میں موجود ہے بیان کیا ہے ایک تصویر کا کھڑی کردی ہے غم و الم کا ذکر ہے تو در و دیوار سے یاس و حسرت ٹپک رہی ہے مسرت و عشرت کا چرچا ہے تو ہر شے شگفتہ و خنداں نظر آتی ہے وصل کا خیال ہے تو کل لوازمات عیش موجود ہجر مد نظر ہے تو شام غربت مرعوب باغ کا ذکر آگیا ہے تو قمری کے قہقہے اور بلبل کے چہچہے برسات کا جو خیال آیا تو بجلی کی چمک و دل کی کڑک ہوا کا زور مینہ کا شور اسی کو بلاغت کہتے ہیں۔ آبحیات میں مثنوی میرحسن پر تقریظ موجود ہے آزاد کی تحریر کا کیا کہنا اگر وہ عام حالت سے تعلق رکھتی ہے اور اسمیں اُن خوبیوں برتر از وہم و خیال کا مفصل بیان ہوگا جس کا سراغ ایشیائی شاعری میں کم ملتا ہے فطرتی منظر اور نیچرل سینری کی توضیحات سے لطف دوبالا کیا جائیگا اردو میں بہت سی مثنویاں لکھی گئی ہیں مگر سحر البیان کی پاسنگ کو بھی کوئی نہیں پہونچتی بلاغت اور بیان فطرت میں جیسے عمدہ کی زبان میں ایسی کہ سوائے گلزار نسیم کے اور کوئی نظیر نہیں میری رائے میں ما ورا ایک وصف کے گلزار نسیم کو سحر البیان سے کچھ مناسبت نہیں آزاد مثنوی کی تعریف کرتے ہیں کہ مثنوی حقیقت میں سرگذشت یا بیان ماجرے ہے جسے تاریخ کا ایک شعبہ سمجھنا چاہیئے لہذا مثنوی میں وہ جملہ امور ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں جو فطرتی طور پر عادتاً واقعہ و حال کے لئے لازم ہیں۔ میر صاحب نے جا بجا اُمور متذکرہ بالا کا قریب قریب ہی پاس رکھا ہے گلزار نسیم میں اسقدر لغزشیں ہیں جنکی انتہا نہیں تناقض پر تناقض وارد ہیں مثنوی اگر تاریخ کا شعبہ ہے تو اسمیں ذرا شبہ نہیں کہ بیچاری تاریخ کا بڑی بیرحمی سے خون کیا گیا ہے غزل

اور قصائد کے میدان کیا کم وسیع تھے کہ نازک مثنوی کو بھی بغیر پامال کیئے نہ رہا گیا گلزار نسیم میں جو باتیں عادتاً یا فطرتاً یا بیان واقعہ کی جان یا لازم ہیں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

کہہ سکتے ہیں کہ قصہ بے نظیر نتیجۂ فکر حسن ہے اور قصہ بکاؤلی اصل نثر تھا نسیم نے زیور نظم سے آراستہ کر کے عروس نو پیراستہ کو ہدیۂ ناظرین کیا اصل قصہ میں جو خرابیاں تھیں وہ قائم ہیں نسیم انکے ذمہ دار ہماری رائے میں مذکورالصدر دلیل کے پیش کرنے سے نسیم بُرے نہیں ہو سکتے بلند خیالی انکی اس سے ظاہر ہے کہ ایسا قصہ پسند کیا۔

اسپر بھی خیال نہ کیا کہ میر صاحب کے وقت میں قصہ بکاؤلی موجود تھا کیا وجہ کہ میر حسن نے اس قصہ کو اختیار نہیں کیا۔ اگر غور کیجئے تو صرف اس قصہ کا رد ہی کرنا میر صاحب کے کمال علوئے مرتبہ کی دلیل ہے نسیم اگر اسکو اختیار نہ کرتے بالضرور طبعزاد بھی ایسا ہی لچر ہوتا بلند خیالی اور اختراع کا مادہ بھی اگر ہوتا تو ایسی شئی کی طرف طبیعت کیوں رجوع ہوتی عام خیالات سے برتر طبیعت پانی ہر ایک کا حصہ نہیں صحبت کا اثر اختیار نہ کرنا ہر ایک کا کام نہیں یاران جلسہ سے انوکھا ہونا کوئی معمولی بات نہیں مگر قدرت نے یہ جملہ صفات میر صاحب کی ذات میں ودیعت کر دیئے تھے جسکی وجہ سے میر صاحب نے نام لازوال حاصل کیا یہ لازم نہیں ہے کہ جو کتاب جسقدر زیادہ دلچسپ ہوگی اسی قدر زیادہ غلطیوں سے بھی پاک ہوگی۔ لارڈ بیکن اعلیٰ مرتبہ کا فلسفی انگلستان کا مقولہ ہے (بہت سی کتابیں ایسی دیکھی گئیں جو قریب قریب غلطیوں سے بالکل پاک ہیں لیکن نام کو بھی دلچسپ نہیں اور ایسی بھی کتابیں نظر سے گذریں کہ جنمیں بہت غلطیاں ہیں مگر انتہا درجہ کی دلچسپ)

گلزار نسیم آخرالذکر درجہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ خوبی تو سحرالبیان ہی میں ہے کہ ازبس دلکش فطرت و عادت کے قریب قریب مطابق غلطیوں سے مبرا اور قاعدۂ عروض کی حد سے قدم باہر نہیں نکلا بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مضمون اعلیٰ زبان پاکیزہ۔ مگر صرف ترتیب کے الٹ پھیر سے مزہ بدل جاتا ہے عمدہ مضمون لکھنا کچھ سہل کام نہیں خون جگر پینا ہوتا ہو اسوقت

مقبولیت عام کہیں جاکر حاصل ہوتی ہو ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات پر زمانہ ختم ہوجاتا ہے۔

زبان بہ نسبت مضمون کے عام فہم ہے لہذا عام طور سے وہ مضمون کی برائی کو ظاہر نہیں ہونے دیتی یہی وجہ ہے کہ گلزار نسیم باوجودیکہ خیالات عالی سے بالکل معرا ہے مگر قبولیت عام رکھتی ہے شستگی زبان ولطف شاعری نے دوسرے نقص کو ایسا چھپایا کہ کسی کا خیال بھی اس طرف کو نہیں جاتا۔ اور جائے کیسے فطرت وعادت کچھ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ مگر اب خیال وسیع ہوتا جاتا ہے کہ معنی بھی کوئی شے ہے اسکو بالکل بیکار تصور نکرنا چاہیے۔ تجربہ دینے والا اور آئندہ زندگی میں کام آنیوالا اسی کا مطالعہ ہے ایک حد تک گلزار نسیم کی تعریف جائز ہی بلکہ اگر نہ کیجائے تو بیجا ہے۔ مگر میر صاحب کے پہلو میں نسیم کو کرسی دینی ظلم ہے۔

لارڈ بیکن کا قول ہے کہ زبان مافی الضمیر کا آلہ ہے اصل مطلب جہاں فوت ہوا تو آلہ کی پھر کچھ ایسی قدر نہیں رہتی سمجھدار کے آگے لفاظی سے کام نہیں چلتا۔ جبتک کہ پتے کی بات کہی جائے اور نفع وضرر اُسکے گوش گزار نہ کیا جائے صاحبان سخن سنج نے لکھا ہی کہ ایران کے سعدی اور ہند کے میر حسن شکسپیر ہیں اور شکسپیر وہ شخص ہے جو فطرت انسانی کا بڑا ماہر مانا گیا ہے عام خیال ہے کہ اس شرح وبسط سے اور اس خوبی سے قانون قدرت کا صحیفہ بہت کم کسی نے پبلک کے سامنے پیش کیا ہے انگلستان میں شکسپیر سے زیادہ قبولیت بہت کم کسی نے حاصل کی ہے۔ قبولیت عام میری مراد نہیں بلکہ بڑے بڑے نکتہ فہم وجلیل القدر مصنفوں نے اسکی لیاقت خداداد کا اعتراف کیا ہے۔ دیگر ممالک کے شاعروں نے بھی اُسکے کلام سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ جرمنی کے عالموں نے اسکی تصنیف کی شرحیں قلمبند کیں جرمنی کا ذکر خاص طور پر یوں کیا گیا ہے کہ براعظم یورپ میں اُسکا نمبر علم وفضل علمی عروج پر ہے نسیم کا نام کہیں بھی کسی خصوصیت میں نہیں لیا گیا ہے۔

پس گلزار نسیم کو سحر البیان کے مقابلہ میں لانا قہر ہے اس موقع پر یہ شعر صادق آتا ہے

ظلم ہے گر کرو نہ میر کو یاد　　قہر ہے گر ندو سخن کی داد

حضرت سعدی و میر صاحب کا کلام دیکھ کر تعجب آتا ہے کہ ان بزرگوں کی طبیعت زمانے سے ایسی اچھوتی کیسے واقع ہوئی اسمیں ذرا شک نہیں کہ ان اصحاب کی ذات مقدسہ کی رفعت و علو نے اُس درجہ اعلیٰ پر عروج فرمایا ہے کہ نیچے خیالات اور صحیفۂ قدرت نگاری میں معزز ہمعصروں کو یا قرنہائے مابعد و ماقبل کے مضمون نگاروں کو کچھ بھی مناسبت نہیں ایک امر قابل غور ہے کہ شیکسپیر ایسی سرزمین پر پیدا ہوا تھا جہاں مضمون اور زبان کم سے کم توام سمجھی جاتی تھیں اُن کی آب و ہوا خیالات میں بسی ہوئی تھی پس کہہ سکتے ہیں کہ شیکسپیر کی ضمیر میں فطرت انسانی کا تصور نشوونما پا چکا تھا صحبت وبشی پیشہ یاران جلسہ کے خیالات ویسے۔ لہذا اُس سے جو ظہور میں آیا وہ چنداں تعجب خیز نہیں۔ اس کی تعریف اس وجہ سے ہے کہ اُس نے ایسی روش اختیار کی تھی کہ اسمیں یکتائے زمان رہا۔ اور جو راہ اُس نے دکھلائی اُسپر چلنا کچھ آسان نہیں۔ اور سعدی علیہ الرحمہ بھی جو ایران میں پیدا ہوئے تھے رطب و یابس دوران سے واقف گردش ایام کا تجربہ سیر و سیاحت کا چرچا عالموں کی صحبت پائے ہوئے بڑے بڑے دار العلوم دیکھے ہوئے اور سلطنت ایران کا عروج بھی قائم تھا۔ مگر گئے گذرے وقت کے بچارے حسن کو ذرا ملاحظہ فرمایئے نہ شکوہ سلطنت باقی نہ کچھ رواج علم ایسا تھا اور آپ شیکسپیر ہند کا خطاب شہرت میں کیا کچھ کر دکھلا گیا مصرع ہے ع درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں۔

تاہم سعدی علیہ الرحمہ کی اور ہی شان ہے آپ کے وجود باجود سے جسقدر زمانہ فخر کرے بجا ہے۔ جو باتیں گلستاں اور بوستاں میں پائی جاتی ہیں وہ اس زمانہ میں بڑے بڑے جلیل القدر مدبران اور وزرا کی صحبت میں ملنی دشوار ہے

ز نسیم جاں فزایت تن مردہ زندہ گردد ز کدام باغ اے گل کہ چنیں خوش است بویت

درس و تدریس کا ماحصل کیا ہے یہی کہ گھر بیٹھے گرم و سرد زمانہ سے واقفیت ہو۔ مادۂ فراست ذکاوت میں ہیجان ہو عقل تیز ہو اُسے ذہن رسا ہو مختلف اشیاء کا علم حاصل ہو واقفیت عام پیدا ہو کہ دنیا میں کس موقع پر فطرت انسانی کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔ رواج کس کو کہتے ہیں

اور اُنسے کیا نتیجے نکلتے ہیں اعلیٰ درجہ کے کتب بینو کو بھی سوائے اسکے کہ اصولی ہیں نا تجربہ کار فلسفی اور کوئی خطاب مہتم بالشان نہیں ملتا جبتک کہ صحیفۂ قدرت کا بذات خاص مطالعہ نہ کیا جائے۔ جب یہ حال ہے تو آپ ہی بتلایئے کہ ایسی کتاب کی کیا وقعت ہوگی اور اُسکے پڑھنے سے کیا واقفیت بڑھے گی جسمیں فطرت و عادت کا کچھ بھی خیال نہیں رکھا گیا جو دل میں آیا لکھدیا نہ جودت طبع دکھائی گئی نہ فکر رسا سے کچھ کام لیا گیا۔ نہ مشکل کو حل کرنے میں عقل پر زور ڈالا گیا سوائے اُس کتاب کے دنیا میں اسکی مثال نہیں ملتی معلوم ہوتی اور بجز اُن اوراق کے باقی کائنات میں اسکا وجود مفقود اصول اگر کمزور اختیار کیا گیا ہے خیر یہ بھی جائز۔ مگر اُسپر قائم تو رہیئے۔ یہ کیا کبھی یہ کبھی وہ ادائے مطلب کا یہ کیا طرز ہے۔ آیندہ اپنے اپنے موقع پر انشاء اللہ مع نقل مضمون اصل کتاب پر پوری بحث کیجائے گی۔

مثنوی میں بالکل قاعدۂ تاریخ نویسی کا ملحوظ نہیں رکھا جا سکتا کچھ شاعری وغیرہ کی چاشنی ضرور دینی چاہیئے مگر اُتنی کہ خوبی عبارت کے ساتھ ساتھ اگر فطرت و عادت وغیرہ کا بھی خیال مدنظر رہے تو کیا خرابی ہے جو مشکل کہ فکر رسا کے ذریعہ سے بطریق احسن اور موافق عادت یا اسکے قریب قریب حل ہو سکتی ہے وہ بعید از قیاس دلیلوں سے کیوں انجام کو پہونچائی جائے جن پری وغیرہ کی مدد لیجئے مگر موقع محل و قواعد مسلمہ کا ضرور لحاظ رہے اور تناقضات کا بھی کہ ایک وقت تو عرش اعلیٰ پر مسند نشین کردیا اور دوسرے موقع پر اسکو بلا وجہ معقول اسفل السافلین کا رستہ دکھا دیا یہ ہرگز جائز نہیں رکھا جا سکتا۔ سحر البیان مطابق اصول بالا لکھی گئی ہے نہ خوبی عبارت میں اسکی وجہ سے فرق آیا اور نہ دلچسپی میں کمی واقع ہوئی بلکہ نکتہ فہم کے لیئے قند مکرر کا مزہ دیتی ہے اور نسیم نے جو اسکو بالائے طاق رکھا تو کوئی ندرت عجیبہ پیدا نہیں کی پھر کوئی وجہ نہیں کہ کجرفتاری کیجائے کچھ ہاتھ آئے تو مضائقہ نہیں جبکہ گمر جائے تو اچھی راہ چھوٹنی عقل سے بعید ہے ایک صاحب کا قول ہے کہ قصہ گوئی کوئی آسان چیز نہیں ہے یہی وجہ سے کہا گیا کہ مذکور الصدر نکات کا التزام رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے ورنہ ہر کہ ومہ ادھر اُدھر کی

باتیں بلا ربط ملا سکتا ہے۔ لیجئے قصہ ہو گیا۔ قصہ کے یہ معنی ہیں کہ خیالی سرگذشت ایسے پیرایہ میں بیان کیجائے کہ واقعہ میں اور اسمیں تمیز نہو سکے۔ جو باتیں کہ فطرتًا یا عادتًا امورات دنیوی میں اکثر پیش آتی ہیں یا آسکتی ہیں وہ ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیجائیں کہ واقعی وہ چیز بالذات موجود ہے۔ اگر دربار شاہی ہے تو شان و شوکت رعب و داب صفائی اور سجاوٹ جملہ لوازمات موجود اگر ذکر باغ ہے تو درخت و گل و بلبل بہار و خزاں نہر و حوض سرو قمری نسرین و نسترن سنبل و سوسن نہ یہ کہ دربار تو شاہی ہے اور حاضرین کے خیال ایسے کہ اپنے گھر کی مجلس عیش و نشاط میں بیٹھے ہوئے ہیں باقی آئندہ

(راقم منظر الحق دہلوی)

از ریاض الاخبار مطبوعہ ۱۶ / جون ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم

از حکیم برہم

اس مشہور مثنوی کا ایک نسخہ ہمارے پاس لکھنؤ سے آیا ہے ہم نے اُسپر ایک مختصر سا ریویو فتنہ میں کر دیا تھا مگر پنڈت ترلوکی ناتھ صاحب (جنھوں نے یہ اڈیشن چھپوایا ہے اور جو لکھنؤ کے کشمیری محلہ سے ہم کو بھیجتے ہیں) کے کئی خط ریویو کے لئے آئے ہیں کہ ہم ریاض الاخبار میں کچھ تحریر کریں۔ ہم نے دیکھا کہ حضرت شرر نے اسپر ایک ریویو کر دیا ہے جسمیں دو ایک اعتراض کے سوا اکثر اعتراض یا اشتباہ اس قابل تھے کہ ہر شخص اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا اور جناب شرر کا ممنون ہوتا مگر افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں حق بات پر کبھی توجہ نہیں کیجاتی جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں غلطیاں زبان میں بڑھ گئیں اور بڑھ رہی ہیں بعض اصحاب کو یہ عار ہے کہ کوئی قصباتی شخص زبان پر ایک حرف لکھنے کا مجاز نہیں ہے بعض اصحاب بات بات پر اڑ جاتے ہیں کہ گذشتہ دور میں جو کچھ شاعر لکھ گئے گویا وہ الہام کی وقعت رکھتا ہے اسپر نکتہ چینی اور شک ظاہر کرنا قابل ملامت و نفرین ہے شرر نے کیا لکھا ہے اس کی نسبت ہمکو اسوقت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے آج ایک مراسلہ ہم درج کرتے ہیں جسمیں چند اعتراضات شرر کی تائید کی گئی ہے جہاں تک تحقیق ہوئی ہے کہ اودھ پنچ کے زریں صفحات پر اسقدر غیر قابل اطمینان جواب ہم کیوں لکھتے ہیں اودھ پنچ نے آجتک جسقدر اعتراض کئے جہاں تک کسی

اٹھ نہیں سکتا مگر خدا جانے کن صاحب نے ایسے کمزور جواب اودھ پنچ میں چھپوائے ہیں جنکو دیکھ کر ہمکو سخت تعجب ہے۔ جناب چکبست اپنی قابلیت اور اعلیٰ لیاقت کے اعتبار سے قابل قدر شخص لکھنؤ کے انشا پردازوں میں ہیں اور ہمکو امید ہے کہ وہ ایک وقت میں بہت کچھ ترقی کر جائیں گے۔ مگر نوجوانی کی امنگوں میں ذرا قلم حد ادب سے آگے نکل جاتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے شرر۔ حالی۔ آزاد۔ سرشار کا مقابلہ کیا تھا جسکو دیکھ کر تمام فاضل انشا پردازوں کو حیرت ہوگئی تھی کہ یہ کیا لکھ گئے ہیں دو چار صاحبوں نے ہمارے پاس مراسلہ بھیجے ہیں مگر اس خیال سے کہ ہمارے دوست سرشار اب دنیا میں موجود نہیں ہیں انکا ذکر مناسب نہیں۔ تاہم بہت اصرار لوگوں کو ہے کہ اسپر ضرور کچھ لکھا جائے۔ مگر ہمکو حیرت ہے کیا لکھیں جبکہ دنیا جانتی ہے کہ ہمارے دوست سرشار کا علم اور انشا پردازی بمقابلہ شرر و حالی کے کسی طرح کی کوئی سفارش نہیں کرتی اسیطرح گلزار نسیم کے دیباچہ میں مسٹر چکبست نے زندہ، صبا وغیرہ شعرا کے کلام سے نسیم کے کلام کے مقابلہ میں فضول وقت صرف کیا ہو اور اس معاملہ میں انکا نام حالی صاحب کے نام کے نیچے ضرور لکھ لینا چاہیئے شرر نے انصاف کی نظر ڈالی ہے گو انکو بھی اب گلزار نسیم کی شاعری پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ نسیم نے اگر غلطیاں کیں تو گرفت کا موقع اب نہیں ہے اسلیئے کہ جس زمانہ میں انکی شاعری کا شباب تھا اسوقت یہ نکتہ سنجیاں اور نازک خیالیاں مضامین آفرینیاں نہیں تھیں جو آخر دور میں جناب امیر مینائی مرحوم نے ختم کر دیں اور اور شاعروں میں کوئی شاعر بھی ایسا نہ نکلے گا جو اپنے کلام کی صحت کا دعویٰ کر سکے یہ بات کچھ خدائے سخن ہی کو حاصل تھی بہر حال جس حالت میں جناب شرر نے غلطیاں دکھائیں انکو جو کچھ جواب دیا گیا ہے۔ سراسر ضد سے کام لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ شرر کو گالیاں دی گئی ہیں اسبات کا ہم اعتراف کرینگے کہ حالی کے کل اعتراض لغو و فضول ضرور ہیں جسکا جواب ۱۹۰۵ء میں اودھ پنچ بخوبی دے چکا ہے۔ چکبست کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی ہم آیندہ اسپر مفصل ریویو کرینگے۔

از ریاض الاخبار ۱۶۔ جون۔ مراسلات

گلزار نسیم

۱۱ مئی ۱۹۰۵ء کے اودھ پنچ میں ایک مضمون نسیم کی رنگین بیانی و حضرت شرر کی شرر فشانی کی سرخی سے طبع ہوا ہے گو اس مضمون سے اڈیٹوریل کالم پر ہیں مگر ہم ایسے مہمل مضمون کو اپنے لائق دوست اڈیٹر صاحب اخبار مذکور کی انشا پردازی کا نمونہ ہرگز نہیں خیال کر سکتے اسلیئے کہ اُن کی خداداد قابلیت ذہانت اور طباعی کے ہم نہیں تمام اہل ملک قائل ہیں اس مضمون کے دیکھنے سے ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نویس صاحب کو نہ تو کچھ استعداد علمی ہے نہ اُن میں شعر کہنے اور سمجھنے کا مادہ ہے اور نہ کچھ زبان دانی سے بہرہ ہے اس مضمون میں دیگر اغلاط زبان کے سوا جو شعر مثال میں پیش کیئے گئے ہیں وہ بالکل بے موقع اور غلط لکھے گئے ہیں میں اس مضمون کو تو چھوڑے دیتا ہوں کہ یہ مضمون کس نے لکھا اور ہمارے دوست نے کیوں ایسے مضمون سے پنچ کے صفحات سیاہ کیئے مگر اس کے مضامین سے بحث کرتا ہوں کہ اس مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ نسیم کی لغزشوں اور حضرت شرر کے اعتراضات کی رد جو کسی طرح اُٹھ نہیں سکتے کسی نافہم نے خامہ فرسائی کر کے اس لچر مضمون کے ذریعے پبلک کو دھوکا دینا اور اصلی غلطیوں کو چھپانا چاہا ہے اسی وجہ سے میں ایک سرسری نظر میں ان نرالے مضمون نگار صاحب کا پردہ فاش کیئے دیتا ہوں۔ گلزار نسیم کے اس نئے اڈیشن پر جسے پنڈت برج نرائن صاحب چکبست نے شائع کیا ہے مولانا محمد عبدالحلیم صاحب

شررؔ نے اپنے رسالہ دلگداز میں ایک ریویو لکھ کے نسیمؔ کی واقعی غلطیاں اور مثنوی مذکور کی بعض خوبیاں بھی بیان کی تھیں اور اس مضمون کے متعلق جو غلط خیالات پیدا کرنے چاہے تھے انکے دور کرنے کی کوشش کی تھی مولانا نے نہایت تحریر میں انصاف اور متانت سے بحث کی تھی اور جو اعتراضات کیئے ہیں انکو صحیح یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص نہیں اٹھا سکتا بلکہ جملہ شعراء لکھنؤ کو انپر اتفاق ہے اسپر کسی گمنام شخص نے اودھ پنچ کے دامن میں چھپ کے ایک طویل مضمون شائع کیا ہے جسمیں سوائے اسکے کہ ذاتیات پر بعض حملے کیئے گئے ہوں ورنہ چار سے زیادہ اعتراضوں میں سے صرف دو چار کا جواب قدما کے کلام میں تصرف کرکے پرانے اشعار کو عمدًا غلط کرکے یا غیر متعلق اشعار کو متعلق کرکے دیا گیا ہو۔ اور کچھ نہیں ہے اور حیرت کی یہ بات ہے کہ بعض کشمیری پنڈتوں کو اس پر ناز بھی ہے اس کا فیصلہ اس قسم کی فضول تحریروں اور گالیاں دینے سے نہیں ہوسکتا اصلی فیصلہ یوں ہوسکتا ہے کہ حضرت شررؔ کے اعتراضوں اور نیز اپنے اُن چند جوابوں کو اس عہد کے مشہور اور مستند شعراء دہلی اور لکھنؤ کے پاس بھیج دیجئے خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ ان اعتراضوں کو کوئی اُٹھا بھی سکتا ہے کہ نہیں۔ لکھنؤ میں تو خاندان انیسؔ کے سخنداں یادگاران دبیرؔ مرحوم میں سے حضرت اوجؔ مرزا محمد ہادی صاحب بی، اے، اور ان کے علاوہ حضرت جلالؔ و جناب تسنیمؔ وغیرہ ہیں دیگر بلاد میں حضرت ریاضؔ۔ جلیلؔ۔ حکیم برہمؔ ایسے سخنداں موجود ہیں دہلی کے پرانے اساتذہ میں سے حضرت ظہیرؔ حیدرآباد میں ہیں ان لوگوں کو تکلیف دی جائے اور اُن کا فیصلہ اصلی فیصلہ تصور کیا جائے ورنہ یوں گالیاں دینے اور بے دلیل سخن پروری کرنیسے آج تک کوئی کامیاب نہیں ہوا۔ اس تنگ خیالی کو ملاحظہ فرمایئے کہ مولانا شررؔ فی الحال ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اُنھیں طعنہ دیا جاتا ہے کہ چونکہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لہذا گلزار نسیم پر نہایت توجہ کے ساتھ ریویو کیا گیا ہے۔ ان بزرگ کے نزدیک اتحاد کے معنے یہ ہیں کہ

نہ مسلمان کسی ہندو کی کتاب پر منصفانہ ریویو کریں نہ ہندو کسی مسلمان کی کتاب پر ماشاء اللہ ان باتوں سے تو پتا چلتا ہے کہ ہمارے دوستوں نے چشم بد دور انگریزی میں خوب ترقی کی ہے ۔ مولانا نے مثنوی گلزار نسیم کی یہ دو بحثیں دکھائیں تھیں کہ شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے وہ اعلیٰ درجہ کی مثنوی ہے مگر غلطیوں کے لحاظ سے دیکھئے تو اس سے بدتر نظم اُردو میں نہ ملے گی یہ ہمارے مہربان کے نزدیک اجتماع ضدین ہے غالباً آپ کے نزدیک جس میں ایک عیب ہوتا ہے تو پھر کوئی خوبی نہیں ہوتی اور جس میں کوئی خوبی ہوتی ہے تو پھر کوئی عیب نہیں ہوتا واقعی یہ تو اتنی بڑی غلطی مولانا شرر کی پکڑی کہ اسکے بعد کسی جواب کی ضرورت ہی نہیں باقی رہتی ۔ مگر یہ اجتماع ضدین اُنھیں دماغوں کا جوہر ہے جو گلزار نسیم کے قدرداں ہیں ہمارے دوست نے اگر ایسا دماغ نہ پایا ہوتا تو دلگداز کا جواب ہرگز نہ لکھ سکتے ۔ گلزار نسیم کو مسٹر حکیمت نے خود نسیم کی تصنیف ثابت کرنا چاہا ہے اور اسکی شہادت میں اپنے بھولے پن کے قیاسات اور حکیم صاحب کی روایت پیش کی ہے مولانا نے لکھا ہے کہ منشی اشرف علی وصبا مرحوم کا بیان تھا کہ آتش نے کہدی اور خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے کیا عجب کہ آتش نے تفنن طبع کے لئے کہا ہو اور غلطیاں دیکھ کر نو عمر خوبصورت شاگرد کی طرف منسوب کردیا ہو اسپر لکھا گیا ہے کہ یہ روایتیں بھٹیگڑ خانہ کی گپیں ہیں اور طعن کیا جاتا ہے کہ گھر سے آیا ہے معتبر نائی ۔ نہیں جناب نائی نہیں آپ اپنی کہار ہی کی روایت پر اعتبار کیجئے لیکن اس کو تمام شعرا جانتے ہیں کہ کل صاحب مذاق سخن سنجوں کو یقین ہے کہ یہ مثنوی نسیم کی نہیں آتش کی ہے منشی امیر اللہ صاحب تسلیم زندہ بیٹھے ہیں وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ اس میں آتش کے سب شاگردوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور شریک ہے اور نسیم نے جو کچھ کہا اُسکا بہت تھوڑا حصہ اس میں باقی ہے ۔ دیگر بڑے بڑے اساتذہ موجود ہیں اُن سے جاکے پوچھ لیجئے ۔ مگر نہیں آپ کے نزدیک یہ سب بھٹیگڑ خانہ کی خبریں ہیں اور معتبر وہی ہے جو آپ نے اپنے پورانے کہار سے سُنا تھا اس سلسلہ میں پردۂ عصمت کا نام لیکر پردہ کی بحث بھی چھیڑ

دلچسپی ہے جسکو اس سے کوئی علاقہ نہیں مگر یہاں تو ذاتیات پر حملہ کرنا مقصود تھا چاہے کسی پہلو سے ہو۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ مولانا نے اگر یہ لکھا تھا کہ پردہ کو مسلمان اپنے ساتھ نہیں لائے بلکہ ہندوستان میں آکر اختیار کیا تو کونسا گناہ کیا اسکے دلائل کو تو آپ کیا معنی شاید دنیا میں کوئی نہ توڑ سکے گا اسکا کیا جواب ہے کہ مسلمان جن ممالک سے آئے اُن میں خانہ نشین کا پردہ نہ کبھی پہلے تھا اور نہ اب ہے پھر مسلمانوں میں اس کا رواج ہوا تو کیونکر اور کہاں سے اسکے مقابل چین میں پہلے سے پردہ موجود تھا جسکو مولانا شرر نے ثابت کردیا ہے اور چینیوں کا اثر مذہب بودھ کے ظہور کے بعد ہندوستان میں بے انتہا پڑ رہا تھا پھر کون سی خلاف قیاس بات ہے اگر کہا جائے کہ چینیوں سے ہندوؤں نے اور ہندوؤں سے مسلمانوں نے پردہ کو اخذ کیا آپکو اگر دعوی ہو تو آپ ہی ثابت کیجئے کہ ہندوستان میں آنے سے پہلے یا اُن ممالک میں جہاں سے مسلمان آئے کبھی بھی سکلیوژن کا رواج تھا، کہ اس بات کا گلزار نسیم خاص پنڈت نسیم کی مثنوی ہے سب سے اہم نازک اور نیا ثبوت جو مسٹر چکبست کو بھی نہیں سوجھتا تھا مضمون نگار صاحب نے یہ دیا ہے کہ اس میں ایک مصرع ہے (شب کی پوشاک بدلی ساری) یہاں ساری کا لفظ منجملہ اُن بیہودہ دور رعایتوں کے ہے جن کی بنیاد پر نسیم کی رعایت لفظی کے میدان میں ٹھوکریں کھانے کے لحاظ سے انکے زیادہ نمبر ملنا چاہیئے مگر ہمارے دوست کو اس مصرع میں خاص ہندو اور ہندو بھی کون کشمیری پنڈت (نہیں جناب میں تو کہتا ہوں کہ خاص الخاص پنڈت نسیم کے گھر کا جلوہ نظر آتا ہے کیونکہ آپ کے نزدیک تو سوا کشمیری پنڈتوں کے اور کسی قوم میں ساری کا رواج نہیں اور میں ایسا سمجھتا ہوں کہ اس مخصوص گھر کے سوا اور کہیں ساری نظر نہ آتی ہوگی مگر میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ مثنوی اس اعتبار سے کہ اسمیں یہ اشعار ؎

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
کرتا ہے یہ دو زبان سے یکسر — حمد حق و مدحت پیمبر

موجود ہیں کسی کشمیری پنڈت کیسا ہندو کی بھی نہیں ہو سکتی وہ کیا جانے کہ پیغمبر کون اور پنجتن کسے کہتے ہیں نہ یہ تناسب اُسکے خیال میں آسکتا تھا بلکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ہندو شاعر مراعات لفظی نظم میں ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ پنڈت نسیم کے دیوان میں اگر کسی جگہ ہوگا تو وہی خاص آتش مرحوم کا عطیہ جو اساتذہ کا عام قاعدہ ہے۔ اسکے بعد باوجودیکہ مولانا نے خود ہی لکھا ہے کہ امانت نے رعایت لفظی کے پیچھے پڑ کے بہت ٹھوکریں کھائیں مگر آپ نے محض کالم بھرنے کے لیے دس بارہ شعر ایسے نظم کر دیے جن میں رعایت نے عیب پیدا کر دیا دکھانا اسبات کو چاہیے کہ عمدہ قسم کی مستحسن رعایت بھی اُنکے کلام میں ہے یا نہیں اسلیے کہ یہی مولانا شرر کا دعویٰ ہے کہ اگر انھوں نے ٹھوکریں کھائیں تو انکی سی کامیابی بھی کسیکو نہیں حاصل ہوئی ایسے اعلیٰ درجہ کے صدہا شعر میں پیش کر سکتا ہوں مگر نہ مجھے اتنی فرصت ہی اور نہ اپنے مہربان کی طرح میں اخبارات کے کالموں پر اتنا ظلم پسند کرتا ہوں ہمارے دوست کو تعریف کر کے اپنا مطلب نکالنے میں بڑا ملکہ ہے چنانچہ مولانا نے جو دعویٰ کیا ہو گلزار نسیم میں اہل لکھنؤ کے نزدیک صدہا غلطیاں ہیں اور اس مثنوی کی زبان لکھنؤ کی زبان نہیں ہے اسکے معاوضہ میں وہ مولانا کی اس عبارت کو پیش کرتے ہیں کہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ آتش نے یہ مثنوی تفنن طبع کے طور پر کہی ہو اور پھر نسیم کو دیدی ہو اسکا آخری فقرہ دلگداز میں یوں ہے کہ (اور پھر نسیم کو اسمیں متعدد لغزشیں دیکھ کر دیدی ہو) اگر صحیح عبارت نقل کر دیتے تو معارضہ ثابت کرنا دُشوار پڑ جانے والا ہمارے دوست کو شاید فاتر العقل کہتا اس سے ضرورت ہوئی کہ قطع و بُرید کا عمل کر کے جواب دیا جائے اب صحیح عبارت پیش کرنے کے بعد میں پوچھتا ہوں کہ یہ کونسی بعید از عقل بات ہے کہ آتش کو اپنے کلام میں فروگذاشتیں یا لغزشیں نظر آئی ہوں اب ذرا اعتراضات کے جو چند جواب دیے گئے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہوں نسیم کے مصرع (شادی کو کہا حیا اُٹھا کر) پر مولانا نے اعتراض کیا تھا کہ حیا اُٹھانا بے معنی ہے، پردہ حیا اُٹھانا چاہیئے اسکا جواب دیا جاتا ہے کہ حیا اُٹھانا حیا اڑا دینا حیا اُٹھ جانا لکھنؤ کی فصاحت زبان ہے

معقول۔ مگر کوئی ثبوت) حیا کے ساتھ اڑا دینا اور اُٹھ جانا دونوں صحیح ہیں مگر اُٹھانا نہ کسی زبان پر ہے اور نہ لکھنؤ میں بول سکتا ہے اسکے بعد شرم اُٹھانے کا محاورہ بھی بطرق ثبوت پیش کردیا ہے اگر آپکا حافظہ کمی کرتا ہو تو ایسی دو چار لفظیں بتادوں سر اُٹھانا پانوں اُٹھانا دم اٹھانا۔ میں پوچھتا ہوں ان الفاظ کے گنوانے سے کیا۔ حیا اُٹھانا صحیح ہو سکتا ہے ہرگز نہیں اس سے بھی زیادہ کمال یہ کیا ہے کہ امیر مرحوم کے مصرع کچھ زری شرم نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں۔ کو سند میں پیش کیا ہے جسکے دیکھنے کے بعد ہمیں شک نہیں باقی رہتا یا تو نامہ نگار صاحب زباں دانی و شاعری سے بالکل مس نہیں رکھتے یا جان بوجھ کر دھوکا دیتے ہیں اور خود بیوقوف بن کر دوسروں کو بنانا چاہتے ہیں۔ امیر مرحوم کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ زری شرم نہیں ہے جسے میں اُٹھا نہ سکوں یعنی برداشت نہ کرسکوں اُٹھانے کے معنی برداشت کرنے کے سب کے نزدیک جائز ہیں اور اگر نسیم کے مصرع میں بھی اُٹھانے کے یہ معنی ہوتے تو کوئی اعتراض نہ تھا اُٹھانا کے اگر یہ معنی ہوں تو کسی کی حیا کو دوسرے شخص کا برداشت کرنا تو اُسپر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر نسیم نے حیا اُٹھانے سے یہ معنی لئے ہیں کہ شہزادے نے اپنی حیا کو برطرف کرکے یا سامنے سے ہٹا کے شادی کی درخواست کی یعنی حیا اُٹھانا بمعنی حیا کو برطرف کرنا یا چھوڑ دینا۔

ریاض الاخبار ۶۔ جولائی ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم

آجکل اودھ پنچ میں یہ بحث چھڑی ہے کہ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے جو اعتراض گلزار نسیم پر کیئے ہیں صحیح نہیں غلط ہیں اس ضمن میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گالی گلوج کی نوبت آگئی ہے مولانا شرر کی نسبت بہت سخت و سست الفاظ استعمال ہو رہے ہیں جن کو پڑھکر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مکرم و محترم منشی سجاد حسین صاحب کیوں اسقدر خفا ہو گئے ہیں اور شرر نے ان کی کیا خطا کی ہے شرر کیوں گردن زدنی و کشتنی ہیں اور شرر کے ساتھ کیوں ایسا سلوک کیا جاتا ہے شرر نے اگر گلزار نسیم پر ریویو کیا تو کوئی خطا نہیں کی شرر نے اگر خوشامدانہ ریویو نہیں کیا تو واجب التعزیر نہیں شرر کے ریویو پر اگر ہمارے مکرم و فاضل دوست کو سختی کے ساتھ کچھ لکھنا تھا تو پہلے مسٹر چکبست کی حیرت انگیز دلیری پر کچھ لکھنا چاہیے تھا جنھوں نے آتش و رند و صبا خواجہ وزیر۔ ناسخ سب کی تحقیر و توہین کی اور ایک حد تک سب کا درجہ نسیم سے گھٹا دیا یہ امر مسلم ہے کہ نسیم کی کوئی بساط او حقیقت ان شعرا کے سامنے نہ تھی صرف اپنی قوم کے ایک شاعر کی مداحی کے خیال میں مسٹر چکبست نے تمام لکھنؤ کے نامور شعرا پر بہت خراب و کمزور اور بزدلانہ حملہ کیا ہے اور اس معاملہ میں چکبست صاحب کا نام خواجہ حالی کے نام کے پاس ہی ہمیشہ درج کر لیا ہے جسطرح آپ کو شاعری سے مس و حس نہیں ہے ان فنا فی القوم

تعلیم یافتہ نوجوان کو بھی شاعری سے کوئی غرض اور واسطہ نہیں ہے۔ ہم اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کا نام نامی اسوقت زبان پر نہ لاتے مگر ایک مضمون میں اُنھوں نے ہمکو متنبہ کیا ہے کہ ہمنے اودھ پنچ کا جواب درج اخبار کیوں کیا اسکے کئی جواب ہیں۔ اخبار آزاد سے ہے مضمون ہیں کوئی جملہ ایسا نہ تھا کہ جو ادب کے دائرہ کے باہر ہوتا مضمون فی نفسہ بہت مُدلل اور اچھا تھا اور اسکی تردید بالکل غیر ممکن ہے ہمکو یہ علم تھا کہ جس مضمون کا یہ جواب ہے وہ ہمارے لائق کرم فرما کا ہے اسلیئے کہ ہمارے مکرم کبھی ایسی کمزور بحث پر قلم نہیں اُٹھاتے نہ ہمنے کبھی انکی تحریر کو ایسا کمزور اور سست دیکھا جو اعتراضات شرر نے کئیے ہیں گو موجودہ زمانہ میں اُنکا حرف حرف صحیح ہے مگر جس زمانہ میں نسیم تھے اسوقت کی زبان اور طرز کلام اور تصرفات کو دیکھتے ہوئے ہم نسیم کی کوئی خطا نہیں دیکھتے ہمارے دوستونکو صرف یہی لکھدینا چاہئے تھا مگر نسیم کی غلطیوں کا جواب دینا اور غلط الفاظ کو تسلیم کرنا یہ ایک بڑی جرأت ہے ہمارے دوست اور عالی دماغ مکرم نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمنے شرر کو دیہاتی لکھا تو ہمارا روئے سخن شرر کی طرف نہ تھا مگر ہم یہاں پر تسلیم کرتے ہیں کہ اگر ہم شرر کو دیہاتی لکھیں تو شرر کی کوئی توہین نہیں ہو۔ بلکہ شرر کا فخر ہو کہ ایک دیہات کا باشندہ آج اس قابل ہو کہ جسکی کتابیں نصاب تعلیم میں پڑھائی جاتی ہوں اور جسکی لکھنؤ میں سند لی جاتی ہے اور جو فخر لکھنؤ تمام ملک میں مشہور ہے اور اسی طرح اودھ پنچ کی وقعت اور عزت تمام ملک میں ہے حالانکہ وہ بھی ایک دیہاتی اڈیٹر اور دیہات کے رہنے والے آج کل فخر لکھنؤ ہیں اور اسوقت دیہاتونکی وجہ سے اُردو زبان کی ترقی ہوئی ہے کہنے کو جو دل میں آئے کہو مگر جب تھوڑی دیر اس مسلہ پر کوئی غور کرتا ہوگا تو انصاف اُس کو سمجھاتا ہوگا کہ بیشک قصباتیوں کی بدولت آج زبان کا یہ عروج ہو کیا شاعری کی دنیا میں کوئی آج ریاض جلیل و نسیم۔ مضطر سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ کیا انکا کلام جناب جلال کی طرح روشناس عالم نہیں ہے بلکہ کچھ زیادہ کیا شرر کی تصانیف کا شہرہ تمام ملک میں نہیں ہے۔ اور لوگ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے شہری ہونے کا خیال تو میر و مرزا تک تھا اور وہ زمانہ بھی اسی کام کا تھا اب اس فضول خیال کو دل سے نکال کر یہ

دیکھنا چاہیئے کہ شرر نے جو اعتراض کئے صحیح ہیں یا نہیں ہمارے نزدیک شرر کے اعتراض ضرور صحیح ہیں آتش نے لکھا تھا ؎ در و در ماں سے المضاف ہوا۔ مگر پھر انکی کسی نے تقلید نہیں کی اگر کوئی تقلید کرتا تو ٹوکا جاتا غلط لفظ غلط ہی ہے نسیم نے اگر حل کہا تو غلط تھا۔ چانصاحب نے کہا تو کہا اگر منشی امیر احمد صاحب مرحوم لکھتے تو بھی یہ لفظ غلط ہی ہوتا اسپر اسقدر اصرار کیوں ہے چانصاحب کا خط بھی دفتر پنچ میں جنت سے آگیا۔ اور اس میں ہزاروں گالیاں بھی شرر کو اور دیہاتیوں کو دیگئیں مگر دوست نے یہ نہ سوچا کہ اس سے ہم بھی تو مستثنیٰ نہیں ہم گلزار نسیم کی حالت دکھانا پسند نہیں کرتے ہاں شرر کے اعتراضات پر آئندہ کچھ لکھیں گے آئندہ کیلئے ہم اپنے دوست اڈیٹر صاحب اودھ پنچ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اس جھگڑے کو مٹا دیں شرر سے اگر کبھی کا کوئی رنج ہو اسکو دلسے بھلا دیں مگر ہمکو اسکی توقع نہیں ہو کہ ایسا کوئی ملال درمیان ہو مسٹر چکبست اور انکے طرفدار ضرور آمادہ کرتے ہونگے کہ شرر کو بھلا برا کہا جائے مگر ؎ انصاف شیوہ ایست کہ بالائے طاعتست۔ ہم کبھی اسکو نہ پسند کرینگے کہ کوئی شخص شرر یا اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کے خلاف سخت سست مضامین بھیجے اور ہم درج کریں۔ اس سے بڑھکر دنیا میں کوئی نامناسب بات نہیں ہے۔ ہمنے جو لکھا ہے اپنے قدیم تعلقات اور نیازمندانہ دعوؤں کی بنا پر لکھا ہے ورنہ ہم اسکا لکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے نسیم کی غلطیاں دکھا کر شرر کو زند و صبا کا جواب دینا تھا وہ حاصل ہوگیا اور اعتراضات کو سبنے تسلیم کر لیا اسکے ثبوت میں ہمارے پاس کئی خط آئے مگر حد ادب سے بڑھی ہوئی تحریریں ہمنے درج کرنا پسند نہ کیں۔

ریاض الاخبار مطبوعہ ۲۲ جولائی ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم

اس مثنوی کے جدید اڈیشن نے قیامت برپا کر رکھی ہے آتش مرحوم جان صاحب مغفور کی رد میں بیقرار ہوگئی ہیں اور ہر ایک شاعر نسیم کی غلطیوں کو صحیح تسلیم کر رہا ہے اور شرر کے واجبی اعتراضوں کی کوئی وقعت نہیں کرتا کیوں اس لئے کہ نسیم لکھنوی تھے اور شرر عصباتی ہیں اور ہمارے شاعروں کا علم و عقل اور شاعری کا موازنہ اسی طرح گرا یا گیا تو دنیائے شاعری میں ایک شاعر بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کون کہہ سکتا ہے کہ صرف اس بناپر کہ لکھنؤ کی لونڈیاں یا بعض متوسط درجہ کی خاتونیں جو غلط الفاظ بولتی ہیں یا غلط لغت استعمال کرتی ہیں وہ کتابی حیثیت سے صحیح سمجھے جائیں اور تمام دفتر لغت اور علم السنہ کو گور کہ دھندہ بنا کر دنیا کو موقع دیا جائے اس طرح تو اردو زبان کبھی دنیا میں صحیح و سلامت نہیں رہ سکتی لکھنؤ میں تو کبوتر کو قبوتر اور کاغذ کو قاغذ اور علی بخش کو علی بخش کہتے ہیں اور اسی طرح سے صدہا الفاظ کا استعمال ہوتا ہے مگر اسکو کوئی صحیح و قابل تمسک نہیں سمجھتا۔ آتش اور جان صاحب کی طرف سے خط و کتابت کر کے یہ ثابت کرنا کہ ہمارے شعرا عوام کی زبان کو مستند اور قابل تمسک سمجھتے تھے اور علم لغت کو دریا برد کر دینے کے قابل جانتے تھے دراصل شعرا ر زمان پر حرف رکھتا ہے۔ جناب خواجہ حیدر علی صاحب آتش مرحوم و مغفور اور جناب جان صاحب کے خطوط اور نواب نوازش علیخاں مرحوم کے گھر کی لونڈی کی دستاویز کا کوئی اثر ان اعتراضات پر نہیں ہوا

جو گلزار نسیم پر کئے گئے ہیں اور جنکا اعادہ اب نہایت وضاحت کے ساتھ پیام یار میں ہوا ہے پیام یار میں جو اعتراض گلزار نسیم پر ہیں اُنکے بڑے حصہ سے ہم کو اتفاق ہے مگر جہاں جہاں ہمارے مکرم اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کی پالسی سے بحث کی گئی ہے یا انکی نسبت کلمات سخت استعمال کئے گئے ہیں اُسے ہمکو سخت اختلاف ہے اور ہم افسوس کرتے ہیں کہ ایسے الفاظ کا استعمال ایک علمی زبان کی بحث میں کیوں ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر شخص ایک رائے کی پرستش نہیں کرسکتا اسمیں اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ رہا یہ کہ گلزار نسیم کے جھگڑے میں انکی رائے کیوں جناب شرر کے موافق نہیں ہے اسکا کوئی سبب ہوگا دنیا میں بہت سے روشن خیال ایسے ہیں جو اساتذہ کے کلام کو گو وہ غلط ہو قابل تمسک خیال کرتے ہیں نواب مرزا خانصاحب داغ مرحوم اور شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کی صریح اور فاش غلطیاں دیکھتے ہوئے بھی کوئی انکا شاگرد یا طرفداران کی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا اور ہمیشہ ہر شخص کچھ نہ کچھ معنی پیدا ہی کر دیا کرتا ہے ہم پھر کہیں گے کہ اسمیں قابل الزام جو صاحب ہیں وہ جناب چکبست ہیں جنھوں نے محققانہ دیباچہ نہیں لکھا اعلان جنگ دیا اور مشہور استادوں کی توہین کی اور غلط روایات و غلط قصہ فرضی کہانیاں درج کرکے لکھنؤ والوں کا دل دُکھایا ایسی حالت میں اگر نسیم صاحب کی فاش غلطیاں دکھا دی گئیں اور ثابت کر دیا گیا کہ یہ اس قابل تھے جنکو استادوں کے برابر کرسی دیجائے تو کیا بُری بات جناب شرر نے کی۔ آیندہ کیلئے ہم چاہتے ہیں کہ جو صاحب بحث کریں وہ اصل بحث پر خیال و توجہ رکھیں فضول باتوں کے ذکر و مذکور سے کچھ کام نہیں نکل سکتا۔

از ریاض الاخبار مطبوعہ ۲۰ اگست ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم

اس مثنوی کے نئے اڈیشن پر جو اعتراض کئے گئے ہیں اُسکا جواب چکبست صاحب نے اردوئے معلے میں بہت صبر و سکون کے ساتھ دیا ہے ایک ایسی مثنوی کی تائید جسکے جدید اڈیشن کو چکبست صاحب نے اپنا وقت صرف فرماکر مرتب کیا ہے) انکا فرض ہو مگر اُنکا فرض صرف گلزار نسیم کی ثنا و صفت ہی تک محدود تر ہے تو اچھا ہے خدا کرے وہ یہ بھی سمجھنے لگیں کہ شاعر کے کلام میں خصوصیت کے ساتھ تمام خوبیاں ہی نہیں ہوتیں ایک صاحب (زمانہ) میں نقاد لکھنوی کے نام سے ریویو کرتے کرتے ایسے جوش میں آگئے ہیں کہ مثنوی سحر البیان سے گلزار نسیم کو لڑا دیا اور اُسپر صبر نہیں آیا تو سحر البیان کی مرمت بھی کر دی ان باتوں سے اب کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ گلزار نسیم کی خوبیاں ہر شخص کو اپنا گرویدہ کر چکی ہیں۔ گلزار نسیم کی چھوٹی بحر اُسپر اختصار اور ترکیب الفاظ کی خوبیاں دلکشی کا سبب ہیں لیکن اس سے چشم پوشی کرنا دانائی نہیں ہے کہ جناب نسیم مرحوم کا شمار طبقۂ شعرا بیرل سوقت استادوں کے زمرہ میں نہ تھا اسکے کئی سبب تھے لکھنؤ کی زبان اُسوقت آتش و ناسخ صاف کر رہے تھے (ا) خود اُنھوں نے اپنے بچپن کے کلام میں جو دو چار محاورۂ قدیم زبان کے باندھ دیے تھے اُنکو ترک کر کے ایک نئی داغ بیل ڈال رہے تھے اور زبان اور اسکے محاورے محلوں میں خراد پر چڑھ رہے تھے عموماً سارا شہر اسوقت اہل زبان ہونیکا دعوی نہیں کر سکتا تھا نہ خود صبا خواجہ وزیر

امانت کے ہر کلام میں کیسے ہی عیوب چکبست صاحب نکالیں مگر عموماً ان لوگوں کی
قابلیت اور انکی زبان تسلیم کر لی گئی تھی اور اُن کو اس قسم کے موقع بھی حاصل تھے کہ وہ ایسا دعوے
کرسکیں ان اصحاب کا کلام ہی اُنکے دعوے کے ثبوت میں موجود ہے وہ زمانہ تو بہت دور ہا
اسوقت بھی لکھنؤ میں کشمیریوں کی زبان کی سند کوئی نہیں لیتا ہمارے مرحوم دوست جناب سرشار
جنھوں نے اُردو کی دنیا میں اپنے ڈنکے بجوا دئے تھے اور جنکو یہ دعوی تھا کہ لکھنؤ کی زبان ہے
ان کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی تھی اور اودھ پنچ نے ثابت کر دیا تھا کہ طباعی اور ذہانت اور
چیز ہے اور زبان دانی اور شئے ہے لکھنؤ میں کشمیریوں اور دیہاتیوں پر ایک ہی طرح نظر ڈالی
جاتی ہے اگر یہ خیال کیا جائے کہ ناسخ اور اتیر کہاں کے رہنے والے تھے تو دیہاتیوں کے
احسان سے ابھی کچھ روز شہر والے اور سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ بالخصوص اودھ پنچ کے
احسانات سے بہت دنوں تک چکبست صاحب اور اُنکے ہم خیال شہری سبکدوشی
نہ حاصل کرسکیں گے اور ہمکو مسرت ہے کہ یہ احسان بھی کسی شہر والے کا نہیں ہو حاصل کلام
یہ ہے کہ جناب نسیم مرحوم کا شمار اُستادوں میں نہ جب تھا نہ اب ہے اور اُنکے کلام پر جو اعتراض
کئے گئے تھے وہ بہت صحیح تھے اسلئے کہ وہ آتش کے شاگردوں میں تھے اور شاگردوں کے بعد
داخل ہوئے اُسوقت آتش اور اُن کے شاگرد ترکیبوں اور بندشوں اور اس زبان کو ترک
کر چکے تھے جو جناب نسیم نے گلزار نسیم میں لکھی ہے اور جسپر جناب شہید نے اعتراض کئے ہیں
(تک مجھ پاس) اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اُسوقت کسی کی زبان پر نہ تھے نسیم صاحب نے
ایک سخت کام اپنے سر لیا تھا وہ ان الفاظ سے اس مثنوی کو نہ بچا سکے اور چونکہ محلات کی
زبان اور خواص کی صحبتوں سے دور تھے اس لئے زبان کی خوبیاں مثنوی میں نہ پیدا کرسکے
ہاں شاعرانہ محاسن استعارات اور تشبیہ کو اُنھوں نے خوب صرف کیا ہے ان وجوہ سے
چکبست صاحب کا جواب کافی نہیں ہے اور بہت سی دلیلیں ٹھیک بھی نہیں ہیں انشاء
ہم چکبست صاحب کے مقدمہ پر سرسری نظر ڈالیں گے جسمیں اُنھوں نے حالی صاحب کی

تقلید میں شعرائے لکھنؤ پر بوچھار کی ہے اور چند فرضی قصے جناب نسیم صاحب مرحوم کی تعریف میں درج کر دیے ہیں یہی باتیں محرک ہوئی ہیں کہ مثنوی کی خوبیاں اور اسکے عیوب ظاہر کر دیے ہیں کہ پھر کوئی ایسی جرأت نہ کر سکے۔

از ریاض الاخبار مطبوعہ ۲۴ اگست ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم

مسٹر چکبست کو بڑی زحمت جناب نسیم مرحوم کے حقوق کے اثبات میں اٹھانا پڑی ہے کسی کا مرتبہ بڑھانے کے لئے یہ لازم ہے کہ اسکے معاصر مٹا دیے جائیں مگر ہمارے نزدیک مسٹر چکبست صاحب کی یہ رائے زیادہ قابل وقعت نہیں ہے کہ ایک نسیم کی برتری کے واسطے رند۔ صبا۔ وزیر۔ خلیل۔ امانت وغیرہ کا درجہ اس قدر گھٹایا جائے کہ ان کی تحقیر و توہین ہو جناب امانت مرحوم کے رعایت لفظی کا خاکہ اڑانے میں بہت کچھ ہمت صرف فرمائی گئی ہے اور آخر نہایت ناشائستہ الفاظ میں نکتہ چینی کیگئی ہی جناب چکبست کو اس کی کچھ ضرورت نہ تھی کہ وہ صرف جناب نسیم کے کلام پر تقلید کرتے اور اس کی خوبیاں اگر دکھاتے تو اچھا تھا امانت مرحوم نے جو رنگ اختیار کیا وہ انکا خاص حصہ تھا اور جس زمانہ میں وہ اس رنگ کی طرف متوجہ ہوے اسوقت لکھنؤ میں اسکی ضرورت تھی

شعرا کی سوسائیٹی میں یہی رنگ پسند کیا جاتا تھا رشک مرحوم کے کلام کو دیکھنا چاہیئے شاعر کے کلام میں اسکی بہت موجود ہے امانت مرحوم پر چوٹ کرتے کرتے منشی احمد علی صاحب شوق کی مثنوی زہر عشق پر بھی ایک وار مسٹر چکبست صاحب نے کر دیا ہے ؎

پاجی ہیں شریف سب اُجڑ جائیں ہیری ہوویں بیر کیڑے پڑ جائیں

اس شعر پر مسٹر چکبست صاحب فرماتے ہیں اپنے نزدیک ان صاحب نے نسیم کے ذیل کے شعر کا جواب دیا ہے ؎

سنبل مرا تازیانہ لانا شمشاد اسے سولی پہ چڑھانا

منشی احمد علی صاحب شوق کی مثنوی میں گو بہت شعر بے ضرورت نکلیں گے مگر اس عیب سے گلزار نسیم بھی خالی نہیں ہے معلوم نہیں مسٹر چکبست کو اس اعلان جنگ کی ضرورت کیا تھی منشی احمد علی صاحب شوق کا ایک شعر سراپا میں ہے ؎

بیخود تھے شراب پینے والے مستی میں اُلٹ دیئے پیالے

گلزار نسیم میں اس شعر کا جواب نہیں ہے کیا جناب چکبست اس وجہ سے زہر عشق کو گلزار نسیم کا درجہ عطا کرینگے ایک مقام پر نسیم کے دو شعروں پر یہی اعتراض ہو اور انکی رعایت لفظی کو جناب چکبست پسند نہیں کرتے اسی طرح اگر وہ اور شعرا کو بھی معذور رکھتے تو رند۔ صبا۔ وزیر۔ خلیل۔ امانت۔ شوق کے طرفدار وں کو گلزار نسیم پر نکتہ چینی کی ضرورت نہ ہوتی نسیم کی زبان کے متعلق یہ نوٹ ہے کہ ٹکسالی زبان ہے مگر اس دلیری کا ثبوت کچھ نہیں ہے چند شعر جو دیئے گئے ہیں اگر کل مثنوی میں سو پچاس شعر زبان کے نکل آئیں تو کوئی کمال کی بات نہیں ہے ٹکسالی زبان کے لئے لازم ہے کہ زبان کی کوئی غلطی نہ ہو جناب نسیم نے زبان کا خیال کچھ بھی نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے رعایت استعارہ و تشبیہ کی پابندی کی وہ جانتے تھے کہ زبان کے دائرہ میں میرا قلم کام نہیں دے سکتا ورنہ وہ سحر البیان کا رنگ اختیار کرتے ان کے ان شعروں کا کہیں جواب نہیں ہو اور کوئی

شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ لکھنؤ کی زبان میں یہ شعر کہے گئے ہیں ؎

دائیں دیکھا نظر نہ آئی
بائیں دیکھا کہیں نہ پائی

یعنی دائیں بائیں بکاؤلی کو تاج الملوک نے نہیں پایا۔ نہ پائی کے لیے جو کچھ اردو کے معلے میں مسٹر چکبست نے کہا ہے وہ ان کی زبان میں شاید صحیح ہو مگر ذوق سلیم اور زبان سے واقف احباب کہہ سکتے ہیں کہ یہ زبان کہاں تک صحیح ہے ؎

پریوں نے ہوا سے تخت اُتارا
ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا

ستارہ ٹوٹتا ثابت ہوا مگر مصرع کی ترکیب نے جو اُلجھن زبان میں پیدا کی ہے ظاہر ہے۔ زبان کو دائرہ سے نکالکر بھول بھلیاں میں الفاظ کو ڈال دیا ہے ؎

جو گاتی تھیں مثل آواز
مجرے کو اُٹھی وہ صورت ناز

رعایت لفظی کے چکر میں آکر خلاف واقع ناز کا اٹھنا ثابت کیا ہے۔ ناز اٹھایا جاتا ہے ناز اُٹھتا نہیں ہے صورت ناز بکاؤلی اُٹھی یہ کہاں کی زبان ہے ؎

ہے اب جو بیان سنگ ساری
یوں پائے قلم ہوا ہے بھاری

پاؤں بھاری ہونا حمل کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ معلوم نہیں قلم کے پاؤں بھاری ہونے سے کس قسم کا حمل مراد ہے صرف رعایت لفظی نے یہ عیب پیدا کیا ہو ؎

یہ در ما نند چشم بے خواب
ہوتا ہے سحر کو بند بیتاب

بیتاب اس محل پر بمعنی ہے یا برائے بیت ؎

کروٹ لے کر وہ عنبریں مو
اُٹھ چلنے کا سوچتا تھا پہلو

عنبریں مو تاج الملوک کی صفت ہے اس مثنوی میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ زوائد اور حشو کا دخل نہیں ہے مگر یہ صفت معشوق کی ہو سکتی ہے نہ عاشق جان باز کی ؎

لعل و گہر ایک درج میں ہو
شمس و قمر ایک برج میں ہو

دونوں ردیفوں میں (ہیں) چاہئے۔ لکھنؤ کی یہی زبان ہے ؎

کیا تیرے حمل کا ڈھنگ پایا — سرسوں سا ہتھیلی پر جما یا

دوسرے مصرع کا مطلب صاف نہیں ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا ایک محاورہ ہے مگر یہاں سیاق کلام سے اس مصرع کا کوئی مطلب نہیں ہے ؎

چمن سے رہا مجمع بدو نیک — رخصت ہوئے رفتہ رفتہ ایک ایک

(بدو نیک) کا مجمع بھی قابل تعریف ہے حالانکہ مجمع میں سلاطین اور ملوک اور اعزا و اقربا بھی تھے معلوم نہیں (بد) و بدکردار کون لوگ اس مجمع میں تھے۔ رخصت ہوئی یا رخصت ہوئے دونوں زبان کی حیثیت سے غلط رفتہ رفتہ ایک ایک رخصت ہوگیا یا رخصت ہوا۔

تھا داغ پسر مقدر اس کو — جنتی تھی ہمیشہ دختر اس کو

اسکو ہمیشہ دختر جنتی تھی یہ زبان تو لکھنؤ کی نہیں ہو سکتی۔ ہاں نیرنگ بہار کشمیر ہو تو ہو اگر یہی ٹکسالی زبان ہے تو مسٹر چکبست صاحب کا دعویٰ صحیح ہے ؎

ہر چند سنا گیا ہے اس کو — اردو کی زبان میں سخنگو

ہر چند اسکو اردو کی زبان میں سنا گیا ہے غلط ہے۔ ہر چند یہ اردو کی زبان میں سنا گیا ہو صحیح ہے اس قسم کی سیکڑوں غلطیاں موجود ہونے پر ٹکسالی زبان کہنا مسٹر چکبست کی دلیری اور جرأت کی تعریف کرنا چاہیئے۔

(ب)

(ریاض الاخبار مطبوعہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء)

گلزار نسیم

مسٹر چکبست جناب امانت مرحوم کی زباں دانی پر حرف رکھتے ہیں خدا کی شان ہے کہ امانت مرحوم تو زبان سے ناواقف ٹھہرائے جائیں اور نسیم مرحوم اہل زبان کہے جائیں۔

جناب چکبست صاحب اس طرح امانت مرحوم کی حرف گیری کرتے ہیں مثلاً امانت مرحوم کے لئے تناسب لفظی کا شوق جنون کے درجہ تک پہونچگیا ہے لیکن چونکہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہیں ہے اور طبیعت میں شستگی کا جوہر نہیں لہٰذا جو شعر اس رنگ میں کہا ہے اُسے پڑھکر ہنسی آتی ہے (یہ الفاظ جناب امانت مرحوم کی شان میں استعمال ہوئے ہیں اور پھر یہ توقع کی جاتی ہے کہ نسیم مرحوم کی ستائش میں آپ کی ہاں میں ہاں ملانے کو اہل لکھنؤ زبان کھولیں۔

سچ تو یہ ہے کسی فن کی تنقید کے لئے اُس سے واقفیت بھی ضرور ہے اگر کوئی شخص کہے کہ تاج محل میں یہ نقص رہ گیا تو اسکے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ فن انجنیری سے بھی واقف ہو۔

مسٹر چکبست بیشک بی اے ہیں اور ان کی تعلیم انگریزی قاعدہ سے مکمل ہو مگر اُن کو شاعری کے نکات اور اسکے فن سے کیا تعلق ہے۔ اگر کچھ بھی واقفیت ہوتی تو امانت مرحوم کی زبان پر وہ اعتراض نہ کرتے۔ اسلئے کہ امانت مرحوم جس طبقے اور جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ اہل زبان ہونے کا دعویدار تھا اور اب تک اُنکے خاندان میں دعویدار

اور فصیح البیان شاعر موجود ہیں۔ جو غیر مہذب الفاظ جناب امانت مرحوم کی شان میں مسٹر چکبست نے استعمال کیئے ہیں اُن کو پڑھکر کوئی شخص جو شایستگی پسند ہے صبر نہیں کر سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ امانت مرحوم کو رعایت لفظی کا جنون تھا مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ امانت مرحوم کے وقت میں سوسائیٹی کا رنگ طبیعت کیا تھا اور رعایت لفظی اضافت سخن میں داخل ہے یا نہیں جنون کی جگہ چکبست صاحب دوسرا لفظ بھی استعمال کر سکتے تھے مگر دلی خیالات پر وہ پردہ نہ ڈال سکے زبان پر قدرت کاملہ نہ ہونے کا ثبوت رعایت لفظی سے تو ہو نہیں سکتا اسلئے کہ اس معاملہ میں نسیم مرحوم بھی کچھ پیچھے نہیں رہے ہیں۔

اس بات کا جواب کوئی مہذب شخص نہیں دے سکتا کہ امانت مرحوم کی طبیعت میں شستگی نہ تھی اگر امانت مرحوم کی شائستگی پر حرف رکھا جاتا تو شاعری کی دنیا میں کوئی شاعر بھی نہیں بچ سکتا اور اگر ذاتی افعال و اقوال پر یہ حملہ ہے تو اسکا جواب اہل لکھنؤ دیسکتے ہیں یا وہ لوگ جو خود لکھنؤ کی سپر اور لکھنؤ کا پشت پناہ تصور کرتے ہیں اتنا ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاہی دربار میں امانت مرحوم کی وقعت اور عزت اور سوسائیٹی میں قدر و منزلت بحیثیت ایک شائستہ فرد ہونے کے امانت مرحوم کی مسلم ہے کوئی تنگ خیال بھی اس قسم کے کلمات انکی شان میں زبان سے نہیں نکال سکتا۔ جن پیرایہ اور سیاق کلام میں جناب امانت مرحوم اور جناب شوق پر مسٹر چکبست نے اعتراض کیئے ہیں اگر اسی رنگ میں جناب نسیم مرحوم پر وہ اعتراض کرتے تو ہم کو افسوس نہوتا مگر جہاں انھوں نے نسیم مرحوم کی حرف گیری کی ہے وہاں برادری کا پاس بہت کچھ کیا ہے اور اس طرح گل فشانی فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں عرض کرنا مناسب ہے کہ اگر نسیم سے بھی تناسب الفاظ کے ساتھ لطافت سخن قائم نہیں رہ سکی ناظرین انصاف فرمائیں کہ امانت مرحوم کے لئے جنون کا لفظ استعمال ہوا ہے اور نسیم مرحوم کیواسطے اسکے مقابلہ میں کوئی جنون خبط سودا کا لفظ نہیں فرمایا حالانکہ آپ اسکے قائل ہیں

نسیم مرحوم نے بھی اکثر ایسی خطا کی ہے جو شخص کثرت سے ایک عیب کا خوگر ہو تو اسکو مجنون کہنا اگر جائز ہے تو اُسکے مقابل کو بھی خبطی کہنا مناسب ہے امانت مرحوم کے لئے تو یہ کہا گیا کہ زبان پر قدرت کاملہ حاصل نہیں ہے اور نسیم مرحوم کیواسطے یہ رعایت جائز رکھی گئی کہ لطافت سخن قائم نہ رہ سکی۔ ان خیالات کو دیکھکر اگر مسٹر چکبست صاحب کی اصلاح پر قلم اٹھایا گیا تو کوئی بیجا بات نہ تھی۔ اسپر ہمارے دوستوں کو ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے خفگی اور غصہ صرف کرنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے مگر بات وہ کہنا چاہئے جو سب پسند کریں نسیم مرحوم کی طرفداری اگر جائز ہے تو خواجہ وزیر اور رند اور صبا خلیل امانت شوق کی طرفداری کیوں ناجائز ہے۔ نسیم پر اعتراض کئے جائیں تو غصہ صرف ہو اور مسٹر چکبست نے تمام شعرا پر کند چھری چلائی تو اُن سے بازپرس نہو۔ مسٹر چکبست اپنے دعوے کو بھی بھولجاتے ہیں فرماتے ہیں اکثر نسیم سے بھی تناسب الفاظ کی لطافت سخن قائم نہ رہ سکی۔ اکثر کا عکس خوب کیا ہے دونوں باتوں میں کونسی بات تسلیم کی جائے (قابل معافی) کا جملہ کہتا ہے کہ آپ کے نزدیک تناسب لفظی سخت جرم اور سخت گناہ ہے جسکا کفارہ ممکن نہیں ہے یہ آپ کی سخن سنجی پر ایک قطعی دلیل ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فن شاعری پر آپ کو کامل عبور ہے۔ نسیم قابل معافی اسواسطے ہیں کہ وہ برادری میں داخل ہیں۔ اور رند خلیل امانت مرحوم شوق اسلئے ملزم ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ مقدمہ لکھتے وقت جسطرح جناب حالی صاحب کو اس بات کا خیال نہ تھا کہ کوئی اسپر نگاہ ڈالے گا اسی طرح مسٹر چکبست صاحب بھی یہ سمجھے ہوئے تھے کہ کون دیکھنے والا ہے اور کون خیال کرتا ہے نسیم کا مرتبہ اسقدر بلند کرنا چاہیے کہ ناسخ اور آتش بھی لحد میں بیقرار ہو جائیں افسوس ہے کہ خلاف توقع ہر شخص کی نظر پڑگئی اور وہ پردہ اُٹھ گیا جسمیں تعصب کا خوفناک چہرہ نظر آرہا ہے۔

(از حکیم برہم صاحب)

از اخبار تفسیر تیج ۷۔ نومبر ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم اور قلقل

اس بحث کے متعلق قلقل رقم طراز ہے۔ اس بے لطف جھگڑے کی ابتدا شرر صاحب نے کی ہے۔ نہیں معلوم کیا ضرورت داعی ہوئی تھی کہ نسیم ایسے شاعر کا جن کی شاعری اپنا نقش جما چکی ہے آج یہ اعتراضات تذکرہ کیئے جائیں۔ جبکہ حضرت خواجہ حافظ علیہ الرحمہ یہ اصول روشن قائم فرما گئے ہیں۔

بہ ستاں نو یہ سرودے فرست   بہ یاران رفتہ درودے فرست

نسیم آج نہیں ہیں۔ انکی تنوی زیر تصنیف یا ابتدا زیر طبع نہیں ہے پھر شمار اعتراضات سے وہ کیا اصلاح ہے جو منظور تھی۔

طبقۂ شعرا میں بحث مذہب و قومیت کبھی نہیں ہوتی وہاں صرف درجۂ سخن پر حریفان ہم پہچانے جاتے ہیں پس جب نسیم ایک بڑے دورۂ شاعری کے تاباں شخص تھے تو کیوں انکی تابش کو دھندلا کرنے کی کوشش درکار ہے۔

کلام سلف میں سب سے پہلے دیکھے جانے کی بات جو ہے وہ یہ ہو کہ انکے عہد میں دور کہ خیالات اور معیار سخن کیا تھا اور ضرور ہے کہ پچھلے لوگوں کو ہم جب شاعری یا کسی علم و فن کی بحث میں دیکھیں تو ہمیں انھیں کے دور میں استغراق خیال سے اپنے آپ کو موجود فرض کرنا چاہیئے

اور پھر ہم انکی بزم مذاق میں حاضر ہوکر نگاہ کریں تو دیکھیں گے کہ انپر جرأت اعتراض ہوسکتی ہے یا نہیں۔ یہ تو ٹھیک نہیں ہے کہ ہم زمانۂ موجودہ کے خیالات پر گذشتہ اشخاص کی فرو گذاشتیں پکڑیں۔

اودھ پنچ مطبوعہ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۵ء جلد ۲۹ نمبر ۳۹

اردوئے معلّٰی کی رائے

ہمعصر مذکور العنوان گلزار نسیم کے قضیے سے متعلق جو رائے اظہار فرماتے ہیں اسکے چند فقرے حسب ذیل ہم درج کرتے ہیں یقین ہے انکو شرر صاحب اپنے تخلص کیطرح پس پشت نہ ڈالیں گے بلکہ زیب ناصیہ فرمائینگے۔

عنوان اول سے متعلق گلزار نسیم کی تصنیف کو خواجہ آتش کے ساتھ منسوب کرنا خطا ہے بلکہ ہمارے نزدیک اس قسم کی بے بنیاد روایتوں کو درحقیقت صحیح سمجھنا اپنے تئیں مذاق سخن سے بیگانہ ثابت کرنا ہے۔۔۔۔۔۔۔

شعرائے لکھنؤ میں سے صرف خواجہ آتش ایک ایسے شاعر تھے جنکے کلام کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ اس میں آورد سے آمد زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں انکو گلزار نسیم کا مصنف

ٹھہرا جسکا ہر ہر شعر اردو تصنع کی گویا ایک مجسم صورت ہے۔ بہر کیف ناواجب ہے ......

گلزار نسیم کی زبان بیشک لکھنؤ کی زبان ہے۔ اگرچہ اسمیں بعض غلطیاں بھی موجود ہیں ...

لیکن ساتھ ہی اسکے ان چند غلطیوں کی بنا پر یہ کہنا بھی غایت درجہ کی کوتاہ نظری ہے کہ نسیم کی زبان لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔ یا یہ کہ ان غلطیوں نے گلزار نسیم کو مٹا دیا۔

(از حسرت موہانی)

از اتحاد جلد ۱ نمبر ۱۳ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۵ء

(از مولوی عبد الحلیم صاحب شرر)

گلزار نسیم پر دلگداز میں جو اعتراضات کئے گئے انکی تائید اور معترضوں کی تردید کے لئے ہم سے کئی صاحب اصرار فرما رہے ہیں۔ افسوس وہ اس بات کو نہیں خیال فرماتے کہ اب اس بارے میں کچھ لکھنا دلگداز کی شان و وضع کے بالکل خلاف ہے دلگداز نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اعتراضوں کے جواب میں اودھ پنچ کے صفحوں پر جو کچھ لکھا گیا وہ خود بتائے دیتا ہے کہ ان اعتراضوں کے اٹھانے کی کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے۔ اور اگر کسی صاحب کے دل میں کچھ شبہ رہ گیا ہو تو اسکا فیصلہ ریاض الاخبار کے سخن سنج و مستند اڈیٹر اور جناب بدر نے کر دیا۔ اتحاد ایسی تنگ خیالی کو لغو اور بیہودہ خیال کرتا ہے کہ گلزار نسیم پر اعتراض کرنے سے اتحاد کی پالسی پر کوئی اثر پڑیگا اسلئے اگر ضرورت ہوئی تو اس بحث کے متعلق اتحاد کے صیغہ مراسلات میں ان حضرات کے مضامین شائع کر دئے جائینگے جو دلگداز سے یہ کام لینا چاہتے ہیں۔

اس بارۂ خاص میں کشمیر درپن کی باتوں پر عصر جدید کو اور نیز ہمیں برا نہ ماننا چاہئے

کیونکہ اُسے قدرتی طور پر ایسا لکھنے کا حق حاصل ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کشمیری برادری کے سپرد ہیں اور وہ کشمیری پنڈت ہے یہ وہ جلد ہو جو تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سب کو برابر کر دیا کرتا ہے۔

(از شرر)

از اتحاد جلد ۲ نمبر ۱۵ یکم اگست ۱۹۰۵ء

گلزار نسیم پر ہم نے ریویو کیا اور مہذب طریقے سے پبلک کو بتا دیا کہ اس مثنوی میں باوجود ہزارہا خوبیوں کے صدہا غلطیاں ہیں اور اس کی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں اس بحث کو اودھ پنچ نے نہایت ناپاک اور گندے طریقے سے اُٹھایا اور ہم نادم ہیں کہ ہماری وجہ سے مہذب پبلک کو ایسے بیہودہ اور ناپاک الفاظ سننے پڑتے ہیں اُنکے جواب میں ویسی ہی بدتمیزی خود بھی گوارا کر لینا ہمارا کام نہیں۔ اور نہ ہمیں اسکی لیاقت ہے ہم اپنے مکرم دوست حسن افضل صاحب بدر کی خدمت میں اُنکے شکر گزار ہو کے عرض کرتے ہیں کہ براہ کرم وہ اپنا قلم روک لیں۔ اور نہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ منشی نثار حسین صاحب مہتمم پیام یار نے جس کام کو ایک دفعہ سر کوب نکال کے پورا کیا تھا پھر دوبارہ کریں کسی کو کچھ دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم اور منشی سجاد حسین صاحب خود ہی نپٹ لیں گے۔

اس سے آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں ویسی ہی گالیاں بک کے اور اسیطرح کے ناپاک کلمات استعمال کر کے اتحاد یا دلگداز کے مہذب ناظرین کو تکلیف دونگا نہیں میں اس معاملے کو منشی سجاد حسین صاحب کی جسمانی معذوری کے ساتھ ایک اخلاقی و روحانی معذوری خیال کر کے غیر قابل لحاظ سمجھتا ہوں اور وہی کروں گا جو ایک شہدے کے مقابل میں ہر شریف آدمی کو کرنا چاہیئے۔ آپ کے مکان کے سامنے ایک شہدا کھڑا ہو کے گالیاں دیگا تو آپ اپنا دروازہ بند کر لیں گے۔ اسی طرح میں اودھ پنچ پر اپنے دفتر کا

دروازہ بند کرتا ہوں۔ جناب منشی سجاد حسین صاحب کی خدمت میں التماس ہے کہ آیندہ براہ مہربانی اپنا مہذب پرچہ میرے پاس نہ بھیجا کریں نہ میں پڑھونگا نہ جواب دینے کو جی چاہے گا۔ مجھے تبادلہ موقوف کرنا منظور نہیں۔ اتحاد اور دلگداز ان کی خدمت میں برابر حاضر ہوا کرینگے۔ مگر جب تک اس تہذیب سے وہ مضامین شایع کرتے ہیں مجھے اپنا جہاں جہاں آزاد کہانے سے معاف رکھیں۔

لیکن نسیم کے کلام پر ریویو کرنے کا جو سلسلہ دلگداز میں جاری کیا گیا ہے وہ برابر جاری رہے گا۔ ابھی تو مثنوی ہی پر ہمیں بہت سے اعتراض کرنے ہیں مگر اس سے فراغت حاصل کرکے ہم انکے دیوان پر بھی ریویو شروع کرینگے کسی اخبار یا رسالے میں اگر کوئی معقول بات کہی گئی یا معقول جواب دیا گیا تو اُس کا ضرور لحاظ کیا جائیگا ہم تسلیم کرینگے یا جواب دینگے۔

(اودھ پنچ مطبوعہ ۱۰ اگست ۱۹۰۵ء جلد ۲۹ نمبر ۳۶)

اودھ پنچ سے شتر غمزہ

(از منشی سجاد حسین صاحب)

جو منھ میں یار کے آتا ہے بک جاتا ہے اے آتش
نہ اُلٹی ہی سمجھتا ہے نہ وہ رشک قرسیدھی

اس مرتبہ اتحاد میں جناب مولانا عبد الحلیم صاحب شرر خادم قوم ادیب نکتہ پرور

سابق اڈیٹر پردۂ عصمت و اڈیٹر جال و گداز و اتحاد و اڈیٹر مستقل المورخ و اڈیٹر دستور العرفان و مصنف بدر النسا کی مصیبت، نے ہمکو شہدے کا خطاب دیا ہے۔ عمرت دراز باد۔

اور یہ محض اس گناہ پر کہ ہم نے نسیم لکھنوی کی مشہور مثنوی گلزار نسیم پر بہٹ دھرمی تعصب مذہبی سے لبریز۔ مولوی شرر کے اعتراضات لایعنی کی منصفانہ تردید کی جسارت کی ہزار شکر کہ ہم نہ گندہ دہن مولوی ہیں نہ سیست بادہ ریاکاری ورنہ شرعی شہدے ہوتے۔ اب خوف ہے کہ کسی روز مولانا شرر وضو کرکے صعود وشکر میں اللہ میاں سے مراقبہ کریں تو ہم کیا کرینگے۔ ہم تو سمجھتے تھے اودھ پنچ میں جو مضامین نکل رہے ہیں انکے جواب دینے کی اگر جرأت کی گئی تو ظرافت ولطافت کے پیرایے میں جودت دکھائی جائیگی۔ مگر مولانا نے اپنے خلقی دستور کے ہوئے مذاق کے مطابق جواب

رباعی بدم گفتی وخورسندم عفاک اللہ نکو گفتی۔

مولانا شرر نے بھی پردرد ہوکر پنچ کے تمام مضامین کا جواب گلزار نسیم کا سا اختصار مد نظر رکھکر ایک لفظ میں دیدیا ہے۔ مولانا کے اور بہت سے اوصاف تو معلوم تھے مگر یہ نہ معلوم تھا کہ سلامتی سے مولانا لجالوست معشوق مزاج بھی ہیں اور ذرا سی چھیڑ میں بگڑ کے روٹھ جاتے ہیں اچھا ہوا کہ شاہی نہ ہوئی ورنہ ہمیں شہر چھوڑ دینا پڑتا۔ پھر اور تو ہم سے کچھ نہ بن پڑتا سیدھے حیدرآباد چلے جاتے کیا کہیں مولانا کی یہ ادا ہمیں رہ رہ کر یاد آتی ہے کہ ہائے کس انداز سے کہتے ہیں کہ کوئی اور صاحب دخل نہ دیں ہم اور منشی سجاد حسین نپٹ لیں گے دیہم، تو دل میں کھپ گیا واقعی ایسی بھی ایک ادا کھلتی ہے ؎

عرب کے ملک میں دیکھے بہت شتر غمزے   پر ایک اونٹ میں پائی نہیں ادا تیری

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اب ہم اودھ پنچ نہ لیں گے۔ صورت سے بیزار ہیں بہت اچھا صاحب۔ آپ اودھ پنچ سے ناراض ہو جائیے مگر یاد رہے یوں تو ممکن تھا

کہ او وہ پیچ آپ کی خدمت میں کوتاہی کرجاتا لیکن اب جب تک صفحۂ ہستی پر اسکا وجود قائم رہے گا اس وقت تک یہ برابر آپ کی خاطر میں دخیل ہوتا رہے گا آپ کوسنے گالیاں دیجئے مگر یہ بھی کہتا رہیگا ؎

اے پیچ برا مان نہ کچھ اس کے کہے کا　　　معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی

اور اگر عشق کامل میں اثر ہے تو دکھا دے گو آپ اس سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں لیکن از روے نطرت بغیر اسکے دیکھے آپ کو تسکین نہ ہوگی کم سے کم ہفتہ میں ایک بار چھپا کر آپ کے دست مبارک کو ضرور بوسہ دے ہی دیگا - پیچ کہتا کیسی کہی ہے ع

وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو - آپ نے گو پیچ کے خلاف بہت سے سخت سست مضامین پردے پردے میں لکھے ہیں مگر چونکہ وہ اپنے نام سے نہیں شایع کیئے اور آپ یہ کہتے ہیں کہ (ہم انکے لئے ذمہ دار نہیں) اس لئے ہم کو بھی آپ سے شکایت نہیں ؎

اس شوخ کی گالی کا برا مانیئے کیونکر　　　جو ہنس کے یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اب پیچ ہمیشہ کے لئے آپ سے ظاہر طور پر یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے ؎

ہم تو تجھے نباہیں تو دے گالیاں ہمیں　　　اپنی زبان دیکھ ہماری زبان دیکھ

کشمیری درپن بابت ماہ اگست ۱۹۰۵ء نمبر ۸ جلد ۳

(از اڈیٹر کشمیری درپن)

دلگداز میں گلزار نسیم کے متعلق ابھی تک بحث جاری ہے یہ بحث زیادہ تر لفظی ہو اسوجہ سے ہم اسکے نسبت کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے ہاں مثنوی مذکور کے متعلق مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کے دو متضاد بیانات ناظرین کی دلبستگی کے لئے پیش کرتے ہیں مارچ کے پرچہ میں مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر آتش نے اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انھیں نو عمر شاگردوں سے تھی اسی کی تحریک سے یا اسکی مشق اولیں دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو پھر اس میں متعدد لغزشیں دیکھ کے اسے بجائے اپنے اسی کیطرف منسوب کردیا ہو جن دنوں یہ مثنوی کہی گئی ہے ان دنوں شاعری کا یہ رنگ تھا کہ معائب محاسن پر غالب خیال کئے جاتے تھے۔ اور شعرا کو کلام میں خوبیاں پیدا کرنے سے زیادہ فکر اس بات کی ہوتی تھی کہ کلام عیوب سے پاک ہو لہذا یہ خیال اس بات کا پورا محرک ہوسکتا تھا کہ آتش اس مثنوی کو کہیں اور اپنے کمسن شاگرد کو دیدیں۔ اگر ہمارا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو مولوی عبدالحلیم صاحب کیطرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس مثنوی میں آتش کے بہت شاگردوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے اب جولائی کے دلگداز میں آپ کہتے ہیں کہ اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے ساتھ انکے (اڈیٹر ریاض الاخبار کے) اس ارشاد کی نسبت کہ جو اعتراضات شرر نے کئے ہیں گو موجودہ زمانہ میں انکا حرف حرف صحیح ہے مگر جس زمانہ میں نسیم تھے اسوقت کی زبان اور طرز کلام اور تصرفات کو دیکھتے ہوئے ہم نسیم کی کوئی خطا نہیں دیکھتے۔ ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں نسیم کو اتنا زمانہ نہیں گذرا کہ انکی طرف سے ایسی عذرداری جائز سمجھی جائے۔

ایسے تصرفات اور ایسی لغزشیں اگر اُس زمانہ میں جائز تھیں تو ضرور تھا کہ انکے معاصرین اور دیگر شاگردان ناسخ و آتش کے کلام میں بھی پائی جاتیں۔ اب ذرا غور طلب یہ امر ہے کہ مولوی عبدالحلیم صاحب کے یہ دونوں بیانات کہاں تک ایک دوسرے کی تنسیخ کرتے ہیں۔ اگر مثنوی آتش کی تصنیف

ہے یا اگر اسمیں صبا - رند خلیل کی شرکت ہو تو اسکے معائب کے ذمہ دار یہ سب شعرا ہیں اور اگر نسیم کے معاصرین کا کلام ایسے تصرفات اور ایسی لغزشوں سے پاک ہے تو گلزار نسیم میں انکی شرکت تسلیم نہیں کیجا سکتی معلوم ہوتا ہے کہ جولائی میں مضمون لکھتے ہوئے مارچ والے مضمون کا ہونا کو خیال نہیں رہا گیا ہوا ۔ غلبۂ ذکاوت سے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے مگر ہمکو خوشی یہ ہے کہ اس بحث میں اودھ پنچ نے نہایت ہی بے تعصبی سے کام لیا ہے منشی سجاد حسین صاحب ایسے منصف مزاج انشا پرداز سے امید بھی ایسی ہی تھی گو کہ منشی صاحب موصوف کی صحت میں فرق آگیا ہے مگر خلقی ذہانت اور طبیعت داری میں فرق نہیں آیا ہے اور جس زور کے مضامین آپ کے قلم سے اس بحث میں نکلے ہیں انسے ثابت ہوتا ہے کہ عالمانہ اور محققانہ لیاقت کے ساتھ آپکا آئینۂ دل مذہبی تعصب کے زنگ سے صاف ہے ۹ اگست ۱۹۰۵ء کے اتحاد میں جو بیہودہ گستاخی مولوی عبد الحلیم شرر نے منشی صاحب کی خدمت میں کی ہے اسکا جواب یہی ہے کہ

اللہ ہے نگہبان اسکی آبرو کا منہ پر پڑا اسی کے جسنے فلک پہ تھوکا

علاوہ اڈیٹوریل مضامین کے اودھ پنچ میں ایک ایسے شخص کا مراسلہ شائع ہوا ہے جسکی علمی لیاقت ذہانت اور قابلیت سے حضرت شرر اور انکے ساتھیوں کو بھی انکار نہو گا - ہماری مراد منشی احمد علی صاحب شوق سے ہے آپ ان چند بزرگوں میں سے ہیں جنکی ذات پر لکھنؤ کو ناز ہے آپ مدت تک اخبار آزاد کے اڈیٹر نامور کے ساتھ رہے ہیں اور پنچ میں جو آپ کے مضامین نکلے ہیں انکا شمار بصورت اردو کے اعلیٰ لٹریچر میں کیا جاتا ہے علاوہ بریں آپ ایک کہنہ مشق اور مشہور شاعر بھی ہیں چنانچہ مثنوی ترانۂ شوق آپ سے یادگار ہے اور یہ مثنوی گلزار نسیم کے طرز میں آپنے تحریر فرمائی ہے لکھنؤ میں مشہور ہے کہ ترانۂ شوق گلزار نسیم کے جواب میں لکھی تھی اور اسلئے شاید مولوی عبد الحلیم صاحب شرر کو حضرت شوق سے حمایت کی امید تھی آپ نے جو مراسلہ پنچ میں اس بحث کے متعلق بھیجا ہے اور جسکو منشی سجاد حسین صاحب نے قول فیصل مانا ہے ہم اسے درج ذیل کرتے ہیں۔

حصّۂ دوم

ظریفانہ مضامین

پنڈت جیدر شنکر نسیم

اور

خواجہ دیا علی آتش

(از منشی سجاد حسین صاحب)

دنیا میں کسی مشہور ہردلعزیز تصنیف اور کلام کے واسطے احمد کی پگڑی محمود کے سر کرنے کی بہار دیکھنے کا لطف تو عموماً ہر ملک کے لوگوں کو ہوتا ہی ہے چنانچہ انگریزی خدائے سخن کا مسئلہ مشہور ہی ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں ایک کم علم ہرن چرانے والا ادہر

یہ شاعری۔ ہو بہو یہ اسکے دوست کی فلسفی دماغی قابلیت ہے جس نے اس کلام کو اس درجہ پر پہونچایا کہ کوہ کندن والوں نے مختلف تاویلوں ترکیبوں سے یورپ سے لیکے امریکہ تک بال کی کھال موشگافیوں حل اور زیر و بینات واہیات خرافات جھگڑا نکال کے سرسے زمین کھود ڈالی اسیطرح اردو میں بھی گلزار نسیم کی تصنیف کا جھگڑا بعض لوگوں نے اس مدت دراز کے بعد جب مثنوی کو شائع ہوئے اسکی تقلید کیئے ہوئے اسکے جواب لکھے ہوئے زمانہ گذر چکا اور کسی کو اس خیال کے اظہار میں بوجہ بازاریت اور ناواقفیت طرز سخن مجال نہیں ہوئی کہ اس فرسودہ بے حقیقت بات کو مرد میدان بنکے زبان پر لائے یا سمجھداروں کے سامنے پیش کر سکے۔ بیٹھے بٹھائے بیکاری کا مشغلہ فضول جھگڑا نکالا ہے باسی کڑھی میں ابال آیا۔ جب غلط نویسوں اور ارزاں چھاپنے والے مطبعوں کی مہربانی سے مثنوی بہت کچھ مسخ ہو چکی اور زمانے نے بھی مصنف کے عقیدے کے مطابق مسئلہ تناسخ کا کامل ثبوت دیدیا تو بعض لوگوں کی طبیعتوں کو اتحاد کے کچے گھڑے کی بدکیفی سے چلو میں الو ہو جانے کی تجی دی۔ یعنی شاگرد نسیمؔ اور استاد آتشؔ کی تصنیف کو قیاس اور بدگمانی کی کونڈی میں تعصب کے بھنگ گھوٹنے سے اس مثنوی کی بھاد یوبی کو ایسا پیسا چھانا کہ اب ایک مصنف کا نام دیا شنکر نسیمؔ نہ رہا بلکہ استاد حیدر علی آتشؔ کی شرکت غالب مثل ڈبل پیبو کے نشہ دھواں دھار کرنے کی غرض سے طرفہ معجون۔

حیدر شنکر نتیش۔ دیا علی آسم۔ نام تیار ہو گئی جیسے انگریزی میں شکسپیر اور بیکن کے امتزاج سے شیکن اور بیکسپیر کا ولایتی نسخہ دل لگی بازوں کی زبان پر ہے اسیطرح یہ بھی بن گیا اب اگر کوئی۔ اسکے۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

اس کے ابتدائی شعر سے ثابت کرے کہ اس کے ہر ہر لفظ سے پیدا ہے کہ یہ مثنوی ہندو پنڈت کی کہی ہوئی ہے۔ اور اس میں وہ مذہبی لطافتیں نزاکتیں بھری ہیں کہ خواجہ صاحب

بوجہ مسلمان ہونے کے ان کی جانب خیال ہی نہیں کر سکے اور وہ لوگ جو اس کو آتش کا کلام سکھتے ہیں خود جان ہی نہیں سکتے تو محض آئینہ فروش شہر کوراں گشتن ہے اور اگر ہماہمی کج بحثی ہٹ دھرمی سے چند جہلا کے سامنے کسی نے کہدیا کہ یہی مسلمان آتش کی طبیعت داری تھی کہ بطور تفنن دبخاطر ہندو شاگرد) ابتدائے مثنوی میں تبرکاً لفظ لائے اور شگوفہ کاری بجائے گل کاری محض غلطی سے باندھ دیا تو ایسی خاک بیزی ہے جس سے گڑے مُردے اکھاڑنے والی نباشی اور سیکنڈ ہاش پنڈت کی خاکستر لاش کو بربادی کے سوا کچھ نتیجہ نہیں اگر نسیم مسلمان ہوتے تو بوسیدہ کفن ہی پلے پڑتا اب تو بجز خاک بدہان دشمنان کے سوا اللہ کا نام ہے۔

از اودھ پنچ مطبوعہ ۱۳ر جولائی ۱۹۰۵ء

جان صاحب کی فریاد جنت کی ڈاک

کل بارہ بجے شب کو ایک فرشتہ ایک لفافہ دے گیا جسمیں بجائے مہر کے چشم حور لگی ہوئی تھی۔ اس لفافہ کے اندر ایک غزل رکھی ہوئی تھی جو لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جان صاحب کی زور فکر کا نتیجہ تھی چونکہ اس غزل کے شروع میں برائے اشاعت در اودھ پنچ) لکھا تھا اسلئے ہمارا فرض ہے کہ بجنسہ اسکو شائع کر دیں پیشتر دلگداز میں بھیجی گئی تھی مگر وہاں سے واپس آئی۔ اب غزل ملاحظہ ہو۔

بنے زباندان ایرے غیرے تمام اس لکھنؤ میں آ کر
دوگانا جانی یہ وہ مثل ہے ملے شہیدوں میں خوں لگا کر

ہمارا ہی سمجھو گا اس سے باجی (حمل) بگاڑا ہے جسنے میرا
کرونگی رسوا میں سارے عالم میں خوب انکو اسے بنا کر

نہ جان پر میری رحم کھایا نہ اپنی ذلت کا دھیان آیا
گرایا میری زباں کا پایہ حمل میں بیکار یہ بڑھا کر

ہیں طرفہ معجون یہ ہاتی سمجھ پہ انکی پڑی ہے پھٹکی
جہاں کی بحث شاعری کی چلا بغل میں لغت دبا کر

دہل فصاحت ہے شاعروں کی لغت ہو ملا لو انکو مبارک
جو حمل سننے کی آرزو ہے رہیں فرنگی محل میں جا کر

ہیں چھاونی ڈنکے کی چوٹ کہتی ہوں نظم میں نے حمل کیا ہے
اگر نہ مانو اٹھاؤں تیسوں کلام صاحب ابھی منگا کر

ہزار کوشش کریں میاں جی یہ حمل قائم نہیں رہیگا
ہیں جنکی آنکھیں وہ خود ہی دیکھیں ہمارا دیوان فوراً اٹھا کر

خراب مٹی ہے شاعروں کی اجڑ گیا شہر لکھنؤ کا
زبان تھی مستند جہاں کی وہاں یہ ہاتی جلسے میں آ کر

ہوا تصرف یہ کیا بلا ہے یہ وہ زمانہ ہے باجی ماں
گواہیاں دیتی ہیں مسلماں جو جھوٹے قرآں اٹھا اٹھا کر

سزا ہے انکی دہاتیوں کو جنھوں نے بیکار سر چڑھایا
یہ تال بے تال کیوں نہ ناچیں کیا خراب انکو منہ لگا کر

زباں سے خاک انکو مس نہیں ہے حسد کی ہو ملبس اگر روشن
ہوائیں اپنی یہ باندھتی ہیں نسیم کا مضمون اڑا کر

جو یہ تعصب کھلا کھلا ہے چلے گا ڈھنگ اتحاد کا کیا
یہ کچی دیوار بیٹھ جائیگی ایک دن آپ بھس بھسا کر

جو ایک مجکو کوئی کہے گا بھری زباں سے وہ دس سنے گا
محل کی لونڈی نہیں ہے بندی جو منہ میں رہ جائیگی گڑگڑا کر

یہ اچھی مضمون نگاریاں ہیں کہ غیر کی آڑ میں ہیں لکھتے
چلے تو ہیں نا جی کو صاحب مگر ہیں گھونگٹ میں منہ چھپا کر

دلیل بندی نہیں کسیکی اٹکلے رکھدونگی دھجیاں میں
نہ جانصاحب پہ منہ کی آئیں یہ پیچ مرزا سے منہ کی کھا کر

(جانصاحب جنتی)

از اودھ پنچ مطبوعہ ۲۰۔ جولائی ۱۹۰۵ء

جنّت کی ڈاک

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۱

مولانا (؟) شرر عشق اللہ۔ مجھ کو آپ سے نہ تعارف حاصل ہے نہ آج تک آپ کا نام سنا تھا۔ کل شب کو زمرّدیں محل میں جلسہ تھا اور وہ بھی واجد علی شاہ کی طرف سے کیا کیا سامان تھے قدم قدم پہ ناز و انداز جتاتی ہوئی حوریں پرا باندھے ہوئے کھڑی تھیں غلمان شراب طہور کے جام تقسیم کر رہے تھے۔ سامنے نہر کوثر موجیں مار رہی تھی گلہائے فردوس سے دماغ معطر تھا۔ ایک قتالۂ عالم حور، قلق لکھنوی کا یہ شعر گا رہی تھی ؎

نکتہ چینیوں کے سوا کوئی نہیں قدرشناس　　آپ بربادی ارباب ہنر دیکھیں تو

غرضکہ عجب سماں تھا واللہ مجھ کو تو رنگیلے پیا جانعالم کے وقت کا لکھنؤ یاد آ گیا (رہا سہا یہ لکھنؤ نہیں جسکی آپ لوگوں نے مٹی تباہ کر رکھی ہے) ہاں یہ کیفیت دلوں کو گرما رہی تھی کہ اتنے میں دور سے شور و غل کی آواز آئی اور اسکے دو چار منٹ بعد جان صاحب لکھنؤ کے مشہور ریختی گو سر پیٹتے داخل محفل ہوئے۔ انکا اس صورت میں داخلہ کہ گانا وغیرہ سب غت رَبُود اور کل حاضرین محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری (کیا ہے کیا) کی چاروں طرف سے صدا بلند ہوئی مگر جان صاحب ہیں کہ کسی کی سنتے ہی نہیں اور آنچل پھیلا پھیلا کے کوستے جاتے ہیں کہ یا خدا جس نے میرا محل بگاڑا ہے اُس سے تو ہی سمجھ (اور جس شخص کو برا بھلا کہہ رہے ہیں کسی کا نام تو سمجھ میں نہیں آتا ہے (پر انشتر) سا سنائی دیتا ہے) خیر وہ جلسہ رقص و سرود تو برخاست کیا گیا پوچھا گیا کہ آخر کون ہے اور محل کسنے بگاڑا

تب اُنھوں نے سب کچا کچا حال کہہ سُنایا کہ میاں شرر نے نسیم لکھنوی پر اعتراض کیے ہیں انکا مضحکہ اودھ پنچ میں اُڑایا گیا تو شرر نے ایک مضمون بدر کے نام سے ریاض الاخبار میں نکالا اسمیں اپنی بہت کچھ تعریف کی اور بہت کچھ جلی کٹی بھی سُنائی اور میرے شعر میں تصرف کرکے حمل کو بگاڑ کر یہ (حمل) بنا دیا۔ اودھ پنچ نے اس فی بطن القائل کی خوب دھجیاں اُڑائیں اور لکھنے والے کو بدر الشرر کا خطاب دیا۔ یعنی جسطرح اکثر بڑے کنکووے میں جھلجھل لٹکا دیجاتی ہے اسطرح حضرت شرر کے پیچھے (بدر) کا دُم چھلا باندھ دیا۔ دلگی بازوں نے دلگی کے طور پہ مجھے اودھ پنچ دکھایا۔ بس آگ ہی تو لگ گئی غصے میں سر پیٹتے تم لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ چونکہ اپنے اپنے مکان میں کوئی نہیں تھا لہذا یہ پتہ لگاتے لگاتے اس جلسہ میں پہونچا یہاں سب ہی جمع تھے۔ غالب۔ ذوق۔ رند۔ صبا۔ نسیم۔ ناسخ۔ قلق۔ اسیر۔ وغیرہ محض تخلص کے شاعر نہیں تمام شعرائے دہلی و لکھنؤ کا جمگھٹا تھا (کیونکہ شاعر ہمیشہ جنت بھیجے جاتے ہیں) خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا جانصاحب کی تسکین کر دیگئی کہ (یہ) کا لفظ خود ہی حمل کا ذب کا پتہ دیتا اور اناڑی یعنی غیر شاعر کا پھوہڑ پن ظاہر کرتا ہے آپ کیوں بگڑتے ہیں خاص اہل شہر تو آپ کے کلام کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر اسپر بھی انکا غصہ فرو نہوا اُنھوں نے ریختی کہہ کر اودھ پنچ میں بھیجدی غالبًا وہ چھپ گئی ہو۔ اب یہاں ہم لوگوں کو یہ شوق پیدا ہوا کہ بھئی دیکھیں یہ میاں شرر کون ہیں جنھوں نے نسیم لکھنوی پر اعتراض کرنے کی جراُت کی۔ فرشتے بلائے گئے تحقیقات کا حکم دیا گیا وہ گھنٹے بھر کے اندر دلگداز کے وہ پرچے لے آئے جس میں اعتراضات شائع ہوئے ہیں۔ اعتراض پڑھے گئے اور سخن فہمی اور زباندانی پر خوب یاروں نے قہقہے لگائے خصوصًا رند۔ وصبا وغیرہ تو بہت چین بجبیں ہوئے اور اُن لوگوں نے کہا کہ ہمکو جنت میں یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہم لکھنؤ سے آئے ہیں۔ افسوس لکھنؤ کی یہ حالت ہوگئی کہ وہاں کے باشندے گلزار نسیم کے معمولی شعر نہیں سمجھ سکتے۔ مگر سب اس فکر میں تھے

کہ آخر یہ حضرت شرر کون بزرگوار ہیں کہ اتنے میں سید محمود جو شراب طہور کے نشے سے
چونکے تو پوچھا گیا کہ حضرت آپ کو تو آئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا آپ بتائیے
کہ میاں شرر کون ہیں آپ کا نام سنتا تھا کہ سید محمود نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور آپکا
حال اسطرح بیان فرمایا۔ میں اپنی طرف سے کچھ تصرف نہیں کرتا جو انھوں نے کہا صاف
صاف لکھے دیتا ہوں سید محمود نے کہا کہ جس زمانے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار فسانۂ آزاد
لکھ رہے تھے اُسوقت ایک خاص طبقے میں انکی بہت شہرت ہوگئی تھی اور کوئی ناول لکھنے
والا اُسوقت نظر نہیں آتا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب کہیں باہر سے لکھنؤ میں وارد ہوئے
عبد الحلیم صاحب نام اور شرر تخلص اور کچھ دنوں کے بعد اپنے نام کے آگے مولوی لکھنے لگے
اور آخر میں مولانا ہوگئے۔ گو کہ ان صاحب کا کبھی کوئی شعر نہ سنا تھا مگر آپ کے پیکر شہرت پر
تخلص ہمیشہ بدگوشت کیطرح نظر آتا رہا غرض کہ شرر صاحب نے تاریخی ناول لکھنا شروع کئے
اور ان ناولوں میں فتوحات اسلام کے افسانے لکھے۔ صلیبی لڑائیوں کی روایتیں لکھیں
مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف جوش دلایا۔ محمود غزنوی کے حملوں کے قصے لکھ کر ہندو مسلمانوں میں
تعصب کی آگ بھڑکائی اسی طرح اکثر ناول ایسے لکھے کہ جن میں شیعہ سنیوں کے جذبات مخالفت
میں لانے کی کوشش کی گئی تھی ان شرر افشانیوں نے آتش بغض و حسد کو خوب تیز کیا۔
اور ایک متعصب فرقے میں آپکی خوب شہرت ہوگئی تو اور لوگ کہنے لگے کہ ابھی تک تو
سرشار ہی فن ناول نویسی میں یکتا سمجھے جاتے تھے اب حضرت شرر بھی بڑے بیت پیدا
ہوگئے۔ مگر اس لکھنؤ کی بے تعصبی تو مشہور ہے۔ انھوں نے کہیں شرر صاحب کو نہیں مانا
کیونکہ نہ انکو تحریریں پسند تھیں نہ آپکی زبان جو کہ خاص دیہات کی گڑھیا سے دھوئی ہوئی ہے
مگر دیہات میں آپ کے بہت سے مُرید ہوگئے اور آپ کے کھانچیوں قدردان پیدا ہوگئے
ہر طرف سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ دشرر بھٹے ناولسٹ اب ڈر کا ہے کا (اس کے بعد
آپ نے ایک اور رنگ بدلا یعنی پردہ کے خلاف ہوگئے۔ ایک پرچہ پردہ عصمت کے نام سے

نکالا جس میں پردہ کے خلاف مضامین لکھنے لگے۔ کسی کی دیوار گر پڑی اور کوئی آدمی کچل کر مر گیا آپ نے فوراً پردۂ عصمت میں لکھدیا کہ پردہ کیسی خراب چیز ہے جو دیوار گری وہ پردہ کی دیوار تھی اگر پردہ کی رسم نہ ہوتی تو یہ دیوار بھی نہ ہوتی اور ایک آدمی کی جان مفت میں جاتی کسی کو برسات میں اِکّے پر پردہ ڈالے ہوئے جاتے دیکھا اور آپ بگڑ گئے یہ کہنے لگے کہ انیسویں صدی میں بھی پردہ سے ہاتھ نہیں اُٹھاتے اور ہاتھ سے پردہ نہیں ہٹاتے کبھی کسی کو آم کی کیری خریدتے دیکھا آپ ٹھہر گئے اور وعظ دینے لگے کہ دیکھو آم کی کیری تو تم یہ دیکھ کر خریدتے ہو کہ اسمیں پردہ نہیں پڑ گیا ہے۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ اپنے خاص گھر کا پردہ نہیں دور کرتے افسوس افسوس۔ کہیں کسی رئیس کی ڈیوڑھی پر ٹاٹ کا پردہ پڑا دیکھا وہاں جم گئے اور دربان سے کہنے لگے کہ دیکھو ہندوستان میں تو چین سے پردہ آیا ہے عرب میں کبھی پردہ نہیں تھا وہ پردہ جس کو انگریزی میں سکلیوژن کہتے ہیں۔ تم کیسے مسلمان ہو کہ پردہ کے خلاف نہیں اگر تم میں ذرا بھی جوش مذہبی ہے تو اس ٹاٹ کے پردہ کو نوچ کر پھینک دو اسکو پھونک دو اسکو نیست و نابود کر دو۔ غرضکہ اسی طرح آپ پردۂ عصمت کی آڑ میں خوب اس قدیم رسم کی پردہ دری کیا کیئے مگر تھوڑے ہی دن میں (پردۂ عصمت) سے آپ کو شرم آنے لگی اور اسکو چاک کر کے ردیوں میں پردہ کی طرح پھینک دیا۔ کچھ روز خاموش رہے۔ اسکے بعد دم چورانے کی طرح پھر شررفشانی شروع کی۔ یعنی اتحاد جاری کیا اب صلح کل بن گئے۔

کہیں لڑائی ہو آپ اتحاد کی قرولی لئے ہوئے موجود اور فریقین کو گالیاں دے رہے ہیں کوئی مانے نہ مانے آپ یہاں فیصلے کو جھگڑا مٹا دینے کے لئے تیار۔ ہاں ان انقلابات کے زمانے میں دلگداز کی باسی کڑھی میں وقتاً فوقتاً اُبال آتا رہا چنانچہ اتحاد کے ساتھ ساتھ دلگداز کا جھگڑا بھی چرخچوں کرتا ہوا میدان سخن میں لایا گیا مختصراً یہ کہ شرر صاحب نے خوب خوب ظاہری رنگ بدلے مگر وہ اپنا باطنی رنگ کبھی نہ چھوڑا اور کسطرح اسکو چھوڑ سکتے ہیں۔ اسپر تو انکی شہرت کا دارومدار ہے۔ فارسی کا اُستاد انھیں کے لئے کہہ گیا ہے ؎

بھر رنگیکہ خواہی جامہ می پوش   مے انداز قدت می شناسم

جبکہ سید محمود نے یہ دلچسپ داستان ختم کی تو اسوقت سب حاضرین کو معلوم ہوا کہ آپ کون بزرگوار ہیں اور آپکا کام کیا ہے۔

مگر کسی پر یہ راز نہیں کھلتا تھا کہ باوجود حامی اتحاد بننے کے آپ نے پنڈت دیاشنکر نسیم کی روح کو اسقدر کیوں صدمہ پہونچایا اور ایسے اعتراضات کیوں کیئے جن سے تعصب کوڑھ کی طرح ٹپکتا ہے۔ اور پھر شروع میں آپ کا یہ اعلان کہ آپ کا مقصد اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ ایک منصفانہ ریویو لکھنا۔ آپ کی تحریر کے بالکل خلاف پڑتا تھا۔ یا ریاض الاخبار میں جو مضمون لکھا تھا اور جو جانصاحب یہاں اُٹھالائے تھے اُسمیں تو آپ نے بالکل پردہ تہذیب اُٹھا دیا تھا اور ہندوؤں کو عموماً اور کشمیری پنڈتوں کو خصوصًا۔ الولو کے میلے کی وضع تہذیب کی ساری کو اُٹھاکے اُنگلیاں مٹکا مٹکا کے فحش بکا ہے۔ کجا اتحاد کی میٹھی میٹھی باتیں اور کجا یہ زہر اُگلنا۔ یہ عقدہ نہیں کھلتا تھا اسکی تفتیش کے لیئے اعمال بد لکھنے والے فرشتے بلائے گئے اور اُن سے کہا گیا کہ تم اپنا دفتر یہاں کھول کر بتاؤ کہ یہ دلگداز میں جو تحریر نکلی ہے اس کا اصلی سبب کیا ہے اور لکھنے والے کا اصلی منشا کیا ہے یہ کہنے کی دیر تھی کہ انھوں نے ایک بیاض نکالی اور کل کچا چٹھا اسی طرح بیان کیا کہ سال دو سال سے لکھنؤ میں ایک نئے فیشن کے انشا پرداز حضرت چک بست پیدا ہو گئے ہیں۔ اُنھوں نے حالی اور شرر کی چھیڑ چھاڑ کرنے کا بیڑا اُٹھالیا ہے۔ حالی تو ایک متین آدمی ہیں۔ وہ خود تو جناب چک بست کے اعتراضات کا جواب دیتے نہیں اپنے مریدوں سے لکھواتے ہیں۔ مگر شرر صاحب تو ریگستان سخن میں اعتراضات کی گرما گرمی سے بلبلا اُٹھتے ہیں۔ چنانچہ جناب چک بست نے ایک مضمون کشمیری درپن میں پنڈت رتن ناتھ سرشار پر بھی لکھا تھا اور سرشار کے جوہر خوب خوب چمکائے تھے اور ایک موقع پر سرشار صاحب کی لیاقت و شہرت کا پردہ اچھی طرح فاش کر دیا تھا۔ یہ مضمون شرر صاحب کے دل میں تیر نیمکش کیطرح کھٹکتا رہا اس فکر میں تھے کہ چک بست کی ایسی گرفت کروں کہ عمر بھر

تو یاد کریں۔ غرضکہ حال میں جناب چک بست نے گلزار نسیم کا شگوفہ چھوڑ دیا۔ پھر کیا تھا پھر تو شرر صاحب کو اچھی طرح سے نیچ بچی چھوٹی اور آنکھیں بند کرکے اور کچکچا کے آپ سے نے گلزار نسیم پر چالیس پچاس اعتراض جڑ ہی تو دیئے اور کہا کہ تو سہی حضرت چک بست کی محنت خاک میں ملا دوں اور نسیم کا نام سخنوروں کے دائرے سے خارج کرادوں اور آخر میں دس پانچ اعتراض تصرف بیجا کے جناب چک بست پر جڑ دیئے اور یہ تو ظاہر ہے کہ بدحواسی میں جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ کس رنگ کے ہوتے ہیں وہی رنگ ان اعتراضات کا ہے کہیں کچھ کہتے ہیں پھر اسکی تردید کرتے ہیں کبھی کسی شاعر کو سے مرتے ہیں مگر ہمیشہ بے سر و پا ہیں جب اعمال بد کے فرشتوں نے رپورٹ پیش کی اعتراضات کی تمام قلعی کھل گئی۔ اور اصلی کیفیت معلوم ہو گئی خیر یہ تو تمہید ہے آپ اصل مطلب سنیئے جسکے لئے میں نے یہ طولانی خط لکھا ہے یعنے اگر دیا شنکر نسیم پر اعتراض کیئے تھے تو آپ کی شرر ریزی انہیں تک محدود رہتی آپ سے نے میری شہرت میں داغ لگانے کی کیوں فکر کی ہے اور میرے شاگردوں کا نام کیوں بدنام کیا ہے۔ باقی آیندہ

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی (حال وارد فردوس بریں)

از اودھ پنچ مطبوعہ ۲۷ جولائی ۱۹۰۵ء جلد ۲۹

جنت کی ڈاک

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۲

آخر بیٹھے بیٹھے یہ آپ کو سوجھی کیا یہ قبر کے مُردے اکھیڑنے کیوں شروع کئے اور پھر اگر ایسی حرکت کی بھی تھی تو سلیقہ کے ساتھ کی ہوتی - زبان لکھنؤ پر آپ کی جان جاتی ہے - اہل لکھنؤ چاہے آپ کو منہ لگائیں یا نہیں - مگر آپ ع لے دیکھے اپنے یاروں کو ان کی طرف سے لڑنے کو موجود - خیر اگر آپ کو لہو لگا کر شہیدوں میں ملنا ہی منظور تھا تو اسی رنگ پر قائم رہے ہوتے - نسیم ہندو تھے ان کی مخالفت آپ کے مسلک کا جزو اعظم تھی انکو خوب جی کھول کے گالیاں دی ہوتیں - مگر کسی کے تو ہو کے رہے ہوتے واللہ غضب کیا کہ مجھ کو اور میرے تمام سرآوردہ شاگردوں کو ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا - آپ کی طبیعت کا اونٹ تو کسی کل بیٹھتا ہی نہیں - بندہ نواز آپ کی شوخی بھی اہل لیل و نہار کی شوخی سے کم نہیں - آپ کسی شہسوار سخن کی ران جمنے نہیں دیتے - نسیم بھی برطرف میں بھی برطرف رند بھی برطرف خلیل بھی برطرف صبا بھی برطرف بس اک آپ ہر طرف آپ نے اپنے بزرگوں سے سنا ہوگا کہ میں نے اور میرے شفیق شیخ ناسخ نے لکھنؤ کی زبان کو دہلی کی غلامی سے آزاد کیا جو کچھ میری زبان سے نکل گیا اُس پر اہل لکھنؤ ہمیشہ ناز کرتے رہے مگر آپ کس ڈھٹائی سے فرماتے ہیں کہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آتش نے ...... اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو پھر اس میں متعدد لغزشیں دیکھ کے اُسے بجائے

اپنے اسی کی طرف منسوب کردیا ہو کیوں حضرت منطقی تو آپ بڑے ہو نگے۔ فرنگی محل ہیں نہ سہی دہلی ہی میں سہی۔ آپ کو یہ ثابت کرنے میں تکلف نہیں ہوتا کہ چین سے ہندوستان میں پردہ اُڑا آیا۔ مگر یہ جو کچھ آپ نے میری شان میں فرمایا ہے۔ اسکے معنے بھی آپ سمجھے کہ نہیں اسکے معنے یہ ہوئے کہ اپنی لغزشوں کا مجکو علم ہو گیا تھا ان کو دور نہ کر سکا اور مجبورًا میں نے مثنوی نسیم کے سر منڈھی یہ تو آپ نے میری بڑی قدردانی کی اور لکھنؤ پر بڑا احسان کیا۔ ہائے میں وہ ہوں کہ مجھ کو میرے معاصرین خدائے سخن کہتے ہیں میرے نیز نشتروں کی چار دانگ ہند میں شہرت تھی مگر آپ نے خود داد دی کہ مجھ سے سہوًا نہیں غلطیاں رہ گئیں بلکہ غلطیوں اور لغزشوں کا علم ہونے پر بھی میں اُن کو دور نہ کر سکا ع اس فہم کے اس سمجھ کے قرباں۔ اور پھر لغزشیں جیسی ہیں وہ آپ کے مضامین سے ظاہر ہیں۔ مثلاً گلزار نسیم کا مصرع ہے ع بجلی سے لہر سے تھا ہم آغوش۔ آپ فرماتے ہیں کہ لہر کی جگہ لہر یعنی ہائے متحرک کے ساتھ اردو میں غلط ہے) (اردو میں غلط ہے اور انگریزی میں جائز ہے) کیوں صاحب جس وقت مجھ کو (اس غلطی) کا علم ہو گیا تھا تو میں اسکو یوں نہیں بدل سکتا تھا کہ ع ۔ تھا بجلی سے لہر سے ہم آغوش ۔یا دوسرا مصرع ہوا کہ ع بیجا وہ ہوا کہا کہ جا جا۔

آپ فرماتے ہیں کہ برہم ۔ ہوا کی جگہ پر (بیجا ہوا کہنا بہت ہی متبذل بازاری زبان ہے اور بازار بھی لکھنؤ نہیں کہیں اور کا) (یہ لکھنؤ نہیں) بھی کیا خوب ہمارے وقت میں تو یہ کہا جاتا کہ لکھنؤ کا نہیں۔ اب آپ ہی دل پر دہ عصمت) پر ہاتھ رکھ کر فرمائیے کہ میں کہ (میں بیجا ہوا) (کو برہم ہوا) نہیں بنا سکتا تھا اور وہ کونسا اعتراض ہے جس کو میں تو میں آپ کی لیاقت کا شخص بھی۔ دم زدن میں دو چار لفظ بدل دینے سے دور نہیں کر سکتا۔ مگر آپ کو یہ لکھنے میں ذرا تکلف نہ ہوا کہ مجھ کو اپنی لغزشوں کا علم بھی ہوا اس پر بھی میں اُن کو دور نہ کر سکا اس حماقت کی اور تو کوئی وجہ ہو نہیں سکتی یا تو آپ یہ کہئے کہ مجھ کو نسیم سے دشمنی تھی

مگر آپ ایسا کہہ نہیں سکتے کیونکہ آپ قبول چکے ہیں کہ مجھ کو اس ہونہار شاگرد سے خاص دلبستگی تھی کہ میں نے انکو فریب دیا محض یہ غرض تھی اسلئے رہنے دیں کہ جب لکھنؤ میں جہل کی تاریکی پھیلے تو میاں شرار آتشی لغزشوں سے فائدہ اُٹھاکر جگنو کی دُم کی طرح چمکیں لیکن ایسا ہو نہیں سکتا صاحب اتحاد بن کر ہندوؤں کی در پردہ جڑ کاٹنا ان کے قابل فخر بزرگوں کو بُرا بھلا کہنا آپ کے وقت کے مسلمانوں کو مبارک ہو۔

اگر طریقت اسلام در جہاں این ست ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

ہمارے وقت میں ہندو مسلمان شیر و شکر کی طرح ایک دوسرے سے ملے جلے رہتے تھے اگر کوئی ہندو صاحب کمال ہوا تو اہل اسلام اس کی قدردانی کرتے تھے۔ اور اب بھی شرفاء لکھنؤ کا یہی دستور ہے۔ کم نظری اور تنگ خیالی اوروں کو مبارک رہے۔ یہ جملہ معترضہ تھا باز آمدم بر سر مطلب پس جس حالت میں آپ اس بات پر قرآن اُٹھانے کو تیار ہیں کہ گلزار نسیم میری تصنیف ہے تو کس پہلو سے فرماتے ہیں کہ اسکی زبان لکھنؤ کی مستند زبان نہیں ہے تو پھر کس کی زبان مستند ہو سکتی ہے۔ آخر کس دُھن میں آپ نے یہ مضمون لکھا۔ چک بست بیچارے سے آپ کو بغض نکالنا تھا تو میں نے کیا کیا تھا آپ تو آپ مجھ سے میرے شاگرد سے اور آپ کے بزرگوں سے علیک سلیک نہ تھی پھر اس گھبراہٹ کے کیا معنے! اعمال کے فرشتے کہتے ہیں کہ آپ حیدرآباد سے حضرت سکینہؑ والے قصے میں بہت تعجیل کے ساتھ بھاگے معلوم ہوتا ہے کہ ہوش و حواس کی پچھی وہیں چھوٹ گئی یا اسٹیشن پر رہ گئی آپ نے طب کا رزولیوشن تو کانفرنس میں بڑے جوش و خروش سے پیش کیا تھا۔ بہتر ہے کہ تھوڑے روز تک شیرۂ بادام چاٹئے ورنہ یہ اسہال دماغی کی شکایت رفع نہ ہوگی مانا کہ آپ شاعر ہیں۔ ناولسٹ ہیں۔ مولانا ہیں مگر دوا دارو کرنا عیب نہیں ہے۔ اگر آپ کی عنایت میری ہی ذات تک محدود رہتی چنداں تب ہرج نہ تھا مگر آپ نے تو غضب کیا کہ لکھنؤ کے تمام سربرآوردہ شعراء پر کلوخ اندازی شروع کر دی مجھ سے تو آپ اس امر سے انکار کر ہی نہیں سکتے

ریاض الاخبار میں جو مضمون چھپ نکلا تھا اور جسکے آخر میں کسی صاحبزادے کا نام لکھا ہوا تھا) وہ آپ ہی کا تھا۔ آپ لاکھ چھپائیں مگر ہم تو بیا بانی کے تنکے تنکے کی صدا پہچانتے ہیں آپ نے اسمیں اپنی بڑی تعریف کی تھی اور دلگداز میں بھی کھلم کھلا آپ نے اپنی تعریف کی کہ ہمارا گلزار نسیم والا مضمون لوگوں کو پسند آیا مگر میں سکا قائل نہیں لپنے منھ میاں مٹھو بننے میں کیا مزا ملتا ہے ع حظوظ نفس کے یابد چوزن پستان خود مالد۔ بات تو یہ ہے کہ جب کوئی دوسرا بھی تعریف کرے خیر اصل مطلب یہ ہے کہ آپنے ریاض الاخبار والے مضمون میں لکھا ہو کہ گلزار نسیم میں آتش کے تمام شاگردوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے اور نسیم کا بہت ہی کم حصہ اسمیں باقی ہے۔ یک نشد دو شد۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ اس سے بڑھ کر میرے شاگردونکی اور میری کیا ذلت ہوسکتی ہے کہ جس مثنوی کی تصنیف میں وہ سب شریک ہوں اسمیں اسقدر غلطیاں ہوجائیں کہ آپ ایسے خاکہ اُڑانے پر تیار ہوجائیں اور اسی مثنوی کی نسبت یہ کہا جائے کہ جتنی غلطیاں اسمیں ہیں اُتنی کسی اردو نظم میں نہ ملیں گی۔ آخر اسکا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔ میں تو یہی کہونگا کہ آپ نے اب دلگداز کر بھی۔ اتحاد کی پالسی پر لانا چاہا ہے۔ یعنی ظاہر میں تو آپنے لکھنؤ کی زبان کی طرفداری کی ہے لیکن باطن میں شعراء لکھنؤ کا خاکہ اُڑایا ہے واہ حضرت واہ۔ بنتے تو ہیں آپ لکھنؤ کے اور اہل لکھنؤ کی مذمت میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے۔ اور کیا کہوں آپ اچھے شہسوار سخن ہیں کہ اپنی ہی فوج کو مارتے ہیں۔

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی
(حال وارد فردوس بریں)

اودھ پنچ مطبوعہ ۳۔ اگست ۱۹۰۵ء

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۳

ہاں صاحب آپ کے خیالات کا گورکھ دھندا تو کسی طرح سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ کبھی آپ نسیم کی روح کو صدمہ پہونچانے اور کبھی آپ میری اُستادی میں داغ لگانے کی فکر کرتے اور کبھی میرے تمام شاگردوں کی شہرت خاک میں ملاتے ہیں اسکی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ سنتا ہوں کہ آپ کی تصنیفات دو گدھوں کے بوجھ سے کم نہیں۔ اسلئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو زبان پر اتنی قدرت نہیں حاصل ہے کہ اپنے خیالات صاف طور سے ظاہر کر سکیں۔ بیشک آپ کی انشا پردازی کا رنگ طرفہ معجون ہے کیا کہوں مجبوراً آپکے یہ مضامین پڑھتے پڑھتے زبان خراب ہوئی جاتی ہے۔ مجھ کو ہنسی بھی آتی ہے۔ اور رقت بھی افسوس لکھنؤ کی یہ حالت ہوگئی کہ آپ سے انشا پرداز گلزار نسیم کی زبان پر اعتراض کرنے کی جرأت کریں خدا نخواستہ اور تصانیف تو آپ کے میری نظر سے گذرے نہیں ان دو مضامین میں آپ نے ایسی غلطیاں کیں ہیں کہ ہمارے وقت کے لکھنؤ کا طفل مکتب بھی نکرتا اول تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ نے موقع بے موقع انگریزی الفاظ بے دھڑک استعمال کئے ہیں شاید اس سے آپ کا یہ مطلب ہو کہ میں انگریزی بھی جانتا ہوں مگر آپ کے اظہار لیاقت کے پھیر میں زبان کا خون ہوا جاتا ہے بیشک وسعت زبان کے لحاظ سے انگریزی الفاظ کا استعمال کرنا جائز ہے مگر ایسے الفاظ استعمال کرنا جنکے مترادف الفاظ اردو میں موجود ہیں بعید از دانشمندی ہے میرے شفیق غالب اس وقت میرے پاس تشریف رکھتے ہیں انھوں نے ایک مرتبہ اپنے سہرے میں نمبر کا لفظ استعمال کیا تھا اس اختراع میں تمام اساتذۂ دہلی میں تہلکہ

مچگیا تھا کہ انگریزی لفظ کا استعمال کرنا کیا معنی مگر آپ کے زمانہ میں ہر شخص شتر بے مہار ہے مطلب تو صرف اسقدر ہے کہ عرب کا ناول لکھیئے چاہے زبان کی لطافت مٹی میں ملجائے اَب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ آپنے سات سطروں میں تین جگہ انگریزی لفظ (ایڈٹ) استعمال کیا ہو (دیکھو دلگداز بابت مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۱) تو لفظ ایڈٹ) تو یہ (ایڈٹ) کے معنی جانتا نہیں سید محمود صاحب سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ (ایڈٹ) کرنے کے معنی ترتیب دینے کے ہیں آپ آسانی سے اس غیر مانوس اور غیر فصیح انگریزی لفظ کے استعمال سے پرہیز کرسکتے تھے اسی طرح آپ نے دس گیارہ جگہ۔ مسٹر چک بست لکھا ہے۔ کیوں بندہ نواز یہ کس لکھنؤ کی اردو ہے (آپ چک بست صاحب) لکھ سکتے تھے (جناب چک بست) لکھ سکتے تھے غرض کہ یہ مفہوم آپ بہتر طرح اُردو الفاظ کی مدد سے ادا کرسکتے تھے آپ نے مفت میں انگریزی زبان کے آگے کاسۂ گدائی لیکر اُردو کی آبروریزی کی۔ یہ گنگا جمنی اُردو لکھنے سے آپ کا کیا مقصد ہے اگر آپ کی زبان کسی موقع پر کوتاہی کرے تو انگریزی لفظ استعمال کرنا مجبوری میں داخل ہے مگر اس ڈھٹائی سے انگریزی الفاظ ٹھونس دینا آپ ہی کا کام ہے۔ یہ تو وہی ہے کہ جیسے کوئی شخص غرارہ دار پائجامہ ہیٹ اور جاکٹ پر پہن لے۔ اور طرّہ یہ کہ انگریزی الفاظ استعمال کرنے کا تو آپ کو اسقدر شوق ہے مگر انگریزی الفاظ کے مفہوم سے بوجہ کم علمی آپ واقف نہیں سید محمود نے جب آپ کا مضمون پڑھا تو اکثر جگہ مسکرانے لگے میں نے پوچھا اس کے معنے کیا تو کہنے لگے کہ ہمارے مولانا انگریزی الفاظ تو بے تکان استعمال کرتے ہیں مگر انکا مفہوم نہیں سمجھتے چنانچہ انھوں نے تمثیلاً دو اعتراض کیئے اعتراض نمبر (۱) آپ نے ایک مقام پر (مسٹر چک بست صاحب تحریر فرمایا ہے (دلگداز ماہ اپریل صفحہ ۲۰) واقعی ایجاد بندہ اسی کا نام ہے سید محمود فرماتے ہیں کہ ہر انگریزی خواں طفل مکتب بھی جانتا ہے کہ (مسٹر) کے بعد صاحب یا (اسکوائر) کا لفظ نہیں استعمال کیا جاتا یا آپ کو چک بست لکھنا تھا یا محض مسٹر چک بست (مسٹر چک بست صاحب تو کوئی معنی بھی نہیں رکھتا

دخل در معقولات اسی کا نام ہے یہ جان صاحب کا شعر نہیں ہو کہ آپ (حل) کو بگاڑ کر یہ (حل) بنا دیتے ہیں۔ یہ غیر زبان ہے اسکا جواب دیجئے ورنہ آج سے اُردو لکھنا چھوڑ دیجئے اور اگر یہ نہ کیجیے تو کم سے کم انگریزی الفاظ کے استعمال سے تو کنارہ کشی کیجیے۔

اعتراض نمبر ۲۔ آپ سنے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ (عام پبلک پر ظاہر کر دیا جائے) یہ عام پبلک بالکل غلط ہے۔ پبلک کے معنی خود عوام الناس کے ہیں پھر عام پبلک کہنا) بالکل مہمل و بے معنی ہے۔

خیر یہ تو سید محمود کے اعتراض تھے انکی عذر خواہی تو آپ اسطرح کر سکتے ہیں کہ بغیر کسی انگریزی داں کے دکھائے ہوئے مضامین شائع کر دئے گئے مگر آپ نے اُردو کی غلطیاں ایسی کی ہیں کہ معاذ اللہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں مجھکو تو آپ کے یہ دو مضمون پڑھتے ہوئے الجھن پیدا ہونے لگی میرا مقصد آپ پر اعتراض کرنا نہیں ہے میں صرف آپ ہی کے بھلے کیلئے آپکی لغزشیں پیش کئے دیتا ہوں کہ آیندہ ایسی غلطی نہ کیجیے گا آگے آپ کو اختیار ہے۔

فہمائش نمبر (۱) آپ تحریر فرماتے ہیں کہ قابل غور ۱۳ صفحوں کا وہ دیباچہ ہے۔ جو شائع کرنے والے کی لیاقت و قابلیت کو ظاہر کرتا ہے (بندہ نواز قابلیت و لیاقت) کے بعد کو) محض آپ کی عدم قابلیت ظاہر کرتا ہے فصاحت زبان کے لحاظ سے تو یہ فقرہ یوں ہونا چاہیئے تھا کہ جس سے لکھنے والے کی قابلیت اور لیاقت کا اظہار ہوتا ہے) لیکن اگر آپ ہی کی بندش الفاظ قائم رکھی جائے تب بھی (کو) آپ کے تخلص کی طرح بالکل حشو معلوم ہوتا ہے بس اسقدر کافی تھا کہ قابل غور وہ دیباچہ ہے جو شائع کرنے والے کی لیاقت و قابلیت ظاہر کرتا ہے یہ (کو) کا ادرک (کی) بھرتی کے لئے استعمال کرنا خاص ایسے دیہات کے

ـــــــــــــ

اودھ پنچ: ۔ خواجہ صاحب آپ سے پیشتر اس دنیا کے لوگ اس بے کی گرہ ہٹ پر اعتراض کر چکے ہیں کشمیری درپن میں ڈاکٹر بیچ بہادر سپرو نے بھی یہی اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ ابھی تک اسکا جواب نہ خود حضرت شرر نے لکھا نہ کسی صاحبزادے کے نام سے لکھوایا ہے۔

زبان دانوں کا حصہ ہے۔

فہمائش نمبر (۲) آپ لکھتے ہیں تعجب کی بات نہیں اگر آتش اس دلبستگی کی بنیاد جو انھیں نوعمر شاگرد سے تھی اُسی کی تحریک سے یا اُسکی مشق اولیں دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے طور پر کہا ہو۔ پھر اسمیں متعدد لغزشیں دیکھ کے اُسے بجائے اپنے اسی کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ یوں تو ماشاء اللہ یہ تمام فقرہ اسلوب بیان کے لحاظ سے نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر آخری فقرہ میں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ (اسے) اور (اُسی) کی ضمیریں کس طرف پھرتی ہیں۔ خدا جانے آپ کا یہ مطلب ہے کہ مثنوی کو بجائے اپنے (نسیم) کیطرف منسوب کر دیا یا نسیم کو بجائے اپنے مثنوی کی طرف منسوب کر دیا کیوں صاحب اسی کا نام زباندانی ہے۔ معمولی خیال بھی آپ نثر میں اچھی طرح نہیں ادا کر سکتے دیکھیئے اگر کوئی لکھنؤ والا یہ مطلب ادا کرنا چاہتا تو وہ اسی طرح لکھتا کہ چونکہ آتش کو نسیم سے خاص دلبستگی تھی لہذا تعجب نہیں کہ انھوں نے اس نوعمر شاگرد کی تحریک سے یا اُسکی مشق اولیں دیکھ کر یہ مثنوی تفنن طبع کے طور پر کہدی ہو لیکن اپنی اس تصنیف میں متعدد لغزشیں دیکھ کر اُسے بجائے اپنے نسیم کی طرف منسوب کر دیا ہو (سمجھے مولانا)

فہمائش نمبر (۳) آپ فرماتے ہیں (جن دنوں) یہ مثنوی کہی گئی اُن دنوں شاعری کا یہ رنگ تھا الخ (یہ محض جن دنوں) یہ کہاں کی زبان ہے۔ اگر فصاحت کا خیال ہے تو یہ لکھیئے کہ جس زمانے میں یہ مثنوی کہی گئی الخ اور اگر یہ منظور ہے کہ آپ کا طرز تحریر کسی قدر دیہاتی زباندانی کا پہلو مارتا ہے تو یہ کہیئے کہ (جن دنوں میں یہ مثنوی کہی گئی) محض جن دنوں تو نہ صرف و نحو کے قاعدے سے ٹھیک ہے نہ لغت کی رو سے جائز ہے نہ روزمرے محاورے کے لحاظ سے غالباً آپ نے (دیں) اس لیئے زبان سے نہ نکالا کہ کوئی بکری نہ کہے مگر یہ بھی بزدلی ہو شدان روباہ بازیوں سے باز آیئے۔

فہمائش نمبر (۴) آپ لکھتے ہیں کہ موازنے سے پیشتر ضرورت تھی کہ گلزار نسیم پر

ایک ... ... معقول ریویو کیا جائے حضرت یہ جملہ یوں ہونا چاہیئے۔ موازنے سے پیشتر یہ ضرورت تھی کہ الخ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام سے آپ یہ (اٹھا کر دیکھو الکے پہلے بقول نسیم پیش خیمہ لے آئے شاباش کیا ہونہار ہو۔

فہمائش نمبر (۵) اسکے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں (ہر قسم کی خوبیاں اس میں سے نکال کے دکھائی جائیں) کیوں صاحب یہ (نکال کے) کا بیان کیا تک ہے۔ مثنوی گلزار نسیم بھی کوئی ہانڈی ہے اور اسکی خوبیاں ارویاں ہیں کہ آپ کے سامنے نکال کے) پیش کی جائیں سلامتی سے اختصار بھی آپ کے مزاج میں بہت ہے کہ ضروری الفاظ چھوڑ جاتے ہیں اور طوالت سے بھی اسقدر عشق ہے کہ موقع بموقع کل طویل ہوتے جاتے ہیں اگر آپ صرف اسقدر تحریر فرماتے کہ ہر قسم کی خوبیاں اسمیں دکھائی جائیں تو کیا قباحت تھی۔

فہمائش نمبر (۶) پھر آپ رقمطراز ہوتے ہیں (کہ اس کام کو مسٹر چکبست نے کیا ہی مگر بہت ہی ناقص الخ (پھر وہی) (کو) (آپکا عبارت میں خواہ مخواہ دخل پڑتا ہی۔ لکھنو والے یوں لکھتے۔ یہ کام مسٹر چکبست نے کیا الخ)

فہمائش نمبر (۷) ایک اور جملہ ملاحظہ ہو (سچ یہ ہے کہ امانت نے تناسب الفاظ کی فکر میں اپنے تئیں بدنام تو بہت کیا مگر اس صفت کے پیچھے پڑ کے ٹھوکریں بہت کھائیں تو کامیاب بھی سب سے زیادہ وہی ہوئے ہیں) آپ ہی ایمان سے فرمایئے کہ اس جملہ میں (تو مگر) اور (ہیں) کا استعمال کس قدر بے موقع ہوا ہے - دیکھئے اس جملے کو اہل زبان یوں ترتیب دیتے ہیں (یہ سچ ہے کہ امانت نے تناسب لفظی کی فکر میں اپنے تئیں بدنام بہت کیا اور اس صفت کے پیچھے پڑ کے ٹھوکریں بہت کھائیں مگر کامیاب بھی سب سے زیادہ وہی ہوئے) حضرت آپ مضمون لکھتے ہیں تو کسی شہر والے کو دکھا لیا کیجئے ورنہ ایسے الجھے ہوئے فقرے لکھنے سے فائدہ - افسوس ہے کہ اگر آپ مشورہ بھی لیتے ہیں تو اجڈ دیہاتیوں سے اور یہ نہیں جانتے ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔

فہمائش نمبر (۸) آپ لکھتے ہیں کہ (افسوس اس بات کا ہے کہ اسکے دوسرے رخ یعنی مثنوی گلزار نسیم کے عیوب کی طرف سے ...... چشم پوشی کی ہے) یہ ہر طفل مکتب جانتا ہے کہ پہلے اسم لایا جاتا ہے اسکے بعد اسکی ضمیر مگر آپ نے اس قاعدہ کو بالکل تہ و بالا کر دیا ہے۔ واہ مولانا واہ یہ جملہ یوں ہونا چاہیئے (افسوس اس بات کا ہے کہ گلزار نسیم کے دوسرے رخ یعنی اسکے عیوب کی طرف سے الخ)

فہمائش نمبر (۹) آپ پھر توسن خامہ کو یوں جولانگاہ سخن میں لاتے ہیں کہ جسقدر یہ مثنوی ایک عمدہ ریویو کی محتاج ہے اردو کی اور کوئی نظم نہیں) کیوں صاحب اس جملے میں (ایک کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اور مثنویاں (دو عمدہ ریویو کی محتاج ہیں اور یہ مثنوی ایک عمدہ ریویو کی محتاج ہے معلوم ہوتا ہے علم ریاضی میں بھی آپکو کچھ دخل ہے۔ (جبھی (ایک) اور دو) آپکو یاد آجاتے ہیں مگر یاد رکھیئے گا کہ جہاں تک زباندانی کا تعلق ہے آپکی ایک نہ چلے گی۔

فہمائش نمبر (۱۰) آگے چلکر آپ نے اپنے بھدی قلم کو یوں اڑایا ہے کہ (اپنی قوم و گروہ میں ہیر دپیدا کرنے کی ایسی ہوس ہوتی ہے کہ انصاف کو بالکل ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں) یہاں حسب معمول (کو) صاحب خواہ مخواہ ڈٹے بیٹھے ہیں۔

فہمائش نمبر (۱۱) پھر آپ یوں گلفشانی کرتے ہیں کہ (اس سلسلے کو ہمنے ابھی ختم نہیں کیا ہے) بندہ پرور اگر پھر اس فقرے کو لکھیئے گا تو اسطرح لکھیئے گا۔ یہ سلسلہ ہمنے ابھی ختم نہیں کیا ہے)

فہمائش نمبر (۱۲) پھر آپ کس ڈھٹائی سے فرماتے ہیں کہ ہم گلزار نسیم کے محاسن کو نہیں بتائینگے۔ مگر آپ موقع بیموقع (کو) ضرور لائینگے۔ حضرت یوں کہنے میں کیا حرج ہے (کہ ہم گلزار نسیم کے محاسن نہیں بتائیں گے۔

فہمائش نمبر (۱۳) اسی طرح آپ تحریر فرماتے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ مسٹر حاکپ بست ... ... ان عیوب کے مٹانے کی کوشش کرتے (

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی (حال وارد فردوس بریں)

اودھ پنچ مطبوعہ ۱۰ اگست ۱۹۰۵ء

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۴

فہمائش نمبر (۱۴) آپ فرماتے ہیں کہ (انکے (یعنی محاسن کے) حیطۂ تحریر میں لانے کے لئے ضرور ہے کہ ایک ضخیم کتاب لکھی جائے) میں پوچھتا ہوں کہ ضرور ہے) اس فقرے میں کس پہلو سے صحیح ہے۔ یا تو آپ یہ لکھتے کہ انکے حیطۂ تحریر میں لانے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ ایک الخ) یا یہ لکھتے کہ ان کے حیطۂ تحریر میں لانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ الخ یہ آپ کس وقت کی اور کہاں کی زبان لکھ رہے ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک لکھنؤ کی یہی زبان ہے تو واقعی گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی زبان نہیں۔

فہمائش نمبر (۱۵) مارچ کے دلگداز میں جو مضمون گلزار نسیم میں آپ نے خاک اڑائی تھی اسکی کیفیت تو آپ دیکھ چکے کہ پانچ صفحوں میں ستّرہ غلطیاں ہیں۔ اب اپریل کے دلگداز میں جو کچھ آپ نے گلفشانی کی ہے اسکی حالت دیکھیے آپ فرماتے ہیں کہ (اس بحث (کو) مکرر چھیڑ دیا ہے) میں دیکھتا ہوں کہ (کو) سے بے طرح آپکو اُنس ہے۔ کیوں نہو وطن کی ہر ایک چیز عزیز ہوتی ہے اسمیں چاہے زبان ہو یا طرز بیان۔ لیکن اگر قلمی لکھنوی بننے کا شوق ہے تو اس خلقی زبان کو ترک کیجئے اور (کو) سلام کیجئے۔ اور جس فقرے کا میں نے اشارہ کیا وہ اگر پھر لکھیئے گا تو اسطرح لکھئے گا کہ وہ بحث مکرر چھیڑ دی ہے۔

فہمائش نمبر (۱۶) آپ لکھتے ہیں کہ ان اعتراضوں کے اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ واقعی نسیم نے سچ کہا ہے ع جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔

آپ لاکھ لکھنؤ کی زبان کے سرپرست بننے کی کوشش کریں اور اپنے تئیں لکھنوی بتائیں لیکن جہاں آپ بولے کہ تمام حقیقت حال آئینہ ہوگئی۔ اس فقرے میں (کوشش کرنی چاہیئے

سے صاف دیہات کی زبان کی بوآتی ہے۔ اگر آپ کے زمانے کا کوئی لکھنؤ والا یہی مطلب ادا کرنا چاہتا تو وہ یوں لکھتا کہ (کوشش کرنا چاہیئے) ہمارے وقت میں اکثر (کوشش کرنی) بھی زبان سے نکل جاتا تھا لیکن منشی امیر احمد صاحب مینائی سے معلوم ہوا کہ اب یہ محاورہ تمام فصحائے لکھنؤ نے ترک کردیا ہے اب جو کہے گا وہ یہی کہے گا کہ (کوشش کرنا چاہیئے) منشی امیر احمد یہ بھی فرماتے ہیں کہ کوئی صاحب جنکا نام **میاں جلال** تھا اسوقت اساتذہ لکھنؤ میں شمار کیئے جاتے ہیں اُنکے زیر اہتمام ایک رسالہ (دستور الفصحا) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جسکے گیارھویں صفحے میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ (درحالیکہ مفعول کسی فعل کا مؤنث ہو تو اس حالت میں جو بعضی علامت مصدری یعنی نا کے الف کو یائے معروف سے بدل کر بولتے ہیں جیسے بات کرنی چاہیے۔ جان دینی دشوار ہوگئی۔ راہ چلنی آسان نہیں نیند آنی مشکل ہے۔ یہ محاورہ خاص فصحائے دہلی یا متقدمین لکھنؤ کا ہے۔ فصحائے متاخرین لکھنؤ اسطرح نہیں بولتے **مفعول خواہ مؤنث ہو خواہ مذکر کسی حال میں یہ علامت مصدری کو تغیر نہیں دیتے یعنی بات کرنا جان دینا راہ چلنا۔ نیند آنا ہی بولیں گے۔ بات کرنی جان دینی۔ راہ چلنی نیند آنی۔ نہ کہیں گے**

بندہ پرور ملاحظہ کیا آپ نے کہ فصحائے لکھنؤ کی زبان کا رنگ کیا ہے۔ اگر آپ کو شرفائے لکھنؤ کی صحبت کا موقع نہیں ملتا تو اس قسم کے رسالے ہی پڑھ لیا کیجیے جو مبتدیوں کے لئے اصلاح زبان کی غرض سے شائع کیئے جاتے ہیں۔ مانا کہ آپ کی (عمر عزیز) بہت گذر گئی ہے۔ اسوقت قدیمی اور خلقی طرز بیان کا ترک کرنا دشوار ہے۔ لیکن آپ کو کوشش کرنا چاہیئے۔

فہمائش نمبر (۱۷) آپ تحریر فرماتے ہیں۔ دہلی والے گلزار نسیم پر اعتراض کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اعتراض عام اہل لکھنؤ اور لکھنؤ کی مستند زبان پر ہے۔ اسلئے ضرورت بھی ہے کہ عام پبلک پر ظاہر کردیا جائے کہ گلزار نسیم میں اہل لکھنؤ کے نزدیک صدہا غلطیاں

ہیں) خیر یہ تو سب صحیح مگر یہ فرمایئے کہ (ضرورت) کے بعد بھی (کی کیا ضرورت ہے۔ اسقدر لکھنا کافی تھا کہ (اسلئے ضرورت ہے کہ الخ) میں دیکھتا ہوں کہ آپ نثر میں تو اسقدر بھرتی کے الفاظ رکھ دیتے ہیں خدانخواستہ جب پاس تخلص سے کبھی نظم کہنے کا اتفاق ہوتا ہوگا۔ تو قیامت ہی کرتے ہونگے۔ یہ تو زبان کے متعلق فہمائش تھی۔ میرا ایک سوال آپ سے اور ہے۔ وہ یہ کہ اگر آپ کا دعوےٰ صحیح ہے تو میں آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دیکر کہتا ہوں کہ مہربانی کر کے آپ یہ تحریر فرمایئے کہ کس لکھنؤ والے نے یہ لکھا ہے کہ گلزار نسیم میں صدہا زبان کی غلطیاں ہیں اور کس دلی والے نے گلزار نسیم پر اعتراض کیا ہے یوں تو دلی والوں نے اکثر لکھنؤ کی زبان پر اعتراض کیا ہے۔ مگر اُس دلی والے کا نام بتایئے جس نے محض گلزار نسیم پر اعتراض کیئے ہوں اور وہ ایسے اعتراض ہوں جو سوائے گلزار نسیم کے کسی اور لکھنؤ کے شاعر کے کلام پر عائد نہ ہوتے ہوں منشی امیر احمد مینائی فرماتے ہیں کہ شیخ ابراہیم ذوق کے قابل فخر شاگرد محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور روزگار کتاب آب حیات میں گلزار نسیم کی تعریف کی ہے۔ اب آپ اُس دلی والے کا نام بتایئے جنے اعتراض کئے ہیں۔ خیر کجا بود مرکب کجا تاختم۔ اب اصل مطلب سنیئے۔

فہمائش نمبر (۱۸) آپ فرماتے ہیں کہ میرا مقصد اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ صرف دو مقصد ہیں) حضرت جو مطلب آپ ادا کرنا چاہتے ہیں وہ اس فقرے سے نہیں ادا ہوتا۔ آپ کو یہ لکھنا تھا (میرا مقصد محض اعتراض کرنا نہیں ہے الخ) نسیم تو زبان پر حکومت نہیں رکھتے مگر آپ ماشاءاللہ (آپ کی حکومت) خوب بڑھی ہوئی ہے کہ نثر میں اپنا مطلب نہیں ادا کر سکتے۔

فہمائش نمبر (۱۹) آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اب میں مثنوی کے اشعار نقل کر کے لوگوں کے شبہات واعتراضات پیش کئے دیتا ہوں) یہ آپ نے نہ تحریر فرمایا کہ (لوگوں) سے آپ کی کیا مُراد ہے۔ باہر کے لوگوں سے مُراد ہے یا کسی اور قسم کے (لوگوں سے)

فہمائش نمبر (۲۰) آپ دیان کے بیڑے) والے اعتراض کے بارے میں فرماتے ہیں کہ (مسٹر چک بست نے آتش کی جو اصلاح نقل کی ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد نے یہ دونوں غلطیاں نکال دی تھیں۔ مگر نسیم نے .... اپنا ناقص مصرع قائم رکھا) سیاق کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ یہ مطلب ادا کرنا چاہتے ہیں کہ استاد نے یہ دونوں غلطیاں دور کر دی تھیں لہذا آپ کو یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ اُستاد نے دونوں غلطیاں نکال ڈالی تھیں، مگر آپ کو اپنا خلقی طرز سخن یاد آگیا اسکا کیا علاج ہے) (غلطی نکالنے) کے معنی تو اعتراض کرنے کے ہیں۔ غلطی نکال ڈالنا۔ بیشک غلطی دور کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ میں نسیم پر اعتراض نہیں کر رہا تھا بلکہ ان کی غلطیاں دُور کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں پھر آپ سے پوچھونگا کہ جب میں نے (خود تفنن طبع) کے طور پر مثنوی کہی تھی تو پھر نسیم کیونکر۔ اسے اصلاح کے لئے میرے پاس لائے۔

فہمائش نمبر (۲۱) آگے چل کے آپ لکھتے ہیں کہ خیر اکی (نسیم کی) خوشی مگر خرابی یہ کہ ذمہ دار لکھنؤ قرار دیا جاتا ہے۔ کیوں صاحب یہ محض (خرابی یہ) کے کیا معنی ہیں۔ یہ کہاں کی زبان ہے آپ کو لکھنا تھا (مگر خرابی یہ ہے کہ الخ)

فہمائش نمبر (۲۲) ایک اعتراض سے متعلق آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

قطع نظر اسکے پہلا مصرع بہت بھونڈا ہے (لہر) کی جگہ (لہَر یعنی لے متحرک کے ساتھ موزوں کردیا گیا ہے)

اب آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ یہ پورا جملہ کسقدر بھونڈا ہے اور کتنے لفظ اسمیں بے موقع اور بے محل استعمال ہوئے ہیں جس صورت پر اس جملے کے الفاظ ترتیب دیئے گئے ہیں اس کے مطابق میں لفظ (یعنی) بالکل بے معنی نظر آتا ہے۔ اور ہا سے متحرک کے ساتھ بھی بالکل بے محل استعمال ہوا ہے۔ دیکھئے اہل زبان اس خیال کو یوں ادا کریں گے قطع نظر اسکے کہ پہلا مصرع بہت بھونڈا ہے (لہر کی جگہ۔ لہَر موزوں کردیا گیا ہے یعنے

(لہر میں حرف ”ر“ کو متحرک بنا دیا ہے)

فہمائش نمبر (۲۳) اب ایک اور جملہ ملاحظہ ہو آپ فرماتے ہیں کہ رعایت لفظی کے الزام کو دور کرنے کے بعد بھی مسٹر چکبست نے تسلیم کر لیا ہے) اس موقع پر بھی آپ اپنا مطلب ظاہر نہ کر سکے جو الزام دور کر دیا گیا وہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ آپ تو کہنا یہ چاہتے تھے کہ مسٹر چکبست نے رعایت لفظی کا الزام دور بھی کرنا چاہا ہے لیکن ایک حد تک تسلیم بھی کر لیا ہے۔

فہمائش نمبر (۲۴) پھر آپ فرماتے ہیں کہ اس رعایت کے شوق نے نسیم لکھنوی کے کلام میں بہت سے بدنما عیوب ہی نہیں پیدا کیے بلکہ بعض موقعوں پر انھیں ابتذال اور فحش گوئی پر بھی آمادہ کر دیا) بندہ نواز یہ لکھنؤ کی اُردو نہیں ہے اسے پرانے لوگ گڈا امیر اُردو کہتے تھے۔ لکھنؤ والا یہ مطلب ادا کرے گا تو یوں کہے گا، کہ اس رعایت کے شوق کی وجہ سے نسیم لکھنوی کے کلام میں بہت سے بدنما عیوب ہی نہیں پیدا ہو گئے ہیں بلکہ بعض موقعوں پر ابتذال اور فحش گوئی کی بھی نوبت آگئی ہے۔

فہمائش نمبر (۲۵) ایک موقع پر چند اعتراضات پیش کرنے کے قبل آپ فرماتے ہیں رعایت نے کیا کیا خرابیاں پیدا کی ہیں۔ یہ محض لفظ (رعایت) آپ نے کس رعایت سے استعمال کیا ہے۔ آپ کا مطلب تو یہ ہے کہ رعایت لفظی کے شوق نے کیا کیا خرابیاں پیدا کی ہیں)

واللہ آپ کا یہ اختصار قیامت کرتا ہے۔ اپنے نزدیک آپ گلزار نسیم کا جواب نثر میں لکھ رہے تھے۔

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی (حال وارد فردوس بریں)

(اودھ پنچ مطبوعہ ۲۴۔ اگست ۱۹۰۵ء جلد ۲۹)

آتش کا خط شرر کے نام نمبر (۵)

(دلگداز ماہ اپریل ۱۹۰۵ء۔ گلزار نسیم)

فہمائش نمبر (۲۶) آپ فرماتے ہیں (شاعر نے کسی مضمون کے ادا کرنے کی کوشش کی ہے مگر ضروری الفاظ کے چھوڑ دینے سے مطلب خبط ہو گیا ہے) کیوں صاحب الفاظ کے بعد کے کیا معنی رکھتا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے تھے۔ ضروری الفاظ چھوڑ دینے سے مطلب خبط ہو گیا ہے (غالباً یہ) (کے ابھی کو) کا بھائی ہے۔ جبھی آپ کو اس سے اسقدر اُنس ہو۔

فہمائش نمبر (۲۷) آپ فرماتے ہیں کہ جبتک کسی خاص نگین کو دکھا کے یہ نہ کہا جائے اگر اہل زبان یہ مطلب اسطرح ادا کرینگے جبتک کوئی خاص نگیں دکھا کے یہ نہ کہا جائے۔

فہمائش نمبر (۲۸) آپ لکھتے ہیں کہ اسمیں پری کی جگہ (پریاں) چاہیئے جو نہایت ہی ذلیل قسم کی غلطی معلوم ہوتی ہے (کیوں مولانا یہ جو) کی ضمیر کس طرف پھرتی ہے اس جملہ کی ترکیب سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ (جو) کی ضمیر اس پورے فقرے کی طرف پھرتی ہے کہ (اسمیں پری کی جگہ پریاں چاہیئے) مگر اس سے آپ کا مطلب خبط ہوا جاتا ہے۔ یعنی اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ آپ کا یہ تحریر فرمانا کہ (پری کی جگہ پریاں چاہیئے) نہایت ہی ذلیل قسم کی غلطی ہے۔ گو یہ بہت درست ہے کہ آپ کا ایسا لکھنا نہایت ذلیل قسم کی غلطی ہے مگر آپ کا مطلب تو کچھ اور ہے سنیئے اگر پھر کبھی ایسا جملہ لکھنے کا اتفاق ہو تو یوں لکھیئے گا۔ اسمیں پری کی جگہ پریاں چاہیئے (محض پری) لکھنا نہایت ذلیل قسم کی غلطی ہے۔

فہمائش نمبر (۲۹) آپ برہم ہو کر فرماتے ہیں کہ (برہم ہو کی جگہ پر (بیجا) ہوا لکھنا

میرے خیال میں بہت بتنل بازاری زبان ہے اور بازار بھی لکھنؤ نہیں کہیں اور کا اس آخری فقرے کا اختصار غضب کا ہے خیر یہاں بھی مختصراً یہ کہا جاتا ہے کہ اس فقرے کو یوں لکھنا چاہیئے تھا کہ (بازار بھی لکھنؤ کا نہیں کہیں اور کا)

فہمائش نمبر (۳۰) آپ کڑک کر فرماتے ہیں مگر (دست پانا) **قابو پانا** کی جگہ ہرگز نہیں جائز ہے۔ مسٹر محمود لکھتے ہیں کہ اس مصرع کی زبان صاحب لوگوں کے بیرا اور خانساماں کی زبان ہے بندہ پرور اگر پیوند لکھنوی بننے کا خیال ہے تو اس جملہ کو یوں لکھنا چاہیئے۔ مگر دست پانا **قابو پانے** کی جگہ پر ہرگز جائز نہیں ہے۔

فہمائش نمبر (۳۱) آپ کے دماغ کے کوہ آتش فشاں سے ایک مقام پر یہ مادہ خارج ہوا ہے کہ اُردو میں صرف مادی **مشینوں** کی نسبت کل کا لفظ مستعمل ہے (یہ مادی مشین کیا بلا ہے۔ مسٹر محمود سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ (مشین) کا لفظ انگریزی زبان میں (کل) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے آپ نے (مشین) کے قبل مادہ کس لیئے جمع کر دیا ہے۔ کیا آپ نے روحانی مشین بھی دیکھی ہے بندہ نواز اگر اس موقع پر صرف (مشین) کہتے تو زبان کا کون سا پُرزا بگڑا جاتا تھا آپ کو انگریزی الفاظ کے ترجمے سے بہت اُنس ہے مگر اس موقع پر تو وہ یہ عیب انشا پردازی بھی آپ کی پردہ پوشی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انگریزی میں بقول سید محمود کے کوئی انگریزی ہے مگر بھونڈی۔

(میٹریل مشین) نہ کہیئے گا۔ یہ آخر آپ نے کون سا کارخانہ کھولا ہے جہاں ایسی بندشیں اور ترکیبیں ڈھل کر نکلی ہیں غالباً دگداز پریس کی طرح یہ بھی انسانی نگاہوں سے پنہاں ہے۔

فہمائش نمبر (۳۲) آپ ایک مقام پر نہایت وحشت کے لہجہ میں فرماتے ہیں تفنگ کے چلنے سے انسان کی چال کو کیا علاقہ مگر صرف اس وجہ سے کہ بندوق بھی

چلا کرتی ہے اسے موزوں کر دیا (میں پوچھتا ہوں کہ یہ (اسی) کی ضمیر کس لفظ کی طرف پھرتی ہے۔ الفاظ کی ترتیب سے تو ظاہر ہے کہ اُسے) بندوق کے لئے استعمال کیا گیا ہے لیکن یہ آپ کا مطلب نہیں ہے بندہ نواز ایسی نحو و صرف کی جاہلانہ غلطیاں کرنا شان مولویت کے خلاف ہے) دیکھئے اس آخری جملے کو یوں لکھنا چاہیئے تھا مگر صرف اس وجہ سے کہ بندوق بھی چلا کرتی ہے ایسا موزوں کر دیا گیا)

فہمائش نمبر (۳۳) ایک مقام پر آپ کے شیشۂ فکر سے یوں شراب سخن ٹپکتی ہے کہ اسکے معنے شاید یوں کہے جائیں کہ محل کے بنتے ہی جام شراب کا دور چلنے لگا) یا جام شراب کا دور چلنا) خاص دیہات کی فصاحت ہے اگر اہل لکھنؤ اس خیال کو ادا کریں گے تو یا یہ کہیں گے کہ (محل کے بنتے ہی جام چلنے لگا) یا یہ کہیں گے کہ شراب کا دور چلنے لگا آپ کو شاید یہ شعر یاد نہیں۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ حب تلک بس چل سکے ساغر چلے

آپ کے نزدیک یہ کہنا چاہیئے تھا۔ دور ساغر شراب چلے۔

فہمائش نمبر (۳۴) آپ کے شتر وگربہ) سے بہت بھڑ سکتے ہیں مگر آپ کے ذیل کے فقرے میں دونوں ساتھ ساتھ بلبلا رہے ہیں) آپ فرماتے ہیں) اگر دخت رز کا آنا محمود کا آنا نہیں تھا تو پھر حماد اس سے کیوں ملی۔ کیونکہ وہ تو کشتی میں ہے اور ابھی نہیں آئی ہے) اول تو تمام جملہ اونٹ کے کوان کی طرح کا واک واقع ہوا ہے اسپر شتر گربہ) سے نجات پانا منظور ہے۔ تو اس جملے کو اسطرح لکھئے اگر دخت رز کا آنا محمود کا آنا نہیں تھا تو پھر حماد اس سے کیونکر ملی کیونکہ وہ تو کشتی میں تھی اور اسوقت تک نہیں آئی تھی)

فہمائش نمبر (۳۵) (اب اس سے بڑھکر شرمناک) غلطی ملاحظہ ہو آپ تحریر فرماتے ہیں (خیر بھگا دی تو چونکہ آدھی تیھر کی ہوگئی تھی اسلئے گراں ہوئی الخ) کیوں صاحب یہ (تو چونکہ) کس جانور کا نام ہے۔ یہ تو شتر گربہ بھی نہیں ہے یا (محض تو) لکھئے یا صرف (چونکہ

لکھئے۔ یہ دونوں کا اجماع کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ تو وہی ہے کہ جیسے (چوں چونکہ) لکھئے (دیکھئے) اہل زبان اس جملے کو اگر لکھیں گے تو یا اسطرح لکھیں گے کہ خیر بکاؤلی تو آدھی تیھر کی ہوگئی تھی الخ یا اسطرح کہ (خیر بکاؤلی چونکہ آدھی تیھر کی ہوگئی تھی الخ)

فہمائش نمبر (۳۶) شتر گربہ پر اعتراض کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ (افسوس معلوم ہوتا ہے کہ اس **نقصان نے کیسے اچھے شعر کو مٹا دیا۔**

علاوہ اسکے کہ اس جملے کے آخری فقرے میں حسب معمول آپ کے قدیم عنایت فرما (حضرت کو) تشریف رکھتے ہیں اس موقع پر (نقصان) کا استعمال میری سمجھ میں نہ آیا۔ آپ کا مطلب تو یہ ہے کہ اس **نقص** (نے کیسے اچھے شعر کو مٹا دیا اور لکھتے ہیں آپ (نقصان) کیا یہ آپ نے نقص کی جمع بنائی ہے یا کوئی نیا محاورہ ایجاد کیا ہے آخر آپ کو بے موقع لفظ **نقصان** استعمال کرنے سے کیا فائدہ ہوا اگر یہی حال رہا تو دعوائے زبان دانی (بے سود ہے) دیکھئے اہل زبان یہ مطلب اسطرح ادا کرینگے (افسوس معلوم ہوتا ہے کہ اس **نقص نے کیسا اچھا شعر مٹا دیا**)

خواجہ حیدر علی آتش

(حال وارد فردوس بریں)

(اودھ پنچ مطبوعہ ۳۱ اگست ۱۹۰۵ء جلد ۲۹)

آتش کا خط شرر کے نام نمبر (۶)

فہمائش نمبر (۳۷) آپ فرماتے ہیں کہ (صاف ظاہر ہے کہ پیغام کی جگہ اصل میں انعام کا لفظ ہوگا) افسوس کہ آپ کو بھرتی کے الفاظ استعمال کرنے سے سیری ہی نہیں ہوتی۔ آپ یہ کہہ سکتے تھے کہ صاف ظاہر ہے کہ (پیغام) کی جگہ (انعام ہوگا) یہ کا لفظ کی کیا ضرورت تھی اگر آپ (انعام) کو لفظ نہ بتلا دیتے تو کیا کوئی اسے جملہ خیال کر سکتا۔ یہ طوالت پسندی کی وجہ ہے کہ آپ کو گلزار نسیم کا اختصار کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

فہمائش نمبر (۳۸) ایک شعر کی نسبت آپ فرماتے ہیں کہ (اسمیں۔ میں سمجھتا ہوں دو دستہ کی جگہ) دو دستہ ہوگا یہ میں میں بھی کیا خوب ہے۔ جب کسی بز اخفش کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے تو وہ ایسی ہی آواز نکالتا ہے۔ میری شفیق ذوق کا مصرع ہے۔

ع تو کہے ہیں۔ میں کہوں میں کی چھری گردن پر۔

غالباً آپ نے اسی مصرع کا تتبع کیا ہے۔ دیکھئے اک ذراسی اصلاح میں آپ کا یہ جملہ درست ہو جاتا ہے۔ یوں تحریر کر سکتے تھے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اسمیں دو رستہ کی جگہ دو دستہ ہوگا۔ جائے استاد خالی است)

فہمائش نمبر (۳۹) آپ مادری لہجہ میں فرماتے ہیں کہ اس اڈیشن میں جو اس اہتمام سے شائع کیا گیا ہے ایسی فروگذاشتیں ہرگز قابل معافی نہیں۔ مگر خرابی تو یہ ہے کہ اصلاح درکنار (اس اڈیشن میں جہاں کہیں تصرف کیا گیا ہے اور کسی قسم کی تنقیح و اصلاح کی کوشش کی گئی ہے وہاں بجائے بنانے کے شعر غارت کر دیا گیا ہے)

جناب عالی آپ خود ہی انصاف کیجیے کہ اس جملہ کی ترکیب کسقدر بد واقع ہوئی ہے

اول تو دو جگہ (اس اڈیشن میں) استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کتنا بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔
دوسری مرتبہ (اس اڈیشن میں) بالکل بیکار ہے علاوہ بریں پانچ سات لفظیں اور آپ نے بے موقع اور فضول استعمال کی ہیں اب فرماتے ہیں **مگر خرابی تو یہ ہے کہ اصلاح در کنار** الخ) کیوں صاحب یہاں (مگر) کی کیا ضرورت ہے اور (مگر) کی دم میں جو یہ پانچ سات الفاظ بندھے ہوئے ہیں ان کی کیا ضرورت ہے کہاں تک آپ کو سمجھایا جائے قدم قدم پر ٹھوکر کھائی ہے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اصلاح دے کر آپ کا مطلب ظاہر کر دیا جائے۔ دیکھئے فصحائے لکھنؤ اس جملہ کو اس طرح ترتیب دیں گے۔ اس اڈیشن میں جو اس اہتمام سے شائع کیا گیا ایسی فروگذاشتیں ہرگز قابل معافی نہیں ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ جہاں کہیں اس قسم کی تصحیح یا اصلاح کی کوشش کی گئی ہے وہاں بجائے بنانے کے شعر غارت کر دیا گیا ہے تعجب ہے کہ اس موقع پر آپ نے یہ نہ کہا کہ شعر کو غارت کر دیا گیا ہے)

فہمائش نمبر (۴۰) آپ فرماتے ہیں کہ مسٹر چکبست صاحب نے اس نئے اڈیشن کو خود مصنف صاحب کے اصلی اڈیشن کے مطابق درست کر کے شائع کیا ہے)

مسٹر چکبست صاحب) کی ترکیب پر تو سید محمود صاحب بھی حسب معمول اس جملے میں جلوہ افروز ہیں۔ مگر سب پر طرہ یہ جملہ ہے کہ مصنف صاحب کے اصلی اڈیشن الخ) کیوں حضرت (یہ مصنف صاحب کا اصلی اڈیشن) کیا شئے ہے) یا تو کہئے کہ مصنف صاحب کا اڈیشن) یا یہ کہیے کہ (اصلی اڈیشن) دونوں کے ایک ہی معنے ہیں کیا مصنف صاحب کا کوئی نقلی اڈیشن بھی تھا جس کے مقابل میں آپ مصنف صاحب کا اصلی اڈیشن پیش کرتے ہیں دیکھئے یہ جملہ اسطرح لکھنا چاہئے کہ (چکبست صاحب نے یہ نیا اڈیشن خود مصنف صاحب کے اڈیشن کے مطابق الخ

فہمائش نمبر (۴۱) آپ فرماتے ہیں مگر حالت یہ نظر آئی کہ جو غلطیاں الخ) بندہ نواز یہ شرفاء لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔ سید محمود صاحب فرماتے ہیں کہ یہ (بیرا اور خانساماں لوگوں) کی زبان ہے

شرفائے لکھنؤ یوں کہیں گے کہ مگر یہ حالت نظر آئی ۔

فہمائش نمبر (۴۲) آپ فرماتے ہیں کہ جٹلمنس پہلے مصرع میں ہے وہی دوسرے میں بھی رہنا چاہیئے (کیوں مسٹر یہ آپ ہی کی تقلید ہے) یہ ٹمنس کیا بلا ہے سید محمود صاحب فرماتے ہیں کہ فارسی میں اسکا مترادف لفظ۔ (زمانہ) موجود ہے۔ پھر آپ نے خواہ مخواہ انگریزی لفظ کیوں استعمال کیا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ موقع بموقع انگریزی الفاظ استعمال کرنے سے لوگ اس مغالطہ میں آجائیں گے کہ آپ انگریزی زبان سے واقف ہیں بندہ نواز آپ کی انگریزی کی لیاقت کا پردہ تو سید محمود صاحب کے اعتراضات سے فاش ہوگیا۔ ایک نوآموز انگریزی داں بھی (مسٹر جیک بست صاحب) اور عام پبلک نہ کہے گا آپ نے وہ مثل سنی ہوگی کہ ایک کوا مورکے پرکھونس کر موروں میں جا ملا تھا اسی طرح اپ اپنے مضامین میں انگریزی الفاظ کھونس کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کو انگریزی زبان سے بھی مس ہے مگر جو اس کوّے کا حشر ہوا اس سے آپ کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے ۔

فہمائش نمبر (۴۳) ایک مقام پر آپ فرماتے ہیں کہ جبتک کوئی اور حرف ربط نہ ملایا جائے (مطلب ہی نہیں نکل سکتا) کیوں صاحب (مطلب) کے بعد (ہی) کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو (کو) سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ آپ کو اس (ہی) سے انس ہو۔ یوں لکھنے میں کیا قباحت ہے کہ جبتک کوئی اور حرف ربط نہ ملایا جائے مطلب نہیں نکل سکتا۔

فہمائش نمبر (۴۴) آپ ایک مقام پر رقت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ جس سے اصل مصرع کی فصاحت بے تکلفی و سادگی جاتی رہی ہے اس جملہ کی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آتی۔ سید محمود کہتے ہیں کہ انگریزی میں یہ قاعدہ ہے کہ جب دو چار برابر کے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں تو آخر میں حرف ربط (یعنی اینڈ) استعمال کرتے ہیں اسی کا تتبع آپ نے اردو میں کیا ہے کہ (فصاحت) کے بعد محض ایک خط کھینچدیا ہے اور (بے تکلفی) کے بعد حرف عطف

(یعنی و) ملایا گیا ہے۔ انگریزی میں یہ ترکیب عام ہے مگر اُردو میں محض غلط ہے اردو میں ایسے موقعوں پر ہر لفظ کے بعد حرف ربط لانا واجب ہے یعنی آپ کو اس طرح لکھنا چاہئے تھا کہ (فصاحت و بے تکلفی و سادگی جاتی رہی) اگر آپ کو یا آپ کے قدر دانوں کو اس میں عذر ہو تو نثر اُردو میں یا نظم میں ایسی ترکیب دکھاویں جیسی کہ آپ نے جملہ کی ہے بندہ نواز انگریزی کی تقلید فضول ہے۔ انگریزی روش کی پیروی میں آپ اپنی چال بھی بھول جایئے گا۔ ہائے اس موقع پر مجھے اپنا شعر یاد آتا ہے ؎

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں　　ہنسا گل کی طرح غنچہ بہار، اسکا دہن بگڑا

فہمائش نمبر (۴۵) گلزار نسیم کا ایک مصرع ہے کہ ع قسمت سے مفر ہو ابھی کب (؟) اسکے معنے آپ بتلاتے ہیں کہ قسمت سے بھاگ کے بھی کہیں پناہ نہیں مل سکتی اور یہی اہل زبان کے محاورے میں بھی ہے اس فقرے میں دو جگہ آپ نے (بھی) استعمال کیا ہے حالانکہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور اکثر (نوآموز شاعر) جب دیکھتے ہیں کہ کسی طرح مصرع کی چول نہیں بیٹھتی تو (بھی) لے آتے ہیں خیر وہاں تو اتنا اطمینان ہو جاتا ہے کہ (بھی) کی بدولت مصرع موزوں ہو گیا لیکن آپ کا (بھی) کا نا موزوں استعمال گناہ بے لذت سے کم نہیں

فہمائش نمبر (۴۶) گلزار نسیم کا ایک شعر ہے

چلیئے گا تو ساتھ ہیں بلا عذر　　رہیئے گا تو بندگی میں کیا عذر

اس نئے اڈیشن میں یہ مصرع اسطرح چھپ گیا ہے ؎

چلیئے گا تو ساتھ میں بلا عذر　　رہیئے گا تو بندگی میں کیا عذر

جس کی آنکھوں پر تعصب کے پردے نہ پڑ گئے ہونگے وہ دیکھ سکتا ہے کہ (ہیں) میں حرف ہا کا شوشہ (ہ) مٹ گیا ہے اس وجہ سے (میں) پڑھا جاتا ہے مگر آپ (مولوی) ہو کر اور مسلمان ہو کر حضرت چکبست کو اس تصرف بیجا کا ملزم قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے (ساتھ ہیں کو ساتھ میں) بنا دیا افسوس صد افسوس اڈیٹر اتحاد ہو کر ایسی نفاق پسند

طبیعت رکھنا آپ ہی کا کام ہے۔ خیر اس قصے سے تو چنداں مجھے مطلب نہیں۔ میں آپ کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس مہمل الزام کو الفاظ کا کیسا بھونڈا لباس پہنایا ہے آپ فرماتے ہیں کہ (ساتھ میں نے اس بے تکلفی کو خاک میں ملانے کے بعد شعر کو کیسا غارت کر دیا) بندہ پرور یہ خیال اس سے بدتر الفاظ میں نہیں ادا ہو سکتا تھا جیسا کہ میں پیشتر لکھ چکا ہوں۔ گنڈا میر اردو اسی کا نام ہے۔ دیکھئے یہ خیال اس طرح ادا کرنا چاہئے تھا کہ (ساتھ میں) کی وجہ سے وہ بے تکلفی خاک میں مل گئی اور شعر غارت ہو گیا)

فہمائش نمبر (۴۷) گلزار نسیم کا شعر ہے۔

چلتے تھے ادھر سے دو بچاری ایک ایک کی کر رہا تھا خواری

آپ فرماتے ہیں کہ پہلے مصرع میں (جاتے تھے) کی جگہ (چلتے تھے) بنایا گیا ہے (خدا جانے کون فرشتہ آپ سے کہہ گیا کہ اصل مثنوی میں (جاتے تھے) تھا۔ اور حضرت چکبست نے (چلتے تھے) بنا دیا نسیم خود مجھ سے کہتے تھے کہ انھوں نے (چلتے تھے) نظم کیا ہے علاوہ بریں (چلتے تھے) میں کیا قباحت ہے کہ آپ اس قدر گرم ہو کر فرماتے ہیں ایسی اصلاحوں سے مثنوی کو بہت بڑے اور گہرے زخم لگے ہیں) ۔ ماشاء اللہ آپ کو دعوئے زباں دانی بھی ہے۔ اس لئے شاید آپ کا یہ خیال ہو کہ جاتے تھے) کے بدلے (چلتے تھے) کہنا ان کی زبان ہے۔ مگر یہ خیال آپ کا صحیح نہیں ہے۔ ہمارے وقت کی زبان تو درکنار آپ کے وقت کے شعرا نے بھی جاتے کے بدلے (چلتے) استعمال کیا ہے تو اب مرزا داغ میرے سامنے اسوقت بیٹھے ہیں وہ اپنا شعر سنداً پیش کرتے ہیں ؎

حشر میں لیں گے اس بزم سے چلنے والے ہاتھ ملتے ہی اُٹھے عطر کے ملنے والے

علاوہ بریں نسیم کے شعر میں (چلتے تھے) ہی زیادہ فصیح ہے۔

فہمائش نمبر (۴۸) آپ فرماتے ہیں کہ (گو انکے علاوہ اس مثنوی میں اور بھی بہت سے شبہات ہیں) مگر اسی قدر لغزشوں کا ظاہر کردینا میں کافی سمجھتا ہوں کیوں حضرت کیا (شبہہ) اور (لغزش) مترادف الفاظ ہیں کہ آپ دونوں کو ایک ہی معنوں میں استعمال استعمال کرتے ہیں (شبہہ) کے معنی تو یہ ہیں کہ کسی شے کی نسبت یقین کا درجہ نہ ہوا ہو اور (لغزش) کے معنی یہ ہیں کہ یہ تسلیم کرلیا گیا کہ کسی شے میں عیب موجود ہے مگر آپنے دونوں کو خلط ملط کردیا ہے۔ واہ مولوی صاحب واہ

فہمائش نمبر (۴۹) آپ فرماتے ہیں کہ انکا جوش ممکن ہے کہ اُن شبہات کو میرے دل سے مٹا دے) اب اس آخری (کو) کو بھی چھاتی پر پتھر رکھ کر سلام کیجئے اور اپنے جملے کو یوں ترتیب دیجئے۔ انکا جوش ممکن ہے کہ وہ شبہات میرے دل سے مٹا دے الخ بندہ نواز یہ دوسرا مضمون بھی آپ کا خاتمہ پر آگیا۔ سرسری نظر سے دیکھنے سے جو لغزشیں دکھائی دیں اُن کے متعلق آپ کو فہمائش کردی گئی۔ اس سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ زبان دانی کتنی مشکل چیز ہے۔ نسیم نے تقریباً پونے دو ہزار شعر کی مثنوی لکھی ہے۔ اسمیں آپ نے تین چالیس غلطیاں بڑی کوشش سے نکالی ہیں۔ حالانکہ آپ کا ایک اعتراض بھی صحیح نہیں ہے اور جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ اس سے آپ کی لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر آپ کے واسطے یہ امر قابل غور ہے کہ ان دو مضامین جن کا حجم ۱۶ صفحوں سے زیادہ نہیں ہے پچاس لغزشیں موجود ہیں افسوس افسوس باقی آئندہ۔

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی

(حال وارد فردوس بریں)

اودھ پنچ مطبوعہ ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء جلد ۲۹

جنت کی ڈاک

آتش کا خط شرر کے نام نمبر (۷)

میاں شررؔ۔ مارچ اور اپریل کے دلگداز میں جو مضمون آپ نے گلزار نسیم کی شہرت پر خاک ڈالنے کی غرض سے شائع کئے تھے اور غلبۂ ذکاوت سے نسیم کی زبان پر بھی اعتراض کئے تھے۔ اعتراض جس پایہ کے تھے انکی قلعی اچھی طرح کھل گئی ہوگی۔ میرا صرف منشاء یہ تھا آپ پر یہ ظاہر کردوں کہ آپ دو سطریں بھی صحیح نہیں لکھ سکتے ہیں چنانچہ آپ کے دو مضموں میں جنکا ذکر ابھی کرچکا ہوں اور جنکا حجم ۱۶ صفحے سے زیادہ نہیں ہے پچاس غلطیاں زبان اور محاورے کی موجود ہیں۔

سبحان اللہ انشا پردازی کا یہ رنگ اور زبان دانی کا یہ دعویٰ کہ تمام اساتذہ لکھنؤ کے مرشد بن کر آپ نے نسیم پر اعتراض شائع کرنے کی جرأت فرمائی ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند میں تو اسی کو رو رہا تھا کہ افسوس اب لکھنؤ کی یہ حالت ہوگئی کہ وہاں آپ کے ایسے انشا پرداز دعوائے زباں دانی کریں لیکن کل ایک اور تازہ گل کھلا اعمال بد کے فرشتے جولائی ۱۹۰۵ء کا دلگداز اتفاقیہ میرے پاس لے آئے اس میں بھی آپ نے گلزار نسیم پر کچھ گلفشانی کی ہے اور تحسین اور ستائش ریوڑیاں بانٹنے کے بعد آپ یہ تحریر فرماتے ہیں تکلف میں کیا ہے۔ کہ وزیرؔ۔ رندؔ۔ صباؔ۔ اور خلیلؔ۔ وغیرہ کا جو دور تھا اس کے آخری شخص نسیم ہیں۔

بندہ نواز یہ آپ نے خوب کہی سید محمود فرماتے تھے کہ آپ تاریخی افسانہ لکھتے ہیں مگر اس موقع پر تو آپ نے تاریخ کو افسانہ بنا دیا ہے۔ کیوں حضت اسی کا نام تحقیق ہے۔ جن بزرگوں نے آپ کے کان میں یہ پھونک دیا تھا کہ گلزار نسیم میں نے تفنن طبع کے طور پر کہی ہے اور اس میں نسیم کا بہت کم حصہ ہے انھوں نے آپ سے یہ نہ فرمایا کہ رند و صبا وغیرہ کے دور کے نسیم آخری شخص تھے کہ اولیں شخص تھے ابھی تو لکھنؤ میں میرے بہت سے شناسا اور دوست موجود ہیں جو میرے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے اور جن کو میرے شاگردوں کی کیفیت اچھی طرح سے معلوم ہے آپ نے انھیں سے اس امر کی نسبت مشورہ کر لیا ہوتا کہ نسیم کا میرے شاگردوں میں کیا پایہ تھا اور آیا وہ میرے شاگردوں کے دور کے آخری شخص تھے مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ نسیم و خلیل و صبا ایک ہی سال میں میرے شاگرد ہوئے اور ان کے بعد رند نے مجھ کو غزل دکھائی شروع کی رند تو اسوقت میرے شاگرد ہوئے ہیں جبکہ گلزار نسیم تصنیف ہو چکی تھی اور اگر کوئی شخص میرے شاگردوں کے دور کا آخری یادگار ہے تو وہ رند ہے گلزار نسیم ۱۲۵۴ھ ہجری میں تصنیف ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کی تاریخ تصنیف سے ظاہر ہے یعنی توقیع [illegible] وزیش باد۔

اور ۱۲۵۸ھ میں رند میرے شاگرد ہوئے ہیں۔ رند پیشتر فیض آباد میں رہتے تھے اور میر خلیق کے شاگرد تھے میر خلیق کی شاگردی کے زمانہ میں انکا تخلص وفا تھا جب فیض آباد میں بہو بیگم صاحبہ جنت نصیب ہوئیں اور میر خلیق فرخ آباد چلے گئے تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے جسوقت یہ میرے شاگردوں کے زمرے میں داخل ہوئے تو ان کی عمر ۲۸ یا ۲۹ برس کی تھی میرے کہنے سے انھوں نے تخلص بھی بدلا یعنی وفا سے اسم بامسمیٰ رند بن گئے نیز اپنا پچھلا کلام انھوں نے دریا برد کر دیا۔ بالفعل جو کچھ غزلیں وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔ وہ میری ہی شاگردی کے زمانہ کی کہی ہوئی ہیں۔

؎ اور تاریخ۔ خواجہ صاحب نے جو کچھ محض حافظہ کی مدد سے تحریر فرمایا ہے اسکی تصدیق اس ڈیڑھ صفحہ کے مضمون سے ہوتی ہے جو کہ رند نے اپنے حالات زندگی کی نسبت اپنے دیوان اول کے آخر میں لکھا ہے اور جو کہ ہر ایسے شخص کی نظر سے گذرتا رہتا ہے جسکو کہ شعر و سخن کا کچھ بھی مذاق ہو۔

اس حالت میں اگر نسیم نے یہ کہا کہ ع تجھ پاس تو اک عصا ہی جانی۔
تو کیا غلط کہا۔ تجھ پاس اور مجھ پاس کی ترکیب پر یہ سمجھ کر حرف رکھنا کہ رندؔ صباؔ و خلیلؔ وغیرہ کے دور کے آخری شخص نسیمؔ تھے لہٰذا وہ ایسا محاورہ نظم کرنے کے مجاز نہ تھے جو کہ رندؔ وغیرہ نے ترک کر دیا تھا محض لاعلمی سے رندؔ نے گلزار نسیم کے تصنیف ہونے کے چھ برس بعد جو غزل کہی ہے اسمیں یہ شعر موجود ہے ؎

پھر یہ منھ لیکے آئے ہو مجھ پاس   دور ہو سامنے سے نفرت ہے

اسی طرح سب اعتراضوں کا جواب ہو سکتا ہے۔ اس داستان کے سننے کے بعد آپ پر اور آپ کے دریدہ دہن پردہ پوشوں پر یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ رندؔ میرے شاگردوں کے دور کے آخری شخص تھے نہ کہ نسیمؔ ہاں آپ کے تجربہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ نسیمؔ کا انتقال رندؔ۔ صباؔ و خلیلؔ وغیرہ کے بعد ہوا۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ جب دنیا سے میرا سفر ہوا تو اسوقت رندؔ صباؔ خلیلؔ وغیرہ سب موجود تھے۔ مگر نسیمؔ میرے سامنے اُٹھ گئے تھے ہائے وہ دن مجھے اب تک نہ بھولے گا جبکہ میں نے یہ خبر پائی کہ نسیمؔ کو ہیضہ ہو گیا سب جانتے ہیں کہ سوائے مشاعرے میں جانے کے میں کبھی اپنے بوریے سے نہیں ہلتا تھا بڑے بڑے رئیسوں اور امیروں کو یہ حسرت رہ گئی کہ میں ان کے یہاں جاؤں حتےٰ کہ امجد علی شاہ مجھے بلایا کئے۔ مگر میں نہ گیا اور یہ کہلا بھیجا کہ اگر وہ بادشاہ ہیں تو میں بھی فقیری میں ملک سخن پر حکومت رکھتا ہوں۔ اگر ان کو مجھ سے ملنے کی تمنا ہو تو میرے جھوپڑے تک آجائیں اور جسدن سے شیخ ناسخ مرے تھے اسدن سے میں نے مشاعروں میں بھی جانا ترک کر دیا تھا۔ لیکن جب نسیمؔ کے دفعتہً بیمار ہو جانے کی خبر سنی تو میں اسکے مکان پر گیا اور خود اسکے بازو پر امام ضامن باندھا اور صحت کیلئے دعا کی مگر۔

کسی طرح سے نہ ٹوٹا طلسم حیرت و یاس   در قبول سے ٹکرا کے سر دعا الٹی

ؔلہ اودھ پنچ حضرت چکبست بھی یہ سند پیش کر چکے ہیں ۱۲

دوسرے روز یہ خبر سنی کہ نسیم نے جنت کی راہ لی۔ اس روز تمام شعرائے لکھنؤ میں ماتم تھا میرے اور میرے شاگردوں کے علاوہ لکھنؤ کے تمام سربرآوردہ شعرا جنازہ کے ساتھ تھے اور کہتے تھے کہ یہ جوانمرگ شاعر اگر زندہ رہتا تو خدا جانے شاعری کو کیا معراج دیتا مجھ پر تو اک سکتے کا عالم طاری تھا اور کبھی کبھی بیساختہ زبان سے نسیم کی غزل کا یہ شعر نکل جاتا تھا ؎

کچھ سوز تخ میں ہو نسیم بولو
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

خبر کجا بود مرکب کجا تا ختم۔ اب تو آپ پر یہ روشن ہوگیا ہوگا کہ نسیم کا انتقال میرے سب شاگردوں کے پیشتر ہوا ہے لہذا وہ میرے دور کے شاگردوں کے اوّلیں شخص تھے۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ جب آپ معمولی واقعات سے اسقدر بیخبر ہیں کہ آپ کو یہ نہیں معلوم کہ تندمیرے شاگردوں کے دور کے آخری شخص تھے کہ نسیم۔ تو پھر آپ تنقید و تحقیق پر قلم کیوں اٹھاتے ہیں کیا دلگداز کے پڑھنے والے بالکل سادہ لوح ہیں کہ وہ ایسے فقروں میں آجائیں گے آپ اپنے تئیں مولوی کہتے ہیں اور اسلام کی عظمت کا راگ گاتے ہیں آپ کے لئے ایسا دروغ مصلحت انگیز باعث شرم ہے ابھی تو آپ شیخ ہیں اگر غلہ ارزاں ہوا تو امسال سید ہوجایئے گا۔ سید رہنمائے قوم کو کہتے ہیں۔ کیا تب بھی آپ اسی طرح الٹے سیدھے تاریخی واقعات لکھکر لوگوں کو گمراہ کیجیے گا۔ استغفراللہ استغفراللہ۔

یہ سلسلہ تو یہاں ختم ہوا اب میں پھر آپ کو ان لغزشوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں جن سے کہ آپ کی تحریر مملو رہتی ہے پچاس فہمائشیں تو لکھ چکا ہوں۔ اب اس مضمون میں جسمیں کہ آپ نے تاریخ ماضیہ کی اصلاح فرمائی ہے، جو جو غلطیاں آپ کی ہیں انکی نسبت فہمائش ضروری ہے۔ اس بات سے میں بہت خوش ہوں کہ پچھلی فہمائشوں کا

اثر آپ پر اتنا ضرور ہوا کہ اس مضمون میں آپ نے بمقابلہ بشیر کے کم غلطیاں کی ہیں۔ لیکن تاہم آپ بھی بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے اسی خیال سے چند فہمائشیں سلسلۂ قدیم قائم رکھتی ہوئی، درج ذیل ہیں۔

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی

(حال وارد فردوس بریں)

اودھ پنچ مطبوعہ ۱۴۔ ستمبر ۱۹۰۵ء

جنّت کی ڈاک

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۸

(دیکھو دلگداز بابت ماہ جولائی ۱۹۰۵ء)

فہمائش نمبر (۵۱) آپ تحریر فرماتے ہیں کہ بجائے اسکے کہ تہذیب و شائستگی سے جواب دیا جاتا یا کوئی بھی قابل لحاظ جواب دیا جاسکتا تھا نہایت بے عنوانی اور بے تہذیبی سے بحث ہونے لگی۔ کیوں صاحب (یہ دیا جاسکتا) کا اس مقام پر کیا کام ہے آپ کی یہی انشا پردازی جو کہ آپ کے قدردانوں کو سکتے میں ڈالدیتی ہے۔ دیکھیے آخری جملہ اسطرح لکھنا چاہیئے تھا کہ یا کوئی بھی قابل لحاظ جواب دیا جاتا ؎

فہمائش نمبر (۵۲) آپ فرماتے ہیں جنھوں نے ہماری تحریر کو غور و انصاف کی نظر سے دیکھا دیہ) (کو) تو طاعون کے کیڑے کی طرح آپ کی سرزمین انشا پردازی سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا خیر ہم بھی ٹوکنے سے باز نہیں رہیں گے۔ اس جملہ کو یوں ترتیب دینا تھا کہ (جنھوں نے ہماری تحریر غور و انصاف کی نظر سے دیکھی)

فہمائش نمبر (۵۳) کسی اخبار کے اڈیٹر کی نسبت آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے خیال میں انکا فیصلہ کافی ہے اس لئے کہ شاعری کی دنیا میں کسی اخبار کو وہ وقعت و استناد

نہیں نصیب ہے جو انھیں حاصل ہے) کیوں مولانا آپ ہی ایمان سے فرمائیے کہ ایسا جملہ کسی کہنہ مشق انشا پرداز کے قلم سے نکلے گا یہ (انھیں) کی ضمیر کس کی طرف پھرتی ہے سیاق کلام سے تو یہ پایا جاتا ہے کہ (انھیں) سے آپ کی مراد اڈیٹر صاحب) ہیں مگر صرف ونحو کے قاعدے سے انھیں کی ضمیر (اخبار) کی طرف گردن اٹھائے ہوئے ہے آپکا مافی الضمیر کچھ ہے اور (انھیں کی ضمیر) کچھ کہتی ہے دو ملاؤں میں مرغی حرام اسی کا نام ہے یہ آپکا قصور نہیں ہے جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو خدا زبان میں لکنت پیدا کردیتا ہے پس وہ کہتا کچھ ہے اور زبان سے کچھ نکلتا ہے۔ چونکہ یہاں آپ زبان کے بدلے قلم کو گناہگار کررہے ہیں۔ اسلئے زبان قلم میں لکنت پیدا ہوگئی ہے آپ لکھتے کچھ ہیں اور قلم سے کچھ نکلتا ہے خیر یہ رونا کہاں تک رویا جائے آپ استادوں کی اصلاح پر غور کیجئے۔ یا تو اس جملہ کو اسطرح لکھئے کہ شاعری کی دنیا میں کسی اخبار کو وہ وقعت و استناد نہیں حاصل ہے (جو انکے اخبار کو حاصل ہے) یا اخبار کو ردی سمجھ کے الگ کیجئے اور یوں لکھیئے کہ شاعری کی دنیا میں اور کسی کو وہ وقعت استناد نہیں نصیب ہے جو کہ انھیں حاصل ہے)۔

فہمائش نمبر (۵۴) آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ایسے **تصرفات** اور ایسی لغزشیں اگر اسی زمانے میں جائز تھیں) تو ضرور تھا کہ ان کے **معاصرین** ..... کے کلام میں بھی پائی جاتیں) اول تو یہ **تصرفات** کے لئے (جائز نہیں) بھی کیا خوب ثانیاً (**معاصرون**) نے واقعی نے تمام فقرے میں جان ڈالدی ہے فصاحت اسی کا نام ہے اور جدت تو معاصرون) کے صاد چشم سے اشک ندامت کی طرح ٹپکی پڑتی ہے۔ آپ کو تو یہ دعوےٰ ہے کہ میں نئے الفاظ استعمال کرتا ہوں۔ پھر آپ معمولی لفظ (معاصرین) کاہے کو استعمال کرتے۔ مگر پابندی وضع کے معنے یہ ہیں کہ آج سے (**حاضرین**) کے بدلے (**حاضرون**) اور (**سامعین**) کے بدلے (سامعون) اور **شائقین** کے بدلے (**شائقون**) بھی استعمال کیا کیجئے۔

فہمائش نمبر (۵۵) آپ نہایت بغیظ میں فرماتے ہیں کہ پھر نسیم کو جو۔ ان غلطیوں میں منفرد ہیں معذور کیونکر رکھا جاسکتا ہے سبحان اللہ کیا اسلوب بیان ہے۔ یہ (کو جو ابھی توجہ نکمہ) سے کم نہیں۔ بندہ نواز یہ خیال اسطرح ادا کرنا چاہیئے تھا کہ (پھر نسیم) جو کہ ان غلطیوں میں منفرد ہیں کیونکر معذور رکھے جاسکتے ہیں) مگر آپ کو تو (کو) جان سے زیادہ عزیز ہے۔ عبارت کی شان بگڑ جائے مگر (کو) ضرور آئے۔ جب آپ کوئی مضمون لکھنے بیٹھا کیجئے تو قبل مضمون شروع کرنیکے کسی کاغذ پر کو کو کو کو کو کو کو کو کو الخ دس بیس مرتبہ لکھ لیا کیجئے تاکہ آپ کی تسکین ہوجائے مگر عبارت کمبخت کا تو خون نہونے پائے۔

فہمائش نمبر (۵۶) آپ فرماتے ہیں کہ معروض کیا) غلط ہے۔ عرض کیا چاہئے اسمیں محاورہ ہی نہیں غلط ہے بلکہ نحو و صرف کی جاہلانہ غلطی ہے۔ کیوں صاحب یہ اس ہیں کیا معنی رکھتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ (کو) کی طرح کچھ (ہیں) سے بھی آپ کی الفت بڑھ چلی ہے خدا خیر کرے آپکو یہ لکھنا تھا کہ اس مقام پر محاورہ ہی نہیں غلط ہے الخ

(یہاں پر خط جنتی میں کچھ لکھا تھا جو سمجھ میں نہ آیا)۔

فہمائش نمبر (۵۷) پھر آپ ٹھوکر کھاتے ہیں یعنی آپ لکھتے ہیں کہ کلام بولنا شاید آجکل صاحب لوگوں کے بنگلونکے آس پاس بیرا اور خانساماں لوگونکی زبان ہو) بندہ پرور ذرا زبان سنبھالکر بولیئے یہ شرفا کا انداز گفتگو نہیں خیر مجھ کو اس سے زیادہ مطلب نہیں میں آپ سے پہلے تو یہ پوچھتا ہوں کہ محض آس پاس کے کیا معنی ہیں جب تک آپ یہ نہ کہیں کہ بنگلوں کے آس پاس رہنے والے الخ) اُسوقت تک تمام جملہ بے معنی رہے گا۔ آپ ہی ایمان سے فرمایئے کہ یہ بے معنی جملے لکھنا کہاں کی شان فصاحت ہے ثانیاً میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ نسیم کی شان میں تو آپ ایسے تہذیب سے خالی کلمے استعمال کرتے ہیں اور اپنی زبان پر غور نہیں کرتے کیوں صاحب آپ (جو بیرا اور خانساماں لوگوں) تحریر فرماتے ہیں یہ تو (بیرا لوگ) (خانساماں لوگ) (عورت لوگ) (مرد لوگ) کس کی زبان ہے کیا یہی اہل لکھنؤ کی زبان ہے جسکے

آپ سرپرست بنتے ہیں لکھنؤ کا کنجڑا کبڑیا بھی بیرا لوگ) اور خانساماں لوگ اپنی زبان سے نہ کہے گا۔ یہ واقعی بیراؤں اور خانساماؤں کی زبان ہے۔

فہمائش نمبر (۵۸) (دکھیئے تو) کے محاورے کے استعمال پر آپ حرف دھرتے ہیں اور اس مطلب کو اسطرح ادا کرتے ہیں کہ آتش و ناسخ کے وقت سے یہ الفاظ متروک ہیں)

کیوں حضرت یہ (الفاظ) یہاں کن معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دکھے تو) دو لفظوں سے مرکب ہے (نہ کہے) کا استعمال آتش و ناسخ کے وقت سے متروک ہے۔ نہ (تو) کا کہنا آپ کو یہ چاہیئے تھا کہ آتش و ناسخ کے وقت سے یہ **محاورہ** متروک ہے مگر غلطی ذکاوت سے کہہ گئے کہ یہ الفاظ متروک ہیں **ع** ماشاء اللہ چشم بد دور۔

فہمائش نمبر (۵۹) آپ فرماتے ہیں کہ (ضد انس و جان) کی جگہ پر ضد انس و جانی) جاہل کے سوا کسی پڑھے لکھے کی زبان سے نہ نکلے گا۔ یہ جہالت کی گفتگو تو آپ کو مبارک رہی میں اسقدر عرض کرونگا کہ جگہ کے بعد پر) لانا محض پرکٹی اوڑانا ہے۔ محض اسقدر لکھنا کافی تھا کہ ممکن نہیں۔ کہ ضد انس و جان کی جگہ ضد انس و جانی کسی پڑھے لکھے کی زبان سے نکلے)

فہمائش نمبر (۶۰) افسوس آپ فرماتے ہیں کہ خواب کردن فارسی کا محاورہ ہے اُردو میں سونے کے محل پر خواب کرنا۔ کہنا غلط ہے۔ تحقیقات کا یہ حال اور نسیم پر اعتراض جڑنے میں آندھی۔ بندہ پرور میرا یہ شعر آپ نے شاید نہیں دیکھا ؎

انتظار ملک الموت میں بیدار ہوں میں بخت خفتہ کو میرے خواب گراں کرنے دو[a]

آپ نسیم پر کیا اعتراض کرتے ہیں کہ میری زبان پر اعتراض کرتے ہیں)

فہمائش نمبر (۶۱) آپ بدنما مسکراہٹ کے ساتھ فرماتے ہیں کہ **لیکن خیر** اگر خلاف محاورہ زبان اختیار کی تھی تو تذکیر و تانیث کا لحاظ رکھتے۔ کیوں صاحب۔ یہ لیکن خیر۔ کیا بلا ہے۔

---

[a] اوردھ پنچ۔ خواجہ صاحب۔ مدت ہوئی حضرت چکبست آپکا یہ شعر اس اعتراض کی تردید میں پیش کر چکے ہیں ہمنے سنا ہو کہ اسکے جواب میں حضرت شرر لکھنے والے ہیں کہ آتش کا کلام مستند نہیں ہے۔

اس مقام پر چہ ۔ لیکن) کے معنی ہیں وہی خیر اکے ہیں پھر یہ (لیکن لیکن اور خیر خیر) سے کیا مراد ہے یہ بھی تو چونکہ کا جواب ہے ۔ یا یوں کہیئے کہ خیر اگر خلاف محاورہ زبان اختیار کی تھی الخ ۔ یا یوں کہیئے کہ (لیکن اگر خلاف محاورہ زبان اختیار کی تھی الخ) لیکن خیر سے تو کوئی چیز نہیں ۔

فہمائش نمبر (۶۲) آپ فرماتے ہیں کہ بکاؤلی کو قرار تو دیا نقش اور پھر اسکے ساتھ فرماتے ہیں (پائی) زبان[1] کو یہ کسقدر ناگوار گذرتا ہے ۔ کیوں صاحب آپ کیا زبان سے سنتے ہیں ؟ تو پھر یقینی طور پر آپ کان سے گفتگو کرتے ہونگے[2] ۔ اہل لکھنؤ تو جب کسی ترکیب کی عدم فصاحت کا ذکر کرینگے تو یہ کہیں گے کہ کانوں کو کسقدر ناگوار گذرتا ہے مگر آپ کے انشا پردازی کا باوا آدم ہی نرالا ہے ۔

فہمائش نمبر (۶۳) آپ فرماتے ہیں کہ مطلب چاہے خبط ہو جائے کوئی مضائقہ نہیں ، بندہ نواز اہل لکھنؤ کہیں گے کہ مطلب چاہے خبط ہو جائے کچھ مضائقہ نہیں غالباً (کوئی) آپ نے اس لیئے استعمال کیا کہ اُسے (کو) سے صوری تعلق[3] ہے ۔ دیکھئے بندہ پرور آپکے ان تین صفحے کے مضمون میں بھی ۱۳ غلطیاں موجود ہیں خوب آپ نے خانۂ سخن کو تین تیرہ کیا ہیں فہمائش کرتے کرتے تھک گیا ۔ مگر آپکی نیت غلطیوں سے نہیں سیر ہوتی اس موقع پر مجھے اپنا شعر یاد آتا ہے ؎

اثر کرتی نہیں تعلیم تیرہ روزگار دل کو
اُدھر پڑھتے مجھے شاعرانے کی وہ لفظ ادھر سیدھی

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی ۔

(حال وارد فردوس بریں)

---

[1] اوڈ پنچ حضرت چکبست بھی اپنے دندان شکن مگر دلآویز لہجے میں سن تو کچھی گرفت پر اعتراض کر چکے ہیں ۱۲

[2] اوڈ پنچ دیکھئے اعضا کا انقلاب ۔ کہاں تک ترقی کرتا ہے ۱۲

[3] اوڈ پنچ بجا ہے یہ (کو) کی مادہ ہے ۱۲

اودھ پنچ مطبوعۂ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۵ء

تیسری ڈاک

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۹

میاں شرر۔ کل میری نظر سے اُردوئے معلےٰ کا وہ پرچہ گذرا جس میں کہ آپ نے حضرت چکبست کے مضمون کے جواب میں جواب الجواب شائع کیا ہے اس مضمون کی دو تین باتیں مجھے بہت پسند آئیں اولاً یہ کہ اس مرتبہ آپ نے بہت کم غلطیاں کی ہیں (مثلاً کہیں مسٹر چکبست صاحب نہیں لکھا ہے نہ) عام پبلک لکھا ہے بلکہ میری فہمائش کے مطابق آپ نے مسٹر چکبست لکھا ہے انگریزی الفاظ بھی بہت کم استعمال کیے ہیں۔ اور بہت کم کیا یعنی صرف ایک مقام پر (ایورج) کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ بقول سید محمود اس بدنما انگریزی لفظ کا مترادف لفظ اردو میں (اوسط) موجود ہے خیر عادت چھوٹتے چھوٹتے چھوٹتی ہے یہ کیا کم ہے کہ آپ نے اپنی غلطیوں کا اعتراف تو کیا۔ میں یہ دیکھ کر بھی بہت خوش ہوا کہ اس مضمون میں (کو) بھی بہت کم بے موقع استعمال ہوا ہے شاباش اسی طرح میری فہمائشوں پر عمل کیجیے گا تو اچھے اُردو لکھنے والوں میں آپ کا بھی شمار ہونے لگے گا حضرت داغ کہتے ہیں کہ اس مضمون میں غلطیاں کم ہونے کا ممکن ہے یہ سبب ہو کہ اُردوئے معلےٰ کو جو صاحب ترتیب دیتے ہیں اُنھوں نے جا بجا اصلاح فرمادی ہو کیونکہ اُردوئے معلےٰ اصلاح زبان میں خاص طور سے سرگرم ہے مگر میں یہ نہ کہوں گا۔ آخر آپ انسان ہیں حیوان نہیں اگر نصیحت آپ پر کارگر ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بزرگوں کی نصیحت پر عمل کرنا عیب میں

نہیں داخل ہے۔ ہاں سب سے زیادہ مستحسن آپ کا یہ فعل ہے کہ آپ نے اس مضمون میں صاف طور سے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ گلزار نسیم پنڈت دیا شنکر ہی کی تصنیف ہے کیونکہ آپنے یہ لکھدیا ہے کہ اگر یہ رائے دیکھنے یہ رائے کہ یہ مثنوی یا تو آتش کی کہی ہوئی ہے یا یہ کہ آتش کی اصلاح کی بدولت یہ ایک قابل قدر مثنوی ہو گئی (ابھی مسٹر چکبست کے خلاف ہے تو میں اس کے واپس لینے کو تیار ہوں) یہ ضرور ہے کہ دنیا والے آپ کو اس غلطی کے تسلیم کرنے پر بہت چھیڑینگے کیونکہ آپ نے اپنے مارچ والے دلگداز میں اس دعوے کی تائید میں بہت کچھ خامہ فرسائی کی تھی کہ یہ مثنوی نسیم کی نہیں ہے۔ اور اپنے بزرگوں کا قدم بھی درمیان میں ڈالا تھا بیچارے منشی شرف علی کی روح کو بھی بیقرار کیا تھا مگر دنیا والوں سے آپ یہ کہ سکتے ہیں کہ میں نے چکبست کی خاطر سے ایسا لکھدیا ورنہ میرا دلی عقیدہ ابھی نہیں بدلا ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ آپ یہ کہ سکتے ہیں کہ میں نے کرسی کی وضع نباہی وہاں کے باشندے اکثر ایسی باتیں کرتے ہیں کہ باز آید پیشانی (مجھکو اس موقع پر ایک روایت یاد آئی جو کہ خالی از دلچسپی نہیں ہے۔

نواب سعادت علیخاں کے دربار میں کسی ظریف الطبع شخص نے کہا کہ کرسی کے لوگ سب احمق ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ایک کرسی کے بزرگ بھی موجود تھے وہ بہت گرم ہوئے اور یہ کہنے لگے کہ آپ جھوٹ کہتے ہیں ہم اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ کرسی کے لوگ بڑے عقلمند ہوتے ہیں اور ایک صاحب جو کہ عقلمندوں کے آخری دور کے یادگاروں میں تھے وہ بھی کہتے تھے کہ کرسی کے لوگ بڑے عاقل ہوتے ہیں جن صاحب نے یہ بحث چھیڑی تھی انھوں نے اس دعوی کی تردید کی۔ آخرکار سعادت علی خاں نے کہا کہ اچھا ہم اس بات کا امتحان کریں گے کہ کرسی کے لوگ آیا عقلمند ہوتے ہیں کہ بیوقوف۔ چنانچہ ہفتہ عشرہ بعد نواب موصوف نے کرسی کا دورہ کیا کرسی کے امرا نے نواب کو بڑی دھوم دھام سے دعوت دی اور انواع اقسام کی چیزیں تیار کیں مگر ایک استاد باورچی لکھنؤ سے بلائے گئے تھے اسی کی زیر نگرانی کرسی کے باورچیوں نے کھانا تیار کیا تھا جب نواب دعوت سے محظوظ ہوکر رخصت ہوئے تو انھوں نے دل میں کہا

کہ یہ لوگ تو بڑے سلیقے سے پیش آئے انکو احمق کہنا صحیح نہیں ہے۔ مگر نواب نے ایک ہی منزل طے کی ہوگی کہ باورچی خانہ کے مہتمم صاحب جو کہ کرسی کے خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے ایک مرتبہ ایک طاق کی طرف گئے اور اسمیں سے ایک پڑیا اٹھاکر سر پیٹنے لگے۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیا ہے کیا کہنے لگے کہ یہ مصالحہ پلاؤ میں ڈالنے کے لئے رکھا گیا تھا مگر کمبخت باورچی یہ خاص مصالحہ ڈالنا بھول گئے۔ نواب کو پلاؤ ہرگز نہ پسند آیا ہوگا۔ افسوس ہماری محنت پر پانی پھر گیا۔ یہ سننا تھا کہ کرسی کے تمام بزرگ تاسف کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم لوگوں کی قسمت ہی میں بیوقوف بننا لکھا ہے۔ مگر یہ بزم تاسف برپا تھی کہ مہتمم صاحب ایکبارگی بول اٹھے کہ مار لیا ہے مار لیا ہے! واللہ کیا سوجھی ہے۔ دیکھو تو اس حماقت کی تلافی کیسی خوبصورتی سے کرتا ہوں۔ یہ کہکر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور نواب سعادت علی خاں جس طرف گئے تھے اسی طرف روانہ ہوئے جب نواب کے خیمہ تک پہونچے تو حضور میں رسائی کی درخواست کی درخواست منظور ہوگئی اور مہتمم صاحب نواب کے روبرو حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ خداوند نعمت اگر یہ مصالحہ کی پڑیا پھانک لیجئے تو ہمارے حال پر بڑی عنایت ہوگی کمبخت باورچی اسے پلاؤ میں ڈالنا بھول گیا۔ اب بھی پھانک لیجئے تو مزا آجائے گا کیونکہ کھانا ابھی ہضم نہ ہوا ہوگا نواب یہ درخواست سنکر مسکرائے اور کہنے لگے کہ واقعی تم نے ثابت کر دیا کہ کرسی کے لوگ کس قسم ہوتے ہیں۔ اس روایت کے بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اپنا دعوے واپس لیا ہے تو چکبست صاحب اسے اعتراضات کے مصالحہ کی باقی ماندہ پڑیا سمجھیں اور اسکے قبول کرنے میں تکلف نہ کریں۔

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی
(وارد حال فردوس بریں)

اودھ پنچ مطبوعہ ۲، نومبر ۱۹۰۵ء

جنت کی ڈاک

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۱

میاں شرر کسی نے سچ کہا ہے۔ ع۔ ما درچہ خیالیم فلک درچہ خیال۔ انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے اور انسان پر کیا موقوف ہے ہر مخلوق کا یہی حال ہے شیطان علیہ اللعن کو دیکھو۔ جب اسنے حضرت آدم کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا تو اسکا خیال تھا کہ میرا کیا کوئی بنا سکتا ہے۔ اور اسکا خیال ایک معنی میں بیجا بھی نہ تھا کیونکہ تھوڑی وقعت اسے اسوقت ضرور حاصل تھی۔ اسی عارضی وقعت کی بنا پر اس نے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ گلزار بہشت کو پامال کر ڈالونگا۔ مگر مزاج معشوق کی طرح زمانہ کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ وہی شیطان اک دم زدن میں مردود خلائق ہوگیا۔ نہ وہ وقعت رہی نہ وہ مرتبہ۔ بلکہ جتنے عیوب تھے وہ طشت ازبام ہوگئے۔ بالکل رنگ ہی بدل گیا۔ اور شیطان پر کیا موقوف ہے۔ جو کوئی اپنی حد سے بڑھ کر بات کرتا ہے اُسے خدا ذلیل کرتا ہے جب کوئی لونڈی کسی گھاگر پر چڑھ کر لات مارتا ہی تو منہ کی کھاتا ہے سوائے بھاگنے کے کچھ نہیں بن پڑتا۔ اور جہاں بھگا مشہور ہوا وہاں پھر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

یہی کیفیت شیطان کی ہوئی اب کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا اس ذلت کے بعد اگر اُس نے تہیہ کرلیا ہے کہ میں خصائل حسنہ کی ہمیشہ بیخ کنی کیا کرونگا اور نیک نیت اور انصاف پسند لوگوں کے خلاف ہمیشہ شورش برپا کرتا رہونگا تو کیا برا کیا آخر غصہ بھی تو

کوئی چیز ہے۔ اور خصوصاً ذلت کے بعد جو غصہ آتا ہے وہ بڈھب ہوتا ہے۔ وہ جامہ سے باہر کر دیتا ہے مجھ کو اپنا شعر یاد آگیا ؎

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

غرضکہ اس عالم نیرنگ ساز کا یہی وتیرہ ہے کہ دل کے ارادے نہیں پورے ہونے دیتا۔ مجھ کو وہ زمانہ یاد آتا ہے جبکہ تم نے بڑے زور کے ساتھ مارچ اور اپریل کے دلگداز میں گلزار نسیم پر اعتراضات شائع کئے تھے اور یہ لکھا تھا کہ گلزار نسیم میں صدہا غلطیاں ہیں اور ۳۷ اعتراضات پیش بھی کئے تھے اور چونکہ اس زمانہ تک لوگ تمھیں کسی قدر وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لہذا تمھارے اعتراضات غور کی نگاہوں سے دیکھے بھی گئے اور تمھارا بھی یہ خیال تھا کہ (ہمچو من دیگرے نیست) بھلا ان اعتراضات کی تردید میں کون قلم اٹھا سکتا ہے۔ اور بہتوں کا یہی خیال ہوگا۔ مگر تم پر بھی وہی مثل صادق آئی ع ما درچہ خیالیم فلک درچہ خیال

اودھ پنچ نے تمھیں ٹوکا۔ اور اودھ پنچ کیا معنی کل ساتذۂ لکھنؤ کو تمھاری یہ حرکت ناگوار گذری اور تم کو صلاح دی گئی کہ تم اپنا دعویٰ واپس لے لو۔ اور نہایت تہذیب کے ساتھ تمھیں یہ صلاح دی گئی۔ مگر تمنے یہ صلاح نہ مانی اور اودھ پنچ کے اڈیٹر کو شہدا کہا حالانکہ جب تک اسقدر غصہ کی وجہ نہ تھی ہندوستانی کے نامور اڈیٹر بابو گنگا پرشاد صاحب ورما نے اس نازیبا حرکت پر تمھیں سرزنش کی تو ان کو بھی تم گالیاں دینے لگے مگر اسی یکم اگست اتحاد میں (جسمیں تمنے اڈیٹر اودھ پنچ کو شہدا کہا تھا) تم نے یہ اعلان بھی شائع کیا تھا کہ (نسیم کے کلام پر ریویو کرنے کا سلسلہ جو دلگداز میں شروع کیا گیا ہے وہ برابر جاری رہیگا ابھی تو مثنوی پر ہمیں بہت سے اعتراض کرنے ہیں مگر اس سے فرصت حاصل کر کے ہم انکے دیوان پر ریویو شروع کرینگے (اتحاد یکم اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲) اور ایک حد تک اس اعلان کی پابندی بھی کی گئی۔

کہ دلگداز میں ۱۹ یا ۲۰ اعتراضات شائع بھی کئے گئے۔ چنانچہ کل پچاس ساٹھ

اعتراضات شائع کئے گئے مگر ایسی صدہا غلطیوں کی تصدیق تو ناممکن ہے کیونکہ اس شرط کے پورا کرنے کے لئے کم سے کم (دو تین سو) اعتراضات کی ضرورت ہے مگر باوجود اس زبردست اعلان کے تم ستمبر کے دلگداز میں (جو کہ آخر اکتوبر میں شائع ہوا ہے) لکھتے ہو کہ (دلگداز اپنے صفحات کو اس لغو بحث سے علیحدہ کئے لیتا ہے آیندہ وہ جدید اعتراضات نہ شائع کریگا) آخر اس وعدہ خلافی کے کیا معنے مرد تو اپنی بات کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ تم سے اعتراضات بھی گڑھے نہیں جاتے سنا ہے ایک کمہار تمھارا دوست ہے اسی سے کچھ اعتراضات (بنوالو) اعتراضات بند کرنے کے لئے تم یہ عذر پیش کرتے ہو کہ اب بحث کا رنگ لغو) ہو گیا ہے اسلئے تم اپنا دامن آلودگی سے پاک رکھنا چاہتے ہو۔ مگر دیکھو تو یکم اگست کے اتحاد میں تم اس بحث کو (لغو) قرار دے چکے ہو کیونکہ اتحاد کے اسی نمبر میں تم نے اڈیٹر اودھ پنچ کو گالیاں دی ہیں) اور اسی نمبر میں یہ اعلان بھی شائع کیا ہے کہ اعتراضات کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ باوجود اس بحث کو لغو سمجھنے کے تم نے اعتراضات کا سلسلہ جاری رکھنا مناسب سمجھا۔ پھر اب یہ عذر لنگ پیش کرنا چہ معنی دارد۔ مرزا ستم ظریف مجھ سے کہتے ہیں کہ تم نے شیطان کی صلاح کے مطابق جدید اعتراضات کا سلسلہ بند کیا ہے اور غالباً صحیح وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر پچھتاؤ گے شیطان نے تمھارے جدامجد کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہی سلوک تمھارے ساتھ بھی کیا یعنی پیشتر شیطان ہی نے حضرت آدم کو گیہوں کا دانہ کھانے کی صلاح دی تھی۔ اور پھر شیطان ہی نے بہشت سے نکلوایا بھی اسیطرح شیطان ہی نے تمھیں انگلی دکھائی تھی کہ تم نے گلزار نسیم پر اعتراضات کیئے اور اب اس مردود خلائق نے تمھیں یہ صلاح دی کہ اعتراضات بند کردو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم علمی جنت کے بہشت سے نکالے گئے اور سب کی نظروں میں ذلیل ہوگئے۔ اور جسطرح حضرت آدمؑ کے زوال کی داستان ابھی تک نہیں فراموش ہوئی ہے اسی طرح تمھاری ذلت بھی دائمی ہو

تم نے ستمبر کے دلگداز میں یہ بھی لکھا ہے کہ جوابات میں حامیان مثنوی سے سوائے لاطائل تاویلوں جاہلانہ سخن پروریوں اور شہدوں کے ایسے گالی گلوج کے کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑا۔ نزدِ خدا ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے۔ آخر اس جھوٹ کی کوئی انتہا بھی ہے۔ چک بست کا جواب جو جولائی کے اردوئے معلےٰ میں شائع ہوا تھا اس پر لاطائل تاویلوں جاہلانہ سخن پروریوں اور شہدوں کی ایسی گالی گلوج کا الزام لگانا تمھارا ہی کام ہے۔

چک بست کے مضمون کے علاوہ منشی احمد علی شوق کا مراسلہ اودھ پنچ میں شائع ہوا تھا اس میں نہایت تہذیب و متانت کے ساتھ تمھارے مہمل دعووں کی تردید کی گئی تھی۔ اردوئے معلےٰ کے اڈیٹر نے بھی تمھاری بے تکی ہانک کی اصلاح فرمائی ہے۔ آخر ان حضرات میں سے کس نے شہدپن کیا ہے جس کا شکوہ تم دلگداز میں کرتے ہو ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا، تمھارے ہی لئے کہا گیا ہے بیشک بحث کی ابتدا سے تمھاری تائید میں جو مضامین نکلے ہیں اُن میں جاہلانہ سخن پروری اور لاطائل تاویلوں کو عموماً دخل ہے اور مضامین جو تم نے ایک صاحبزادے کے نام سے خود اپنی تعریف میں شائع کئے تھے اُن میں پورا (شہدپن) اور (شہدپن) بھی دیہات کا لکھنؤ کا نہیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ اس بحث میں ایک مستند شخص بھی تمھارا حامی نہیں ہے۔ تم اپنی تعریف اپنے منہ سے کیا کرو یہ اور بات ہے۔ شہدپن کا شکوہ تو محض ادا سے معشوقانہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم سمجھتے تھے کہ تمھارے اعتراضات کا کوئی جواب نہ دیگا تم تمام مسلمانوں کو اپنا ایسا متعصب سمجھتے تھے کہ وہ اس علمی مباحثے کو بھی مذہبی جھگڑے کی نظر سے دیکھیں گے۔ اور ہندوؤں کی ہستی تو محض تم اسلئے ضروری سمجھتے ہو کہ اُن سے اتحاد کے چندہ کے پیرایہ میں روپیہ وصول کرو تم نے اپنی شرافت کے ثبوت میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب کوئی بحث بازاری لوگوں اور عوام کالانعام میں پہونچ جاتا ہے تو پھر گفت سے باہر ہو جاتا ہے اور سوا اسکے کہ شرفا ان بازاری شہدوں کے

ہاتھ سے اپنا دامن چھڑا کے الگ ہو جائیں۔ کوئی چارہ نہیں بن پڑتا، دکھ درد نے کی سند نہیں بھولے پن کی باتیں کرتے ہو۔ تم ان بازاری شہدوں کے ہاتھ سے اپنا دامن چھڑا لو مگر اس دامن پر جو رسوائی کا داغ لگ گیا ہے اُسے کیونکر چھڑاؤ گے یہ دیہات کی کیچڑ کا دھبا نہیں کہ دو چار روز میں چھوٹ جائے بلا کسی شخص خاص کا نام ظاہر کئے ہوئے تم نہایت بیکسی کے لہجہ میں لکھتے ہو کہ دشمنی دیجاتی ہے کہ وہ شخص لکھنؤ کا پاک شہدا ہے لہذا فحش گوئی ہیں اسکی کوئی تقلید نہیں کر سکتا آخر وہ شخص کس سے مراد ہے۔ تم نے کسی کا نام تو لکھا نہیں لکھنؤ میں تو اکثر عصمت مآب بیویاں اپنے جنت نصیب شوہر کا ذکر (وہ شخص) کہہ کر کرتی ہیں۔ مگر ظاہرا تم پر تو یہ گمان ہو نہیں سکتا۔ پھر یہ وہ شخص کون ہے۔ تمہاری تائید میں جو مہذب مضامین نکل رہے ہیں اور جن میں شہدپن انہیں ہوتا ان میں سے ایک کا ذکر خیر تم اس طرح کرتے ہو کہ فتنہ نے ..... ایک مختصر نوٹ لکھا ہے جنھیں کہتے ہیں کہ لکھنے والے صاحب کی ذہانت پر تعجب ہے کہ وہ (ب) سے بے عقل وغیرہ سمجھے مگر حرف با سے وہ باپ کو نہ پہچان سکے) اس جملے کے بعد نہایت جوش سے تم لکھتے ہو کہ کیوں منشی ریاض احمد صاحب کو لوگ پہچانتے ہیں یہ لکھ تو گئے مگر تم نے اس پہلو پر نہ غور کیا کہ اگر کوئی کہے کہ فتنہ کے مضمون نگار کی شکایت بیجا ہے آپ نے تو خوب پہچان لیا) افسوس تمہیں زبان سے کہنا نہیں ہے۔

راقم خواجہ حیدر علی آتش

(از فردوس بریں)

اودھ پنچ مطبوعہ ۹۔ نومبر ۱۹۰۵ء

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۱۱

دیکھو دلگداز ستمبر ۱۹۰۵ء

تم نے لکھا ہے کہ جوابات میں حامیان مثنوی سے سوالا طائل تاویلوں جاہلانہ سخن پروریوں اور شہدوں کے ایسے گالی گلوج کے کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتا۔ لہذا آپ دلگداز اپنے صفحات کو اس **لغو بحث** سے علیحدہ کیے لیتا ہے۔ آیندہ وہ جدید اعتراضات نہ کرے گا۔

یہ تو خیر جھوٹ اور (بہانہ بسیار) میں سے ایک بہانہ ہے مگر اس دامن سمیٹنے کے بعد تم نے یہ کیا لکھا کہ اس کام کو (اعتراضات جڑنے کے کام کو) ان لائق و سخن فہم کاملان فن کے لیے چھوڑے دیتا ہے جنھوں نے اسے اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ خوشامدانہ فقرہ لکھ تو گئے مگر اس پہلو پر نہ غور کیا کہ تم تو اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لئے اس (**لغو بحث**) سے **الگ** ہوئے جاتے ہو معنے صاف طور پر یہ ہوئے کہ اب یہ بحث اس قابل نہیں رہی کہ کوئی مرد شریف اسمیں حصہ لے۔ مگر اپنے احباب یعنی **لائق و سخن فہم کاملان فن** کو یہ صلاح دیتے ہو کہ اس (لغو بحث) میں برابر حصہ لیتے رہیں۔ جیسا کہ اسی مضمون میں درپردہ خوشامد کے بعد تم گڑگڑا کر صاف الفاظ میں کہتے ہو کہ ہم دکن ریویو کے فاضل نامہ نگار پروفیسر نقاد۔ بی۔ اے کی خدمت میں التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی تنقید کا سلسلہ برابر جاری رکھیں "

جسکے معنے یہ ہوئے کہ اک تم تو شریف ہو اور باقی تمھارے **لائق سخن فہم اور کاملان فن**

اسی قابل ہیں کہ وہ اس (لغو بحث) کا سلسلہ جاری رکھیں - آخر اسکا جواب تمہارے پاس کیا ہے جو وجہ تمہارے لئے کنارہ کشی کی ہو سکتی ہے - وہ انکے لئے بھی ہو سکتی - اگر تمھیں شرافت مانع ہے (تو اگر تم انکو شریف سمجھتے ہو) تو انکو بھی شرافت مانع ہو سکتی ہے - افسوس ہے تمھاری عمر عزیز کے چالیس سال گذر گئے مگر بات کرنے کا سلیقہ نہ آیا۔

خیر اس بحث سے کنارہ کشی کی وجہ تو اور ہی کچھ ہے اسکو تو یا خدا جانتا ہے یا تمہارا دل جانتا ہے - اب رہی یہ شہدوں کی ایسی (گالی گلوج) یہ ہمیشہ تمھارے اظہار شرافت کے لئے مانع ہوتی ہے (اور یہ پردۂ عصمت) بھی تمھیں اسلئے بند کرنا پڑا کہ تمھاری پردہ دری کی کوشش سے جو اظہار شرافت ہوتا تھا اسکے خلاف) شہدوں کی ایسی گالی گلوج) شروع ہو گئی - یا حضرت سکینہ کی شان میں جو تمنے گستاخانہ اور بیہودہ مضامین لکھے تھے اور جنکو پڑھ کر سچے مسلمان کا خون اُبلنے لگتا ہوگا - ان مضامین کی تردید میں بھی تمھارے خیال کے مطابق شہدوں کی ایسی گالی گلوج ہوتی اور اسکا اثر حیدرآباد میں عربوں کے رسالے تک پہونچا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تم سمجھے کہ یہ (گالی گلوج) کوئی عملی صورت نہ اختیار کرے لہذا تم اپنی شرافت کے ٹٹو پر سوار ہو کر لکھنؤ چلے آئے - غرضکہ جو بات تم کہتے ہو اُسپر شہدوں کی ایسی گالی گلوج ہونے لگتی ہے اور تم ٹھہرے مہذب اسلئے اس سے کنارہ کشی کر لیتے ہو اور بڑی بات تو یہ ہے کہ تمھارا اصول ہمیشہ (اتحاد بلکہ ... ... رہا ہے اسلئے جہاں نفاق کی شکل پیدا ہوئی اور تمنے شرافت کا بوریا بدھنا سنبھالا اور رفو چکر ہوئے - مگر تمھیں لوگوں کی خوشامد کرتے ہوئے شرم نہیں آتی - اس مضمون میں تم نے منشی ریاض احمد صاحب اور پروفیسر نقاد کی کتنی خوشامد کی کہ لٹد میری آبرو بچائیے) (یا پہلے اتحاد میں حافظ جلیل حسن صاحب کی خوشامد کر چکے ہو اور در پردہ جو خطوط تمنے بھیجے ہیں اور اساتذہ لکھنؤ کے قدموں پر ٹوپی رکھی ہے اسکا حال تو اعمال بد کے فرشتوں سے معلوم ہوتا رہتا ہے - جب تم نے اعتراض کئے تھے تو کیا انھیں لوگوں کے برتے پر کئے تھے جن کی آج اس بھونڈے طریقے سے خوشامد کر رہے ہو - ایسا کرنا اہل آبرو کی وضع کے

خلاف بھلا تمنے اودھ پنچ کو بھی کسی کی خوشامد کرتے سنا یا دیکھا ہمارے وقت میں اکثر جیالے فقیر یہ صدا لگایا کرتے تھے کہ مسافر ہیں بیکس ہیں لاوارث ہیں یتیم ہیں ہماری مدد کرنا ثواب میں داخل ہے یہی کیفیت ایک حد تک تمھاری ہو کہ اس علمی مباحثہ کو مذہبی جھگڑا بنا کر اپنی بیکسی جتا کر دربدر مدد کے خواہاں ہوتے ہو۔

دیکھو انسان کچھ کھو کے سیکھتا ہے۔ مگر تم کو کبھی عبرت نہ حاصل ہوئی۔ خیر اب بھی ہوش میں آؤ۔ (سکینہ بنت حسین) (اور پردہ عصمت) والے مضامین لکھنے کی بدولت جو کچھ تمھاری ذلت ہوئی وہ بھی حیا دار کیلئے اس امر کی محرک ہوسکتی تھی کہ گھر بار چھوڑ کر حج کو چلا جائے۔

لیکن اس ذلت کا نتیجہ صرف اسقدر ہوا کہ تمھیں لوگ بے شرم اور متعصب سمجھنے لگے اس مرتبہ برے پھنسے ہو یعنی تمھاری نثاری اور زباندانی کا پردہ فاش ہوگیا۔ اور یہ پردہ کیا فاش ہوا کہ روزی کے ٹھیکرے میں ٹھیس لگی۔ تم کب تک گھر پھونک تماشہ دیکھو گے افسوس ہے کہ تم نے اپنی ہستی پر نہ غور کیا اور اپنی بساط سے بڑھ کر حملے شروع کر دیئے۔ اگر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کیا کرتے تو کوئی تمسے مخاطب بھی نہ ہوتا مزے سے بیابانی کے تکیئے پر ڈنڑ پیلا کرتے۔ کنج غزلت سے نکلنا تمھارے لئے قیامت ہوگیا۔ ہائے مجھے اپنی جوانی کا شعر یاد آگیا ؎

نکلکر کنج غزلت سے نہ کر ہنگامہ افروزی
شرر یاقوت کا ہمسنگ ہو جبتک ہے پتھر میں

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی
(حال وارد فردوس بریں)

از اودھ پنچ مطبوعہ ۱۶۔ نومبر ۱۹۰۵ء

آتش کا خط شرر کے نام نمبر ۱۲

دیکھو دلگداز ماہ ستمبر ۱۹۰۵ء

اب تمھارے اس آخری مضمون کے متعلق چند فہمائشیں درج ہیں۔ پیشتر کے دو تین مضامین میں جنکا حجم ۱۵ صفحوں سے زیادہ نہ تھا ۶۳ لغزشیں شمار کرا چکا ہوں۔ اس مرتبہ جو ایک صفحہ دلگداز کا تم نے گلزار نسیم کے متعلق سیاہ کیا ہے اس کی لغزشیں بھی قدیم فہمائشوں کے سلسلے میں ظاہر کئے دیتا ہوں۔

فہمائش نمبر ۶۴ (اس مثنوی پر اعتراض کرنے اور اسکی تنقید کرنے کا سلسلہ دلگداز نے چھیڑا تھا) اس جملہ میں اسکی کا کیا تک ہے۔ اسکے معنی تو یہ ہوے کہ اعتراض کی تنقید بھی تم ہی کرتے تھے جو بقول ازلی (ب) تمھارا شریک ہے اس سے اس امر کے متعلق مشورہ کر لیتا۔

فہمائش نمبر ۶۵ (جس کے ساتھ ہی اُردو کی لٹریری دنیا میں تحریک ہو گئی) تحریک تو ضرور ہو گئی مگر نزلہ تم ہی پر گرا۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ محض تحریک ہو گئی) اس موقعے پر بے معنے ہے کہنا یہ چاہئے تھا کہ (تحریک پیدا ہو گئی)

فہمائش نمبر ۶۶۔ لہذا اب دلگداز اپنے صفحات کو اس لغو بحث سے علحدہ کئے لیتا ہے)

واہ رے (کو) اسی کی بدولت لوگ تمھیں (شرر اینڈ کو) کہنے لگے ہیں۔

میں تو صرف (کو) سے واقف ہوں۔ مسٹر محمود (شرر اینڈ کو) کے فقرہ پر خوب قہقہے لگاتے ہیں اگر یہ لکھتے کہ اپنے صفحات اس لغو بحث سے الخ) تو مفت میں روشنائی بچتی اور بیکار قلم نہ گھستا مگر تمھارا تو یہ اصول ہے کہ جان جائے مگر (کو) نہ جائے)

فہمائش نمبر ۶۷) بلکہ اس کام (کو) اُن لائق سخن فہم کاملان فن کے لئے چھوڑے دیتا ہوں)

اس مرتبہ حضرت (کو) کی شان نزول اور ہے مگر ہے (کو) اس (کو) کے کاف کی کشش تمہیں اپنی طرف اسی طرح کھینچتی ہے جیسے تنکے کو کہربا۔ دیکھو یہ فقرہ یوں لکھنا تھا کہ (یہ کام اُن لائق و سخن فہم وغیرہ وغیرہ اب (کو) تمھارے اس فقرے سے اسطرح اڑگیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

فہمائش نمبر ۶۸ مگر سچ یہ ہے کہ جب کوئی مبحث بازاری لوگوں میں ۔۔۔ پہونچ جاتا ہے تو پھر گرفت سے باہر ہو جاتا ہے)

یہ فقرہ قابل گرفت ہے مبحث کا گرفت سے باہر ہونا چہ معنی دارد۔ بیشک ایک معنی اس جملے کے ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ (وہ مبحث قابل گرفت نہیں رہتا) مگر تمھارا مطلب کچھ اور ہے وہ مطلب اُن الفاظ سے ادا نہیں ہوتا مبحث کچھ کرسی کا ڈنڈا تو ہے نہیں کہ تمھاری گرفت میں رہے۔ خدا جانے تم کس دُھن میں گرفتار ہو۔ اور لکھتے کیا ہو ذرا قلم پکڑنا سیکھو یہ مقام پر تمھاری گرفت سے باہر ہوا جاتا ہے۔

فہمائش نمبر ۶۹ بلکہ یہی دھمکی نہیں دیجاتی ہے کہ وہ شخص لکھنؤ کا پاک شہدا ہے۔ لہذا فحش گوئی گالیاں بکنے اور نقالی میں اسکا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلگداز اور دکن ریویو ۔۔۔ نے اپنی وضع کو نہیں چھوڑا) یہ (بلکہ یہی نہیں) کی خبر دوسرے جملہ میں نکلنی چاہئے۔ یہی۔ یعنی یہ دھمکی ہی نہیں دیجاتی بلکہ کچھ اور بھی کیا جاتا ہے۔ مگر خبرا ندارد ہے۔ اور دوسرا جملہ نتیجہ یہ ہوا سے شروع ہوتا ہے غرضکہ کل جملہ دیہات کی سڑک کیطرح

ناہموار ہے۔ اسی سڑک پر تمہارا قلم بھٹیارے کے ٹٹو کی طرح چلا ہے۔ یہ حرف اسی کے نقش پا ہیں جن کو تمہارے مُرید آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ ہاں یہ (وہ شخص (کس سے مراد ہے) اتنا اطمینان تو ضرور ہے کہ شخص مذکور مولوی نہیں ہیں ورنہ پاک شہد سے کے بدلے تم اسے شرعی شہدا لکھتے)

فہمائش نمبر ۷۔ دکن ریویو نے تو اپنی وضع (کو) نہ چھوڑا) یہ بات وہ بات (کو) جناب پھر موجود ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ (کو) تمھیں اسقدر عزیز ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم نے اپنی نثر میں (کو) جا بجا اس شدت کے ساتھ گھسیایا ہے کہ ہر اک جملہ (کو) کا بیلی کا بار معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنے میں کیا ہرج تھا کہ دکن ریویو نے اپنی وضع نہیں چھوڑی۔

فہمائش نمبر ۸ (جنھوں نے ... ... خیر آباد والے کارٹون کو دیکھا ہوگا آخری (کو) ہے۔ مگر ہے (کو) اچھا اب اسے یوں بدلو (جنھوں نے .. خیر آباد ... والا کارٹون دیکھا ہوگا۔ تمھیں ایمان سے کہو کہ اب یہ فقرہ کتنا چست ہو گیا۔ خیر یہ تو پُرانا رونا ہے۔ اب یہ دریافت کرنا ہے کہ آخر (کو) سے تمھیں اُنس کیوں ہے بعض حضرات کہتے ہیں کہ دیہات میں (کو) کا استعمال بہت ہوتا ہے۔ مثلاً **کو آوت ہے کو جاوت ہے** اسوجہ سے تمہاری زبان پر یہ اسقدر جاری ہے۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ اپنے نام کے آگے مولوی لکھتے ہو تو شاید کسی اور پہلو سے تمہاری مولویانہ نگاہ میں (کو) کا حسن سما گیا ہو۔ مولویانہ نگاہ دیکھئے تو (کو) نہ صوری حیثیت سے قابل عشق ہے نہ معنوی حیثیت سے۔ یعنی صرف و نحو کے لحاظ سے اور کو علامت مفعول ہے)

کیا اسکے کثرت استعمال سے تمہاری یہ مُراد ہے کہ یہ **علامت مفعول کے بدلے علامت شتر** کہلائے صوری حیثیت سے (کو) عظیم اللہ خانی حقے کے نیچے سے مشابہ ہے۔ نیچے سے عشق ہوگا۔ تو نیچہ بندوں کو تم کو اس سے کیا غرض عظیم اللہ خاں کی نسبت مشہور ہے کہ ذات کے نائی تھے۔ ممکن ہے تمہارے (معتبر نائی) (نے) اکو کی تم سے

اس پہلو سے سفارش کی ہو۔ مگر کوئی وجہ معقول اب تک نہ سمجھ میں آئی۔ مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس تنقیدِ جہرے کے مضمون میں بھی ساٹھ لغزشیں موجود ہیں گویا اس وقت تک چوبیس صفحے گلزارِ نسیم کے متعلق تم نے دلگداز میں لکھے ہیں ان میں ۱۷۔ لغزشیں ہیں افسوس صد افسوس۔

راقم خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی

(حال وارد فردوس بریں)

(از اودھ پنچ مطبوعہ یکم فروری ۱۹۰۶ء)

سالِ نو کا انوکھا خطاب

(از منشی سجاد حسین)

ہر سال مختلف حضرات کو مختلف خدمات کے صلہ میں مختلف خطاب ملتے رہتے ہیں۔ کوئی اپنی علمی خدمات کی بدولت شمس العلما ہو جاتا ہے۔ کوئی پولٹیکل خدمات کے صلہ میں خان بہادر۔ سی۔ آئی۔ اے وغیرہ ہو جاتا ہے۔ مگر کیا افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے شرر صاحب جو کہ اپنے تئیں ہر فن میں کامل اور ہر کمال میں مرد یکفن لکھواتے ہیں اب تک خطابات سے محروم رہے۔ اور کسی قسم کے اعزاز کا (طوق زریں) آپ کی کوتہ گردن میں نہ ڈالا گیا۔ اس کمی کے پورا کرنے کے لیے اودھ پنچ کی سرکار سے شرر صاحب کو سالِ نو کی تہنیت میں ذیل کا اعزاز بخشا جاتا ہے۔ چونکہ آپ کے خدمات اور کمالات گوناگون ہیں

لہذا ایک خطاب سے آپ کی تسکین نہیں ہوسکتی تھی اسی خیال سے متعدد پیرایوں میں آپکے سر پر اعزاز کا چوتالا بجایا جاتا ہے (الف) کہ پہلی جنوری ۱۹۱۶ء سے آپ کو ذیل کے خطابات عطا ہوئے۔ نضلۃ العلما۔ فصیح الکرسی۔ عینی الینچر۔ خفاش الملک طبلہ نواز جنگ۔ نائٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف۔ پردۂ عصمت (ب) اتنا بیا یہ کہ آلیلش جذب گوز شتر آپ کی سلامی لیگئی۔

(۱) نضلۃ العلما۔ یہ خطاب آپ کو اس غرض سے دیا گیا ہے کہ باوجودیکہ آپ اپنے تئیں عربی و فارسی کا عالم سمجھتے ہیں۔ مگر آپ کی لیاقت کا یہ حال ہے کہ آپ (قطرہ زن سیل) کی ترکیب کو غلط بتاتے ہیں۔ آپ (قطرہ زن) سے قطرہ بار مراد لیتے ہیں۔ اور آپ کو اس کی خبر نہیں کہ فارسی میں (قطرہ زن) شتابندہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے عربی کی آپ کی قابلیت جسقدر بڑھی ہوئی ہے اسکا ثبوت آپ اس مضمون میں ملتا ہے جو کہ آپ نے (سکینہ بنت حسین) کے عنوان سے لکھا تھا اور جس میں آپ نے اُن عربی کی کتابوں کی شہادت دی تھی جنکی علمار کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں۔ تاریخ میں آپ کو اسقدر دخل ہے کہ آپ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں چین سے پردہ آیا اور مسلمانوں نے ہندوؤں سے پردہ کی رسم سیکھی۔ حالانکہ انگریزی فارسی یا عربی وغیرہ کی کسی تاریخ سے اس امر کی شہادت نہیں ملتی کہ ہندوستان میں چین سے پردہ آیا۔ نیز چین میں نہ کبھی پردہ کی رسم تھی نہ اب ہے۔ غرضکہ اسی قسم کے علمی خدمات کے صلہ میں آپ کو نضلۃ العلمار کا خطاب دیا گیا۔

(۲) فصیح الکرسی۔ یہ خطاب آپ کو اسلئے دیا گیا کہ آپ فخر کرسی ہیں اس سے تو آپ کو انکار ہے کہ آپ کرسی میں پیدا ہوئے مگر آپ یہ اعلان شائع کرا چکے ہیں کہ آپ کا خاندان کرسی کا خاندان ہو۔ اور اب تک اپنی دہاتی وضع پر قائم ہے) بہرصورت کرسی کی خاک سے آپ کا تعلق ثابت ہے۔ اور کرسی کی زبان پر جسقدر آپ کو قدرت حاصل ہے اس کا ثبوت (بدر الفنا کی مصیبت) اور (میوۂ قلم) کے مطالعہ سے مل سکتا ہے (

(۳) ٹینی الپنجر یہ خطاب آپکو اس غرض سے دیا گیا ہے کہ آپ پست خیال اور پستہ قد ہیں خیالِ پنجہ (ٹینی مرغی اور سوں کی گانٹھ کو بھی) دلگداز پریس کے شیخ وغیرہ کی پھبتیاں آپ پر عموماً ہوا کرتی ہیں اور اسمیں ایک رعایت یہ بھی ہے۔ کہ آپ پیر پنجر کے بھی کبھی مریدی بجاتے ہیں۔

(۴) خفاش الملک اس خطاب میں کئی رعایتیں ہیں اول یہ کہ جسطرح خفاش کو روز روشن سے وحشت ہوتی ہے اسی طرح آپ روشن خیال حضرات کے دشمن ہیں ثانیاً یہ کہ آپکا (اتحاد) بھی خفاشانہ ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کہتے ہیں ایک مرتبہ چرندوں اور پرندوں میں لڑائی ہوئی دونوں طرف سے خوب خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں چمگادڑ نے یہ ترکیب سوچی کہ جب چرندوں کی فتح ہو تو وہ اپنے تئیں چرندوں میں شامل کرلے اور اپنے دانتوں کو چرند ہونے کے ثبوت میں پیش کرے۔ اور جب پرندوں کو فتح ہو تو اُن میں شامل ہو جائے اور اپنے پروں کو پرند ہونے کے ثبوت میں پیش کرے۔ یہی کیفیت شرر صاحب کی ہے ایک زمانہ وہ تھا کہ آپ نے منصور موہنا لکھکر اور ہندوؤں کو گالیاں دے کر مسلمانوں میں سوخ پیدا کرنا چاہا اور اپنے تعصب مذہب کو استواری ایمان کی شکل میں پیش کیا۔ ایک زمانہ پھر وہ آیا کہ آپ نے (سکینہ بنت حسین) مہمل اور گستاخانہ مضمون لکھکر ایک خاص فرقہ میں اپنا وقار بڑھانا چاہا۔ اب جب آپ نے دیکھا کہ آپکی اصل حقیقت پبلک پر ظاہر ہوگئی اور آپ کے مذہبی جوش کا پردہ پردۂ عصمت کے ساتھ فاش ہوگیا۔ اور یہ دیکھا کہ آجکل ہیں مولوی عزیز اللہ صاحب آپ کے مربی (ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے حامی ہیں تو آپنے بھی روٹی کمانے کی غرض سے اتحاد نکالا اور ہندو مسلمانوں شیعہ سنیوں کے میل جول کی ظاہرا کوشش کرنے لگے۔ غرضکہ جسطرف ہوا کا رُخ دیکھا اُسطرف آپ بھی چمگادڑ کی طرح اُڑ گئے پس خفاش کی حکایت آپ پر صادق آتی ہے اور (خفاش الملک) آپ کا مناسب خطاب ہے (طبلہ نواز جنگ) چونکہ بیابانی کے تکیئے کے آپ پشتینی رئیس ہیں اور طبیعت بھی آپکی جنگجو ہے جو واقع ہوئی ہے لہٰذا اب (طبلہ نواز جنگ) آپ کیلئے ایک موزوں

عہ پیام اتحاد ۱۲

خطاب ہے (نائٹ کمانڈر آف دی آرڈر آف پردۂ عصمت) کا خطاب آپکو اُن خدمات کے صلہ میں ملا ہے جو آپ پردہ دری کی کوشش میں بجالائے ہیں۔

(ب) الیس ضرب گوزہ شترکی سلامی اس غرض سے آپ کے لئے تجویز کی گئی ہے کہ آپ نے عرب کے متعلق بہت سے ناول لکھے ہیں

(مُہر عدالت اودھ پنچ)

(از اودھ پنچ مطبوعہ ۱۶- نومبر سنہ ۱۹۰۵ء جلد ۲۹ نمبر ۴۵)

گلزار نسیم پر تازہ اعتراضات

(نشگرف رقم شاگرد شُرُر)

منشی شجاد حسین شاحب

جناب مستطاب بعد تسلیم بشد تعظیم گذارش ہے کش آپ نے شنا۔ آج کل ایک بڑے شاعر عدا اشتاد مشلم الشبوت کے شاگرد اور شرکا نے نشیمن بوم شوم سے برشاتی مینڈکوں کی طرح شور شر مچانا شروع کیا ہے یہ شوخ و شنگ و شاہی کا شیرہ پیتے ہیں اشفار (کوشش وکاوش) کر رہے ہیں کہ مجھے اندیشہ ہے اگر اشی طرح شور و تشغب رہا تو جس طرح مشہور شخص شیخ علی بخش کے ایڈیشن کمیاب ہو گئے کہیں

کوئی صاحب شکار شاہیں شامت اعمال نہو جاویں خیر تو ہے کہیں شراب یا نشی شربت تو نہیں نوش کر گئے کہ اسقدر شین کے خرچ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

آپ شہر میں رہکر شون کھینچے کہاں پڑے رہتے ہیں۔ آج کل تو جسکو دیکھئے شین کا استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ آجکل شعر و شاعری کا بڑا زور شور ہے۔ اور کیوں نہو آتش ایسے باشان و شوکت استاد کے شاگرد رشید کشمیری پنڈت دیا شنکر نسیم کی مشہور مشش جہت مثنوی کی شہرت کا شیر دہاڑ رہا ہے جسکی آواز شنکر کے آجکل کے شغال شتر بے مہار کیطرح شہر یا ریگستان یعنی ریگزار کی طرف بھاگے جاتے ہیں۔ شرابیوں کی طرح یہ کیا بے تکی ہانک لگانی شروع کر دی۔

ارے صاحب کس میں ہی اکیلا نہیں جو اس شین کے مرض میں مبتلا ہوں انشاء اللہ خاں نے بھی میاں مصحفی کی ہجو میں شین کا بڑا خرچ کیا ہے۔ اب بتائیے اگر میں نے شین کا خرچ زیادہ کیا تو کیا کسی شریر کے زخم شکم پر آپ شور چھڑکا سنئے اگر آپ نے کبھی زیادہ شکایت کی تو میں نالش کر کے کسی کو بعبور دریا کے شور کی سزا دونگا۔ جسکا آپ کو شان وگمان بھی نہ ہوگا خوب یاد آیا شیخ کہنے پر تو آپ شاکی ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب یہ د شام اودھ) نولکشور پریس (گنگا پرشاد ورما پریس (کشمیری درپن) وغیرہ وغیرہ میں کیوں شین شامل کیا گیا کوئی شبب تو ہے کہ جسکو دیکھو شین کی چاشنی شرٹ تیا ہے۔

یہ بھی جانے دیجئے اب مجھکو تو کہتے ہیں نسیم کو کس نہیں کہتے انکی کل مثنوی اسی شین کی لغزشوں سے بھری پڑی ہے۔ سنئے۔ بیت

مہر لب شہ ہوئی خموشی ۔۔۔ کی نور بشر سے چشم پوشی

دی آنکھ جو شہ نے رو نمائی ۔۔۔ چشمک سے نہ بھائیونکو بھائی

لشکر کش و تاجدار تھا وہ ۔۔۔ دشمن کش و شہر یار تھا وہ

کہاں تک تشطیر کروں اور سنئیے۔ ہر چند کہ بادشاہ نے ٹالا + اس ماہ کو شہر سے نکالا

ایسی ہزاروں لغزشیں نسیم میں ہیں جنکو دعویٰ ہو آپ کا ثواب دے۔
اخاہ تو آپ نے گلزار نسیم پر اعتراض کیئے ہیں۔ تری ہاں اور کیا آپ سمجھے نہیں۔
پنچ شاباش۔

(راقم شگرف رقم شاگرد شرر)

شریف سے جو مقابل رذیل ہوتے ہیں
وہی لڑائی میں اکثر ذلیل ہوتے ہیں

(از اودھ پنچ مطبوعہ ۹۔ نومبر ۱۹۰۵ء جلد بست و نہم نمبر ۴۲)

شرر کی شاعری

مولانا اودھ پنچ

واللہ آپ کے نامہ نگار بھی عجب عالم بےخبری میں بسر کرتے ہیں جس کو دیکھئے وہ لکھ رہا ہے کہ مولانا شرر محض تخلص کے شاعر ہیں کوئی کہتا ہے کہ تخلص کا بدگوشت محض برائے وزن بیت ہے۔ یا تخلص کا گھینگا بیکار لٹکائے ہوئے ہیں یا تخلص کی پھریری کان میں فائدہ گھونسے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کے بندے یہ نہ سمجھے کہ ع تانباشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا۔
ذرا سا ککرمتا برسات میں اُگتا ہے اسکا تو کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہی ہے پھر میاں عبدالحلیم جو تخلص کا لٹھ عہ

عہ اودھ پنچ۔ یہ دیہات کا تلازمہ ہے ۱۲

باندھے ہوئے اُردو شاعری کے پیچھے گھوم رہے ہیں تو اسکی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ بندہ درگاہ تو اللہ میاں کے یہاں سے فلسفی کا دماغ لے کے آئے ہیں اور ذرا فن تاریخ سے بھی شوق رکھتے ہیں لہذا یہاں فکر لاحق ہوئی کہ ناولسٹی کے دریاؤں کے دُرِ یتیم میاں عبدالحلیم کے تخلص کی ماہیت دریافت کیجائے۔ ہفتوں اس فکر میں غلطاں پیچاں رہا۔ تمام باوقعت گلدستے اور رسالے دیکھ ڈالے مگر کسی میں اس دُرِ یتیم کی شاعری کی آب و تاب نہ دکھائی دی ایک روز اتفاقیہ ردیوں میں ایک پرچہ مل گیا جسپر گلدستۂ سخن لکھا ہوا تھا یہ ایک گلدستہ کا نام ہے جو کہ لکھنؤ میں (اخبار تمنائی کے ساتھ) شایع ہوتا تھا۔ غرضکہ اسی گلدستہ کے ایک پرچہ میں شررؔ کی ایک غزل نظر سے گذری جسکے شروع میں لکھا ہوا تھا غزل طبعزاد جناب ابو نعیم محمد عبدالحلیم صاحب شررؔ کا نام دیکھنا تھا کہ باچھیں کھل گئیں اور دل میں یہ خیال گذرا کہ میاں عبدالحلیم کا تخلص محض قلیہ میں کا نقطہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ شررؔ شراب سخن کی بھٹی سے نکلا ہے۔ اب غزل ملاحظہ ہو۔

بعد مدت کے لکھا یار نے لوگر کاغذ   بھول آیا ہے وہیں ہائے پیمبر کاغذ

پہلا حسن تو اس شعر کا یہ ہے کہ مصرع اولی پڑھا نہیں کہ یہ مصرع یاد آگیا ع

بعد مدت کے پھنسا ہے یہ پرانا چنڈول۔ علاوہ اس کے بندش الفاظ اور پاکیزگی زبان کا یہ عالم ہے تو سبحان اللہ خصوصًا (لوگر) ترکیب نے تو شعر میں جان ڈالدی سفید کاغذ سیاہ کاغذ۔ مہین کاغذ۔ دبیز کاغذ آجتک سنا تھا یہ (لوگر کاغذ) شررؔ کے دماغ کی پیسپرمل سے بنکر نکلا ہے۔ یہ ہو نہو (لوگر) فرانسیسی زبان کا کوئی لفظ ہے جو بغیر فرانسیسی زبان کی ڈکشنری دیکھے ہوئے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور سنئیے خط کے معنوں میں کاغذ کا استعمال کسقدر مناسب ہے یہ خاص لکھنؤ کی مستند زبان ہے جسکا پتہ گلزار نسیم میں نہیں ملتا۔ اتنا ہم کہیں گے کہ اگر (کاغذ) کے بدلے (کاگد) کہا جائے تو شررؔ کی مادری زبان کا جلوہ نظر آجائے۔ نیز پیامبر اور (قاصد) کے بدلے پیمبر کتنا فصاحت میں خبر اُلودہ ہے۔ مولانا تو لغوی معنوں پر مٹے ہوئے ہیں جسطرح (لہجہ) کے معنی صراح میں زبان کے ہیں اسی طرح (پیمبر) کے معنی لغت میں قاصد کے ہیں۔

سب پر طرہ یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں ربط کس قدر ہے اگر ایک گندھی ہے تو دوسرا مولوی

دوسرا مطلع ملاحظہ ہو ؎

وصف تنگی دہن کا جو لکھا بر کاغذ ہوگیا غنچۂ وابستہ سمٹ کر کاغذ

دل تو (تنگی) (دہن) میں (دی) کا زور ملاحظہ ہو پس کپی کی طرح لٹکی پڑتی ہے۔ اور (بر کاغذ) کی ترکیب تو (لوگر کاغذ) سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ آخر (بر کاغذ) کیا بلا ہے۔ مولوی صاحب نے تو غالباً (بر) کے معنے (اوپر) کے لئے ہیں جس سے کل مصرع کے معنی یوں ادا کئے جا سکتے ہیں کہ (وصف دہن کا جو لکھا اوپر کاغذ کے) مگر مولانا کی طبع بکر کا منشا یہ ہو کہ (بر) میں حرف با بر بجا لئے (زبر) کے کوئی اور علامت رہے۔ لیکن قافیہ سے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ تنگی (دہن و غنچۂ وابستہ) (اور سمٹ کر) کی رعایت بھی موجود ہے۔

واہ مولانا واہ (قایو پانے) کے بدلے (دست پانا) تو جاہلانہ غلطی ہے اور بر کاغذ عالمانہ خوش فعلی ہے۔

اور سنئیے کاغذ کا سمٹ کر غنچہ ہو جانا بھی کیا خوب شاید مولانا کا مطلب یہ ہے کہ کاغذ سمٹ کر گندھی کی کپی کی ڈانٹ بنگیا۔ تشبیہ تو اچھی ہے۔ مگر اس خاص صورت کے علاوہ یہ کہنا کہ کاغذ سمٹ کر غنچہ ہوگیا ویسا ہی ہے جیسا کوئی شخص کہے کہ پیپرمل سمٹ کے مولر کا درخت بنگئی۔ یا بیا بانی کا تکیہ سمٹ کے گھنٹہ گھر بنگیا۔

ہاں ایک رعایت اس شعر میں خوب ہے (یعنی کاغذ بھی ہے) اور بستہ بھی موجود ہے مگر (بر کاغذ) کی ترکیب کا جواب ناممکن ہے۔ یہ خاص کرسی کے (برا عظم) کی زبان ہے۔

تیسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

دل پہ جھرمٹ دم تحریر کیا شوق نے کیا لکھا کچھ بھی نہیں جب پر لکھا دن بھر کاغذ

دیکھئے اس شعر میں (کاغذ) کس قدر ضروری ہے بس استاد کا مصرع یاد آجاتا ہے

ع ہے سپستاں فارسی ہندی لسوڑا سانپ کا۔ دوسرے مصرع میں دونوں جگہ لکھا کا الف (گندھی کی ٹانگ کی طرح کمزوری) کے مرض میں مبتلا ہے بس دبا جاتا ہے (شوق کا جھرمٹ) بھی ملاحظہ طلب ہے نیز آخر میں (کیا) کتنا فصیح معلوم ہوتا ہے۔ یہ نزاکتیں (اور بندشیں) نسیم مرحوم کے کلام میں آتش کی اصلاح سے بھی نہ پیدا ہو سکیں۔ یہ تو سب کچھ سُنا آخر اس کمبخت شعر کے معنے کیا ہیں اگر موجودہ زمانہ میں مولانا نے یہ شعر کہا ہوتا تو ایک معنے پیدا بھی ہو سکتے تھے کہ حضرت شوق نے اودھ پنچ میں ایسا قول فیصل لکھا۔ کہ شرر نے جو کچھ صفحے اعتراضات سے سیاہ کئے تھے وہ بے لکھے کے برابر ہو گئے۔ چوتھا شعر ملاحظہ ہو

آپ دو بول ہمیں لکھتے تو ہم رکھ لیتے سر پہ سینہ پہ دل و دیدۂ تر پر کاغذ

سبحان اللہ دبجدہ "ہم رکھ لیتے) کتنا ظرف ظاہر کرتا ہے اور (بول لکھنا) تو خاص لکھنؤ کا سکہ ہے۔ نسیم نے (کلام بولنا) واقعی غلط نظم کیا ہے) (بول لکھنا) صحیح اس اصول کے مطابق (خط لکھنا) غلط ہے۔ خط بولنا صحیح ہو۔

نیز ترکیب الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مرتبہ آپ۔ سر پہ سینہ پہ دل و دیدۂ تر پر کاغذ رکھ لیتے) معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا معشوق گو کہ (دو بول) لکھتا ہے مگر پورے تاؤ پر لکھتا ہے کہ آپ اسے ایک ہی مرتبہ آدھے دھڑ پر رکھ لیتے ہیں غالبًا یہ (دو بول) بڑے جلی قلم سے لکھے جاتے ہونگے۔ پانچواں شعر ملاحظہ ہو

نامہ بر قتل کئے نوچے کبوتر کے پر[عہ] اب بھلا بھیجیں گے بو لو تمھیں کیونکر کاغذ

داللہ مولانا نے اپنے پنجۂ فکر سے کیا شاعری کو نوچا کھسوٹا ہے (بولو) دوسرے مصرع میں خواہ مخواہ دھنسا پڑتا ہے۔ اور (کاغذ) تو حسب معمول (خط) کے معنوں میں اس شعر میں بھی استعمال ہوا ہے۔ نسیم کے اس مصرع پر (خاتم کے نگیں بنائے ہوتے) تو شرر کا یہ اعتراض تھا کہ بغیر (انھوں نے) کے مصرع ناکمل ہے۔ مگر اس شعر کے دوسرے

عہ اودھ پنچ۔ مگر دم چھوڑی کہ وہ بھی ترکی ٹوپی کے پھندنے کے پردے میں نمایاں ہے ۱۲

مصرع میں یہ سوجھا کہ (بغیر ہم) کے مطلب خبط رہتا ہے۔

چھٹا شعر ملاحظہ ہو ؎

واں سے پھر آیا تو پھر بھیجا پھر ابھر بھیجا   یوں ہی کتنے دنوں کھایا کیا چکر کاغذ

واللہ پہلے مصرع کے (پھر پھرا) سے شعر پھرکی بن گیا جیسے دوسرے مصرع میں یہ ارشاد ہوتا ہے (کہ کھایا کیا چکر کاغذ) مگر اس (پھرا پھر) سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جس دماغ سے یہ شعر نکلا ہے وہ زمانہ کی الٹ پلٹ سے گھنچکر بنکر رہ گیا ہے۔

اس شعر میں ایک اور حسن ہے کہ مصرع اولی موزوں پڑھا نہیں کہ (بھیجا) کا الف ٹوٹی زیرپائی کے تلے کی طرف سٹ سے نکل گیا) مقطع ملاحظہ ہو ؎

خود شررؔ آؤ چلیں بیٹھیں در جاناں پر   فائدہ کیا جو سیہ کرتے ہیں لکھ کر کاغذ

بسم اللہ کہیں لکھنؤ سے تشریف تو لیجائیے۔ در جاناں پر جائیے کہیں اور جائیے۔ یہاں بیٹھ کر تو اپنے نامۂ اعمال کا دفتر نہ سیاہ کیجئے۔ ناظرین اودھ پنچ شرر کی شاعری کا رنگ دیکھ چکے خدا کی عنایت سے ان چھ شعروں میں تمام معائب شاعری موجود ہیں۔

مولانا نے یہ اعلان شائع کیا ہے کہ گلزارِ نسیم میں جتنی غلطیاں ہیں اتنی کسی شاعر کے کلام میں نہ ملیں گی۔ مولانا کا یہ دعوی صحیح ہو کہ نہو لیکن یہ ضرور صحیح ہے کہ جتنی غلطیاں مولانا کے ان چھ شعروں میں ہیں اتنی غلطیاں کسی شاعر کے چند سو اشعار میں بھی نہ ملیں گی شاعرانہ زباندانی کا یہ رنگ اور نسیم کی زبان پر اعتراض کرنے کے لئے یہ آندھی۔ بس جی چاہتا ہے کہ ایسے کو کانجی ہاؤس بھجوا دیجئے۔

(راقم دندان شکن)

لہ پنچ - اس شعر میں اور رعایت ہے (یعنی بھیجا) دماغ کے اندر ہوتا ہے اور (چکر) بھی موجود ہے۔ اسے بھی دماغ سے تعلق ہے ۱۲

اودھ پنچ مطبوعہ ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء

نکلا جو رن میں پنچ کا خنجر غلاف سے

اُڑنے لگے شرر دم خاراشگاف سے

بدرالنسا اور اُس کی مصیبت نمبر ا

کسی اُستاد کا مصرع ہے ع قضا آتی ہے چیونٹی کی جب اُسکے پر نکلتے ہیں۔ یہی حالت آج کل شرر کی ہے ابھی کل کی بات ہے کہ حضرت کرسی سے رینگتے رینگتے لکھنئو پہونچے۔ یہاں پھر رفتہ رفتہ تک بیابانی کے تکڑے کی خاک چھانی رفتہ رفتہ ایسے پر پرزے نکالے کہ ناولسٹ ہو گئے مگر خیر یہ تھی کہ ابھی تک قبر کے مردے اکھاڑنے میں مصروف رہتے تھے اور عروس سخن کے لئے مبالغہ و تحریف کے کفن کھسوٹ کھسوٹ کے پشواز تیار کرتے رہتے تھے۔ غرضکہ ٹیاں کوڑی کی طرح گوشہ عافیت میں پڑے رہتے تھے۔ نہ ان سے کوئی مخاطب ہوتا تھا نہ یہ کسی سے بھڑنے کی جرأت کرتے تھے۔ مگر گذشتہ مئی میں گرمی کی شدت نے جہاں اور اثر پیدا کئے وہاں یہ تازہ گل کھلایا کہ شرر کے دماغ کی بھٹی کا ٹمپریچر بڑھا دیا پھر کیا تھا شراب سخن اُبلنے لگی ایسی اُبلی کہ آخر کار ٹوٹنے سے ٹپک پڑی اس شراب کا ٹپکنا تھا کہ چاروں طرف تعصب کی جو اڑی کرسی کی ہوا نے اس بو کو دور دور پہونچا یا حتی کہ حضرت پنچ کے بھی آرام میں خلل پڑا ایک بار چونک پڑے اب دیکھتے کیا

ہیں کہ مارے بو کے دماغ پریشان ہوا جاتا ہے گندھی کے یہاں سے عطر منگایا عطر ایسا ملا کہ مٹی کے تیل سے بدتر پھر پری پر غور کیا تو دیکھا کہ کسی چور کی داڑھی کے تنکے پر پنبہ مینا لپٹا ہوا ہے۔ اور پنبہ بھی کس مینا کا وہی شرر کی شراب سخن کے مینا کا پھر تو حضرت پنچ نے ایک نسخہ تیار کیا اور گلزار نسیم کے پھولوں سے ایک گلدستہ بنا کر سامنے رکھا۔ یہ نسخہ عجب جادو کا نسخہ تھا اور یہ گلدستہ عجب طلسمی گلدستہ تھا کہ اسکی بو باغ جنت تک پہنچی اور شرر کی شراب سخن سے جو تعصب کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی وہ کافور ہوگئی شرر کی نفاست پسند طبیعت کو یہ بہت ناگوار گذرا اور کہنے لگے کہ اب آتش نفاق کی آنچ خوب تیز کروں گا اور دماغ کی دیگ کے بھبکے سے شراب فحش گوئی کے خم کے خم نکالکر سر بازار لنڈھاؤں گا اور ایسی تعصب کی بو اڑاؤں گا کہ نفاست پسند حضرات کو راستہ چلنا دشوار ہو جائے حضرت پنچ کے شاہانہ مزاج کو یہ ضد بہت ناگوار گذری اور رنگین بیانوں کے ایسے چمن کھلائے کہ ہر ہفتہ پھولوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے اترنے لگے جن کی خوشبو سے دماغ معطر ہو گئے۔ مگر اسپر شرر کے دماغ کی گرمی کم نہ ہوئی اور کہنے لگے کہ میں ایسی بولی بولونگا کہ اودھ پنچ کا ہرا بھرا چمن ویران ہو جائے گا۔ یہ خبر بندۂ درگاہ کے کانوں تک پہونچ گئی پھر کیا تھا حضرت پنچ کی قدیمی رفاقت کا خیال آگیا شمشیر آبدار میان سے نکل پڑی۔ ہمت نے کہا پنچ کی تلوار کا لوہا بڑے بڑے مانے ہوئے ہیں اس کی چمک سے حالی کی آنکھوں میں اب تک چکا چوند کا عالم ہے۔ سرشار بھی اسکی کاٹ کے قائل تھے۔ داغ اسی کا داغ دلپر لے گئے۔ پھر شرر کا کیا دم ہے۔ اک ذرا سی چنگاری کی ہستی کیا ہے۔ اسی تلوار کا پانی اسے بجھائے گا۔ ہمت پرواز کا تقاضا ہوا کہ ہم بھی اپنی شمشیر سخن کے جوہر دکھائیں پہلے تو خیال ہوا کہ شرر نے بہت عرب کے متعلق ناول لکھے ہیں۔ ذرا انکی خوبیوں کا پردہ فاش کردیں مگر عرب کے ناولوں کو گوز شتر خیال کر کے چھوڑ دیا۔ سدیشی تحریک کے اصول پر یہ دل میں آئی کہ شرر کا کوئی ایسا ناول چنا جائے جس میں ہندوستان کے متعلق شرر فشانی کی گئی ہو۔

یہ فکر ہوئی کہ ایسا ناول کہاں سے ملے اسی فکر میں غرق تھا اور عالم خیال میں خدا جانے کیا تماشہ دیکھ رہا تھا کہ (بدر النسا) کی آواز آئی کہ للہ میری مصیبت پر نظر ڈالئے۔ یہ آواز آتے ہی جھٹ آنکھ کھل گئی اور آنکھ کھلتے ہی کہا ع مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا۔ باقی آیندہ۔

راقم در ہر جگرے ہست خراشِ سخنِ ما
الماس تراش است تراشِ سخنِ ما

اودھ پنچ۔ مطبوعہ ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء

نکلا جورن میں تیغ کا خنجر غلاف سے
اُڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے

(بدر النسا اور اُسکی مصیبت)

نمبر ۲

بدر النسا۔ یعنی بدر اور النسا۔ یعنی وہ بدر جس میں زنانیت کا مادہ موجود ہو یہ تو بدر النسا کی تشریح ہے۔ اب اور اُسکی (مصیبت) کے کیا معنی (مصیبت) تو خمیر اعمال بد کا نتیجہ ہے۔ بیچارے (اور) نے کیا گناہ کیا ہے کہ وہ بھی بدر النسا کی مصیبت میں گرفتار ہو۔ اردو کی تو یہ ترکیب نہیں فارسی کی یہ ترکیب نہیں۔ ہو نہو فرانسیسی ڈکشنری کے

دستر خوان سے یہ ریزہ چنا گیا ہے (بدر النسا اور اسکی مصیبت) چہ خوش ! یہ وہی مثل ہوئی کہ جیسے کوئی کہے کر سی اور اسکے احمق (آخر اس (اور) کی علت غائی کیا ہے یہ تو حضرت عبد لئیم کے تخلص کیطرح بالکل بیکار ہے دخیر) اور پر غور کرنا فضول ہے۔

اب (بدر النسا) کی دقت پیدا کرنے والی داستان ملاحظہ ہو ہے تو مصیبت کی داستان مگر شتر نے واقعات کا تانا بانا اس طرح کھتیایا ہے کہ جس کے دیکھنے سے بے اختیار ہنسی آتی ہے یہ تو غالباً ناظرین اودھ پنچ کو معلوم ہوگا کہ حضرت عبد لئیم شرر نے یہ مصیبت) اُس زمانہ میں اپنے سر لی تھی جس زمانہ میں کہ آپ اپنے تیشۂ قلم کے زور سے پردہ کی دیوار گرا رہے تھے اس خلاف قدرت قصے کے لکھنے سے آپ کی مراد یہ تھی کہ پردے کی خرابیاں (عام پبلک) پر ظاہر ہو جائیں مگر جہالت کی تاریکی میں سوجھی دور کی جسطرح اونٹ ہمیشہ بغداد کیطرف بھاگتا ہے اسی طرح اس قصہ کے ترکیب دینے کے وقت آپ کی کینہ پسند طبیعت کا شتر بے مہار حیدر آباد کی طرف بھاگا چنانچہ اس قصہ کا ماحصل یہ قرار دیا گیا کہ ایک صاحب (شوکت حسین) اپنی بہو کو لئے ہوئے حیدر آباد سے آرہے تھے۔ اٹارسی کے اسٹیشن پر ایک دوسرے بزرگ ان کو ملے جو اپنی بھاوج کو ساتھ لا رہے تھے کانپور تک دونوں نے ساتھ سفر کیا۔ کانپور سے ایک صاحب فرخ آباد چلے گئے۔ دوسرے صاحب لکھنؤ چلے آئے۔ مگر کانپور کے اسٹیشن پر ایسا بھیڑ بھڑکا تھا کہ حیدر آباد سے جو صاحب آرہے تھے انکی بہو کی ڈولی ان صاحب کی بھاوج کی ڈولی سے بدل گئی جو کہ اٹارسی سے ساتھ ہوئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ جس ڈولی کی سواری کو لکھنؤ کی گاڑی پر سوار ہونا تھا وہ فرخ آباد کی گاڑی پر سوار ہوگئی اور فرخ آباد والی سواری لکھنؤ کی گاڑی پر سوار ہوگئی (بدر النسا اُس حرماں نصیب کا نام ہے جو حیدر آباد سے آرہی تھی اور لکھنؤ جا رہی تھی۔ مگر غلطی سے فرخ آباد پہونچ گئی) اس سے حضرت عبد لئیم شرر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ پردہ بڑی خراب چیز ہے۔ اور اپنی منطق یوں سمجھاتے ہیں کہ اگر پردہ

لہ پنچ۔ غلطی نہیں کیا ہی۔ بدایوں فرخ آباد ہی کے ضلع میں ہے۔ پھر جہاں کی مٹی تھی وہاں پہونچ گئی ۱۲

نہوتا تو ڈولی نہوتی اور اگر ڈولی نہوتی تو بدرالنسا پیدل ہوتی اور پیدل ہوتی تو اس کی کوئی پہچان ہوتی اور پہچان ہوتی تو وہ اسطرح گمراہ نہوتی یعنی جو صاحب اسے حیدرآباد سے لا رہے تھے وہ اسکو لکھنؤ کی گاڑی میں بٹھاتے۔ مگر ہم اس قصہ سے دوسرا نتیجہ نکالتے ہیں یعنی ریل کا سفر بڑی خراب چیز ہے اب اسکا منطقی پہلو ملاحظہ ہو یعنی ریل گاڑی نہ ہوتی تو اسٹیشن نہوتا تو بھیڑ بھڑکا نہوتا بھیڑ بھڑکا نہ ہوتا تو ڈولی نہ بدلتی اور بدرالنسا بیچاری پر مصیبت نہ پڑتی۔ شاہی میں کوئی اسطرح گمراہ نہیں ہوسکتا تھا انھیں باتوں کیلئے تو شاہی کو روتے ہیں۔

یہ تو عام منطق ہے اگر اسی منطق نے ترقی کی تو ایک روز مصنف کے دماغ میں انجن گھس جائیگا۔ اب خاص واقعات ملاحظہ ہوں۔ بدرالنسا کے سسرے شوکت حسین جو کہ اُسے حیدرآباد سے لا رہے تھے۔ سکنڈ کلاس میں بیٹھے تھے مگر کوئی خدمتگار ساتھ نہ تھا یہ گھر سے ایک ماما لیگئے تھے کہ نئی نویلی دُلھن (بدرالنسا) کے ساتھ زنانی گاڑی میں بیٹھی۔ بدرالنسا کے باپ اکبر علی حیدرآباد میں اول درجہ کے وکیل تھے اور ایسے مالدار تھے کہ کرایہ کے لئے ساٹھ روپیہ مہینے کا بنگلہ ٹھہرایا تھا مگر انھوں نے بھی حضرت شرر کی خاطر سے لڑکی کیساتھ ایک ماما تک نہ کی بلکہ صدقے کی کبوتری کیطرح بدرالنسا کو اکیلا چھوڑ دیا۔

کیا شریفوں کی بہو بیٹیاں اسیطرح سفر کرتی ہیں؟ اور خصوصاً نکاح کے بعد حیدرآباد سے لکھنؤ تک تنہا سسرے کے ساتھ روانہ کر دی جاتی ہیں۔ حضرت شرر کو تو دیہات کا خیال دماغ میں سمایا ہوا ہے کہ باڑی سے کرسی یا کرسی سے مہوبے جب گنوار اپنی بہو یا بھاوج کو بلانے جاتے ہیں تو لٹیا ڈوری لے کے جاتے ہیں اور عورتوں کو تنہا لیکر چلے آتے ہیں افسوس ہے تو صرف اسقدر کہ اگر حضرت شرر ایسے خلاف قدرت واقعات نہ لکھتے تو بیچاری بدرالنسا پر ایسی مصیبت نہ پڑتی یعنی اگر ایک ماما چھوچھو اسکے ساتھ ہوتی تو ڈولی نہ بدلنے دیتی۔

علاوہ بریں اس کل رقت خیز داستان سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ڈولی کی سواری [illegible] چیز ہے پردہ سے اس سے کوئی تعلق نہیں پردہ تو برقع سے ہوسکتا ہے اور برقع

اوڑھنے کی وجہ سے ایسی مصیبتیں نہیں پیش آسکتیں ہیں مگر حضرت شرکو ان باتوں سے کیا مطلب ان کو تو غریب بدر النسا کو جھنڈے پر چڑھانا منظور تھا اصل داستان کی تو یہ کیفیت ہے۔ علاوہ اسکے مختلف واقعات ایک دوسرے کے متضاد درج ہیں جن کی وجہ سے مولانا شرر پر حافظہ نباشد کی مثل صادق آتی ہو۔

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ شوکت حسین (بدر النسا کے باپ) سکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے دوسرے جگہ لکھتے ہیں کہ حیدرآباد کے اسٹیشن پر بوریا بدھنا بغل میں دبائے گاڑی پر سے اتر پڑے۔

یہ قطع تو اُن گنواروں کی ہوتی ہے جو تیسرے درجہ سے جھولا سنبھالتے ہوئے اُترتے ہیں دوسرے درجہ کے مسافر کو تو کسی نے نہ دیکھا ہوگا کہ بیگ بغل میں دبا کے یا صندوق سر پر رکھ کر چلتا بنے۔ مولانا شرر ناول لکھنا کا رسے دارد ناحق اپنے تئیں ہنسواتے ہو۔ پیشتر تو شوکت کو عام ہندوستانی مذاق کا شخص اور سیدھا سادھا آدمی کہا گیا۔ نیز یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اُس پر انگریزی تہذیب کا اثر پڑا تھا اور سیدھے سادھے خوش عقیدہ بزرگ تھے مگر سمدھی (اکبر علی) سے شادی کے قدیم رسوم کی نسبت وہ ایک آزاد خیال اور تعلیم یافتہ نوجوان کے لہجہ میں فرماتے ہیں کہ دا بتو دنیا سے یہ رسمیں اُٹھتی جاتی ہیں اور سچ یہ ہے کہ میں ان باتوں (کہ بیاہنے کو آنا لڑکے والوں کا کام ہے) میں بھی کسی بات کا پابند نہیں ہوں پھر بھی سیدھے سادھے خوش عقیدہ بزرگ فرماتے ہیں (مجھے تعلیم کا خیال سب باتوں پر مقدم رہتا ہے ...... لڑکی کا آرام وآسائش سے رہنا اور سب طرح کی راحت بس اسی پر منحصر ہے۔ کہ لڑکے کی لیاقت اچھی اور پوری ہو۔

واہ مولانا واہ (زور قلم) اسی کا نام ہے اگر یہی عالم کچھ روز اور رہا تو عرب کے ریگستانوں میں اگن بوٹ چلا دوگے اور پیر میں چکی باندھ کے ہمالیہ کی چوٹی پھاند جاؤگے

مرد خدا ذرا تناسب الفاظ کا تو خیال رکھا کرو۔ کجا وہ سیدھے سادے شوکت حسین جن کی نسبت تم خود لکھ چکے ہو کہ وہ اسٹیشن کے شور غل سے گھبرا جاتے تھے اور بالکل پرانے فیشن کے آدمی تھے اور کجا اُن کے خیالات جو کہ خاص اونیسویں صدی کے ملبلے کی مثال ہیں جب بدر النسا لکھنؤ کے بدلے فرخ آباد پہونچی تو اسکے باپ نے فرخ آباد میں ان صاحب (قاسم علی خاں) کے نام تار دیا جن کے یہاں وہ دھوکے سے چلی آئی تھی۔ اور کل واقعہ لکھا کہ ڈولی بدل جانے سے ایسا واقعہ پیش آیا۔ اب سنئیے کہ تار کس طرح پڑھوایا گیا۔ قاسم علیخاں پہلے تو ایک بڑھئی کے لونڈے سے تار پڑھوانے گئے جو کہ پڑوس میں رہتا تھا اور کچھ انگریزی جانتا تھا۔

کیوں صاحب کیا فرخ آباد کے شہر میں انھیں کوئی شریف شخص نہ ملا جس سے تار پڑھواتے آخر بڑھئی کے لونڈے کا یہاں کیا تک ہے۔ یہ محض دہات کی بود و باش کا اثر ہے ناول لکھنے چلے اور کوئی چول نہیں بیٹھتی۔ اور چول بیٹھے تو کس طرح ناول لکھنا کارے دارد۔ ع

کار بوزینہ نیست نجاری۔

خیر بڑھئی کے لڑکے سے مطلب نہ نکلا تو اسٹیشن ماسٹر کے پاس دوڑے گئے اسٹیشن ماسٹر نے تار تو پڑھ دیا مگر اُسکے ساتھ یہ رائے بھی ظاہر فرمائی کہ (واہ پردے سے یہ نیا گل کھلا۔ اس اندیشہ کی طرف شاید کبھی کسی کا خیال بھی نہ گیا ہوگا)

واہ مولانا شرر واہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیشن ماسٹر بھی کرسی کا رہنے والا تھا۔ ورنہ ایسا نمک بر جراحت) فقرہ نہ کہتا۔

شروع میں بدر النسا کے خاوند (عسکری) کی نسبت یہ لکھا گیا ہے کہ (عسکری) کی عمر اٹھارہ سال کی ہے ... ... انٹرنس پاس کر چکا اور ایف اے کے فرسٹ ایر میں ہے) آخری صفحہ پر یہ تحریر ہے کہ عسکری کو جبکہ وہ اسکول سے گھر کی طرف آرہا تھا ایک شخص نے چھرا پھونک پھونک کر مار ڈالا۔

کیوں مولانا عسکری ایف اے کے فرسٹ ایر میں تعلیم پانے کے بعد اسکول میں کسطرح آگیا۔ انگریزی کی لیاقت تو مولانا کی ماشاء اللہ بہت سے ڈگری یافتہ حضرات سے بڑھی ہوئی ہے مگر اسکول اور کالج کا فرق نہیں معلوم ہے کرسی کی ہوا کا خدا بھلا کرے جب یہ دماغ میں سماتی ہے تو پھر حافظہ میں بھی فتور آجاتا ہے۔ باقی آیندہ

راقم۔ در ہر جگرے بہت خراشِ سخنِ ما
الماس تراش ست تراشِ سخنِ ما

اودھ پنچ مطبوعہ ۲۔ نومبر ۱۹۰۵ء

نکلا جورن میں پنچ کا خنجر غلاف سے

اڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے

بدرالنسا اور اسکی مصیبت نمبر ۳

تناسب واقعات کے گرد بڑے سے جو بھول بھلیاں حضرت شرر نے بنائی ہے اسکے ایک آدھ گوشہ کی سیر تو پچھلے نمبر میں ہو چکی۔ اس تمام بھول بھلیونکی سیر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اب حضرتِ شرر کی زباندانی کا رنگ ملاحظہ ہو۔ سنتا ہوں حضرت شرر کو بدرالنسا کی مصیبت پر جہاں اور نازہین وہاں ایک یہ بھی فخر ہے اس ناول میں لکھنؤ کی شریف زادیوں کی زبان لکھی گئی ہے اور فصیح البیانی کا کیا کہنا۔ وہ تو

(بدر النسا کی مصیبت) کے لئے شمع ماتم خانہ سے کم نہیں۔ اس شمع سے پھول آنسو ہیں ان سے ایک ہار تیار کرنے کا ارادہ ہے جب یہ ہار تیار ہو جائے گا تو حضرت شر کی زیب گردن ہوگا اور چونکہ شمع کے پھولوں کا ہار ہے لہذا طوق زریں سے کم نہ ہوگا۔ یہ جلتے بلتے پھول اعتراضات ہیں اور ہار انھیں کا سلسلہ ہے خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا آمدم برسرمطلب۔ اس آتش بیانی کا ماحصل یہ ہے کہ شر نے اس ناول میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انکا حال مسلسل درج ہے۔ پہلی ٹھوکر کبری بیگم کے مزاج کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں (قاعدہ تھا کہ جہاں کسی بات کو ایک دفعہ کہا بس رٹ لگجاتی ہے)

کیوں صاحب یہ کیسی قاعدہ ہے (یہ) اڑا دیا گیا کہنا چاہئے تھا کہ (یہ قاعدہ تھا الخ دوسری ٹھوکر پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جہاں کسی بات (کو) ایک دفعہ کہا) کیوں نہ ہو یہ (کو) تو آپ کا پرانا رفیق و ہمدم ہے بس (بدر النسا کی مصیبت میں ساتھ نہ دے مگر اہل لکھنؤ تو یہ کہیں گے کہ (جہاں کوئی بات ایک دفعہ کہی) انھیں (کو) سے زیادہ رغبت نہیں یہ (کو) شر اینڈ کو ہی کو مبارک رہے۔ تیسری ٹھوکر (بس رٹ لگ جاتی) کیا معنے یوں لکھا ہوتا کہ (بس اسی کی رٹ لگ جاتی) آپ کا اختصار بھی قیامت کا اختصار ہے۔ اکثر حضرات اس طرح گفتگو کرتے ہیں کہ آدھی بات سنائی دیتی ہے اور آدھی ریش مبارک کے جھاڑ جھنکار میں پھنس کر رہ جاتی ہے مگر حضرت شر کے لئے تو یہ عذر نہیں پیش کیا جا سکتا کیونکہ زبان قلم داڑھی سے دور رہتی ہے چوتھی ٹھوکر فرماتے ہیں گھر سے خوش حال تھیں (خوشحال) تو اکثر کہاروں کا نام ہوا کرتا ہے۔ لکھنؤ کا محاورہ تو یہ ہے کہ (گھر سے خوش تھیں) خوش کے بعد (حال) پر حضرت شر وجد کریں مگر فصاحت کا اشارہ کچھ اور ہے پانچویں ٹھوکر اب اور سنئے زباندانی کی چول اسطرح بٹھالی جاتی ہے کہ (خدمت[1] گار تو دروازے کے باہر رہتے اور خوش سے

---

[1] اور یہ ترجیح ممکن ہے سیاہی پوچھنے کے لئے داڑھی کا استعمال ہو گئی ہو ۱۲ انکا اور خدمتگار کا املا کسقدر صحیح ہے۔ مگر یہ غلطی کاتب کے سر منڈھی جائیگی ۱۲

اس لیئے کہ ان کا سابقہ میاں سے تھا۔ ... ... شامت تھی تو ماماؤں کی) سبحان اللہ کیا پاکیزہ بندش ہے خصوصاً (دروازے) کا ذکر کس قدر برمحل ہے اگر یہ کہا جاتا کہ خدمتگار تو باہر رہتے الخ) تو شاید لوگ یہ سمجھتے کہ کبری بیگم کے مکان میں (دروازہ نہ تھا) اس لئے حضرتِ شررؔ نے صاف الفاظ میں بیان کر دیا کہ (دروازہ بھی تھا۔ بس اسی سوجھ بوجھ پر تو حضرت شررؔ کے پشتیبان مرے ہوئے ہیں۔

چھٹی ٹھوکر: اسی جملہ میں (رہتے) کے بعد (تھے) غائب ہے معلوم ہوتا ہے کہ دروازے کی چول میں دب کر رہ گیا۔ ساتویں ٹھوکر: (اور خوش تھے اس لئے کہ ان کا سابقہ میاں سے تھا) اس جملہ کی انگریزی ترکیب خاص اس زمانے کی یاد دلاتی ہے جبکہ مولانا انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ کیونکہ سنتے ہیں اس زمانے میں ہمارے علم دوست مولانا نے جہاز پر ملاحوں سے انگریزی زبان سیکھی تھی) وہی اثر اب تک دماغ میں باقی ہے ورنہ اردو میں تو خیال اسطرح ادا کیا جائے گا کہ (اور اس لیئے خوش تھے الخ) یا یوں کہیں گے کہ (اور خوش تھے کہ ان کا الخ) آٹھویں ٹھوکر (ان کا سابقہ میاں سے تھا) یہ بھی کیا خوب اس جملہ کو یوں ترتیب دینا چاہیئے کہ (ان کو میاں سے سابقہ تھا) اس اصلاح سے تو مولانا خوش ہو گئے ہوں گے کہ (کو) آ گیا۔ نویں ٹھوکر: اس بدنصیب جملہ کی نسبت ایک اور بات دریافت طلب ہے کہ دو جگہ (تو) کا استعمال کس غرض سے کیا گیا ہے اور سوائے اسکے کہ (تو) (کو) کا ہم وزن ہے اور کوئی وجہ اس سے اس کی معلوم نہیں ہوتی (خدمت گار) کے بعد جو (تو) صاحب دو زانو بیٹھتے ہیں۔ انھیں برخاست کیجئے یا ماماؤں کے پہلے جو (تو) صاحب پیش خدمت بنے ہوئے جلوہ گر ہیں انھیں پس پشت ڈالیے مختصراً یہ کہ پورا جملہ قابل اصلاح ہے ذیل کی صورت پر اسے ترتیب دینا چاہیئے (خدمتگار باہر رہتے تھے اور خوش تھے کہ ان کو میاں سے سابقہ تھا۔ ... ... شامت تھی تو ماماؤں کی۔

دسویں ٹھوکر۔ ماماؤں کی نسبت فرماتے ہیں کہ اس لیئے بیچاریوں سے نوکری چھوڑتے بھی نہ بن پڑتی۔ میں دیکھتا ہوں کہ جس طرح حضرت شرر کو دکو سے اُنس ہے اسی طرح تھی اور تھا وغیرہ سے نفرت ہے (نہ بن پڑتی) کے کوئی معنی نہیں ہیں کہنا چاہیئے تھا کہ نوکری چھوڑتے بھی نہ بن پڑتی تھی) گیارھویں ٹھوکر ارشاد ہوتا ہے کہ (عسکری) ... ... ماں کے بکنے جھکنے کے ڈر سے ہمیشہ باہر رہتا اور گھر میں آتا بھی تو ڈرتا ڈرتا اور سہما ہوا عسکری بہت پیارا بچہ تھا گورا چٹا ناک سک سے درست اور سو پچاس میں ایک اور اب پڑھنے لکھنے میں جی لگانے لگا تھا۔ اس جملہ میں (اور) کا استعمال غور طلب ہے اب ہم سمجھے اس ناول کا نام (بدر النسا اور اسکی مصیبت) اس لئے رکھا گیا ہے کہ (اور) کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا جائے گا ایک صاحب بات بات پر (گو یا کہ) کہا کرتے تھے ہمارے حضرت شرر (اور) سے مانوس ہیں۔ ابھی تک تو (دکو) اس شرف سے بہرہ ور تھا اب (اور) اس کا رقیب پیدا ہوا اور ایسا ہونا جائے حیرت نہیں ع دکو نہیں (اور) سہی اور نہیں اور سہی۔ بارھویں ٹھوکر بہر حال کبریٰ بیگم اکثر یکہ و تنہائی رہتی تھیں (یکہ و تنہا) تو سنا تھا۔ مگر یکہ تنہای خاص شرر انیڈ کو کے کارخانے کی کسی مادی مشین سے ڈھلکر نکلا ہے ایسی خانہ ساز ترکیبیں کسے نصیب ہیں۔

راقم
در ہر جگرے ہست خراش سخن ما
الماس تراش ست تراش سخن ما

اودھ پنچ مطبوعہ ۹ نومبر ۱۹۰۵ء

نکلا جورن میں پنچ کا خنجر غلاف سے

اڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے

بدر النسا اور اسکی مصیبت نمبر ۴

تیرھویں ٹھوکر۔ بہر حال کبریٰ بیگم اکثر یکہ و تنہائی رہتی تھیں " اے سبحان اللہ یکہ و تنہا کے بدلے یکہ و تنہائی، بھی کیا خوب ہے اگر یکائی لکھا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا اور نہ کچھ سہی (اکائی وہائی) کا وزن پورا ہو جاتا اور اس سے ریاضی کی قابلیت کا سکہ جم جاتا

چودھویں ٹھوکر۔ اب یہاں کوئی برے بھلے کا تو ذکر نہیں **لیکن ہاں اتنا** ضرور کہوں گا کہ تم نہ الٹی سمجھتے نہ سیدھی یہ (**لیکن ہاں**) کس قدر فصاحت کے رنگ میں شرابور ہے بلکہ تر بتر ہے غالبًا یہ کسی انگریزی کی (خوشنما ترکیب) کا ترجمہ ہے۔ مرد خدا یا تو صرف (لیکن) لکھو یا (ہاں) لکھو[1] (لیکن ہاں) تو کوئی معنی نہیں رکھتا (ہاں) کے معنے اس موقع پر خود لیکن کے ہیں اگر تنہا استعمال کیا جائے تو بیشک صحیح ہے ورنہ (لیکن) کے ساتھ بے تکی ہانک سے کم نہیں۔ یا یہ کہو کہ (لیکن اتنا تو ضرور کہوں گا) (یا ہاں اتنا ضرور کہوں گا" افسوس مولانا کو اردو نثاری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے عمر گذر گئی مگر ایک

---

[1] پنچ۔ کہو ہاں ۱۲

جملہ صحیح نہ آیا افسوس صد افسوس ع شتر شد پیر و شاشیدن نیاموخت۔
پندرھویں ٹھوکر "تم تو نہ اُلٹی سمجھتے ہو اور نہ سیدھی" محاورہ ہے کہ فلاں شخص نہ اُلٹی ہی سمجھتا ہے نہ سیدھی مگر آپ محاورے میں تصرف نہ کریں تو آپ کے[1] وطن کی آبرو کیونکر قائم رہے۔ اور تو اور یہ اُلٹی سمجھتے ہو (کے بعد) اور کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے بس بعینہ یہ نظر آتا ہے کہ اونٹ کے گلے میں بلی لٹکا دی گئی ہے۔ تخلص کی پھُریری تو کان میں گھسی ہوئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کی بُو بھی دماغ میں سرایت کر گئی ہو گی۔ اس خیال سے آتش کا مصرع سنداً پیش ہے ع۔
نہ اُلٹی ہی سمجھتا ہے نہ وہ رشک قمر سیدھی۔ دیکھئے اس میں (اور) کو دخل نہیں ہے لیکن آپ کا اصول تو بقول قدر بلگرامی یہ ہے۔ اور چلے اور چلے ساقیا۔
سولھویں ٹھوکر۔ بی بی کی یہ بدمزاجی دیکھ کے شوکت حسین نے ایک لاپروائی سے کچھ کہتے ہوئے باہر چلے گئے"
قسم خدا کی یہ جملہ دیکھ کر تو حضرت شرر کی شان میں سید انشا کا یہ مصرع پڑھنے کو دل چاہتا ہے ع رولٹ جو کھائی ہوئے تو پنجاب جائیے۔ پنجاب میں اس سنے کی بڑی قدر ہے واللہ ہمارے حضرت کی زبان بھی طرفہ معجون ہے کہ سی کے محاورے اس میں پنجاب سے محاورے اس میں ملیں دکن کے محاورے ع چل ایک مزے لتنے پہ قدرت ہے خدا کی + ممکن ہے کہ (صراح) یا بہار عجم یا مصطلحات میں اس (سنے) کی سند ملجائے۔ بہتر ہے اس معاملہ میں بھی اسی بقول قدیم سے رجوع لائیے جو اپنی ذات بابرکات سے آپ کو فیض پہونچانے کے لئے تیار ہو۔ سترھویں ٹھوکر بی بی کی بدمزاجی دیکھ کے شوکت حسین الخ (لکھنا تھا (بیوی) اور لکھ گئے بی بی کیوں نہ ہو مصیبت کے وقت منھ سے کچھ کا کچھ نکل جاتا ہے۔ اٹھارھویں ٹھوکر بری بیگم اس بے پروائی پہ بولا

[1] پنچ گڑسی ۱۲

اور برہم ہوئیں میاں پر تو کچھ زور نہ چلا غریب ماما پر برس پڑیں چلا کے کہا اے عباسی یہ تھا کیا یہ تیرے پاس کیوں آئے تھے ۔

پہلا حسن تو اس جملہ کا یہ ہے کہ چار جگہ (پر) کتنا مناسب و موزوں معلوم ہوتا ہے، یہی (پر) مولانا کے طائر شہرت کے پر ہیں۔ اگر اس طرح نہ لکھتے تو لوگ کہتے کہ بے پر کی اڑائی ہے۔ مگر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ناول لکھنے کا تو حضرت کو اختیار ہے۔ لیکن اس (پر پر) کی سند نہیں ہے۔ علاوہ اس کے انیسویں ٹھوکر اس جملہ میں (چلا کے کہا) اتنا ہی بے ربط ہے۔ جیسا کہ لکھنؤ میں کرسی کا باشندہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ افیون کی پینک میں لکھا گیا ہے۔ یعنی یہ لکھا کہ غریب ماما پر برس پڑیں اور اونگھ گئے اور پھر دو گھڑی بعد چونکے تو ایک بار گھبرا کر لکھ دیا کہ چلا کے کہا) پھر غیں ہو گئے۔ اتنے میں صبح کی نوبت کی آواز جو کان میں گئی تو ایک بار آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے اور حقے کا ایک کش کھینچ کر یہ لکھ دیا کہ (اے عباسی یہ تھا کیا الخ) اور نہ حواس خمسہ کی درستی کے عالم میں جو شخص اس جملے کو لکھے گا وہ اس طرح لکھے گا کہ دکبری بیگم یہ بے پروائی دیکھ کر اور برہم ہوئیں۔ میاں سے تو کچھ زور چل نہ سکا غریب ماما پر برس پڑیں۔ اُس سے چلا کے کہنے لگیں کہ سُن تو سہی عباسی یہ تھا کیا۔ آخر یہ تیرے پاس کیوں آئے تھے الخ'' کبری بیگم کو کوئی اپیچ نہیں دے رہی تھی کہ وہ اے عباسی کہتی۔ ایسے موقع پر سُن تو سہی کہا جاتا ہے۔ بیسویں ٹھوکر۔ عباسی جوان تھی چہرے پر جوانی کا نمک ابھی برقرار تھا۔ وہ نوکری نہ کرتی۔ مگر میاں کی تنخواہ کے چھ روپیوں میں اس مہنگی سمیں میں پوری نہ پڑتی مجبوراً گھر چھوڑ کر نوکری کو نکلنا پڑا۔ لیکن اپنے میاں کی صورت کی عاشق تھی اور وہ بھی روز شام کو آکے دو باتیں ضرور کر جاتا۔

اس جملہ کا کیا کہنا کیا بلحاظ ترتیب الفاظ اور کیا بلحاظ تسلسل خیالات یہ اپنے رنگ میں جواب نہیں رکھتا بس بعینہٖ یہ سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ طبلہ الگ جا رہا ہے

اور سارنگی الگ جارہی ہے اور گانے والا اپنی الاپ رہا ہے۔ انیسویں صدی کی آزادی کے تمام اصول اس جملے میں سما گئے ہیں۔ یعنی ایک فقرہ دوسرے فقرہ کا دبیل نہیں ہے بلکہ خود شتر بے مہار کی طرح جس رُخ چاہتا ہے بھاگا جارہا ہے۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

جس حالت میں یہ کہدیا کہ (عباسی جوان عورت تھی) تو پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ چہرے پر جوانی کا نمک ابھی برقرار تھا۔" ابھی کا استعمال تو اُسوقت مناسب معلوم ہوتا اگر یہ کہا جاتا کہ (عباسی کا جوانی کا عالم گذر گیا تھا مگر چہرے پر جوانی کا نمک ابھی برقرار تھا" یوں تو سیکڑوں) ابھی بڑھا دیے جاسکتے تھے کہ عباسی جوان عورت تھی چہرے پر جوانی کا نمک ابھی برقرار تھا۔ بال ابھی سیاہ تھے دانت ابھی مضبوط تھے آنکھ میں ابھی روشنی تھی وغیرہ وغیرہ اکیسویں[21] ٹھوکر علاوہ بریں جوانی کا نمک چہ معنی دارد کیا بڑھاپے کا بھی نمک ہوتا ہے اس قدر کہنا کافی تھا کہ چہرے پر نمک ابھی ستوار تھا۔" جوانی کا نمک" شاید کسی کے پنساریوں کے یہاں ملتا ہوگا بائیسویں[22] ٹھوکر (جوانی کے نمک) کا ذکر کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ وہ نوکری نہ کرتی مگر میاں .. .. .. چھ روپیوں میں پوری نہ پڑتی) کیوں صاحب یہ جوانی کے نمک اور نوکری کرنے یا نہ کرنے سے کیا تعلق ہے آخر آپ کا اُن دو جملوں کے ایک جا کرنے سے کیا منشا ہے۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وہ جوانی کے نمک) کی تجارت کرتی اور نوکری نہ کرتی۔ علاوہ اسکے "تیئسویں[23] ٹھوکر۔ پوری نہ پڑتی کے بعد (تھی) ہونا لازمی ہے مگر جیسا کہ پیشتر لکھا گیا ہے کچھ (تھی) اور (تھا) سے حضرت کو ایسی نفرت ہے کہ اُنھیں خواہ مخواہ حذف کر جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکیبیں پُرانی ہوگئی ہیں اور ان میں جوانی کے نمک) کی مُپٹ نہیں باقی رہی ہے۔ اس لئے آپ کی جدت پسند طبیعت ان سے بیزار رہتی ہے۔ اسی طرح۔ چوبیسویں[24] ٹھوکر۔ دو باتیں ضرور کرجاتا۔ کے بعد (تھا) غائب ہے۔ گو کہ یہ تمام جملہ لدھڑ کنکوے سے کم نہیں اور اس کی درستی ناممکن ہے

تاہم کوشش شرط ہے معنوی حیثیت سے تو اسکی اصلاح اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ اس دماغ کی فکر کی جائے جس سے کہ یہ جملہ (صادر) ہوا ہے لیکن ترتیب الفاظ کی اصلاح ایک حد تک ممکن ہے۔ یعنے جملہ کو یوں لکھنا چاہیے تھا کہ (عباسی جوان عورت تھی) چہرہ پر نمک ہوتا وہ نوکری کرتی لیکن چونکہ اس مہنگی سمے میں میاں کی تنخواہ کے چھ روپیوں میں پوری نہ پڑتی تھی اسلئے اسے گھر چھوڑ کر نوکری کو نکلنا پڑا تھا۔ مگر وہ اپنے میاں کی صورت کی عاشق تھی۔ اور وہ بھی روز شام کو آکر اس سے دو باتیں کر جاتا تھا۔

راقم

در ہر جگرے ہست خراشِ سخنِ ما
الماس تراش ست تراشِ سخنِ ما

اودھ پنچ مطبوعہ ۱۶۔ نومبر ۱۹۰۵ء

نکلا جو رن میں تیغ کا خنجر غلاف سے
اڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے

بدر النسا اور اسکی مصیبت نمبر ۵

ٹھوکر نمبر ۲۵۔ میاں بس اتنا کہنے کو آئے تھے کہ اسے کھانا دلوا دو " آخر (کو) اکی کیا ضرورت ہے۔ حضرت آتش نے اپنے خطوط میں اسکی خوب دھجیاں اڑائی ہیں۔ بدر النسا کی مصیبت میں (کو) اکا زور کم ہے۔ مگر تب بھی کہیں کہیں اس جھاڑ جھنکاڑ

میں بھی یہ حشرات الارض کی طرح رینگتا نظر آتا ہے۔

ٹھوکر نمبر ۲۶ - کبریٰ بیگم خاص الخاص (لکھنؤ کی شریف زادیوں[لہ] کے لہجہ میں عباسی ماما سے کہتے ہیں (انھوں نے (یعنی کبریٰ بیگم کے شوہر شوکت حسین نے) اسی لیئے تو لاکے گھر میں بٹھایا ہے کہ تجھ سے ہنس بول کے جی کے کڑھائیں" میں حضرت شرر سے پوچھتا ہوں کہ ماما نوکر رکھی جاتی ہے کہ گھر میں بٹھائی جاتی ہے اگر نوکر رکھنے کے لیئے (گھر میں بٹھانا) کہہ سکتے ہیں تو برخاست کرنے کے لئے گھر سے اُٹھا نا کہنے میں کیا ہرج ہے۔ مثلاً اگر کوئی یہ مفہوم ادا کرنا چاہے کہ فلاں شخص مفسدہ پردازی کی وجہ سے دکن سے نکالا گیا"، تو کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں شخص دکن سے اُٹھا دیا گیا" کچھ روز عروس سخن کے گھر بیٹھیں تب کچھ سلیقہ آئے گا ورنہ یہ تال بے تال بکر کو ہمیشہ ہنسوائے گی۔ ٹھوکر نمبر ۲۷ عباسی ماما شوکت حسین سے کہتی ہے "میاں آپ مجھ سے بات نہ کیا کیجئے۔ آپ تو ہر طرح اچھے رہیں گے مگر میں گھر بار سے گذری ہونگی تمیں اپنے قدردانوں کے سر کی قسم انصاف سے کہدو کہ اس جملے کے معنے کیا ہیں گھر بار سے گذری ہونگی" چہ معنی دارد۔ یا تو ایک لغت بناؤ جس میں اپنی خانہ ساز ترکیبوں کی تشریح کر دیا کرو (اُس لغت کا نام کرسی اللغات رکھو) ورنہ نثاری سے ہاتھ اُٹھاؤ اس پیشہ میں تمھارے لیئے ذلت کے سوا کچھ نہیں دھرا ہے میاں سردی کی فصل آئی ہو ماش کی کھچڑی کھاؤ اور لحاف تان کر سو رہو کیسی نثاری اور کہاں کا زور قلم۔

مذکورۂ بالا جملہ میں دو نوں (مگر) مگر کسقدر زیب دیتے ہیں نثاری کو شرر نے

لہ حضرت شرر کو یہ ناز ہے کہ بدر النسا کی مصیبت میں لکھنؤ کی شریف زادیوں کی زبان لکھی گئی ہے۔ حالانکہ شریف زادیاں تو درکنار لکھنؤ کی ڈومنیوں کی بھی زبان شرر کو نصیب نہیں۔ بیشک آپنے کرسی کی (شریف زادیوں کی) زبان لکھی ہو تو تعجب نہیں۔ کیونکہ شرر وہیں کے شریف زادے ہیں ۱۲ ۵۲ پنج پھر خوب ہوا اندر نہ گئی ۱۲

(علم دریاؤ) بنادیا ہے۔ اسی دریاؤ میں یہ دونوں (مگر) کروٹیں لے رہے ہیں۔ مگر ہمارے اعتراضات کے ایک ہی فیر میں دونوں اڑے جاتے ہیں۔ دیکھو اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں۔ میاں آپ مجھ سے بات نہ کیا کیجئے آپ کا تو کچھ بگڑے گا نہیں میں گھر بار سے نکالی جاؤں گی " **ٹھوکر نمبر ۲۸** ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو۔ مندرجہ ذیل مکالمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کبریٰ بیگم اور شوکت حسین میں در پردہ مادر و پدر کا مذاق بھی ہوا کرتا تھا۔ **شوکت حسین** یہاں تو خود ان کا خط موجود ہے۔ **کبریٰ بیگم**۔ اب یہ خبر کہ کسکا ہے ؟ ہم پوچھتے ہیں کہ (کس کا ہی ؟) اس موقع پر کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ معترض کہتے ہیں کہ حضرت بالکل عنب الثعلب خشک ہیں اور **مذاق** سے مس نہیں رکھتے ہیں وہ دیکھیں کہ اس مکالمہ میں کیا در پردہ مذاق موجود ہے۔

ہم کو اس موقع پر ایک روایت یاد آگئی ایک کرسی کے مولوی صاحب لکھنؤ گئے کسی گندھی کی دکان پر عطر خریدنے گئے۔ گندھی نے کہا کہ عطر حاضر ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کس کا ہے ؟ گندھی نے جواب دیا کہ کرسی کی مٹی کا " عطر بھی مٹی کا ہوتا ہے اور آدمی بھی **ٹھوکر نمبر ۲۹**۔ شوکت حسین اپنی بیوی سے سالی صاحب کی نسبت کہتے ہیں کہ کل دوپہر کو یہاں لکھنؤ کے اسٹیشن پر آ **پہونچیں گے**۔ چہ خوش ! (آدھمکیں گے) لکھا ہوتا تو کچھ معنی بھی پیدا ہو جاتے (آ پہونچیں گے) تو محض مہمل ہے۔ **ٹھوکر نمبر ۳۰** (میں نے) جو کچھ کہنا تھا کہدیا اب تمہیں اختیار ہے " اس موقع پر (میں نے) کس قدر بے محل استعمال ہوا ہے یہ (نے) خاص پنجاب کا سکہ ہے۔ کیوں نہ ہو حضرت پنجاب کی ہوا بھی کھا آئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہی ہوا پیٹ میں بھری تھی ۔ بدر النسا کی مصیبت لکھتے وقت لکھنؤ میں چھوڑ دی۔ مگر افسوس ہے کہ تب بھی حضرت شرر کی نثاری کی ہوا نہ بندھی

ٹھوکر نمبر ۳۱۔ کبریٰ بیگم لکھنؤ کی شریف زادیوں کی زبان میں فرماتی ہیں کہ دن مجھے تو جب یقین آئے کہ وہ اصل خیر سے یہاں آ کے پہونچ جائیں) واقعی د آ کے پہونچ جائیں) خاص لکھنؤ (یعنی دار السلطنت اودھ) کی فصاحت ہے۔ افسوس باوجود عینک کے شرر کو یہ نظر نہ آیا کہ (آ کے) اس موقع پر لنگڑی کرسی کے پشتیبان کیطرح بالکل بیکار ہے۔ محض (پہونچ جائیں) کافی ہے۔

ٹھوکر نمبر ۳۲۔ حضرت شرر فرماتے ہیں کہ اکبر علی کچھ دنوں وطن میں تلاش معاش کرتے رہے جب کچھ کام نہ چلا تو بی بی کو ساتھ لیکر غریب الوطنی اختیار کی اور حیدرآباد دکن کو روانہ ہوئے"۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی جسطرح حضرت جب دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں کچھ کام نہیں چلتا) تو حیدرآباد دکن روانہ ہو جاتے ہیں اسیطرح اکبر علی بھی نوکدم حیدرآباد ہی بھاگے۔ خیر ہم کو اس جھگڑے سے مطلب نہیں امر ضروری یہ ہے کہ (کام چلنا) اس موقع پر بالکل بے محل استعمال ہوا ہے۔ کہنا چاہئے تھا کہ جب کوئی تدبیر کارگر نہوئی) اور غلبۂ ذکاوت سے لکھ گئے کہ جب کچھ کام نہ چلا"۔ اگر کسی شخص کو تجارت میں یا اور کسی پیشہ میں کامیابی نہیں ہوتی ہے تو اُس خاص موقع پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص کا کام نہیں چلا" نہ کہ تلاش معاش میں ناکامیاب رہنے کا مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہو"۔ یا مثلاً کسی شخص پر مصیبت پڑے اور وہ گھر کا زیور گرو رکھ کر اپنا کام نکالنا چاہے اور پھر بھی شامت اعمال سے ناکامیاب رہے۔ تو یہ کہا جائے گا کہ فلاں شخص نے اپنے گھر کا زیور گرو رکھنے میں بھی تکلف نہ کیا لیکن تب بھی کمبخت کا کام نہ چلا"۔ یہی دو ایک مفہوم کام چلنے کے ہیں"۔ زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں عقلمند را اشارہ کافی است۔

حضرت شرر کو لکھنؤ کے سیدھے سیدھے محاوروں کے مفہوم سے واقفیت نہیں اور اساتذہ لکھنؤ کے مرشد و پشت پناہ بننے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں اور کیا لکھوں۔

ے شیخ صاحب پکارتے پھریئے ہر گلی کوچے کام ناول کا

ٹھوکر نمبر ۳۳ - کبریٰ بیگم کو نکاح کے دن سے کبھی میکے کا مزہ نہیں نصیب ہوا تھا جس کا اکثر صدمہ رہتا تھا" سبحان اللہ کیا زبان ہے۔ میکے کا مزہ بھی کیا خوب واللہ پیاری بدر النسا کی داستان لکھتے لکھتے حضرت مزے میں آ گئے اگر سسرال کا مزہ" کہا جائے تو چنداں ہرج نہیں کیونکہ لڑکیاں اپنے شوہروں کی چاشنی محبت سے حظ اٹھاتی ہیں۔ یہی سسرال کا مزہ کہا جا سکتا ہے" لیکن حضرت سے یہ کوئی پوچھے کہ میکے کا مزہ کیا بلا ہے۔ اور کسطرح حاصل ہوتا ہے ممکن ہے کہ کرسی میں میکے کے مزے کا چٹخارہ بھی ہوتا ہو لہذا حضرت نے اپنے وطن کی رسم لکھدی۔

راقم - در ہر جگرے ہست خراشِ سخنِ ما
الماس تراش ست تراشِ سخنِ ما

از اودھ پنچ مطبوعہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۵ء

نکلا جو رن میں تیغ کا خنجر غلاف سے

اڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے

بدر النسا اور اسکی مصیبت نمبر ۶

ٹھوکر نمبر ۳۴ - ارشاد ہوتا ہے کہ "اکبر علی کو زیادہ ٹھہرنے کی فرصت تھی

...... بہن نے زیادہ ٹھہرنے پر اصرار کیا " سبحان اللہ ٹھہرنے پر کیا انکار رہے اور کیا اصرار رہے ۔ لکھنؤ کا تو ایک بازاری شخص بھی گفتگو میں اس لفظ سے پرہیز کرتا ہے مگر مولانا اگر ایسی حماقتیں نہ کریں تو کرسی کی آبرو کسطرح قائم رہے ۔ مرد خدا ایسے موقع پر (ٹھہرنے) کے بدلے قیام کرنا استعمال کیا جاتا ہے ۔

ٹھوکر نمبر ۳۵ ۔ اُن دنوں مقدمات کا زیادہ ہجوم تھا اور زبردستی موکلونکو دم دلاسا دے کے (اکبر علی) نے صرف پندرہ روز کا زمانہ اس سفر کیلئے نکال لیا تھا " (زبردستی دم دلاسا دینا) بھی کیا خوب ۔ یہ ویسا ہے جیسا کوئی شخص کہے کہ فلاں شخص نے زبردستی کے ساتھ انھیں دھمکی دی (افسوس زباندانی کا دعویٰ اور اتنی خبر نہیں کہ (زبردستی) کے معنی ہی یہ ہیں کہ (دم دلاسا) کی گنجائش باقی نہیں رہی ۔ **ٹھوکر نمبر ۳۶** ۔ اب ذرا لکھنؤ کی شریف زادیوں سے فرماتے ہیں (بلقیس نے کہا بہن اب تم لیٹ کے سو رہو تین دن کی تھکی ہو قسم خدا کی لیٹ کے سو رہو) کی ترکیب کسقدر بانکی ہے (لیٹی ہوئی نثر) اسی کا نام ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ کھڑے کھڑے بھی سو جاتے ہیں کہ جا بیجا سو رہنے کے لئے ۔ لیٹنے کے لئے بھی ارشاد ہوتا ہے چنانچہ (بدر النسا کی مصیبت) میں متعدد جگہ فقرہ ملے گا **صفحہ ۸** اپر یہ لکھا ہے العرض باتیں کرتے کرتے دونوں لیٹ کے سو گئے ۔ **صفحہ ۲۰** یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ایک لڑکی نے چپکے سے عسکری کو وہاں پہونچا دیا اور سب لیٹ کے سو رہے " آخر اس کی وجہ کیا ہے ؟ یا تو مولانا اکثر رات کو ناول لکھتے لکھتے کرسی کے ڈنڈے پر ہاتھ رکھ کے بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتے ہیں اسی لئے ذاتی تجربہ کے لحاظ سے ہر مقام پر تشریح کر دی جاتی ہے کہ لیٹ کے سو رہے مگر اتنا خیال نہ کیا کہ آدمی نہوئے لینڈی کتے ہوئے کہ لیٹے جاتے ہیں ۔ اگر لیٹ کے سو رہے " فصیح ہے تو پھر پاس وضع کے معنی یہ ہیں کہ یہ بھی لکھا کریں کہ ۔

منہ کھول کے کھانا کھایا۔ کھڑے ہو کر چلے۔

ٹھوکر نمبر ۳۷ ۔ فرماتے ہیں کہ "بدرالنسا جو بدرو کہلاتی تھی ابھی پانچ برس کی بچی تھی، بچہ کی مادہ بچی" بھی کیا خوب۔ واقعی سچی انشا پردازی اسیکا نام ہے۔ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ "پانچ برس کی بچی تھی" اور غلبۂ ذکاوت سے کہہ گئے (بچی) غالباً یہ بھی بیرونی بول چال ہے۔ **ٹھوکر نمبر ۳۸** ۔ ذرا مکالمہ ملاحظہ ہو۔ کبریٰ بیگم اے بٹیا بدرو۔ یہاں آکے اندر کھیلو **بلقیس بیگم** بہن بدرو کو دھوپ میں نہ کھیلنے دیا کرو پھول سی لڑکی دھوپ میں کالی[1] ہوئی جاتی ہے۔ **بدرو** ۔ واہ اس کی گڑیا کے انیچے نے پنچانہ پھر دیا ہے پوتڑے نہ دھوؤں **کبریٰ بیگم** بہن تم اسے بدرو کیوں کہتی ہو بندریا کہا کرو لو راُئی بندریا ہے۔ **بلقیس بیگم** ۔ اے بٹیا بدرو اندر چلی آؤ" **ناظرین پر واضح** ہوگیا ہوگا بدرالنسا کے دُلار کے نام کیا کیا ہیں۔ یعنی بدرو یا بٹیا بدرو پسند ہے خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب اعتراضات ملاحظہ ہوں کہنا چاہیئے تھا "پھول سی لڑکی دھوپ میں کمھلائی جاتی ہے" اور لکھ گئے کہ "کالی ہوتی جاتی ہے" اس فقرے سے بدرالنسا کی روسیاہی کا پردہ رہ جائے مگر خلاف محاورہ ضرور ہے۔ علاوہ اسکے گلاب کے "پھول سی لڑکی" لکھنا تھا محض پھول تو کوئی چیز نہیں ہے۔

راقم ۔ در ہر جگرے ہست خراشِ سخنِ ما
الماس تراش است تراشِ سخنِ ما

---

[1] پینچ ۔ آخاہ بدرالنسا کی روسیاہی کا سبب آج معلوم ہوا غالباً جس دھوپ میں بدرالنسا کالی ہوئی اسی میں حلیمن کے بال سفید ہوئے ہیں ۱۲

اودھ پنچ مطبوعہ ۱۴ - دسمبر ۱۹۰۵ء

نکلا جو رن میں پنچ کا خنجر غلاف سے
اڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے

بدر النسا اور اسکی مصیبت نمبر

ٹھوکر نمبر ۳۹ - کبری بیگم خاص الخاص لکھنؤ کی شریف زادیوں کے لہجہ میں فرماتی ہیں کہ (توبہ کرو بہن! غیروں میں شادی بیاہ کر کے کہیں بھی پوری اُتری ہے) (پوری اترنا) بھی کیا خوب۔ اس جملہ سے تو کچوری کی بو آتی ہے۔ تحسین کی مسجد کے نیچے کے جو حلوائی رہتے ہیں وہ اس فقرہ کو سُن لیں تو شرر کی زباندانی پر ایمان لے آئیں۔ (پوری پڑنا) تو سُنا تھا مگر پوری اُترنا) شرر نے کرسی کے حلوائیوں سے سُنا ہوگا۔ خیر خشکہ یا بیرونہ اگرچہ گندہ۔ لیکن ایجاد بندہ **ٹھوکر نمبر ۴۰** - کبری بیگم اپنے بھائی اکبر علی سے (بیٹا بدرو)[1] کی نسبت کہتی ہیں کہ آخر اس کی بات چیت شادی کے متعلق ہونی چاہئے اسکے جواب میں اکبر علی لکھنؤ کی شریف زادیوں کے لہجہ میں کہتے ہیں کہ (میرا تو ارادہ ہے کہ یہیں کہیں مناسب دیکھ کے کر دوں گا آہا ہا کر دوں گا کس قدر تہذیب و

---

[1] پنچ سبحان اللہ کیا گرما گرم تنقید ہے ۱۲ [2] (بدر النسا کی مصیبت) صفحہ ۶ سطر ۲۳ ملقیس بیگم فرماتی ہیں (اے بیٹا بدرو اندر چلی آؤ) مطلب یہ ہے کہ شرر نے خود بدر النسا کو بیٹا بدرو کا خطاب دیا ہے ۱۲

لطافت میں غوطے کھا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ (مناسب) کے بعد موقع کا لفظ چھوٹ گیا ورنہ پورا تلازمہ ہو جاتا۔ میاں شرر لکھنوٗ کا تو ایک بازاری شخص بھی اپنی بہن سے جب گفتگو کریگا تو ایسا بیہودہ لفظ منھ سے نہ نکالے گا۔

ٹھوکر نمبر ۴۱۔ یہ ٹھوکر مذہبی تعصب کی ٹھوکر ہے یعنے چونکہ (بٹیا بدرو) اور عسکری کی عمر کم تھی اور کبری بیگم کہتی تھیں کہ ابھی نکاح ہو جائے تو اکبر علی نہایت تضحیک کے ساتھ کہتے تھے کہ یہ تو ہندوؤں کی سی شادی ہوگئی" اس جملے کے معنے کیا ہیں اس سے صرف ہندوؤں کا دل دکھانا مقصود ہے۔ افسوس کہ بدر النسا کی مصیبت کے صفحوں سے بھی شرر کا دلی تعصب پھیکی روشنائی کیطرح پھوٹ نکلا۔ مگر "تحوند اتحوند" کی بانگ چلی جاتی ہو۔

ٹھوکر نمبر ۴۲۔ ذرا ذیل کا جملہ ملاحظہ ہو۔ شوکت حسین نے (بٹیا بدرو) کی شادی سے انکار تو نہیں کیا تھا مگر ٹالا تھا کہ ابھی بالکل قبل از وقت ہے۔ مگر کبری بیگم کی ضد اور پھر میاں (شوکت حسین) کے مقابلہ میں تابڑ توڑ خط جانا شروع ہوئے یہاں تک کہ انھوں نے مجبور ہو کر لکھ دیا تمھیں اختیار ہے" اس جملہ میں یوں تو تمام الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں مگر درمیان کا یہ فقرہ کہ "اور پھر میاں کے مقابلہ میں تابڑ توڑ خط جانا شروع ہوئے" لاوارث کی لاش کی طرح شرر کی زباندانی کی پکی سڑک پر پڑا ہوا ہو نہ یہ اپنے پیشتر کے فقروں سے چسپاں ہے نہ بعد کے فقروں سے۔ تسلسل عبارت بالکل غت ربود ہے اور (پھر) کی کیا ضرورت ہے۔ نیز میاں کے مقابلہ میں (خط جانا) چہ معنی دارد۔ آخر شرر پر کسنے جبر کیا تھا کہ اس موقع پر مقابلہ کا لفظ لکھو نشد یہ لکھ سکتے تھے کہ میاں کے پاس تابڑ توڑ خط جانے لگے)

ٹھوکر نمبر ۴۳۔ جب عسکری (ساتھ (بٹیا بدرو) کی شادی ہوگئی تو اس واقعہ کو

(۱) پہنچ پھر اسمیں گناہ کیا ہے جس وقت شرر نے بدر النسا کی مصیبت لکھی تھی اسوقت وہ اتحاد کے اڈیٹر نہیں بنے تھے اور یہ خوف نہ تھا کہ ہندو چندہ نہ دینگے ۱۲

شرر صاحب یوں شرمناک لہجہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ گڑیا گڈے کی سی شادی تو کیا نکاح ہوگیا اور قاضی کو بلوا کے دو بول پڑھوا دیے گئے۔

واللہ کیا شرر کے قلم نے اس موقع پر بھوکے چوہے کی طرح قلابازی کھائی ہے لکھنا تھا کہ (نکاح تو کیا ہوا گڑیا گڈے کی سی شادی ہوگئی) اور لکھ گئے کہ گڑیا گڈے کی سی شادی تو کیا نکاح ہوگیا" اوندھی عقل اسی کا نام ہے۔ ٹھوکر نمبر ۴۴ لکھنؤ کے خانہ ساز زباندان حضرت شرر فرماتے ہیں کہ "سسرال کی آب و ہوا انکے مزاج کے بہت ناموافق تھی اور خدا ہی ہے جو بھائی کا گھر بھی آیندہ ایسا صحت بخش رہے اس لئے کہ وہاں سے سمدھیانہ ہوگیا" کیوں صاحب یہ (وہاں سے کیا بلا ہے (وہاں سمدھیانہ ہوگیا) تو درست ہے یہ (سے) اس جملہ میں گندھی کیطرح اپنی ٹانگ اڑائے دیتا ہے۔

راقم۔ در ہر جگر سے ہست خراشِ سخنِ ما
الماس تراش است تراشِ سخنِ ما

اودھ پنچ مطبوعہ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۰۶ء

نکلا جو رن میں پنچ کا خنجر غلاف سے

اڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے

بدرالنسا اور اسکی مصیبت نمبر

ٹھوکر نمبر ۴۵ حضرت شرر فرماتے ہیں (لڑکی کو بھی اکبر علی نے حیدرآباد سے

لہ پنچ دیکھنا قاضی کے گھر کا چوہا تو نہیں ہی ۱۲ لہ جیسے کہ سسرال کی آب ہوا انسان سے۔ دماغ میں شوخی دکھانیکے مضر ہو ۱۲

مدرسۂ نسواں میں داخل کر دیا تھا جہیں پانچ چار سال (حاضری کرنا) کس زبان کے کھیت کی مولی ہے (حاضری کرنا) تو صاحب لوگوں کے بیرا یا خانساماں بھی نہیں بولتے نہ یہ کسی انگریزی محاورہ کا ترجمہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ چونکہ شررؔ کی لیاقت انگریزی میں اکثر ڈگری یافتہ لوگوں سے بڑھی ہوئی ہے اس لئے اُنھوں نے ایک انگریزی محاورہ کا ترجمہ کر دیا۔ اسکول یا کالج میں **حاضری دینا** عام محاورہ ہے اس موقع پر یہ لکھنا تھا کہ **چار پانچ سال حاضر رہ کر پڑھنا لکھنا آگیا** آیا الخ))

ٹھوکر نمبر ۶۳ مسئلہ (غنت ربود) کے وزن پر لکھا گیا ہے کہ سب سے زیادہ **قابل لحاظ یہ ہے** کہ کبری بیگم کے مزاج میں تھوڑا بہت اعتدال پیدا ہو گیا" افسوس کبری بیگم کے مزاج میں تو اعتدال پیدا ہو گیا شررؔ کی زباندانی کی دُم گندھی کی ٹانگ کی طرح سیدھی نہ ہوئی۔ لکھنا چاہیئے تھا کہ سب سے زیادہ **قابل لحاظ یہ بات ہے** "کہ کبری بیگم کے مزاج" الخ اور لکھ گئے کہ سب سے زیادہ **قابل لحاظ یہ ہے** الخ کیوں کیسی کہی۔ بات بات میں فرق ہے۔

ٹھوکر نمبر ۶۴ فرماتے ہیں کہ (کبری بیگم) ...... گھر میں رہتے رہتے پرانی ہو گئیں گئی اور بچے **گود میں پلکے** پیوں پیوں چلے اور اب انگنائی میں دوڑے دوڑے پھرتے ہیں"

سبحان اللہ و بحمدہ۔ شررؔ خالی زباں داں ہی نہیں ہیں بلکہ سلامتی سے مصور بھی ہیں کیا بچوں کے پلنے کی اور انگنائی میں دوڑنے کی تصویر کھینچی ہے آہاہا استاد کا شعر یاد آگیا ؎

چشمان تو زیر ابروانند — دندان تو جملہ در دہانند

مگر ابھی تصویر ناتمام ہے۔ یوں لکھتے کہ گود میں پلکے پیٹوں پیٹوں چلے۔ اب انگنائی میں دوڑے دوڑے پھرتے ہیں اور آیندہ سڑک پر آہستہ آہستہ چلیں گے اور اپنے پاؤں سے۔ مطلب یہ ہے کہ تینوں صیغے ماضی حال مستقبل آ جاتے ہیں غالبًا

حضرت شرر صرف و نحو کا یہ باریک و نازک مسئلہ سمجھ گئے ہوں گے۔" یہ گھٹنیوں کی جگہ یتوں خاص کرسی کی زبان ہے۔" افسوس کہ کبریٰ بیگم تو گھر میں رہتے رہتے پرانی ہو گئیں۔ مگر حضرت شرر لکھنؤ میں پرانے نہ ہوئے۔

ٹھوکر نمبر ۴۸ - کبریٰ بیگم کو یہ سارٹیفکٹ دیا جاتا ہے کہ اب وہ پہلی سی بات بات بدگمانی نہیں ہے چہ خوش چرا نباشد دو لفظ کا جملہ بھی سیدھی طرح نہیں لکھ سکے اور زمانہ بھر سے خم ٹھونک کر لڑنے کو تیار۔ لکھنا تھا کہ **اب وہ پہلی سی بدگمانی بات بات پر نہیں ہے**" اور لکھ گئے اُلٹا نظم میں تو تعقید سنی تھی مگر نثر کی تعقید ایجاد کرنے کا سہرا شرر کے سر ہے۔ مگر ہم بھی اصلاح دینے پر تلے ہوئے ہیں اگر گندھی کی ٹانگ کی طرح شرر کی نثر کا بل نہ نکال دیا ہو تو نام نہیں۔

ٹھوکر نمبر ۴۹ - کبریٰ بیگم خاص لکھنؤ کی شریف زادیوں کے لہجہ میں اپنے میاں سے فرماتی ہیں کہ (تم تو بے فکر بنے بیٹھے ہو اور میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ اے سبحان اللہ اس چھوٹے سے جملہ میں کیا (بنے بنی) کا جوڑا موجود ہے کیوں نہ ہو یہ امانت مرحوم کا رنگ اُڑایا ہے اور تناسب لفظی میں جیسی کامیابی اُنھیں نظم میں ہوئی ویسی شرر کو نثر میں ہوتی نظر آتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو محض اسقدر لکھنا چاہئے تھا کہ (تم تو بے فکر بیٹھے ہو میری جان پر بنی ہے) شرر نے جو (بنی) کے لئے خواہ مخواہ اور بے موقع (بنا) تجویز کیا تو یہ تناسب لفظی کا خبط ہے۔ **ٹھوکر نمبر ۵۰** - ذیل کے جملہ سے شرر کی حساب کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے فرماتے ہیں کہ (کوئی ہفتہ نہ گذرتا جسمیں **دس بارہ خط نہ لکھ کر** روانہ کرنا پڑتے ہوں اس نہیں نہیں پر بھی اتنے خط لکھے گئے کہ **دو مہینے میں ڈیڑھ سو سے زیادہ** خط علی اکبر کے پاس پہونچے) دو سطروں میں (حافظہ نباشد) اسی کا نام ہے۔ دو مہینے میں ڈیڑھ سو خط اسی حالت میں روانہ ہو سکتے ہیں جبکہ ہر ہفتہ اُٹھارہ اُنیس خط روانہ کئے جائیں۔ مگر شرر صاحب یہ فرما چکے ہیں کہ ہر ہفتہ میں دس بارہ خط جاتے تھے خیر جو کچھ ہو

شرر کی غلطی سہی۔ مگر پوسٹ آفس کا فائدہ ضرور ہو یا ہوگا۔ ایک نزاکت اور اس جملہ میں ہے
یعنی شرر صاحب نے اس بات کی تشریح کر دی ہے کہ خط لکھ کر روانہ کیئے جاتے تھے معلوم ہوتا ہے
کہ کرسی میں بے لکھے خط بھی روانہ کیئے جاتے ہیں۔ واللہ شرر نے بھی عجب طبیعت
پائی ہے۔ کہیں تو پورا اڑا جاتے ہیں جملہ کا جملہ اور کہیں بھرتی کے الفاظ بھر دیتے ہیں"

ٹھوکر نمبر ۵۱۔ حضرت شرر یعنی سرپرست زبان لکھنؤ" فرماتے ہیں کہ ڈیڑھ سو سے
زیادہ خط اکبر علی کے پاس پہونچے اور ہر ایک میں یہی تھا کہ بیٹی کو کب بھیجو گے"
دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ڈاکیہ نے شوکت حسین کو خط دیا ... مضمون یہ تھا کہ بیٹی کے
بھیجنے پر تو راضی ہیں" افسوس صد افسوس! بھلا لکھنؤ کا کوئی شریف اپنے کسی عزیز کو
مخاطب کرکے یہ کلمہ زبان سے نکالے گا کہ "بیٹی کو کب بھیجو گے" لکھنا چاہئے تھا کہ بیٹی کو
کب روانہ کرو گے۔ اور لکھ گئے ایسا لفظ جسمیں صاف ذم کا پہلو موجود ہے۔ شرر کو یاد رکھنا چاہیئے
کہ شرفائے لکھنؤ کی یہ زبان نہیں ہے۔ یہ پیام یار کی زبان ہو تو ہو بھیجو گے۔ یا بھیجنے پر راضی
ہیں۔ اس موقع پر نہایت خراب معنی پیدا کرتے ہیں۔ عقلمند را اشارہ کافی ست"

اب زیادہ صاف صاف کیا کہوں ع ہوتا ہے دوات میں قلم مست۔ عسکری کی
شادی میں دھوم دھام کرنے کی نسبت شوکت حسین کبری بیگم سے لکھنؤ کی زبان میں فرماتے
ہیں کہ اول تو میرے پاس نہ نوں روپیہ نہیں اور اگر قرض وام کرکے بند و بست بھی ہوا تو
جو کچھ کروں گا لکھنؤ میں خاص اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سامنے کرونگا"
کیوں نہ ہو۔ کیوں نہ ہو۔ واقعی پردہ کی مخالفت کے یہی معنی ہیں جب پردہ اٹھانا ہی ہے
تو عزیزوں اور دوستوں سے کیا پردہ افسوس ہے تو اس قدر کہ لکھنؤ کا نام کیوں بدنام کیا گیا
اگر یہ لکھتے کہ "کرسی میں خاص اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سامنے کرونگا"
تو چنداں ہرج نہ تھا۔ اور دلگی سنیئے جب شوکت حسین نے کہا کہ خاص اپنے عزیزوں اور

لہ اس جملہ کی تعقید شرر کی تقلید میں ہے ۱۲ ؎ پینچ یہ آپ بیتی ہے کہ جگ بیتی ۱۲

دوستوں کے سامنے کرونگا، تو شرر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسی بات تھی کہ کبریٰ بیگم کے دل پر بھی جم گئی" مناسب بھی یہی تھا۔

راقم۔ در ہر جگرے ہست خراشِ سخنِ ما
الماس تراش است تراشِ سخنِ ما

از اودھ پنچ مطبوعہ ۲۴ اگست ۱۹۰۵ء

رباعیات انیس و دبیر و سودا از جنت

بت کی وقعت نہیں خدا کے آگے بگڑا نسیم سے بگڑتے ہیں شرر	کیا زاغ کا رتبہ ہے ہما کے آگے چنگاری ہے کیا چیز ہوا کے آگے

(انیس از جنت)

جب غیظ سے گرما کے بگڑتے ہیں شرر لیکن یہ نسیم سے بگڑنا کیا خوب	پھولوں کے عوض دہن سے جھڑتے ہیں شرر سبحان اللہ ہوا سے لڑتے ہیں شرر

(دبیر از جنت)

سودا کی رباعی شرر کے نام

مطبوعہ اودھ پنچ ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء

تو فخر آغا[1] نی شدہ وفا ساقط از و آتش زنِ اتحاد باہم ہستی	تو ماہر دین ہستی وہم ساقط از و نامِ تو شرر ہست و را ساقط آز و

(رفیع السودا از خلد بریں)

[1] یہ صنعت آغا نی کا سرمایۂ افتخار ہے بنت حضرت سکینہ بنت الحسین کا خلط تھا۔ کہدا ہے ۱۲

مثنوی گلزار نسیم

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری[۱] | ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر | حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ[۲] انگلیوں میں یہ حرف زن ہے | یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
ختم[۳] اس پہ ہوئی سخن پرستی | کرتا ہے زباں کی پیش دستی

خواستگاری جناب باری سے مثنوی گلزار نسیم کی ترتیب کے واسطے

یارب[۴] مرے خامہ کو زباں دے | منقار ہزار داستاں دے

۱؎ ہر شاخ الخ شگوفہ بمعنی گل۔ اور نیز ممکن ہے کہ بجائے شگرف کاری شگوفہ کاری تحریف کیا ہو شگوفہ صحیح ماننے کی صورت میں حاصل معنی یوں ہوگا کہ وہ ایسا نقاش ہے جسنے ایک شاخ میں بھی اپنی صنعت گلکاری ظاہر فرمائی اور بلحاظ شگرف کے بھی کہتے ہیں یہاں تک کہ شاخ قلم میں بھی اپنی صنعت ظاہر کی یعنی اپنی حمد کے ثمرہ سے بارور کیا ہے ۱۲ ۲؎ پانچ الخ یعنی اسکا پانچ انگلیوں کے بغیر لکھنا دلیل ہے مطیع پنجتن ہونیکی ۱۲ م ش ۳؎ ختم الخ زبان کی سخن پرستی تو ظاہر ہے کہ جز بات کرنیکے اسکا اور کوئی فعل ہی نہیں ہے مگر بعد زبان کے اگر سخن پرست ہے یعنی بات کا بیان کرنیوالا تو بس قلم ہے ۱۲ ۴؎ یارب الخ زبان دے یعنی خامہ کی زبان کو شعر و شاعری دے منقار سے مراد سر قلم کمال اسمعیل ؎ طوطی عقل شکرخائے شود ✤ ہر کجا زد قلم منقارے ✤ یعنی جیسے بلبل انواع نغمات پر قادر ہوتی ہے میرے قلم کو انواع سخن پر قادر کردے ۱۲ ش

افسانۂ گلِ بکاؤلی کا — افسوں ہو بہارِ عاشقی کا
ہر چند سنا گیا ہے اس کو — اُردو کی زباں میں سخن گو
وہ نثر ہے دادِ نظم دوں میں — اس مے کو دو آتشہ کروں میں
ہر چند جو اگلے اہلِ فن تھے — سلطانِ قلمروِ سخن تھے
آگے اُن کے فروغ پانا — سورج کو چراغ ہے دکھانا
یہ سحرِ سخن سدا ہے باقی — دریا نہیں کار بند ساقی
طعنہ[۱] سے زبان نکتہ چیں روک — رکھ لے مری اہلِ خامہ میں نوک
خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر — نیرنگ نسیم باغ کشمیر
نقطے ہوں سپند خوش بیانی — جدول ہو حصار سحر خوانی
جو نکتہ[۲] لکھوں کہیں نہ حرف آئے — مرکز پہ کشش مری پہنچ جائے

داستان تاج الملوک شاہزادہ اور زین الملوک بادشاہ مشرق کی

رودادِ زمان پاستانی — یوں نقل ہے خامہ کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ — سلطان زین الملوک ذی جاہ
لشکر کش و تاجدار تھا وہ — دشمن کش و شہریار تھا وہ
خالق نے دیے تھے چار فرزند — دانا عاقل ذکی خردمند
نقشا[۳] ایک اور نے جمایا — پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا

۱ طعنہ الخ نوک رکھ لے یعنی میری نوک رہ جائے یہ محاورہ ہے مثلاً زید کی بات رہ گئی یعنے اللہ نے بات رکھ لی علیٰ ہذا نوک رکھ لی ۱۲ م ش ن

۲ جو نکتہ الخ نکتہ بھی ہو کہ نکتہ تحریف نقطہ اور نکتہ بھی ہو سکتا ہے معنی یہ کہ میرے کسی مضمون پر اعتراض نہ ہو سکے اور میری کشش یعنے لہ کشش اور فکر سے دلی مقصود تک پہونچ جائے ۱۲

۳ نقشہ یعنی اپنی پیدائش کا نقشہ اور پیش خیمہ سے مراد آثار حمل کے آثار ۱۲ م ش عفا عنہ

امید[1] کے نخل نے دیا بار | خورشید حمل ہوا نمودار
وہ نور کہ صدقے مہر انور | وہ رُخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو | چشمک تھی نصیب اُس پدر کو
خوش ہوتے ہی طفل مہ جبیں سے | ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو | پھر دیکھ نہ سکیے گا کسی کو
نظروں سے گرا وہ طفل ابتر | مانند سرشک دیدۂ تر
پردے سے نہ دایہ نے نکالا | پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
تھا افسر خسرواں وہ گلفام | پالا تاج الملوک رکھ نام
جب نام خدا جواں ہوا وہ | مانندِ نظر رواں ہوا وہ
آتا تھا شکارگاہ سے شاہ | نظّارہ کیا پسر کا ناگاہ
صاد[2] آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی | بینائی کے چہرے پر نظر کی
مہر[3] لبِ شہ ہوئی خموشی | کی نورِ بصر سے چشم پوشی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی | چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
ہر چند[4] کہ بادشاہ نے ٹالا | اُس ماہ کو شہر سے نکالا

[1] امید کے الخ خورشید حمل ہوا نمودار۔ حمل سے مراد برج حمل ہے نہ کہ حمل اور خورشید سے آفتاب یعنی وہ لڑکا ماں کے پیٹ سے یوں نکلا جیسے آفتاب برج حمل سے طالع ہوتا ہے اور تحویل آفتاب برج حمل میں نوروز کے دن ہوتی ہے جو بڑی خوشی کا دن ہے ۱۲ [2] صاد الخ دوسرے مصرع میں بینائی کی تحریف بینائی کی زد یعنی آنکھیں چار ہوتے ہی یا آنکھ کنکھیوں نے دیکھنے کی ممانعت کر دی تھی مگر مقتضائے شوق دیدار بیتاب ہوکر چہرہ کو نظر بھر کر دیکھا ۱۲ [3] مہر لب شہ الخ کی نور بصر نے چشم پوشی۔ نور بصر سے مراد بینائی چشم یعنی نور بصر نے بادشاہ سے چشم پوشی اختیار کر لی اور نور بصر کا چشم پوشی کرنا بینائی کا جاتا رہنا مراد ہے ۱۲ [4] ہر چند الخ شہر عربی میں معنی ماہ ہے جا سکے کہ تاج الملوک کو شہر بدر کیا لطف کا پہلو یہ ہے کہ ہر چند چاند شہر سے نکل ہی نہیں سکتا مگر انھوں نے کمال کیا کہ ماہ کو شہر سے نکال دیا یعنی بادشاہ نے ہر چند ٹالا مگر بھائی شہر بدر کر کے رہے ۱۲ م ش

گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور
خارج ہوا نور دیدۂ کور

آیا کوئی لے کے نسخۂ نور
لایا کوئی جا کے سرمۂ طور

تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور
بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے
مختار ہے جس طرح بنا ہے

جانا چاروں شاہزادوں کا تجویز کحال تلاش گل بکاؤلی کو

پایا جو سفید چشم صفحا
یوں میں قلم نے سرمہ کھینچا

تھا اک کحال پیر دیریں
عینے کی تھیں لگا کے آنکھیں دیکھیں

وہ مرد خدا بہت کراہا
سلطاں سے ملا کہا کہ شاہا

ہے باغ بکاؤلی میں اک گل
پلکوں سے اسی پہ مار چنگل

خورشید میں یہ ضیا کرن کی
ہے مہر گیا اسی چمن کی

اس نے تو گل ارم بتایا
لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا

شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار
رخصت کیے شہ نے چار ناچار

شاہانہ چلے وہ لے کے ہمراہ
لشکر اسباب خیمے خرگاہ

وہ بادیہ گرد خانہ برباد
یعنی تاج الملوک ناشاد

میدان میں خاک اڑا رہا تھا
دیکھا تو وہ لشکر آ رہا تھا

پوچھا تم لوگ خیل کے خیل
جاتے ہو کدھر کو صورت سیل

بولا لشکر کا اک سپاہی
جاتی ہے ارم کو فوج شاہی

سلطان زین الملوک شہ زور
دیدار پسر سے ہو گیا کور

منظور[۱] علاج روشنی ہے
مطلوب گل بکاؤلی ہے

[۱] منظور الخ علاج روشنی چشم ہے یعنی روشنی پیدا ہونے کا علاج ۱۲

گل کی جو خبر سنائی اُسکو
گلشن کی ہوا سمائی اُسکو

ہمرہ کسی لشکری کے ہوکر
قسمت پہ چلا یہ نیک اختر

غلام ہونا چاروں شاہزادوں کا جو سر کھیل کر دلبر بیسوا سے

نقطوں سے قلم کی مہرہ بازی
یوں لاتی ہے رنگ بد طرازی

یک چند پھرا کیا وہ انبوہ
صحرا صحرا و کوہ در کوہ

بلبل ہوئے سب ہزار جی سے
گل کا نہ پتا لگا کسی سے

وارد ہوئے اک جگہ سرِ شام
فردوس تھا اُس مقام کا نام

اک نہر تھی شہر کے برابر
ٹوٹے کے سیارے کہکشاں پر

اک باغ تھا نہر کے کنارے
جویائے گل اُس طرف سدھارے

دلبر نام ایک بیسوا تھی
اُس ماہ کی واں مجلسرا تھی

دروازے سے فاصلے پہ گھر تھا
نقّارہ چوبدار در تھا

بیجا و بجا نہ سمجھے انجان
نقّارہ بجا کے ٹھہرے نادان

آواز پہ وہ لگی ہوئی تھی
آپ آن کے ٹھاٹھ دیکھتی تھی

جس شخص کو مالدار پاتی
باہر سے اُسے لگا کے لاتی

بہلا کے جوئے کا ذکر اٹھا کر
جو سر میں وہ لوٹتی سراسر

جیت اسکی تھی ہاتھ جو کچھ آتا
اُس کا کوئی ہتکھنڈا نہ پایا

بلّی کا سر چراغداں تھا
چوہا پاسے کا پاسباں تھا

اُلٹا تھے اڑھی پہ قسمت آسا
بلّی جو دبا تو موش پاسا

جیتے تھے زر اُس سے سب ہزاروں[1]
قسمت نے پھنسا لیے یہ بھی چاروں

[1] جیتے ہوئے تھے زر یعنی اسکی قسمت کی خوبی نے یا اسکی قسمت کی بڑائی نے یہ بھی چاروں اسکے دام میں پھنسا لیے یعنی محاورہ ہے ۱۲

صیاد[1] تھی لائی پھانس کر صید — کرسی پہ بٹھائے نقش امید
گھاتیں ہوئیں دلربائیوں کی — باتیں ہوئیں آشنائیوں کی
رنگ اُس کا جما تو لاکے چوسر — کھیلی وہ کھلاڑ بازی بدکر
وہ چھوٹ پہ تھی یہ میل سمجھے — بازی چوسر کی کھیل سمجھے
مغرور[2] تھے مال و زر پہ کھیلے — سامان ہارے تو سر پہ کھیلے
بدبختی سے آخری جو اُٹھا — بندا ہونا بدا ہوا تھا
دو ہاتھ میں چاروں اُسنے لوٹے — پنجے میں پھنسے تو چھکے چھوٹے
ایک ایک سے رات بھر نہ چھوٹا — پو پھٹتے ہی جگ انھوں کا ٹوٹا
زنداں کو چلے مچل مچل کر — نردوں کی طرح پھرے نہ چل کر
لشکر میں سے جو گیا سوئے شہر — پانی سا پھرا نہ جانب نہر

جیتنا تاج الملوک کا دلبر بیسوا کو اور چھوڑ کر روانہ ہونا تلاش گل بکاؤلی میں

لانا زر گل جو ہے ارم سے — یوں صفحہ پہ نقش ہے قلم سے
وہ ریگ رواں کا گرد لشکر — یعنی تاج الملوک ابتر
حیران ہوا کہ یا الٰہی — لشکر پہ یہ کیا پڑی تباہی
اُٹھا کہ خبر تو لیجیے چلکر — گذرا در باغ بیسوا پر
حیران تھا یہ بلند پایہ — نکلی اندر سے ایک دایہ
لڑکا کوئی کھو گیا تھا اُس کا — ہمشکل یہ مہ لقا تھا اُس کا
بولی وہ کہ نام کیا ہے تیرا — فرزند اسی شکل کا تھا میرا

[1] صیاد تھی الخ کرسی پہ بٹھائے نقش امید یعنی پوری امید انکے جیت لینے کی ہوئی [2] مغرور الخ سر پہ کھیلے یعنی اپنی ذات کو نذر کھیلے کیونکہ سر یعنی ذات بھی آتا ہے دوسرا لطف یہ ہے کہ سر سامان سفر کو نکلے تھے پہلے سامان ہارے سامان نہ رہا تو سر پہ کھیلے بہر حال مراد سر سے ذات ہے ۱۲ م ش

بولا وہ کہ نام تو نہیں یاد[۱]
طفلی میں ہوا ہوں خانہ برباد

لیکن یہ میں جانتا ہوں دلگیر
مادر تھی مری بھی ایسی ہی پیر

بیٹا وہ سمجھ کے جی سے اُسکو
گھر لائی ہنسی خوشی سے اس کو

چلتے تھے اُدھر سے دو جواری
ایک ایک کی کر رہا تھا خواری

کہتے تھے[۲] فریب دو گی کیا تم
شہزادے نہ ہم نہ بیسوا تم

ذکر اپنے[۳] برادروں کا سُنکر
بولا وہ عزیز کسن تو مادر

کون ایسی کھلاڑ بیسوا ہے
شہزادوں کو جسنے زچ کیا ہے

بولی وہ کہ ہاں جو اہے بدکام
دلبر ایک بیسوا ہے خودکام

بلی پہ چراغ رکھ کے شب کو
چوسر میں وہ لوٹتی ہے سب کو

پاسے کی ہے کل چراغ کے ساتھ
وہ بلی کے سر پہ چوہے کے ہاتھ

شہزادے کہیں کے تھے بد اقبال
بندے ہوئے ہار کر زر و مال

بھائی تھے جوش خوں کہاں جائے
صدمہ ہوا درد سے کہا ہائے

پانسے کا چراغ کا اُلٹ پھیر
سوجھا نہ اُنھیں یہ دیکھو اندھیر

سوچا[۴] وہ کہ اب تو ہم ہیں آگاہ
جیتے ہیں تو جیت لیں گے ناگاہ

اک بلی جو چھیٹی چوہے کو بھانپ
نیولے نے بھگادیا دکھا سانپ

سمجھا وہ کہ ہے شگون نرالا
نیولا پکڑ آستین میں پالا

۱؎ بولا وہ الخ ممکن ہے کہ وہ تحریف ہو دیہ ای کی یعنی شہزادے نے کہا نام یاد نہیں لڑکپن سے آوارہ نانما ہوا ہوں" ۲؎ کہتے تھے الخ حاصل یعنی یہ ہے کہ دونوں شہزادوں و بیسوا کی ہار جیت کے قصہ کا حوالہ دے رہے تھے" ۳؎ ذکر اپنے الخ کوئی شعر مثنوی کا لطف سے خالی نہیں برادروں کے ساتھ لفظ عزیز کیا خوب لائے ہیں ۱۲ ۴؎ سوچا وہ الخ ممکن ہے کہ وہ تحریف ہے یہ کی اور یوں بھی با محاورہ ہے یہ کی تقدیر پر باقی مضمون شعر مشار الیہ ہوگا اور وہ کی تقدیر پر رکھ ساتھ ہوگا اور کاف کے بعد کا مضمون بیان ۱۲

چوسر ہی کے سیکھنے کو یکسر ۔ گھوما وہ برنگ نرد گھر گھر
اک روز اُسے ملگیا امیر ایک ۔ وہ صاحب جاہ دل سے تھا نیک
اشراف سمجھ کے لے گیا گھر ۔ بخشا اُسنے اسپ و جامہ و زر
اُس گل کے جو ہاتھ میں زر آیا ۔ جانبازی کو سُوے دلبر آیا
ملتی تھی کھلاڑ ڈنکے کی چوٹ ۔ نقارہ و چوب میں چلی چوٹ
آواز[1] وہ سن کے در پر آئی ۔ ہمراہ اُسے لے کے اندر آئی
کام اُس[2] کا تھا بسکہ کھیل کھانا ۔ چوسر کا جما وہ کارخانہ
وہ چشم چراغ بیسوا کے ۔ کرنے لگے تاک جھانک آکے
پھولا وہ کہ مار آستیں تھا ۔ چٹکی کے بجاتے ہی وہیں تھا
بلی تو چراغ پا تھی خاموش ۔ بل ہوگیا موش کو فراموش
ہنس ہنس کے حریف نے رُلایا ۔ مانند چراغ اُسے جلایا
پارے بہزار بد دماغی ۔ لی خضر نے غول سے چراغی
پاسے سے چلی نہ جعلسازی ۔ اُجڑی وہ بسا بسا کے بازی
سب ہار کے نقد و جنس ہارے ۔ جیتے ہوے بندے بد کے ہارے
بنیاد جو کچھ تھی جب گنوائی ۔ تب خود وہ کھلاڑ ٹھہرے آئی
پھر پاسے نے کی نہ پاسداری ۔ ہمت کی طرح وہ دل سے ہاری
پاسے کی بدی سے آشکارا ۔ راجہ نل سلطنت ہی ہارا بجلی
دانا تو کرے کب اسطرف میل ۔ ہارا ہے جوئے کے نام سے بیل

[1] آواز الخ دوسرے مصرع میں ہمرہ تحریف ہے ہمرہ کی کیونکہ بتقدیر ہمراہ بے تکلف مصرع موزوں ہے در اندر آئی یعنی باہر سے اندر آئی ۱۲ [2] کام اُس کا الخ یعنی از بسکہ اسکا کام کھیلنا تھا یا کھانا تھا دوسرا پہلو بعضے نسخہ میں یہ بھی ہے کہ کھیل کھانا تھا اور یہ بھی ہے مگر یہاں معنی اول مراد ہیں یعنی کھیلنا اور کھانا دوسرے مصرع میں جو تھا وہ تحریف ہو گیا ہے ۱۲

بارے دیکھا جو بیسوا نے ۔ بندہ کیا غیر کا خدا نے
سوچی کہ نہ اب بھی چال رہیئے ۔ شادی کا مزہ نکال رہیئے
بولی بہزار عجز و زاری ۔ تم جیتے میاں میں تم سے ہاری
لونڈی ہوں نہیں عدول مجھ کو ۔ خدمت میں کرو قبول مجھ کو
بولا وہ کہ سن یہ ہتھکھنڈے چھوڑ ۔ نقارۂ در کو چوب سے توڑ
یہ مال یہ زر یہ جتنے بندے ۔ یوں ہی یہیں رکھ بجنس چندے
بالفعل ارم کو جاتے ہیں ہم ۔ انشاء اللہ آتے ہیں ہم
بولی وہ سنو تو بندہ پرور ۔ گلزار ارم ہے پریوں کا گھر
انسان و پری کا سامنا کیا ۔ مٹی میں ہوا کا تھامنا کیا
شہزادہ ہنسا کہا کہ دلبر ۔ کچھ بات نہیں جو رکھیئے دل پر
انسان کی عقل گر نہ ہو گم ۔ ہے چشم پری میں جائے مردم
یہ کہہ کے اٹھا کہا کہ لو جان ۔ جاتے ہیں کہا خدا نگہبان
دولت تھی اگرچہ اختیاری ۔ پا مردی سے اسپہ لات ماری
جز جیب نہ مال پر پڑا ہاتھ ۔ جز سایہ نہ کوئی بھی لیا ساتھ
درویش تھا بندۂ خدا وہ ۔ اللہ کے نام پر چلا وہ

پہونچنا تاج الملوک کا سرنگ کھدوا کر باغ بکاؤلی میں اور گل لیکر پھرنا

کرتا ہے جو طے سواد نامہ ۔ یوں حرف ہیں نقش پائے خامہ
وہ دامن دشت شوق کا خار ۔ یعنی تاج الملوک دل زار
اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد ۔ صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا ۔ عنقا تھا نام جانور کا

مرغانِ ہوا تھے ہوش راہی | نقشِ کفِ پا تھے ریگ ماہی
وہ دشت کہ جس میں پرند و دو | یا ریگ رواں تھی یا وہ رہرو
ڈانڈا تھا ارم کے بادشا کا | اک دیو تھا پاسباں بلا کا
دانت اُس کے تھے گورکن قضا کے | دو نتھنے رہِ عدم کے ناکے
سر پر پایا بلا کو اُس نے | تسلیم کیا قضا کو اُس نے
بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک | فاقوں سے رہا تھا پھانک خاک
بے ریشہ یہ طفل نوجواں تھا | حلوا بے دود بے گماں تھا
بولا[1] کہ چکھوں گا میں یہ انساں | اللہ اللہ شکر احساں
شہزادہ کہ منہ میں تھا اجل کے | اندیشہ سے رہ گیا دہل کے
پل مارنے کی ہوئی جو دیری | سبحان اللہ شان تیری
اشتر کئی جاتے تھے اِدھر سے | پُر آرد و روغن و شکر سے
وہ دیو لپک کے مار لایا | غراتے ہوئے شکار لایا
اونٹوں کی جو لوتھیں دیو لایا | دم اُس کا نہ اُس گھڑی سمایا
تیورا کے وہیں وہ بار بردوش | بیٹھا تو گرا گرا تو بیہوش
چاہا اُس نے کہ مار ڈالو | یا بھاگ سکو تو راستا لو
وہ اونٹ تھے کاروانیوں کے | سب ٹھاٹھ تھے میہمانیوں کے
میدہ بھی شکر بھی گھی بھی پایا | خاطر میں یہ اُس بشر کے آیا
میٹھا اُس دیو کو کھلاؤ | گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو
حلوے کی پکا کے ایک کڑھائی | شیرینی دیو کو چڑھائی

[1] قولہ بولا کہ الخ مصرعۂ اول میں کاف تحریف کتابت معلوم ہوتا ہے کیونکہ مصرعۂ اول بغیر کاف کے بہم بے تکلف موزوں ہوسکتا ہے یعنی ع بولا چکھوں گا میں یہ انساں ۱۲

ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا — حلوے سے کیا منہ اُس کا میٹھا
کہنے لگا کیا مزا ہے دلخواہ — اے آدمی زاد واہ وا واہ
چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو — کیا اسکے عوض میں دوں میں تجھکو
بولا وہ کہ پہلے قول دیجئے — پھر جو میں کہوں قبول کیجئے
وہ ہاتھ پہ اسکے مارکر ہاتھ — بولا کہ ہے قول جان کے ساتھ
بولا وہ کہ قول اگر یہی ہے — بد عہدی کی بو نہیں سہی ہے
گلزار ارم کی ہے مجھے دھن — بولا وہ ارے بشر وہ گلبن
خورشید کے ہم نظر نہیں ہے — اندیشہ کا واں گذر نہیں ہے
واں موج ہوا ہوا پہ اژدر — واں ریگ زمیں زمیں پہ اخگر
ہوتا جو نہ قول کا سہارا — بچتا نہ یہیں تو خیر ہارا
رہ جا مرا بھائی ایک ہے اور — شاید کچھ اُس سے بن پڑے طور
اک ٹیکرے پر گیا بلایا — وہ مثل صدائے کوہ آیا
حال اُس سے کہا کہ قول ہارا — ہے پیر یہ نوجواں ہمارا
مشتاق ارم کی سیر کا ہے — کوشش کرو کام خیر کا ہے
حمّالہ نام دیونی ایک — چھوٹی بہن اسکی تھی بڑی نیک
خط اُس کو لکھا یہ عبارت — اے خواہر مہرباں سلامت
پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد — رکھیو اسے جسطرح مری یاد
انسان ہو جائے کچھ جو سازش — مہمان ہے کیجیو نوازش
خط لیکے بشر کو لے اُڑا دیو — پہونچا حمالہ پاس بے ریو
بھائی کا جو خط بہن نے پایا — بھیجے ہوئے کو گلے لگایا
اُس دیونی پاس ایک حسیں تھی — زنبور کے گھر میں انگبیں تھی

پھر

محمودہ نام دختِ آدم	لے آئی تھی دیکھ دیونی دم
جوڑا ہم جنس ہاتھ آیا	محمودہ کے گلے لگایا
دن بھر تو الگ تھلگ ہی تھے وہ	دو وقت سے شام کو ملے وہ
تھے ضبط و حیا کے امتحاں میں	پردہ رہا ماہ میں کتاں میں
آپس میں کھلے نہ شرم سے وہ	خاطر کی طرح گرہ رہے وہ
بولا وہ فسردہ دل سحرگاہ	کیا سرد ہوا ہے واہ وا واہ
بولی وہ کہ ہونے کو ہوا ہے	جو غنچے کو گل کرے صبا ہے
بولا وہ یہی تو چاہتا ہوں	گل پاؤں تو میں ابھی ہوا ہوں
پیراہن گل کی بو تھی مطلب	یوسف نے کہا وہ حال یعقوب
اول کہی یہ لگا ہی اپنی	بعد اسکے وہ سب تباہی اپنی
کھولی تھی زباں منہ اندھیرے	کہتے سنتے اُٹھے سویرے
پوچھا رحمت اللہ نے مری جاں	ہم جنس ملا نکالے ارماں
بولی وہ کہ کہتے آتی ہے شرم	دل سرد رہا بغل ہوئی گرم
ناکامی کے جب وہ طور سمجھی	درہم اُس کو ہوا کچھ اور سمجھی
پوچھا کہ بتا تو روگ کیا ہے	درماں ہے کہ درد لادوا ہے
بولی وہ کہ ہے تو درد لیکن	تم چاہو تو ہے دوا بھی ممکن
وہ بولی جو تو کہے زباں سے	تارے لے آؤں آسماں سے
چہرے کو چھپا کے زیر چادر	محمودہ نے کہا کہ مادر
باپ اسکا ہوا اندھے پن سے مجہول	مطلوب بکاؤلی کا ہے پھول
دل داغ اُس کا برائے گل ہے	نرگس[لہ] کے لئے ہوائے گل ہے

لہ قولہ نرگس کیلئے یعنی اپنے باپ کی آنکھ کے لئے خواہش گل ہے ۱۲

ساعی تھی بدل یہ کہنے والی — راہ اُس نے سرنگ کی نکالی
دیووں سے کہا کہ جوہے بنجاؤ — تا باغ ارم سرنگ پہونچاؤ
سُن حاجت نقب بہرِ گلگشت — کترا جو ہوں نے دامنِ دشت
پوشیدہ زمیں کے دلیں کی راہ — حد باندھ کے خوش پھرے اسی راہ
جب مہر تہِ زمیں سمایا — اُس نقب کی رہ وہ آدم آیا
صحن چمن ارم میں اک جا — بوٹا سا تہِ زمیں سے نکلا
کھٹکا جو نگاہبانوں کا تھا — دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا
گوشہ میں کوئی لگا نہ ہووے — گوشہ کوئی تاکتا نہ ہووے
گو باغ کے پاسباں غضب تھے — خوابیدہ برنگ سبزہ سب تھے
نرگس کی کھلی نہ آنکھ یک چند — سوسن کی زباں خدا نے کی بند
خوش قد وہ چلا گل وسمن میں — شمشاد رواں ہوا چمن میں
ایوان بکاؤلی جدھر تھا — حوض آئینہ دار بام و در تھا
رکھتا تھا وہ آب سے سوا تاب — چندے خورشید چندے مہتاب
پھول اُسکا اندھے کی دوا تھا — رشکِ جامِ جہاں نما تھا
پانی[1] کے جو بلبلوں میں تھا گل — پہونچا لب حوض سے نہ خیگل
پوشاک اُتار اُتر کے لایا — پھولا نہ وہ جامہ میں سمایا
گل لے کے بڑھا ایاغ برکف — پتھری سے چلا چراغ برکف
بارہ دری واں جو سونے کی تھی — سو خوابگہ بکاؤلی تھی
گول اُسکے ستوں تھے ساعد حور — چلمن مژگان چشم مخمور

[1] پانی کے جو الخ غالبًا لفظ جو مصرعۂ اول میں تحریف کتابت سے زائد ہوگیا ہے کیونکہ بغیر جو کے بھی مصرع بلا تکلف موزوں ہے ۱۲ منش

دکھلاتا تھا وہ مکان جادو — محراب سے در سے چشم و ابرو
پردہ جو حجاب سا اُٹھایا — آرام میں اُس پری کو پایا
بند اس کی وہ چشم نرگسی تھی — چھاتی کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی
سمٹی تھی جو محرم اُس قمر کی — برجوں پہ سے چاندنی تھی سرکی
لپٹے تھے جو بال کروٹوں میں — بل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں
چاہا کہ بلا گلے لگائے — سوتے ہوئے فتنہ کو جگائے
سوچا کہ یہ زلف کف میں لینی — ہے سانپ کے منہ میں انگلی دینی
یہ پھول انھیں اژدہوں کا ہے من — یہ کالے چراغ کے ہیں دشمن
گل چیں کے ہنسی نہووے بالکل — خندہ نہو برق حاصل گل
پھر سمجھیں گے ہے جو زندگانی — کچھ نام کو رکھ چلو نشانی
انگشتری اپنی اُس سے بدلی — مہر خط عاشقی سند لی
آہستہ پھرا وہ سرو بالا — سایہ بھی نہ اُس پری پہ ڈالا
ہیبت سا زمیں کے دل میں آیا — اندیشہ کی طرح سے سمایا
جب نقب افق سے مہر تاباں — نکلا تو وہ ماہ رو شتاباں
گل ہاتھ میں مثل دست بیضا — اُس نقب کی آستیں سے نکلا
وہ دیونی اور وہ دُخت انسان — دونوں تھیں اسی کی منتظر واں
گل لے کے جب آملا وہ گلچیں — اس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں

گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بُلبل خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کھل کھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنے وہ بکاولی گل اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے
اُٹھی نکہت سی فرش گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل
جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل

ہے ہے مرا پھول لیگیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن تو بتا کدھر گیا گل

سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا

ٹھہرائیں خواصیں صورت بید
ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں

پتا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگی کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لیگیا کون
بیگانہ تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاولی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اُس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

ادھار پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں نہ ہلیں نہ تو نے سنبل

او باد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزہ سے راست مو براندام
انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا دم بخود اسکی سُن کے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اُس کا اُڑا غرض بدلنے — گلبرگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی — دست آویز اُسکے ہاتھ آئی
خاتم تھی نام کی نشانی — انساں کی دست بُرد جانی
ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عُریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اس کی جو کھینچئے سزا ہے
یہ کہہ کے جنوں میں غضبناک — خوں روئی لباس کو کیا چاک
گل کا سا لہو بھرا گریباں — سبزے کا سا تار تار داماں
دکھلا کے کہا سمن پری کو — اب چین کہاں بکاؤلی کو
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ
کہتی تھی پری کہ اُڑ کے جاتی — گلچیں کا کہیں پتا لگاتی
ہر باغ میں بھولتی پھری وہ — ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختہ میں مثل باد جاتی — اُس رنگ کے گل کی بُو نہ پاتی
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے — پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

پہونچنا تاج الملوک کا ایک اندھے فقیر کے تکیے پر اور آزمانا گل کا

پھرنا جو وطن کا مدعا ہے — اب صفحہ پہ یوں قلم پھرا ہے

وہ گلشن مدعا کا گل چیں،
بیٹے تاج الملوک حق بیں

جس وقت گل اُس چمن سے لایا
محمودہ خوش ہوئی کہ آیا

کہنے لگی تو مراد پائی
بولا وہ جو یاں سے ہو رہائی

گل کی وہ غرض کر آشکارا
جوبن کی طرح اُسے اُبھارا

جب دیو سیاہ شب سے مہتاب
رخصت ہوا جیسے چشم سے خواب

اور گل لیے آفتاب تاباں
ہنگام سحر ہوا شتاباں

وہ مہر وش اور وہ ماہ پیکر
اُس دیونی پاس آئی مضطر

گل کی وہ غرض جتائی اس کو
رخصت کی طلب سنائی اس کو

کیا کہتی وہ دیونی کہا جاؤ
دیووں سے کہا کہ تخت لے آؤ

دو بال دیے کہ تو مری لاگ
جب وقت پڑے دکھائیو آگ

دیو اُن کو سر پر بٹھا کے
پرواز کناں ہوا پہ جا کے

بولے کہ کدھر چلو گی کہہ دو
فردوس کے رُخ کہا ادھر کو

وہ مڑ کے اُدھر کو اُڑ کر آئے
گلزار میں بیسوا کے لائے

وقت سحر اور خنک ہوا تھی
گلگشت چمن میں بیسوا تھی

چار آنکھیں ہوئیں تو تھی شناسا
قدموں پہ گری وہ سایہ آسا

صدقے ہو کر کہا خوش آئے
جس گل کی ہوا لگی تھی لائے

ہمراہ یہ کون دوسری ہے
سایہ ہے کہ ہم قدم پری ہے

بولا شہزادہ شکر ہے ہاں
پر ہے گل آرزو سے داماں

محمودہ نام یہ جو ہیں ساتھ
پھول ان کے سبب سے آگیا ہاتھ

جیتا جو پھرا وہ رشک شمشاد
قیدی سے کیے بیسوا نے آزاد

شہزادہ نے بھائیوں کے بے نام
بھجوایا برائے داغ پیغام

چھوٹوں اس نے تھا ان کو تایا — سچوں کھوٹوں نے داغ کھایا
داغا[1] تو چلے تفنگ سے وہ — چھوٹے قید فرنگ سے وہ
چھوڑا ہوس گل و چمن کو — چاروں داغی پھرے وطن کو
بندوں کو کیا جب اس نے آزاد — آیا لب جو وہ رشک شمشاد
اسباب کو کشتیوں پہ کر بار — سونپا سب ناخداؤں کو گھر بار
جب متصل آ گیا وطن کے — خندے یاد آئے مرد و زن کے
سوچا کہ میں خود ہوں خانہ برباد — کیا جانیے کیا پڑے گی افتاد
لازم ہے گل اپنے ہاتھ رکھیے — موقع نہیں بہتر ساتھ رکھیے
لشکر کا انھیں کیا اشارہ — خود کشتی سے اتر گیا کنارہ
وہ پوربی[2] کر کے جو گیا بھیس — جنگلے کی راہ سے چلا دیس
تکیے پہ فقیر پیر اندھا — اک گوشہ میں آنکھیں مانگتا تھا
تھا نقش قدم سا خاک رہ پر — ٹھہرا وہ مسافر اس جگہ پر
بے تجربہ تھی نمائش گل — واجب تھی آزمائش گل
پتلی پہ زر گل آزمایا — سونے کو کسوٹی پر چڑھایا
گل سے ہوئیں چشم کور تاباں — ہو جیسے چراغ سے چراغاں
منہ دیکھ کے اس نے دیں دعائیں — نیچے سے مژہ کی لیں بلائیں
گل کے جو اثر سے شادماں تھا — گلچیں وہ ہوا سے ہمعناں تھا

[1] قولہ داغا تو چلے تفنگ سے وہ - تفنگ کی طرح چلنے سے صرف تیزی رفتار کا تشبیہ دینا مقصود ہے نہ یہ کہ رفتار تفنگ کی محاورہ ثابت کرنا مقصود ہو اور تشبیہ بہت ہی عمدہ ہے ١٢

[2] وہ پوربی الخ پوربی و جوگیا و جنگلہ و دیس سب راگنیوں کے نام ہیں اور دوسرا لطف یہ ہے کہ جنگلے کا وقت دیس کے پیشتر ہوتا ہے ١٢

ملنا چاروں شہزادوں کا اور چھن جانا گلِ بکاؤلی کا تاج الملوک سے اور بینا ہونا چشم زین الملوک کا

ہے بسکہ یہ چرخ جور پیشہ
یوں خار رہ قلم ہے ریشہ

یہ جا کے اُسی جگہ پہ ناگاہ
آپہونچے وہ چاروں غول گمراہ

کہتے تھے کہ واہ رے مقدر
کس شکل سے پھر کے جاتے ہیں گھر

کیا رنگ زمانہ نے دکھائے
گل لینے گئے تھے داغ لائے

کس منھ سے پدر کے آگے جائیں
کیونکر بے پھول منھ دکھائیں

ٹھہرائی کہ اور پھول لیجائیں
کحال کو بے وقوف ٹھہرائیں

اک باد ہوائی توڑ کر پھول
کہنے لگے پھول پھول کر غول

کیا پھول ہے کیا اثر ہے اسمیں
ہو جاتی ہیں روشن اندھی آنکھیں

وہ کور کہ ہو چکا تھا بینا
دیکھا اس نے جو یہ قرینا

بولا کہ یہ گل وہ گل نہیں ہے
اُس پھول کی اور گل زمیں ہے

وہ جوگی جو جاتے ہیں اگر آئیں
دکھلائیں وہ گل تو آنکھیں کھلجائیں

میں کور ابھی ہو چکا ہوں بینا
اندھا نہیں اب ہوا ہوں بینا

چاروں کو تھی حسرت گل تر
جو پائے ہوا کی طرح چل کر

اس جوگی کے جب برابر آئے
باہم کہا دیکھو پھول لائے

گل ہے کہ علاج نور ہے یہ
گل ہے کہ چراغ طور ہے یہ

جوگی یعنے وہ شاہزادہ
بولا کہ بکو نہیں زیادہ

پاتے اگر اُس درخت کی چھاؤں
رکھتے ہی نہ تم زمین پر پاؤں

ڈینگ آپ کی سب فضول ہے یہ
وہ گل یہ نہیں وہ پھول ہے یہ

یہ کہہ کے جو جیب سے نکالا — اُن مفت بروں نے ہاتھ ڈالا
قوت میں وہ چار تھے یہ بیکس — شورش میں وہ چار موج یہ خس
غولوں نے بزور پھول اُڑایا — اُس خضر کو راستہ بتایا
گل پانے سے بسکہ سُرخرو تھے — گھوڑوں پہ ہوا کے شکل بُو تھے
تعجیل سے رو براہ آئے — گل لے کے حضور شاہ آئے
گل لائے جو نور دیدہ دلخواہ — آنکھوں کی طرح پھڑک گیا شاہ
پہنچے سے پلک کے پھول اُٹھایا — اندھے نے گل آنکھ سے لگایا
نور آ گیا چشمِ آرزو میں — آیا پھر آب رفتہ جو میں
خورشیدِ بصر گہن سے چھوٹا — خیرات کے در کا قفل ٹوٹا
دولت جو پاس تھی لٹائی — زر بخشا گل کی رونمائی
ایک ایک کو اس قدر دیا زر — محتاج گدا ہوئے توانگر
بجوائے طرب کے کارخانے — بجوائے خوشی کے شادیانے

پہونچنا بکاؤلی کا دار الخلافت زین الملوک میں اور وزیر ہو کر تاج الملوک کی تلاش میں رہنا

گلچیں کا جواب پتا مِلا ہے — یوں شاخ قلم سے گل کھلا ہے
وہ بادِ چمن چمن خراماں — یعنی وہ بکاولی پریشاں
گلشن سے جو خاک اُڑاتی آئی — اُس شہر میں آتے آتے آئی
دیکھا تو خوشی کے چہچہے تھے — گلچیں کے شگوفہ کھل رہے تھے
گلبانگ زنان تھا جو جہاں تھا — ایک ایک ہزار داستاں تھا
پاتے ہی پتا خوشی سے پھولی — شاد ایسی ہوئی کہ رنج بھولی

جادو سے بنی وہ آدمی زاد ‏ انسانوں میں آ ملی پری زاد
سلطاں کی سواری آرہی تھی ‏ صورت جو نگاہ کی پری تھی
پوچھا اے آدم پریرو ‏ انسان ہے پری ہے کون ہے تو
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے ‏ ہے کونسا گل چمن کدھر ہے
دی اُس نے دعا کہا بصد سوز ‏ فرخ ہوں شہا میں ابن فیروز
گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں ‏ غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام ‏ کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت ‏ پوچھا کہ طلب کہا قناعت
باتوں پہ فدا ہوا شہنشاہ ‏ لایا بصد امتیاز ہمراہ
چہرے سے امیرزادہ پایا ‏ گھر لاکے وزیر اُسے بنایا
نذریں سے لئے بندگانِ درگاہ ‏ دستور سے آملے بصد جاہ
دربار میں چاروں شاہزادے ‏ دیکھے تو کھلے وہ دل کے سادے
چاہا[1] گلچیں کا امتحان لے ‏ پوچھا کہ نگیں جو لے کہاں لے
بتلانے لگے وہ چاروں ناداں ‏ کوئی یمن اور کوئی بدخشاں
جانا کہ جو گل یہ لائے ہوتے ‏ خاتم کے نگیں بتائے ہوتے
تجویز میں تھا یہ صاحبِ فکر ‏ آیا تاج الملوک کا ذکر
نقش اسکو ہوا کہ بس وہی ہے ‏ ان سادوں سے کندہ قلب ہوئی ہے

د دیکھے کہیں چاروں سیدھے سادے۔

[1] چاہا الخ - امتحان تاج الملوک کے لئے بکاؤلی نے چاروں شہزادوں کی طرف متوجہ ہوکر علی سبیل التفہیم یہ سوال کیا کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر کوئی انگوٹھیوں کیلئے نگینہ خریدے تو کہاں سے خریدے اور ایسا سوال اس موقع پر اس طریقہ سے کرنا مناسب اور بجا تھا اور نگینہ پر کیا موقوف ہے ہر شے کی نسبت انھیں الفاظ میں سوال کرسکتے ہیں مثلاً سوال دیکھوں صاحبو گھوڑا خریدنا ہو تو کہاں خریدے اور مقصود ایسے سوالات کا یہ ہوتا ہے کہ فلاں شے کہاں سے خریدنا مناسب ہوگا ۱۲ م ش

ظاہر نہ کیا بطون اپنا ۔۔۔ طالع سے لیا شگون اپنا
منزل گہِ رہرواں بنا کے ۔۔۔ شام و سحر اُسمیں آپ آکے
رہرو کو دیا بہ لطف و اکرام ۔۔۔ آتے آرام جاتے پیغام

آباد ہونا تاج الملوک کا گلشن نگارین بنوا کے اور شہرہ ہونا

تعمیر مکاں کے ہیں جو آثار ۔۔۔ یوں خامہ ہے بہر بیت معمار
شہزادہ کہ عازم وطن تھا ۔۔۔ گل پانے سے خوش چمن چمن تھا
اندھے کو کیا جب اس نے بینا ۔۔۔ اور داغیوں نے وہ پھول چھینا
سوچا کہ خوشی خدا کی غم کھاؤ ۔۔۔ حمالہ دیونی کو بلواؤ
نقل ارم اک مکاں بنا کے ۔۔۔ رکھو پریوں کو اپنی لا کے
بال آگ پہ رکھتے آندھی آئی ۔۔۔ وہ دیونی بال باندھی آئی
تنہا اسے دیکھ کر کہا ہیں ۔۔۔ محمودہ کیا ہوئیں کہاں ہیں (ہوئی)
دریا پہ ہوں اُن کو چھوڑ آیا ۔۔۔ مسکن کے لئے تمہیں بلایا
لیکن وہ مکان وہ حوض وہ باغ ۔۔۔ جو باغ بکاولی کو دے داغ
حمالہ نے دیوؤں کو کیا یاد ۔۔۔ آئے تو کہا یہ بن ہو آباد
ویرانے کو گل زمیں بناؤ ۔۔۔ گلزار جواہریں بناؤ
صناع طلسم کار تھے وہ ۔۔۔ گلشن کے لئے بہار تھے وہ
دیوؤں نے ادھر محل بنایا ۔۔۔ کشتی سے وہ دخترِ رز[لہ] کو لایا

لہ دیوؤں الخ دخت رز تحریف دخترک کی یعنی دختر محمودہ کو یا جفت برگی یا کسی اسی قبیل کے لفظ کی تحریف ہے کیونکہ نسیم کا تو ایک مرتبہ تھا کہ کم سمجھ سے کم سمجھ سخن گو بھی ایسا بے محل اور نامناسب مقام لفظ داخل نظم نہیں کر سکتا ۱۲ ش

حمالہ اُس کی مادرِ پیر — محمودہ سے ہوئی بغل گیر

کچھ دیوؤں کو چھوڑ کر وہیں پر — رخصت ہو کر چلی گئی گھر

گلشن میں سمن بروں کو لایا — نسریں بدنوں سے گھر بسایا

دونوں کو محل میں لا کے رکھا — پھل نخلِ مواصلت کا چکھا

دیوؤں کو کہا کہ بہرِ تمکیں — آباد ہو گلشن نگاریں

دیو آدمی بن کے بن میں آئے — آتے جاتے کو گھیر لائے

جو سُن کے خبر گیا ادھر کو — جنت سے نہ پھر پھرا وہ گھر کو

از بسکہ قریب شہر تھا باغ — خورشید افق نظر پڑا باغ

مفلس زردار امیر قلاش — نوکر تاجر فقیر خوش باش

گھر چھوڑ کر چل بسے سب انساں — پھر تن میں نہ آئے صورتِ جاں

[illegible] ز آدم

[illegible]

ملاقات ٹھہرنی زین الملوک اور تاج الملوک کی آپس میں

گلشن جو بنا جواہر آگیں — یوں صفحۂ قلم سے ہے نگاریں

ساعد نام ایک مہ لقا تھا — دلبر کا غلام باوفا تھا

صحرا سے جو سیر کر کے آیا — لکڑی کے چکا کے بوجھ لایا

دلوائے ہر ایک کو پئے قوت — الماس و عقیق و لعل و یاقوت

تھی بسکہ وہ جا خلاصۂ دہر — کچھ ٹھہرے کچھ آئے جانبِ شہر

کف میں جو وہ لعل بے بہا تھے — من پاتے ہی لوگ اژدہا تھے

شحنہ نے سُنا پکڑ بلایا — لے کر اظہار ساتھ آیا

دیکھا تو وہ جلوہ گاہِ امید — اک دائرہ تھا برنگ خورشید

دروازہ پہ دیوؤں کا تھا پہرا — بھجوا کے خبر وہ شحنہ ٹھہرا

جب واں سے طلب ہوا تو درباں — لائے اُسے بیٹھک گاہِ سلطاں

آداب کیا ادب سے ٹھہرا
ہیبت زدہ دُور سب سے ٹھہرا

ان لوگوں کو لے گیا تھا ہمراہ
معروض کیا کہ یا شہنشاہ

کم مایہ یہ لوگ ہیں بظاہر
چوری کے تو یہ نہیں جواہر

ساعد نے کہا کہ ہے یہ حاسد
نیت ہوئی ہوگی اسکی فاسد

حضرت یہ وہی تو ہیں تبردار
جا اِن سے نہ بولیو خبردار

پھر کر انھیں پاؤں شحنہ بے آس
آیا زین الملوک کے پاس

کی عرض کہ باغ اک بنا ہے
یہ شہر اُجڑا ہے وہ بسا ہے

جو کوئی ہے اُس جگہ یہ جاتا
ڈھیروں ہے جواہرات پاتا

حضرت نے کہا کہ بک نہ خیرہ
قارون کا وہیں ہے کیا ذخیرہ

فرخ کہ وزیر باخرد تھا
سلطاں کا مشیر نیک و بد تھا

بولا کہ شہا یہ بات کیا ہو
نیرنگ و فسوں کا گھر بڑا ہے

ہر چند کہ طرفہ حال ہے یہ
کچھ دور نہیں مثال ہے یہ

حکایت ایک عورت کے مرد بن جانے کی دیو کے جادو سے

ایک ملک میں اک صاحب فوج
رکھتا تھا محل میں بارور زوج

تھا داغ پسر مقدر اس کو
جنتی تھی ہمیشہ دختر اسکو

از بسکہ وہ شاہ تھا بداختر
کرتا تھا حسد سے قتل دختر

اکبار[1] محل میں پھر حمل تھا
وہ شاہ کہ ظلم میں مثل تھا

[1] اکبار الخ اس شعر کے دونوں مصرعوں میں تحریف بین ہوئی ہے ورنہ نسیم سا محقق اسیر خواجہ آتش جیسا اصلاح دہندہ اور پھر ایسی فاش غلطی ہو جائے کہ حمل کو حمل بالتحریک جائز رکھے ایسے قابل و لائق شعرا کے کلام میں ہی اغلاط قابل تسلیم ہوا کرتے ہیں جنکی اصلاح صحیح الفاظ میں متعذر ہو اور ایسے اغلاط جنکی ہمارے وقت کے اور ہم ایسے کج مج زبان دہلی کم نظر میرا اصلاح کر سکیں ہرگز تسلیم نہیں ہو سکتے کہ بغیر تحریف ہیں اور اس شعر کے اصل الفاظ غالبًا قریب قریب الفاظ ذیل کے ہونگے سه اکبار محل میں حمل تھا پھر — اور شاہ جو تھا ستم کا جابر ۱۲ م ش

کھا بیٹھا قسم کہ اب کی باری — بیٹا جو نہ دے جناب باری
اقبال کا کچھ نہ جانیئے اوج — کر ڈالئے ذبح دختر و زوج
کنیا تھی غرض کہ راس اُسکی — پوری نہ ہوئی وہ آس اُسکی
سلطاں کا جو عہد بے خلل تھا — گھر والوں کو خوف کا محل تھا
ملحوظ بدل ہُتا پردۂ راز — سیارہ شناسوں سے کیا ساز
ہر چند ستارہ ماں کا تھا ماند — تھی چاندنی شہرہ کر دیا چاند (ن ۔ از بسکہ)
۱ بیٹے کا وہ زائچہ بنا کے — گویا ہوئے دست بستہ آ کے
حضرت یہ پسر ہے نیک اختر — بدمُن مگر ہے ایک اختر
جبتک یہ چلے نہ اپنے پانوں — حضرت نہ پسر کے سامنے ہوں
حیلہ کرکے چھپا کے یک چند — بیتاب ہوا جب آرزومند
وہ گندم ۲ جو نما تھی بالی — مردانہ لباس سے نکالی
خوش ہو کے پدر نے بہر شادی — ٹھہرائی کہیں کی شاہزادی
بن ٹھن سکے عروس شکل داماد — شادی کو چلی بجانِ ناشاد
اک شب کسی دشت میں تھے ڈیرے — اور روز نکاح تھا سویرے
خیمہ سے وہ بے قرار نکلی — اُس چھلاوے سے مثل خار نکلی (ن ۔ [illegible])
دیکھا تو اندھیری رات سنسان — اک عالم ہو ہے اور بیابان
اک دیو وہاں پہ گشت میں تھا — جویائے شکار دشت میں تھا
دیکھا تو کہا خضر ملے آؤ — منہ کھولو عدم کی راہ بتلاؤ

۱ بیٹے کا الخ۔ مصرعۂ اول میں وہ تحریف ہے کیونکہ نصیر وہ کے بھی مصرع بے تکلف موزوں ہی ۱۲ ۲ وہ گندم الخ یعنی چونکہ وہ لڑکی ایسی تھی کہ گویا لڑکا معلوم ہوتی تھی گندم اور جو کے ذکر سے صرف ایک دوسرے کی ضد ہونیکا اظہار و بیان مقصود ہی نہ گندم و جو کی کمی و بیشی درجات ۱۲ م ش

بیدار کرنا مرد کا

بولا وہ کہ سُن تو آدمی زاد
کیوں تنگ ہے جی سے کیا ہو بیداد

اے مرد خدا خُدا کی سوگند
کہ جس لیئے ہو تو آرزومند

بولی وہ کہ یہ خیال ہے خام
خنجر کا ہو کیا نیام سے کام

کہہ کر کھلے بندوں جی کی تنگی
بے ننگ ہوئی وہ شوخ ننگی

آنکھیں جھپکا کے دیو بولا
تو کیا کھلی پردہ تو نے کھولا

خاطر تیری لے طلسم دکھلاؤں
تو مجھ سی بنے میں تجھ سا بنجاؤں

موند آنکھ کہا تو موند لی آنکھ
کھول آنکھ کہا تو کھولدی آنکھ

پائے مردانگی کے پرتو
دامن میں سے دی چراغ نے لو

تھا لے میں یہاں اُوگا صنوبر
واں شیشہ رہا ترش کے ساغر

اب یاں سے ہے قصہ مختصر طول
فرخ کہ وہ تھا وزیر معقول

بولا کہ شہا جو یہ ہوا ہے
اس بات کا پھر وجود کیا ہے

شہ نے کہا سُن وزیرِ دانا
بے دیکھے سنے کو کس نے مانا

یاد آئی مجھے بھی اک روایت
یہ کہہ کے بیان کی حکایت

حکایت نصیحت گری مُرغ اسیر و نافہمی صیاد کی

اک مُرغ ہوا اسیر صیاد
دانا تھا وہ طائر چمن زاد

بولا جب اُس نے باندھے بازو
کھلتا[1] نہیں کس طمع پہ ہے تو

بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں
گر ذبح کیا تو مشت پر ہوں

پالا[2] تو مفارقت ہے انجام
دانا ہو تو مجھ سے لے مرے دام

[1] کھلتا نہیں الخ یعنے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس چیز کی طمع ہے ۱۲

[2] پالا تو الخ مفارقت ہے انجام یعنے زندگی کا کچھ اعتبار نہیں ۱۲

بازو[۱] میں نہ تو مرے گرہ باندھ سمجھاؤں جو پند اُسے گرہ باندھ
سن کوئی ہزار کچھ سنا کے کیجیے وہی جو سمجھ میں آئے
قابو ہو تو سست کیجیے نہ غفلت عاجز ہو تو ہاریے نہ ہمت (دہو عجز)
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے
طائر سے کے یہ سن کلام صیاد بن دامون ہوا غلام صیاد
بازو سے کے جو بند کھول ڈالے طائر نے تڑپ کے پر نکالے
اک شاخ پہ جا چہک کے بولا کیوں پر مرا کیا سمجھ کے کھولا
ہمت نے مری مجھے اُڑایا غفلت نے تری مجھے چھڑایا
دولت نہ نصیب میں تھی تیرے تھا لعل نہاں شکم میں میرے
دے کر صیاد نے دلاسا چاہا پھر کچھ لگائے لاسا
بولا[۲] وہ کہ دیکھ کر کیا جل طائر بھی کہیں نگلتے ہیں لعل (یہ بھی)
ارباب غرض کی بات سن کر کر لیجیے یک بیک نہ باور
فرّخ یہ وہی شل نہ ہوئے دیکھ آج جو تجھے دہل ہوئے
مشتاق تو تھا چلا وہ دستور دکھلائی دیا وہ بقعۂ نور
نقشے میں وہ گلشن نگاریں گلزار ارم سے تھا خوش آئیں
حیرت تھی کہ یہ طلسم کیا ہے پردیس میں ہوں کہ گھر مرا ہے
اس سوچ میں تخت گہ تک آیا حیران وہ وزیر شہ تک آیا
آداب اک کر کے حسب دستور ٹھہرا تو وہ بادشاہ مستور
سمجھا کہ حسین آدمی ہے کیا جانے کہ خود بکاؤلی ہے

[۱] بازو میں الخ اسے گرہ باندھ یعنی اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لے ۱۲ [۲] بولا وہ الخ مصرع اول میں ضرور کچھ تحریف ہے ممکن ہے کہ یوں ہو ۔ بولا وہ کہ دیکھ یہ بھی تھا جل ۱۲

(ت) پہنچنا وزیر زادہ کا محل

پوچھا کہ کدھر سے آئے کیا نام
بولا وہ کہ نام سے ہے کیا کام

انسان ہوں بندۂ خدا ہوں
بھیجا زمین الملوک کا ہوں

گستاخی معاف آپ آئے
بن گھیر لیا مکان بنائے

بہکا کے بسائے مردم شہر
حضرت کا بڑا ہے آپ پر قہر

دعویٰ یہ ہے یاں زمین دابی
آبادی میں آئی ہے خرابی

خیراب بھی رفع شر جو چاہو
سر آنکھوں سے چل کے جیسا ہو

بولا کہ وہ فتنہ گر نہیں ہم
شر جن سے ہو وہ بشر نہیں ہم

درویشی میں دل کے بادشاہ ہیں
مسند کے تکیہ کے گدا ہیں

دستور کہ عرض کر چکا تھا
شل دل بدگماں مُرکا تھا

بولا چلو صلح درمیاں ہو
باہم مہ و مہر کا قراں ہو

بولا وہ فقیر کی بلا جائے
مشتاق جو ہو وہ شوق سے آئے

بولا وہ کہ خیر تا بہ فردا
اُٹھ جائے گا درمیاں سے پردا

یہ کہہ کے پھرا وزیر آیا
پہونچا تو وہ شہر خالی پایا

شہزادہ و شہ محل میں تھے واں
برہم زدہ بزم کے چراغاں

شہ نے جو وزیر آتے دیکھا
فرخ فرخ پکار اُٹھا

سلطان کے نثار ہو کے دستور
بولا کہ بلائے شاہ ہو دور

دیکھ آیا میں وہ مکان یاقوت
ہے معدن لعل و کان یاقوت

تخت ہے زمردیں کہ مینو
گلشن ہے جواہریں کہ جادو

نقشا کہوں کیا نگار خانہ
جادو کا تمام کارخانہ

دیووں کی بنائی ہے وہ بنیاد
رہنے والے ہیں آدمی زاد

واں صاحب تاج و تخت جو ہے
درویش ہے شاہ نام کو ہے

دیو[1] اسکے عمل میں آ گئے ہیں — جادو کے محل بنا گئے ہیں
کل آپ بھی چل کے کیجیے سیر — وعدہ کر آیا ہوں کہا خیر

بھید کھلنا چھپے ہوؤں کا ایک ایک پر

اب خامہ سے واشگاف یوں ہے — دل ملنے کی راہ صاف یوں ہے
فرخ جو گیا تو شاہزادہ — سوچا کہ ہوں ٹھاٹھ کل زیادہ
رکھا آتش پہ دوسرا بال — حاضر ہوئی دیونی قوی بال
دعوت کی اُسے خبر سنائی — دیوؤں کے رخ اسنے آنکھ اٹھائی
ہمچشموں نے چتون اس کی تاڑی — پلکوں سے زمین بن کی جھاڑی
غولوں سے بھرا جو تھا بیاباں — پھولوں سے بنا دیا خیاباں
صناعی انھوں نے رات بھر کی — مشتاق نے واں وہ شب سحر کی
بجتے ہی گجر وہ شاہ ذی جاہ — چاروں شہزادے لیکے ہمراہ
جو جو امرا تھے سب بلا کے — فرخ کو خواصے میں بٹھا کے
مشرق سے رواں ہوا دلاور — جس طرح افق سے شاہِ خاور
بجلی سے جو زرق برق آئے — فرش ابر کی طرح بچھتے پائے
دیکھا[2] تو تمام دشت گلزار — دائیں بائیں دو رستہ بازار
شہر کتنے تھے دشت پُر خسک تھا — فرخ کہتا تھا کل تلک تھا

[1] دیو اسکے الخ عمل میں آ گئے ہیں یعنی وہ ایسا عامل ہے کہ دیو اسکے تابع عمل ہیں ۱۲

[2] دیکھا تو الخ غالباً لفظ تو تحریف ہے لفظ تھے کی دو رستہ بازار یعنی دو رویہ بازار کیونکہ راستہ لغت میں صف ہے اور ممکن ہے کہ مصرعۂ اول یوں ہو سے دیکھا تو تمام بن ہے گلزار :: بہرحال پہلے مصرعہ میں تحریف معلوم ہوتی ہے ۱۲ م ش

غافل تھے کہ سبز باغ ہے یہ — اپنے ہی جگر کا داغ ہے یہ
تجویز رہے تھے سب کے سب دنگ — جادو۔ افسوں طلسم۔ نیرنگ
اتنے میں سنا کہ صاحبِ تاج — جتنا بڑھے پیچھے سب ہو تاراج
کیا لشکری اور کیا شہنشا — سناٹے میں تھے کہ اللہ اللہ
دیکھے جو جواہرات کے ڈھیر — سب من کے ہوس سے ہو گئے سیر
شہزادہ نے آمد اُن کی پائی — کی تا درِ خانہ پیشوائی
دونوں میں ہوئیں جو چار آنکھیں — دولت کی کھلیں ہزار آنکھیں
ایوان جواہریں میں آئے — الماس کی شہ نشیں میں آئے
وہ چتر کے زیر سایہ بیٹھے — افسر سب پایہ پایہ بیٹھے
جو جو کہ تواضعات ہیں عام — لے آئے خواص نازک اندام
چکنی ڈلی۔ عطر۔ الائچی۔ پان — نقل و مے جام و خوان الوان
رغبت سے اُنھیں کھلا پلا کے — بولا شہزادہ مسکرا کے
اس تاج شہی میں کے نگیں ہیں — کے نام و نشانِ دلنشیں ہیں
سلطاں نے کہا بصد لطافت — یہ چار ہیں عنصرِ خلافت
ایک اور ہوا تھا قابلِ چشم — وہ نور بصر تھا دشمن چشم
جب لائے یہ گل بکاؤلی کا — نکلا تب خار روشنی کا
پوچھا اس نے وہ اب کدھر ہے — سلطاں نے کہا کہ کیا خبر ہے
پوچھا شہزادہ نے کہ یا شاہ — صورت سے ہے کوئی اسکی آگاہ
ایک انمیں سے چشم آشنا تھا — کوکا اسی شاہزادہ کا تھا
بولا کہ حضور ادھر تو دیکھیں — دیکھا تو کہا مری نظر میں
صورت وہی رنگ رو وہی ہے — لہجہ وہی گفتگو وہی ہے

یہ سنتے ہی اُس نے خندہ کر کے — سر پاؤں پہ رکھ دیا پدر کے
سر قدموں سے شاہ نے اُٹھایا — فرزند کو چھاتی سے لگایا
لے لے کے بلائیں کاکلوں کی — پیشانی چومی پیٹھ ٹھونکی
عرض اُس نے کیا کہ دو پرستار — پابوسیٔ شہ کے ہیں طلب گار
حضرت نے کہا بلائیے خیر — اُٹھ جائیں جو بیٹھے ہوں یہاں غیر
شہزادہ نے اک مکاں بتایا — ایک ایک اُٹھا اُدھر کو آیا
سب اُٹھ گئے پر وہ چاروں باغی — بیٹھے رہے فرش گل پہ داغی
شہزادہ اُٹھا محل میں آیا — پردہ تلک اُن کو ساتھ لایا
دلبر سے کہا میں جب کہوں آؤ[له] — تو کہیو یہ چاروں داغی اُٹھواؤ
در پردہ سکھا کے باہر آیا — بے پردہ حضور شہ بلایا
دلبر نے کہا نہ جاؤں گی میں — قربان گئی نہ آؤں گی میں
اُٹھ جائیں یہ چاروں سست بنیاد — داغی ہوئے ہیں غلام آزاد
چاروں کا یہ سنتے ہی اُڑا رنگ — یکبارگی شاہ ہو گیا دنگ
دکھلائی دیے جو بیٹے بیرخ — دیکھا تاج الملوک کے رخ
یاں دلبر تھے داغ واں سُرین پر — یاں نام پہ حرف واں نگین پر
وہ جعل - وہ ہار - وہ غلامی — وہ گھات - وہ جیتنا تمامی
وہ دسترس اور وہ پایہ مردی — وہ بیکسی اور وہ دشت گردی
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر — وہ حلوے کی چاٹ اور وہ تحریر
وہ سعی - وہ دیونی کی صحبت — محمودہ کی وہ آدمیت

له دلبر سے کہا الخ تو کہیو یہ چاروں داغی اُٹھواؤ۔ یعنی ان چاروں داغیوں کو اُٹھواؤ تو ہم آئیں اور ممکن ہے کہ تو تحریف ہو نہ کی ۱۲

تجویز کی وہ سرنگ کی راہ | اور موش دوانیاں وہ دلخواہ
وہ سیر چمن۔ وہ پھول لینا | وہ عزم وطن۔ وہ داغ دینا
وہ کور کے حق میں خضر ہونا | وہ غولوں سے ملکے پھول کھونا
وہ بال کو آگ کا دکھانا | وعدہ پہ وہ دیو کا آنا
وہ نزہت گلشن نگارین | وہ دعوت بادشہ۔ وہ تمکین
گذرا تھا جو کچھ بیان کیا سب | پنہاں تھا جو کچھ عیاں کیا سب
انگشتری پری دکھا کر | کھلوائی سُرین کی مُہر محضر
پہلے تو بہت وہ منہ چڑھے ڈھیٹ | آخر داغی دکھا گئے پیٹ
گھٹوا کے انھیں وہ دو خوش آئیں | پابوسی شہ کو سر سے آئیں
حضرت نے سمجھ کے حُسن خدمت | دونوں کو دیے خطاب و خلعت
نذریں اُن دونوں نے دکھائیں | رخصت ہو کر محل میں آئیں
مسند سے شہ اُٹھ کے بے محابا | بولا بیٹے سے جان بابا
روشن کیا دیدۂ پدر کو | مادر کے بھی چل کے آنسو پونچھو
مشتاق کو رو براہ پایا | ہمراہ اُسے تابخانہ لایا
ماں نے دیکھا جو وہ دلاور | اشکوں کے گہر گئے نچھاور
وہ طفل بھی گر پڑا قدم پر | مانند سرشک چشم مادر
ہر خویش و بیگانہ سے ملا وہ | پھر اپنی جگہ پہ آگیا وہ

غائب ہو جانا فرخ یعنی بکاؤلی کا اور بلوانا تاج الملوک کو گلشن نگارین سے اور متفق ہو کر گلزار ارم میں رہنا

کھلنے پہ جو ہے طلسم تقدیر ۔ اب خامہ نے یوں کیا ہے تحریر
فرخ وہ بادشاہ کا دستور ۔ یعنی وہ بکاؤلی مستور
مطلوب[1] کا سن سمجھ کے سب حال ۔ چاہے کہ نکالے کچھ پر و بال
سوچی کہ دلا شتاب کیا ہے ۔ پھر سمجھیں گے اضطراب کیا ہے
اُس وضع کا پاس کر گئی وہ ۔ تغییر لباس کر گئی وہ
فرخ کہنے تک آدمی تھی ۔ پھر وہ ہی بکاؤلی پری تھی
غربت سے چلی وطن میں آئی ۔ صحرا سے اُڑی چمن میں آئی
پژمردہ خواصوں میں پڑی جان ۔ صدقے ہوئی کوئی کوئی قربان
اُس غنچہ میں اک سمن پری تھی ۔ وہ ہمنفس بکاولی تھی
بولی کہو کیا کیا کہا خوب ۔ بے کچھ کیے پھر بھی آئی کیا خوب
مانگا کاغذ دوات و خامہ ۔ لکھا گچھیں کے نام نامہ
اے یوسف چشم زخم یعقوب ۔ وے رشک برادران منکوب
اے دلبر دلبر دغلباز ۔ وے دیو سوار عرش پرواز
اے آب تہ زمین نیرنگ ۔ وے نقب دوال باغ گلرنگ
اے پردہ کشائے بے حجابی ۔ وے دزد حنائے دستیابی
اے رہرو رہ بہ رہ نہادہ ۔ وے صرصر گل بہا دادہ
اے سبزے سرد برگ گلشن آرا ۔ وے لعل نمائے سنگ خارا
اے سبزے خضر طلسم صورت ۔ وے بے بصر رخ ضرورت
اے باعث عزم میزبانی ۔ وے صاحب بزم مہربانی

[1] قولہ مطلوب کا سن الخ چاہے اور نکالے دونوں بیائے مجہول ہیں نہ بیائے معروف یعنی بکاؤلی کچھ پر و بال نکالا چاہتی تھی یعنی راز کو افشا کیا چاہتی تھی کہ اثنا میں سوچی کہ دلا الخ

اے آئینہ دار خود نمائی — دے سرمۂ چشم آشنائی
اے پردہ کشائے روئے پنہاں — وا اے داغ نمائے پشت اخواں
تو باغ ارم سے لے گیا گل — تو مجھ سی پری کو دے گیا گل
بے رنج ترے واسطے ہوئی ہیں — فرخ ترے واسطے ہوئی ہیں
تجھ کو ترے باپ سے ملایا — مجھ کو یہ ملا کہ تجھکو پایا
جو جو اسرار تھے نہانی — سب تجھ سے سنے تری زبانی
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
چاہا تھا کروں سر اپنے پامال — کر شکر سمجھ کہ تھا خوش اقبال
کیا کہیے کہ صورت اور کچھ تھی — وقت اور ضرورت اور کچھ تھی
اب تک ہیں وہ خار جی کے جی میں — جلد آ کہ ہے مصلحت اسی میں
آئے گا تو درگذر کروں گی — ورنہ بہت سا شر کروں گی
داغوں پہ دیے ہیں داغ تو نے — دکھلائے ہیں سبز باغ تو نے
کانٹوں میں اگر نہ ہو الجھنا — تھوڑا لکھا بہت سمجھنا
پھر خط کی نہ ہو امیدواری — القط ہے قلم کی دوستداری
یہ لکھ کے کہا سمن پری کو — چالاک ہے تو ہی قاصدی کو
یہ خط یہ انگوٹھی لے ابھی جا — پورب کی سمت کو چلی جا
بستے میں ہے گلشن نگاریں — رہتا ہے وہیں مرا وہ گلچیں
خاتم کے نشان سے نامہ دیجیو — ٹھہری رہیو جواب لیجیو
جب خاتم لے کے وہ ہوائی — بستا ہوئی اور بستے پہ آئی
وہ باغ کہ تھا جواہر آگیں — ثابت ہوا گلشن نگاریں
وہ آدمی حور وش پری رو — یعنی تاج الملوک نوش خو

گلگشت میں تھا کسی روش پر — محمودہ دائیں بائیں دلبر
قاصد[۱] نے رخ پری دکھایا — دھیان اُس کو بکاؤلی کا آیا
پہچانتے ہی نگینِ خاتم — بے شبہہ ہوا یقین کا عالم
پر تو پہ وہ یوں چلا تڑپ کے — انگارے پہ جیسے کبک سیکے
دھوکا تھا فقط بکاؤلی کا — قاصد نے دیا وہ خط پری کا
گو سرمۂ خموشی نے کھلایا — تحریر کو آنکھوں سے لگایا
قاصد سے کلامِ لطف بولا — خط صورتِ چشمِ شوق کھولا
وہ نامہ کہ عنبریں رقم تھا — قسمت کا نوشتہ یک قلم تھا
تحریر تھی سرگذشت ساری — کچھ یاس تھی کچھ اُمیدواری
منگوا کے وہیں دوات و خامہ — تحریر کیا جوابِ نامہ
اے شاہِ ارم کی دختِ گلفام — فرخ لقب و بکاؤلی نام
اس نام کے اس لقب کے صدقے — اس نامہ کے اس طلب کے صدقے
میں نے جو غرض سے جی چرایا — تو نے کیوں آکے منہ چھپایا
پھیری جو بدی ہوئی تھی کچھ یوں — تو نیک ہے بے ملے گئی کیوں
تو جائے تو کیوں نہ آئے افسوس — افسوس افسوس ہائے افسوس
تقدیر پھری پھری نہیں تو — امید گئی گئی نہیں تو
اے[۲] کاش میں کچھ بھی سانس پاتا — جی کھول کے داغ دل دکھاتا
معلوم تو ہے کہ شوق کیا تھا — جو کھینچ کے یاں سے لے گیا تھا

۱؎ قولہ قاصد نے الخ مصرع اول میں تحریف کتابت ہوگئی ہے غالباً نسخ قدیم مثنوی میں یوں ہی ہوگا ؏ قاصد نے پری کا رخ جو دیکھا ۱۲ ۲؎ قولہ اے کاش الخ کچھ بھی سانس پاتا یعنی مجھ کو اگر اس امر کا شائبہ بھی معلوم ہوجاتا کہ تو درحقیقت بکاؤلی ہے اور فرخ کا بھیس بنائے ہوئی ۱۲

اب مجھ میں وہ دم اجی کہاں ہے — وہ دل وہ جگر وہ جی کہاں ہے

مر جاؤں اگر طلب میں تیری — میں کیا کہ خبر نہ پہونچے میری

قابل وہاں آنے کے کہاں ہوں — یاں بھی جو رہا تو نیم جاں ہوں

تجھ سے مری خاطر اب کہاں جمع — تو بستر شعلہ میں رگِ شمع

تو برق دماں میں خرمنِ خار — تو سیل رواں میں خستہ دیوار

تو جوشش یم میں مور بے پر — میں نقش قدم تو بادِ صرصر

دھڑکا ہے یہی تو جان دوں گا — مر جاؤں گا اب نہ میں جیوں گا

ہو تجھ سی پری جو خصم جانی — انسان کی ہے مرگ زندگانی

منظور جو ہو حیات میری — تو مان لے ایک بات میری

حمالہ کو بھیج آکے لیجائے — شاید مجھے زندہ پاکے پہونچائے

بھیجا نہ اُسے تو جان لینا — آسان ہے یہاں بھی جان دینا

یہ لکھ کے جو خط سے ہاتھ اُٹھایا — قاصد نے لیا جواب لایا

مطلوب کا خط وہ پڑھ رہی تھی — دیکھا تو وہ دیونی کھڑی تھی

پوچھا کہ ارے تجھے خبر ہے — گلچیں مرا کون سا بشر ہے

وہ صدقے ہوئی کہا بلاؤں — بے دیکھے کسی کا نام کیا لوں

یہ سُن کے وہ شعلہ ہو بھبھوکا — بولی کہ تجھے لگاؤں لوکا

تیرا ہی تو ہے فساد مردار — دایاد کو گل دیا مجھے خار

گل نقب کی راہ لے گیا چور — زندہ کروں اُس موے کو در گور

حمالہ جلی ہوں کیا کہوں میں — داماد کو لا تو ٹھنڈی ہوں میں

آگاہی جو دیونی نے پائی — بگڑی ہوئی بات یوں بنائی

محمودہ ہے کنیز زادی — انسان سے ہوئی ہو اسکی شادی

میرا تو نہیں قصور ہے کچھ	شاید اُس کا فتور ہے کچھ
مجرم جو وہ ہے تو لو میں لائی	یہ کہہ کے اُٹھی چلی ہوائی
آئی تو یہ زار نیم جاں تھا	آپ اپنی قضا کا نوحہ خواں تھا
حمالہ کو دیکھتے ہی رُو رُو	پوچھا کہ تو لینے آئی مجھ کو
بولی وہ بنے بگاڑ کیا ہے	چل دیکھ تو چھیڑ چھاڑ کیا ہے
کچھ بول سکے زیر لب وہ دل زار	ہیجان میں تپ کے جیسے بیمار
لرزا سا چڑھا جو دیونی پر	مانند حواس اُڑی وہ مضطر
اس سمت سے پہونچی یہ عقیلہ	واں آئی پری کی ماں جمیلہ
شکوہ کرنے لگی پری سے	یوں کہنے لگی بکاؤلی سے
گلزار کی سیر کیا خوش آئی	برسوں سے نہیں تو گھر بھی آئی
بے طرح گلوں کی ہے تو شیدا	گلچیں نہ ہوا ہو کوئی پیدا
کھلتے ہیں کچھ انتظار کے طور	رُخ میری طرف نظر کہیں اور
مادر کے کلام سن کے دختر	بولی کہ چمن تو ہے مرا گھر
میں کیا جانوں مجھے خبر کیا	رُخ کس کو کہتے ہیں نظر کیا
تقریر جو بھولے پن کی پائی	وہ سادہ دل اُٹھ کے گھر کو آئی
جب اُٹھ گئی یہ تو دیونی وہ	حاضر ہوئی لے کے آدمی وہ
آیا تو وہ منتظر تھی خونخوار	اندیشہ سے کانپ اٹھا گنہ گار
واں غصہ بھری غضب وہ چتون	پلکوں سے یہاں نظر پہ چلمن
واں سرمۂ چشم گرم تسخیر	یاں قطرۂ اشک تر گلو گیر
واں پھانسنے کو بلا وہ گیسو	یاں تاب سخن نہیں سر مو
بولی وہ پری بصد تامل	کیوں جی تمہیں لیگئے تھے وہ گل

کیا کہتی ہوں میں ادھر تو دیکھو
میری طرف اک نظر تو دیکھو

ہے یا نہیں یہ خطا تمھاری
فرمایئے کیا سزا تمھاری

قابو میں پری کے تھا سلیماں
بولے بتلائے کیا پشیماں

کی عرض رضا ہے جو خوشی ہو
عاشق کی سزا جو پوچھتی ہو

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ
کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

تلوار سے قتل ہو جو منظور
ابرو کے اشارے سے کرو چور

زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو
اپنے دل تنگ میں جگہ دو

یہ سن کے وہ شوخ مسکرا کے
بولی اُسے چھاتی سے لگا کے

گلچیں تو فقط نہیں چمن کا
محرم ہے سارے تن بدن کا

رُخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں
منھ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں

یہ کہہ کے لبوں سے قند گھولے
ہستی نے دلوں کے عقدے کھولے

کاوش پہ ہوا گہر سے الماس
غنچے نے بجھائی اوس سے پیاس

واں غنچۂ یاسمن تھا گلنار
یاں دامن سرو ارغواں زار

واں صبح صفا تھی گل بداماں
پھولی رُخ مہر پہ شفق یاں

کیا آگے لکھوں کہ اب سر دست
ہنوزنا ہے دوات میں قلم مست

افشاء راز ہو کر پھنسنا تاج الملوک کا طلسم میں اور مقید ہونا بکاؤلی کا

خونریز رقمی سے کلک شنجرف
ہے ستر کشائے معنی و حرف

ازبسکہ یہ عشق فتنہ پرداز
ہے شمع فروز پردۂ راز

ہمدم جو بکاؤلی نے پایا
غماز یہ غم خوشی میں لایا

بھڑکائی جمیلہ مادر اس کی
گذرانی خبر برابر اس کی

زنہار سے
ر: بھڑکا کے جھمیلا اسکی مادر + پہنچائی خبر اسے برابر

اک شب کہ تھی خالِ روئے شامت — با مردمِ دیدۂ قیامت
آکر جو ہے دیکھتی جمیلہ — روشن تھے چراغ اور فتیلہ
وہ شعلۂ آتشیں لپک کے — بجلی سی گری چمک دمک کے
دونوں کی رہی نہ جان تن میں — کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں
شہزادہ پہ اُس نے مار چنگال — دریائے طلسم میں دیا ڈال
بیٹی کی طرف کیا نظارہ — جھلا کے کہا کہ خام پارہ
حرمت میں لگایا داغ تو نے — لٹوائی بہار باغ تو نے
تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے — چل دور ہو میرے سامنے سے
خجلت سے پری زمیں میں گڑ کے — سایہ سی رہی قدم پکڑ کے
مادر نے ہزار پاسباں میں — رکھا اُسے قید کے مکاں میں

پابزنجیر ہونا بکاؤلی کا سودائے فراقِ تاج الملوک میں

سودائے الم ہے اب جو تحریر — حرفوں سے قلم ہے پابزنجیر
سنسان وہ دم بخود تھی رہتی — کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
[له] کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ — کپڑوں کی عوض بدلتی تھی رنگ
یک چند جو گذری بے خور و خواب — زائل ہوئی اسکی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر — فانوسِ خیال بن گیا گھر

له قولہ کرتی تھی الخ یعنے جب بھوک اور پیاس کی شدت کھانے اور پینے پر مجبور کرتی تو قسمیں کھاتی اور آنسو پیتی کیا خوب کھانا پینا بہم پہونچایا ہے ۱۲

پریاں وہ جو اُسکی پاسباں تھیں
دانا و عقیل و خوش بیاں تھیں

سمجھانے لگیں کہ مرتی ہو کیوں
ترک خور و خواب کرتی ہو کیوں

ثابت کچھ اثر ستارہ کا ہے
کس چاند کو کیا گہن لگا ہے

رحم اپنی جوانی پر ذرا کر
منھ دیکھ تو آئینہ منگا کر

صورت تری زار ہوگئی ہے
گل ہو کے تو خار ہوگئی ہے

ہے ہے تری عقل کسنے کھوئی
ناجنس کو چاہتا ہے کوئی

سہتی نہیں آگ ماہیٔ تر
رہتا نہیں پانی میں سمندر

مذکور نہیں ہے کچھ حسد کا
ساتھی نہیں کوئی کار بد کا

روشن ہے جو کچھ کیا ہے اندھیر
پھیر اپنی سمجھ سمجھ کا ہے پھیر

محبوس کیا ہے تجھ کو ہر چند
توبہ کا در نہیں کیا بند

بھولے سے بھی کر نہ یاد آدم
پھر گھر وہی تو وہی وہی ہم

اے شمع نہ سوچ گر بد و نیک
رشتہ کاٹے گا تجھ سے ہر ایک

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار
اب مان نہ مان تو ہے مختار

تو قید جفا میں ہے کہ ہم ہیں
تو دام بلا میں ہے کہ ہم ہیں

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے
دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے

جھنجھلائی بکاؤلی کہ بس بس
اب ایک کہو گی تم تو میں دس

مجبور جو ہوں تو میں تمھیں کیا
مجبور جو ہوں تو میں تمھیں کیا

مانا مری حالت اب ردی ہے
بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

بلبل اُسی رشک گل کی ہوں میں
تم کیا ہو ہزار میں کہوں میں

سوجھی وہ کہ یہ نہیں سمجھتی
ہے بلکہ برنگ زلف اُلجھتی

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجئے
سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجئے

کچھ روگ جو دَر پئے خلش ہو
درماں کے لئے دوا بدوش ہو

بیمار پئے عشق لا دوا ہے
اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

آخر یہ تو جی سے اپنے ہی تنگ
ایسا نہ ہو لائے اور کچھ رنگ

یاد آئیں جو ابروانِ خمدار
ریتے نہ کہیں گلے پہ تلوار

وہ سبزۂ خط جو یاد آئے
جھنجھلا کے کہیں نہ زہر کھائے

کر یاد کہیں چہِ ذقن کو
کودے نہ کوئیں میں باولی ہو

دیوانے کی مطلق العنانی
ہے باعثِ مرگِ ناگہانی

تدبیر کا حوصلہ نکالا
زنجیر کا سلسلہ نکالا

بیڑی تھی رُخِ جنوں کی کاکل
یا بوسئ گل کو آیا سنبل

جب وحشتِ عشق ہو زیادہ
زنجیر ہے پیش پا فتادہ

شوریدہ بکاؤلی غضب تھی
زنجیرِ دل میں بھی وہ بند کب تھی

بڑھتی جب دل کی بے قراری
پڑھتی یہ غزل بآہ و زاری

غزل

عالم کا ترے جہاں بیاں ہے
بیتابئ دل جہاں جہاں ہے

زنجیرِ جنوں کڑی نہ پڑیو
دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

ذرّے کا بھی چمکے گا ستارہ
قائم جو زمین و آسماں ہے

جو داغ کہ مہر ہے فلک پر
دلمیں مرے اب تلک نہاں ہے

کس سوچ میں ہو نسیمؔ تو بولو
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

آنا تاج الملوک کا صحرائے طلسم سے روح افزا پری کے ساتھ فردوس میں

بہرِ گہرِ طلسمِ اخلاص
ہے بحرِ سخن میں خامہ غوّاص،

وہ قطرۂ بارشِ جدائی | وہ غرقۂ بحرِ آشنائی
وہ بادشہِ حباب افسر | یعنی تاج الملوک مضطر
بے بہری چرخ سے جو ناگاہ | گرداب کے ہالہ کا ہوا ماہ
جو ماہِ سپہرِ برتری تھا | سو ماہیِ بحرِ ابتری تھا
بادل[1] سا جو وہ بھر آسماں جوش | بجلی سی لہر سے تھا ہم آغوش
دریا تھا نہ بحر تھا نہ جیحوں | طوفانِ طلسم جوشِ افسوں
گرتے تو وہ پانی سر سے گذرا | اُبھرا تو نہ کچھ نظر سے گذرا
موجوں کی عوض تھی جیب و داماں | گرداب کے بدلے تھا گریباں
آگے جو بڑھا جزیرہ دیکھا | اشجار کا واں ذخیرہ دیکھا
جس پھل کو چھوا جو پھر کیا غور | ہاتھ آیا نہ کچھ حباب کے طور
جانا کہ طلسم کا ہے جنگل | ہے یاں کے درخت کا یہی پھل
اور آگے بڑھا وہ بحرِ اوہام | ڈوبا خورشید ہوگئی شام
ڈر جانوروں کا جی میں بیٹھا | اک نخلِ کہن پہ چڑھ کے بیٹھا
ناگاہ سنی صدائے پُرخوف | آیا اک اژدہا پئے طوف
صورت میں پہاڑ کی نشانی | سیرت میں بلائے ناگہانی
منہ کھول کے سانپ ایک کالا | اُس کالے نے من زمیں پہ ڈالا
لہرا لہرا کے اُوس چاٹی | بن میں کالوں نے رات کاٹی
جب صبح ہوئی تو منہ میں ڈالا | کالے نے من اژدہے نے کالا

[illegible]

[1] قولہ بادل سا الخ دوسرے مصرع میں بجلی سی لہر سے تھا تحریف ہے تھا بجلی سی لہر سے ہم آغوش کی کیونکہ بغیر حالت مجبوری کے کسی شعر میں ساکن کا متحرک کر لینا جائز نہیں حالانکہ بجلی سی لہر میں بلفظ لہر کی ہائے ہوز متحرک پڑھے بغیر مصرع موزوں نہیں کیا جا سکتا ۱۲

وہ جا کے افق میں مہر چمکا
مَن افعیِ شب کے منہ سے نکلا

سوچا وہ کہ لیجے من کسی طور
دشمن کا سامنا کیا غور

کچھ گائیں کلیلیں کر رہی تھیں
بن میں ہری دوب چر رہی تھیں

دودھ اُن کا دوہا پیا کھا لو
گوبر کے انھیں کی چوتھ پھینکو

نکلا جو پھر آ کے شب کو اژدر
گلخن سے دھواں دھوئیں سے اخگر

گوبر پھینکا تو دب گیا من
بادل میں چھپا وہ ماہ روشن

بے روشنی اندھے ہو گئے وہ
من ڈھونڈھتے آپ کھو گئے وہ

من لیکے جو اُس نے مُہرہ مارا
شب کاٹ کے صبحدم سدھارا

دو مرغ تھے بیٹھے اک شجر پر
مادہ لگی پوچھنے کہ اے نر

میں تجربہ کر چکی جہاں کا
کھلتا نہیں کچھ طلسم یاں کا

مادہ سے یہ سنکے بولا ٹھان
ہے طرفہ طلسم اس جگہ پر

وہ پیڑ جو حوض پر لگا ہے
طوبےٰ سے خواص میں سوا ہے

اک سانپ ہے واں پہ چوٹ کرتا
مارے سے نہیں کسی کے مرتا

لیکن جو یہ بندۂ خدا جائے
تا حوض قدم قدم چلا جائے

لیکے گا خود اس کو دیکھکر سانپ
منہ چادر آب میں یہ لے ڈھانپ

اُبھرے گا لگا کے جب یہ غوطا
بن جائے گا آدمی سے طوطا

اندیشہ نہ اپنے دلمیں لائے
اُڑ کر یہ اُسی شجر پہ جائے

سب خشک ہے ایک ہے ہری ڈال
دو رنگ کے پھل ہیں سبز اور لال

پہلے تو یہ لال پھل کو کھائے
انسان کا رنگ و روپ پائے

پھر توڑ لے اسکے سبز پھل کو
پھل کچھ اسے دے رہے گا کل کو

جس شخص کے پاس وہ ثمر ہو
ہتھیار نہ اُس پہ کارگر ہو

لکڑی میں اثر یہ ہے کہ دشمن — بن جاتا ہے موم اگر ہو آہن
دو ہاتھوں میں لے جو کاندھے پر سے — اڑتا پھرے جیسے مرغ پر سے
ٹوپی جو بنائے چھیل کر چھال — دکھلائی نہ دے نظر کی تمثال
پتے کی صفت بیان کیا ہو — دم بھر میں بھرے جراحتوں کو
منہ میں رہے گوند اسکا جبتک — گنتی نہیں بھوک پیاس تب تک
تھا ملہم غیب مرغ گویا — سنتے ہی ادھر چلا وہ جویا
کالے نے جہاں سے کی سیاہی — وہ حوض میں تھا مثال ماہی
طوطا بنکر شجر پہ آکر — پھل کھا کے بشر کا روپ پاکر
پتے پھل گوند چھال لکڑی — اس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی
ہاتھ آ جو گئی عصا کی تاثیر — پرّاں ہوا صورت عصا تیر
اڑتا ہوا واں سے دور جا کر — ٹھہرا دم لینے اک جگہ پر
من ران کو چیر کر چھپایا — پتے سے وہ زخم سب بھر آیا
اک حوض پر آب و تاب دیکھا — سرچشمۂ آفتاب دیکھا
غوطہ جو لگا کے سر اٹھایا — وہ آب وہ حوض کچھ نہ پایا
دکھلائی برے دنوں نے شامت — مردی کی رہی نہ کچھ علامت
حوض اسکی ہوئی یہ دیکھتے ہی — فوّارہ تو گم خزانہ باقی
سختی جو دکھاتا تھا مقدر — چھاتی پہ دھرا بچوں سے پتھر
نامردی سے اپنی نعرہ زن ہو — بیچاری چلی کسی طرف کو
آگے سے جوان ایک خوش قد — آتا تھا دنوں کی جیسے آمد
باہم زن و مرد نے کیا میل — دریا سے ملا وہ قطرہ زن سیل
بارے جو پڑی گھر اسکے بے قید — امید سی رہ گئی وہ نومید

جب جن کے نہانے کا دن آیا | غوطا کسی حوض میں لگایا
ابھری تو نہ حوض تھا نہ وہ روپ | پانی کی عوض تھی دشت کی دھوپ
مردی نے جو پھیر وجود پایا | پستانوں کو بے نمود پایا
ترکش پہ نگاہ کی تو تھا تیر | قبضہ میں پھر آئی کھوئی شمشیر
گو شمع بنا چراغ دامن | روشن نہ ہوا وہ رنگ روغن
تھا مردم دیدۂ طلسمات | خال رخ رنگ رو مساوات
اک دیونی مردہ دل سی مبہوت | پستاں سے قد اسکا نخل تابوت
زنبور سیاہ خال اُس کے | برگد کی جٹائیں بال اُسکے
گٹھا لیئے سر پہ لکڑیوں کا | جلتی تھی سموم کا سا جھونکا
شہزادہ کہ تھا کریہ منظر | وہ روسیہ اس کو سمجھی شوہر
گٹھا وہ دیا کہ نیچ لا جا | کچھ نہیں دیر جلد آجا
حیرت زدہ شاہزادہ ناچار | راہی ہوا سر پہ رکھ کے انبار
جب بڑھ کے ہوا نظر سے اوجھل | ہلکا ہوا پھینک پھانک بوجھل
واں سے جو بڑھا تو ایک چشما | پر آب تھا چشم منتظر سا
غوطا جو لگا کے سر اُبھارا | پایا وہی رنگ و روپ سارا
کھویا ہوا مال ہاتھ آیا | بولا وہ کہ شکر ہے خدایا
خورشید مرا گہن سے چھوٹا | زنگ آئینۂ بدن سے چھوٹا
یارب یہی اب میں چاہتا ہوں | یہ چشمہ پھر آنکھ سے نہ دیکھوں
ناداں ہو جو آبرو کو کھو دے | اس پانی سے منھ ہاتھ دھو دے (ہاتھ منھ دھونا)
یہ کہہ کر کاندھے رکھ کے لاٹھی | گھوڑوں پہ ہوا کے باندھی کاٹھی
کھانے کو شجر کا گوند تھا پاس | کیا دخل کہ بھوک لگتی یا پیاس

دیکھا ناگاہ کوہ البرز | اک دیو سیاہ تھا لیے گرز

ٹوپی وہ جو سر پہ چھال کی تھی | عریانی میں پردہ حال کی تھی

اُس دیو کے آگے سے بڑھا وہ | سایہ سا پہاڑ پر چڑھا وہ

گریاں لبِ حوض اک پری تھی | فوارہ کی طرح رو رہی تھی

پُر جوش و خروش اُسے جو پایا | روپوش نے تاج سر اٹھایا

دیکھا جو پری نے آدمی زاد | آہستہ کہا کہ خانہ برباد

رستہ ترا کھو گیا کہاں سے | کھا جائیگا دیو بھاگ یاں سے

بولا وہ بشر کہ دیو کیسا | ہمکو تو ملا نہ کوئی ایسا[2]

بولا وہ کہ بیقراری کیا ہے | تم اپنی کہو تمھاری کیا ہے

کیوں روتی ہو کسکی یاد میں ہو | کیا رنج ہے کس فساد میں ہو

بولی وہ حسیں کہ میں پری ہوں | اس دیو کے بس میں آگئی ہوں

فردوس کا بادشہ مظفر | روح افزا جسکی ہوں میں دختر

سردار کروڑ دیوؤں کا ہے | سلطان ارم مرا چچا ہے

اک دن میں چلی چچا کے گھر کو | باندی تھی بکاؤلی خبر کو

رستے سے یہ دیو پھانس لایا | ابتک تو خدا نے ہے بچایا

نام اُس سے بکاؤلی کا سنکر | رونے جو لگا وہ سر کو دھن کر

پوچھا اُس نے کہ آدمی زاد | تو کیوں رویا کہا کہ فریاد

واں خرمنِ عیش پر پڑی برق | میں بحرِ فسوں میں یاں ہوا غرق

[1] واں پھانس چبھی ہے اسکو غم کی | یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی

[2] [illegible]

[1] واں پھانس الخ یاں سانس نہیں ہے یعنی یہاں تو یہ غم عشق اور غم سے یہ حالت ہے کہ ایکدم بھر کی زندگی کا بھروسہ اور توقع نہیں ہے محاورہ زبان ہے خاص و عام ہے کہ فلاں یا فلاں میں کچھ سانس باقی نہیں یعنی گنجائش نہیں آگے وہ بے حسب محاورہ ہے

بولی وہ کہ چھوٹتے اگر ہم
رکھتے ترے زخم دل پہ مرہم

بولا وہ کہ چل کہا کہ ناداں
وہ دیو کہاں کہاں تو انساں

دیووں سے بھی لڑ سکا ہے کوئی
سایہ کو پکڑ سکا ہے کوئی

بولا وہ کہ جی بجھا نہ جانی
دیو آگ تو آدمی ہے پانی

ہر چند کہ آتش جاں میں ہو لاگ
دبجاتی ہو مشت خاک سے آگ

بولی وہ کہ سُن تو آدمی زاد
وہ دیو ہے تیری کیا ہے بنیاد

تجھ پاس تو اک عصا ہے جانی
لاٹھی سے جُدا نہ ہوگا پانی

بولا وہ کہ یہ جو لٹھ مرا ہے
موسیٰ کا عصا ہے اژدہا ہے

یہ کہہ کے جتائے جوہر اپنے
ساماں دکھائے یکسر اپنے

ٹوپی جو اُتار لی تھی سر سے
پھر رکھ کے نہاں ہوا نظر سے

لٹھ کاندھے پہ رکھ ہوا پہ جاکر
ظاہر ہوا ٹوپی کو اُٹھا کر

یہ شعبدہ دیکھ کر پری نے
اُڑنے چلنے کے پائے کچھ قرینے

تسکین جو ہوئی پری کے جی کو
وہ آدمی لے اُڑا پری کو

وہ دیو پری کو اُڑتے پاکر
اُچکا تو بلا ہوا پہ جاکر

شہزادہ نے اپنے سر کی ٹوپی
جلدی سے پری کے سر پہ رکھ دی

بدلی میں چھپی وہ ماہ روشن
بجلی سا عیاں ہوا وہ پُرفن

وہ دیو کہ بھٹکا پری پہ لپکا
حیرت زدہ آدمی پہ لپکا

شہزادہ کہ لٹھ سے برق دم تھا
بادل سا ہوا کا ہمقدم تھا

دیکھا جو نہ دیو نے گزارا
پتھر اک اُٹھا کے پھینک مارا

وہ سنگ گراں حسرہ عنول
تاثیر سے پھل کی بن گیا پھول

لٹھ اسکا پڑا تو وہ ہوا چور
جس طرح عصا سے جام بلور

غل کر کے زمیں پر گرا دیو
موجود ہوئے ہزار ہا دیو

بادل کی طرح جو اُڑے دشمن
لاٹھی سے ہوا وہ برقِ خرمن

موسیٰ کا عصا تھا لٹھ جواں کا
ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکا

سرمہ کیا کوہ پیکروں کا
جی چھوٹ گیا دلاوروں کا

ٹوپی کو اُتار کر پری نے
چومے قدم بشر پری نے

شہزادے نے تاج سر پہ رکھا
لٹھ کاندھے پہ دل سفر پہ رکھا

فردوس میں جا کے صورتِ حور
ماں باپ سے آملی وہ مہجور

دیووں کی وہ سرکشی سنائی
انسان کی وہ مردمی جتائی

سُن سُن کے اڑے حواس اُنکے
لائے نہ یقیں قیاس اُنکے

پوچھا کہ وہ ہے کہا کہ ہاں ہے
پوچھا کہ کہاں کہا یہاں ہے

یہ سنتے ہی اُس نے تاج اُٹھایا
حیرانوں کو شعبدہ دکھایا

بال اُسکے وبال سے بڑے تھے
ناخن بھی ہلال سے بڑے تھے

تن خاکی تھا جان آتشیں تھی
عریانی قبائے پوستیں تھی

صورت سے فقیر تھا بروگی
کی آؤ بھگت سمجھ کے جوگی

حُسن آرا اُس پری کی مادر
باپ اُس کا بادشاہ مظفر

قدموں پہ گرے کہا ادب سے
حرمت رہی آپ کے سبب سے

بولا وہ خدا خدا کرو واہ
ہے جملہ جہاں کا مالک اللہ

قادر وہی کبریا وہی ہے
آخر وہی ابتدا وہی ہے

بولی وہ کہ حق ہے جو ہے فرماں
تم وقت کے اپنے ہو سلیماں

ٹک لو کمر آؤ لطف فرماؤ
شربت پیو میوہ ہائے تر کھاؤ

بولا وہ کہ اشتہا کسے ہے
کھانے کا مزا رہا کسے ہے

سیاح کو کیا قیام سے کار
شبنم نہیں جاگزینِ گلزار

درویش رواں رہے تو بہتر
آبِ دریا بہے تو بہتر

روح افزا بول اُٹھی اجی واہ
ہم جانے نہ دیں گے تم کو واللہ

آرام کرو کرم کرو آؤ
ہم رام ہوئے نہ رم کرو آؤ

مجمع سے الگ مکان میں لائی
آرام کی جا قرار پائی

اصحاب نیاز کھانے لائے
اربابِ نشاط گانے آئے

تھا[1] اپنے ہی سوچ میں وہ سنسان
ذہن راگ کی تھی نہ رنگ کا دھیان

بیوقت[2] وہ راگ خوش نہ آیا
بے فصل وہ پھاگ خوش نہ آیا

آنا بکاؤلی کا روح افزا کی خبر کو جمیلہ کے ساتھ اور تاج الملوک سے مل کر جانا سات دن بعد

بچھڑوں کے جو ملنے کا بیاں ہو
یوں خامہ خوشی سے تر زباں ہو

روح افزا کو جو کھو کے پایا
مژدہ شاہِ ارم تک آیا

جانا تھا یگانگی میں لازم
چلنے کو ہوئی جمیلہ عازم

وہ ساکن خانۂ سلاسل
یعنی وہ بکاؤلی بیدل

کہتی تھی کہ پیچ سے نکلتی
خواہاں یہ ہوئی کہ میں بھی چلتی

سن[3] کر قیدی کے زار نالے
زنجیر کے پیچ سے نکالے

[1] قولہ تھا اپنے ہی الخ سنسان تھا یعنی خاموش سناٹے میں تھا ۱۲ [2] قولہ بیوقت الخ بے فصل یعنی بیموقع وہ سامان جشن طرب اچھا نہ معلوم ہوا جسطرح پھاگ ہولی کی فصل کے بغیر اچھا نہیں معلوم ہوتا ۱۲ [3] قولہ سنکر قیدی الخ زار نالے یعنی پھوٹ پھوٹ کر رونا یا بلک بلک کر فریاد کرنا حاصل یہ کہ بکاؤلی جسکو ماں باپ نے قید کر رکھا تھا روح افزا کے پاس جانے کیلئے اسکی فریاد اور بیقراری سنکر ماں باپ نے اسکی زنجیر قید کھولدی ۱۲

تخت اُنکی سواریونکے آئے
اُڑتے وہ ہوا کے جھونکے آئے

بانوئے شہر ارم جمیلہ
دختِ اس کی بکاؤلی عقیلہ

رُوح افزا سے ہوئیں بغلگیر
صورت پوچھی کہا کہ تقدیر

کہہ سُن کے مُبارک و سلامت
بیٹھ اُٹھ کے ہوئی جمیلہ رخصت

روح افزا نے کہا کہ جی جاں
تم جاؤ رہیں بکاؤلی یہاں

خاطر سے کہا کہ خیر لیکن
لیجاؤں گی خود میں ساتویں دن

یہ کہہ کے وہ وحشت مجسّم
آہو سی اِرم کو کر گئی رم

روح افزا نے کہا بہن سے
بہتر کوئی جا نہیں چمن سے

گلگشت کرو، چلو کہا خیر
کیا جانئے کہ ہوگی سیر میں سیر

چل پھر کے ہنسی ہنسی میں پوچھا
کھونا مِلنا بہن یہ کیا تھا

روح افزا نے کہا کہ ہمشیر
میں نے یہ سنا کہ تو ہے دلگیر

واللہ کہ چھپا نہ کر خدائی
تیرے پیارے کو ڈھونڈھ لائی

سمجھی وہ ہنسی کہا سِڑن ہو
نادان ہو کیا کہوں بہن ہو

ہم کو یہ ہنسی نہیں گوارا
پیارا ہوئے گا وہ تمھارا

پیارا جو نہ تھا تو کھوگئیں کیوں
بدراہ بھی آپ ہوگئیں کیوں

بولی وہ کہ آشنا تمھارا
پیارا نہیں پیاری کا ہے پیارا

گر اس کی تلاش ہے میں کھوئی
بدراہ نہ کہہ سکے گا کوئی

جو چاہو کہو جواب کیا دوں
قائل نہیں ہوتی ہو دکھا دوں

وہ جوگی وہ دھونی اور وہ آسن
دکھلایا تو تھی اُسی کی جوگن

دیکھا تو دکھا رہی ہے تقدیر
کوشش کا اثر کشش کی تاثیر

روح افزا انکے بیچ میں واں
قالب تھی میان جان و جاناں

دونوں کا بدل تھا وصل منظور
مانند حجاب ہو گئی دور

وہ عنصر تھا بحر ظلم و بیداد
دریا و ہوا سنا کے افتاد

خاطر کی کدورتیں عیاں کیں
چشموں کی وہ صورتیں بیاں کیں

رو رو کے بکاولی دل افگار
بولی کہ خدا کو علم ہے یار

[1]پھرتا تھا تو چشم و دل میں میرے
دیدے مرے نقش پا تھے تیرے

شکل نہ مجھے اپنا تھا منا بھاتا
ہر وقت قضا کا سامنا تھا

ہم چشم پھرے تھے مثل مژگاں
ہم سایہ تھے سب کشیدہ داماں

گھر میں رہنا گراں تھا میرا
زنجیر کا گھر مکاں تھا میرا

جو کہہ کے سٹرن پکارتا تھا
پتھر سا کھینچ مارتا تھا

سختی سہی یا کڑی اٹھائی
افتاد تھی جو پڑی اٹھائی

طالع سے کسے تھی ایسی امید
نکلا ہے کدھر سے آج خورشید

کیوں منہ پہ شفق خوشی سے پھولی
کیا شام وصال راہ بھولی

یہ کہہ کے ملے بہم وہ ایسے
صفحے خط توأماں کے جیسے

یک جان و دو تن تھے سر و بالا
صحبت کا مزا ہوا دو بالا

دربان سی تھی در پہ روح افزا
تھا پیش نظر حیا کا پردا

جب بیٹھے ہوس نکال کے وہ
وارد ہوئی دیکھ بھال کے وہ

بول اٹھی بکاولی کہ داری
محرم کا ہے کام پردہ داری

وہ بولی مجھے تو کچھ نہ آیا
تم نے مگر اب تو ہے سکھایا

کیا جانے ابھی ہوا ہے کیا کیا
اس عمر میں سیکھنا ہے کیا کیا

[1] قولہ پھرتا تھا تو الخ یعنے میرے دیدہ دل کے اندر تیرے پاؤں کے نشان تھے یعنے تیرے قدم میری آنکھوں میں تھے ۱۲ ام شس

باری وہ مہ دو ہفتہ باہم ۔ یک ہفتہ رہی انیس و ہمدم
سمجھی ہفتہ کی میہمانی ۔ ہر ہفتہ عروس شادمانی
وعدے پہ جمیلہ ساتویں دن ۔ آئی تو تھا حیلہ غیر ممکن
ساتھ اُسکے رواں ہوئی وہ گلرو ۔ ہوش اُسکے ہوا ہوئے کہے تو
چاہا کہ وہ تاج رکھ کے سر پر ۔ رہیے روپوش ساتھ چل کر
دامن کو پکڑ کے روح افزا ۔ بولی کہ کدھر کیا ارادہ
الفت کے بہت نہ جوش میں آؤ ۔ کچھ خیر ہے تم کو ہوش میں آؤ
نافہمی سے خوار ہو چکے ہو ۔ اب تو سیکھو کہ کھو چکے ہو
کار مشاطہ خود نہ کیجے ۔ انگارے کو ہاتھ سے نہ لیجے
جلدی تمہیں کیا ضرور دم لو ۔ بیدل نہ ہو قول لو قسم لو
گھبراؤ نہ پاکے نامرادی ۔ غم کھاؤ جو چاہتے ہو شادی
سوچا تو نہ تھا صلاح اُلجھنا ۔ دانائی تھی بات کا سمجھنا

پیغام لیجانا حسن آرا کا بکاولی کی شادی کے واسطے

بیدل نے جگہ جو جی میں پائی ۔ یوں خامہ نے کی زباں کشائی
وہ شکر گزار روح افزا ۔ ماں سے بولی کہ حُسن آرا
واجب ہے ادائے حق مہماں ۔ احسان کا عوض نہیں جز احسان
حُسن آرا نے کہا کہ بہتر ۔ جو اپنے سے ہو نہیں میں باہر
بولی وہ کہ یہ فقیر جوگی ۔ ہے عشق بکاؤلی کا روگی
میں اسکے سبب پہنچی ہوں جی سے ۔ یہ میرے سبب ملے پری سے
راز اُن کا کیا جو آشکارا ۔ راضی ہوئی سُن کے حُسن آرا

بلوا کے مصوّر اک کہن سال
کھنچوائی اُس آدمی کی تمثال

وہ صورتِ[1] حال ارم میں لائی
خلوت میں جمیلہ پاس آئی

چھیڑا کہ ہو مہر سے عقد پروین
پیوند نہال گل ہو نسرین

واجب[2] نہیں اب تامل اسمیں
بھر لے وہیں تک نہ چھلکے جسمیں

بولی یہ جمیلہ کیا بتاؤں
تو اپنی ہے تجھ سے کیا چھپاؤں

سودا ہے مری بکاولی کو
ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

مشہور ہے ضد انس و جانی
یکجا نہیں رکھتے آگ پانی

حسن آرا نے کہا جمیلہ
مجھ کو یہ نہیں پسند حیلہ

کاوش تری بے ثبات ہے یہ
سو بات کی ایک بات ہے یہ

وو دل جو ہوں جانبیں راضی
یہ جان لے کیا کرے گا قاضی

بولی یہ جمیلہ ہوش میں آؤ
جا کر کسی اور کو یہ سمجھاؤ

تجویز کی آپ کے میں قرباں
لیجائے مری پری کو انساں

حسن آرا نے کہا کہ خاموش
شعلے کو کیا ہے کس نے خس پوش

اسباب نہ جمع کر ضرر کے
رکھ پنبہ نہ داغ پر شرر کے

بولی یہ جمیلہ پھر کروں کیا
وہ بولی نہ سمجھی کہتی ہوں کیا

جب دل ہی پری کا آگیا ہے
انسان ہے تو کیا مضائقہ ہے

انساں ہی تھے حضرتِ سلیماںؑ
انساں ہی تھے مسیحؑ دوراں

یہ قطرۂ[3] بحر کبریائی
دریا ہے جو ہوئے آشنائی

[1] قولہ وہ صورت حال الخ یعنی وہ تصویر جس سے تاج الملوک کی ماں کا پتہ ملتا تھا ۱۲م ش [2] قولہ واجب نہیں الخ حاصل یہ کہ بکاولی پر یہیں تک قید و بند رکھنا چاہیئے جہاں تک وہ تحمل کر سکے ۱۲م ش [3] قولہ یہ قطرۂ بحر الخ قطرہ سے مراد انسان یعنی اگرچہ انسان دریائے کبریا میں ایک قطرہ کی مثال ہے لیکن یہ وہ قطرہ ہے کہ اگر اس دریا کا آشنا ہو تو گویا خود دریا ہو جائے ۱۲م ش

کیا[1] شکوہ اگر پری نہ سمجھے
دم دھاگے ہیں رشتۂ نفس کے
افسوس جو آدمی نہ سمجھے
پھندے میں پھنسا ہمیشہ بس کے

بیاہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک کیساتھ اور رہنا ارم میں

شادی کے لئے ہے کلک شنجرف
حسن آرا اٹھی جو نیک تدبیر
انگشت قبول دیدۂ حسرت
دکھلائی جمیلہ کو وہ تصویر

پہچان کے خال و خط سے انداز
بولی کہو کیوں کہا کہ مانا
وہ جیب جو رہی تو یہ سخن ساز
پر کھوئے ہوئے کا کیا ٹھکانا

وہ بولی کہ تجھ کو اس سے کیا ہے
ٹھہری[2] یہ غرض کہ آج کی رات
کہنے تو سمجھ کے کچھ کیا ہے
فیروز شہ آگے چھیڑیے بات

جب سونے کو وہ محل میں آیا
یا د اس نے کیا بکاؤلی کو
افسانۂ عشق اُسے سنایا
لے آئے اُڑا کے اُس پری کو

تصویر بشر دکھائی اُس نے
دیکھا تو نہ فرق تھا سر مو
شادی کی خبر سنائی اُس نے
جانچے خط و خال و چشم و ابرو

نقشے سے وہی نگار پایا
کہنے لگی دل میں یا الٰہی
قسمت کا لکھا سا آگے آیا
شر ہو نہ کہیں یہ خیر خواہی

پیارے سے نہو خلاف وعدہ
دیکھا تو وہ بھیدی حسن آرا
کیا سوچتی ہوں نصیب اعدا
کرتی تھی اُسی کے رخ نظارا

[1] کیا شکوہ الخ یعنی پری اگر کسی امر کو نہ سمجھ سکے تو لحاظ کی عقل پری کے پری سے اسکا شکوہ نہیں ہوگا لیکن آدمی سے بسبب کامل العقل ہونے کے مقام شکوہ ہوگا ۱۲م ش [2] تولہ ٹھہری الخ یعنی جمیلہ اور حسن آرا الغرض باہم یہ بات قرار پائی کہ آج کی رات کو فیروز شاہ کے آگے بکاؤلی کی شادی کا معاملہ چھیڑا جائے ۱۲م ش

روح افزا کا جو آگیا دھیان — تسکین ہوئی آئی جان میں جان

جانا کہ بہار فصل سے ہے — یہ نقل مطابق اصل سے ہے

اقرار میں تھی جو بے حیائی — شرمائی لجائی مسکرائی

حسن[1] آرا نے کہا مبارک — ایجاب اس نے کیا مبارک

سج دھج یہ بنی ادھر بنائے — بن ٹھن کے بنا اُدھر سے آئے

ستارہ شناس کو بلایا — ساعت ٹھہرائی دن دکھایا

شادی کی خبر سے خوش آئی — مشتاق کو خوش خبر سُنائی

راتوں کو جو گنتی تھی ستارے — دن گننے لگی خوشی کے مارے

واں مہندی نے چوڑے پائے خورشید — یاں سبز ہوا نہالِ اُمّید

وہ واں پہ گلاب سے نہائی — یاں تازگی آبرو نے پائی

واں[2] غازہ سے رُخ شفق میں خورشید — یاں جگمگیا منہ پہ رنگِ اُمید

افشاں ہوئے واں ستارہ افشاں — یاں جبہہ سے روشنی دوچنداں

واں مانگ سے رنگ کہکشاں ماند — یاں شملۂ سر سے ہالہ میں چاند

واں زلف نے کھائے پیچ پر پیچ — طُرّہ کلغی پہ یاں تھا سر پیچ

آنچل ہوا واں حجاب عارض — سہرا ہوا یاں نقاب عارض

زیبا ہوا واں بدن پہ گہنا — یاں جامہ وفا کا اس نے پہنا

محرم کے کسے گئے ادھر بند — ہمت کا بندھا ادھر کمر بند

واں[3] گل سے بہار بوستاں ہے — آرائش تخت گل یہاں ہے

دولہا دولہن

[1] قولہ حسن آرا نے الخ ایجاب سے کیا مبارک یعنی اسنے اسکا مبارکباد دینا قبول کیا ۱۲ م س

[2] واں غازہ سے رُخ الخ یعنی غازہ رنگین جو سرخ رنگ ہوتا ہے رخ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ خورشید پر شفق ہے ۱۲ م ش

[3] واں گل سے الخ یعنی وہاں بکاولی کا جلوہ حسن بہار بوستاں ہو رہا تھا اور یہاں پھولوں کے تختوں کی آرائش ہو رہی تھی قدیم رسم ہے کہ شادی میں تختہائے گل بھی بنائے جاتے ہیں ۱۲

الماس[1] کے واں تھے جھاڑ فانوس | یاں جلوہ فروش تخت طاؤس
مہتاب سی چاندنی کا واں فرش | یاں چرخ سے چرخ میں سرِ عرش
واں جلوے حنائی انگلیوں کے | یاں روشنی کے تھے پنجشاخے
بادل سے وہ واں گرج رہے تھے | یاں دھوم سے باجے بج رہے تھے
واں پریوں میں ذکر آدمی زاد | نوشہ کے جلو میں یاں پریزاد
گلگوں بھتا کسی کا بادرفتار | گل رنگ کسی کا تھا ہوادار
ہاتھی تھے تو مستیوں کی دہت تھے | گھوڑے تھے تو چابکی کی لت تھے
وہ ماہ کہ تھا سوارِ شبدیز | تھا پا بہ رکاب شوقِ مہمیز
درتک جو برات ادھر سے آئی | کی سب نے ادھر سے پیشوائی
فیروز و مظفر ایسے دو شاہ | پُرنور تھے جیسے مہر اور ماہ
بارانِ گلاب و بارشِ گل | ہوکر بڑھے آگے باتجمل
سلطان فیروز رشک جم تھا | نوشہ مسند[3] پہ جم کے بیٹھا
ہر پالے بنے کا شور وغل تھا | سنبل کا چنور تو چتر گل تھا
گل سے خوانوں میں زر وہ لایا | اُن غنچہ دہانوں کو کھلایا
خورشید سا آفتابہ لائے | منھ ہاتھ ہر ایک کے دُھلائے
قلیان[2] سے مشکبو دُھواں دھار | بیڑے سپے چکھے پان کے مزیدار

[1] الماس الخ تخت طاؤس خاص تخت شاہی کا نام ہی جو سلاطین تیموریہ دہلی میں موروثی تھا ۱۲ م شمس
[2] قولہ قلیان الخ ممکن ہو کہ مصرعہ ثانی بیڑے کھائے بہت مزیدار یا بیڑے سپے چکھے بہت مزیدار کی تحریف ہو کیونکہ بیڑے مراد خصوصًا ایسے موقع پر بجز پانکے بیڑے کے اور کیا چیز ہوسکتی ہے کیونکہ گو اس زمانے کے محاورہ میں ایسی تخفیف بھی جائز سہی لیکن پھر بھی جب چکھے یا تشدید بے تکلف موزوں ہوسکتا تھا تو مصنف اور انکے اُستاد دونوں میں کوئی ایسا غبی نہ تھا کہ جو ایسی بے ضرورت تخفیف رکھتا
[3] یعنی سلطان فیروز رشک جم کی مسند پر نوشہ نے جلوس کیا ۱۲ م شمس

جب عقد کی انکے ساعت آئی — دو رشتوں میں اک گرہ لگائی
یکجا کیے وہ عروس و داماد — وہ جان پری یہ آدمی زاد
حیرت نے آئینہ دکھایا — شربت دیدار نے پلایا
زلفیں ہوئیں چہرے کی بلائیں — ٹونا وہ نگاہیں سحر آگیں
جو چہرۂ آتشیں پہ تل تھا — اسپند نگاہ بد بدل تھا
جوڑی جو ملی سبنے بنی کی — سنگت ہوئی راگ راگنی کی
جو گائنیں تھیں شہانے گائیں — لیتے ہوئے نیگ راگ لائیں
حق پا کے جو رکھتی تھیں قدامت — بول اُٹھیں مبارک و سلامت
پیارا ہتھا بنے بنی کا جوڑا — خلوت میں دولھا دلھن کو چھوڑا
پریاں کہ ہزار ہا بھری تھیں — ارمان سی سب وہاں سے نکلیں
بے پردگی ہوتی تھی جو اُن میں — دروازوں نے بند کرلیں آنکھیں
طومارِ حجاب کو کیا طے — ساغر پہ جھکا وہ شیشۂ مے
مستانہ ملا دولھن سے نوشاہ — صحبت ہوئی دخت رز سے دلخواہ
مست آنکھیں تھیں رشک جام سرشار — لبریز ہوئی شراب دیدار
گردن تھی صراحئ مے ناب — ہاتھ آئی وہ بہر مستی خواب
جب اوڑھی عروس مہ نے چادر — نکلا پردے سے شاہ خاور
ثابت وہ جو شب کو تھے ستارے — خورشید نکلتے ہی سدھارے
یعنی دولھا دُلھن سحرگاہ — نکلے آرام گہ سے دلخواہ
منھ گھر کو براتیوں نے موڑا — محظوظ دُولھا دُلھن کو چھوڑا (یعنی)
وہ حوض گلاب میں نہایا — یاں رُخ عرقِ گلاب پایا
واں جوڑا چست و تنگ بدلا — یاں جوڑے کے مُنھ کا رنگ بدلا

وہ راگ کا دیکھنے لگا رنگ	یاں پردے میں چھیڑ تھی خوش آہنگ

رخصت ہونا تاج الملوک کا بکاؤلی کو لیکر اور آنا گلشن نگارین میں

غربت سے جواب سرو وطن ہو	گلگشت دو روز یاں یہ حرف زن ہے
شادی ہو کر وہ خانہ آباد	سوچا کہ بنا میں خانہ داماد
غربت میں وطن کی دھن سمائی	اُس فیل کو یاد ہند آئی
خلوت میں ہوا پری سے گویا	دنیا میں ہیں سب وطن کے جویا
پانی تہ خاک کو رواں ہے	لو شعلہ کی سوے آسماں ہے
عزم سفر وطن سمجھ کر	بولی وہ بکاؤلی کہ بہتر
چلئے گا تو ساتھ ہیں بلا عذر	رہیئے گا تو بندگی ہیں کیا عذر
ہاتھ اُس کا پکڑ کے باہر آئی	ماں باپ کے پاس دختر آئی
ہوتے[1] ہی دو چار خویش و دختر	دو سے ہوئے چار اُس جگہ پر
وہ تینوں تھے قوم کے پریزاد	چوتھا اُن میں یہ آدمی زاد
چومی اس نے زمین خدمت	غربت سے وطن کی چاہی رخصت
فیروز شہ و جمیلہ بانو	دونوں ہوئے سُن کے سر بزانو
غوطے میں جو آگئے وہ یکسر	بولی ماں باپ سے وہ دختر
پردیسیوں سے جو کی ہے نسبت	اب کیجیے ہنسی خوشی سے رخصت
دعوی نہیں کچھ دیئے ہوئے پر	قائم رہیئے کیے ہوئے پر
لازم جو ہو اُس میں کد نہ کیجیے	سائل کا سوال رد نہ کیجیے
بولی وہ بخت تھا زبر دست	خورشید کو ذرہ نے کیا پست

[1] قولہ ہوتے ہی الخ مصرع اول میں لفظ چار مضاف ہے اور خویش جو بمعنی داماد ہے مضاف الیہ و معنی ظاہر ۱۲ منہ

انساں سے جھکی پری کی گردن
کانٹے سے رکا ہوا کا دامن

یہ کہہ کے منگائے دو ہوادار
سو دیو بلائے بادرفتار

ہو کر دیووں کی زینت دوش
رخصت وہ ادھر ہوئی ادھر ہوش

اشکوں سے شگون لیا زلالا
آئینۂ رخ پہ پانی ڈالا

سونپا مختار کو جو مجبور
گھر پاس تھا اور وہ منزلوں دور

آئی تو وہ باغ سحر بنیاد
تھا آب و ہوائے خوش سے آباد

خیل و خدم اس کے منتظر تھے
مانند حواس منتشر تھے

پہچان کے سب نے غل مچایا
آیا تاج الملوک آیا

داخل جو ہوئے محل کے اندر
محمودہ لپکی دوڑی دلبر

پوچھا خوش خوش کہا کہ دم لو
دیکھو یہ کون ہیں قدم لو

دلبر یہ ہی بکاولی ہے
محمودہ دیکھ کیا پری ہے

سبحان اللہ کہہ کے دلبر
بولی کہ یہ گھر ہوا منور

محمودہ نے کہا مبارک
خوشنودی آشنا مبارک

ان مختصروں نے جب دیا طول
بولی وہ بکاولی کہ معقول

یہ سمجھو تو کچھ نہیں ہے تکرار
خوش پوش ہو ایک جوڑے دو چار

درجے درجے رہیں وہ ذی ہوش
ہم خانہ و ہمدم و ہم آغوش

طلب ہونا بکاولی کا راجہ اندر کی محفل میں اور آگاہ ہو کر جانا تاج الملوک کا

تقدیر سے ہیں جو شادی و رنج
اب یوں نئے خامہ ہے نواسنج

از بسکہ یہ چرخ فتنہ انگیز
ہے خرمن عیش پہ شرر ریز

یک چند وہ مہ تھی کاہشوں میں
گذری اک عمر خواہشوں میں

تقدیر سے جب مراد پائی | راجا اندر کو یاد آئی
اندر اسن امر نگر ہے شہر ایک | خلقت ہے وہاں کی زندہ دل نیک
اندر ہے بادشاہ اُس کا | آسن ہے تختگاہ اُس کا
مضمون وہ قضا سے اسقدر ہے | اُس بستی کا نام امر نگر ہے
یزدانیوں کا ہے مسکن اسمیں | روحانیوں کا نشیمن اُس میں
کہتے ہیں مورخان ہندی | آباد ہوا پہ ہے وہ بستی
راجا کہ کمال پارسا ہے | مقبول جناب کبریا ہے
خالق نے دیا ہے فوق اس کو | نغمہ سے ہے ذوق شوق اُسکو
انسان کا سرود رقص کیا ہے | پریوں کا ناچ دیکھتا ہے
باری باری سے جو پری ہے | راجا اندر کی مجرئی ہے
لیکن جو بکاولی دل افگار | باری پہ پہونچ سکی نہ بیمار
اک شب راجا تھا محفل آرا | یاد آئی بکاولی دل آرا
پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے | شہزادی بکاولی کدھر ہے
منھ پھیر کے ایک مسکرائی | آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک | ہونٹھوں کو ہلا کے رہ گئی ایک
بولا وہ کہ چپ ہو کیوں سبب کیا | بولیں وہ کہ کہئے بے ادب کیا
ناتا پریوں سے ہے اُس نے توڑا | رشتہ ایک آدمی سے جوڑا
وہ سن کے خفا ہوا کہا جاؤ | جس طرح سے بیٹھی ہو اُٹھا لاؤ
پریاں اُڑیں اوپر اوپر آئیں | مہتابی پہ مثل ابر چھائیں

ف قولہ مضمون وہ آخر مضمون بمعنی محفوظ یعنی وہ شہر موت سے اسقدر محفوظ ہے کہ اُسکا نام امر نگر ہے امر بترکیب ہندی بمعنی نہ مرنیوالا یعنی اُس شہر میں موت کا گذر نہیں ہے ۱۲ تم ش

دیکھا تو وہ دونوں کرتے تھے خواب | گل تکیے تھے آفتاب و مہتاب
ہم بستر آدمی پری تھی | سایہ کے بغل میں چاندنی تھی
غافل جو مؤکلوں نے پایا | اُس نقش مراد کو جگایا
جاگی[1] تو سب اُسکے جوڑ کی تھیں | اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں
بولیں کہ طلب کیا ہے چلیئے | جوڑا یہ خراب ہے بدلیئے
اُٹھی اُسے جی کی طرح چھوڑا | بدلا مانند رنگ جوڑا
ساتھ اُن کے وہ تا بہ محفل آئی | لرزاں لرزاں مقابل آئی
راجا نے نگاہ کی غضب سے | پوچھا کہ یہ بجپائی کب سے
بو آتی ہے آدمی کی لے جاؤ | ناپاک ہے آگ اسے دکھلاؤ
شعلہ سا پری کا جسم کانپا | منہ دامن اشک تر سے ڈھانپا
پریوں نے کشاں کشاں نکالا | صندل سے آتشکدے میں ڈالا
کافور[2] سی جل اُٹھی سراپا | ٹھنڈی ہوئیں تھا جنھیں جلاپا
جو آتش گل نہ لے چمن سے | جھونکا اُسے آگ میں جلن سے
جس رخ پہ تھی کاکل معنبر | تھا چشم زدن میں دود اخگر
جس جسم پہ تھی نفیس پوشاک | شعلہ کے سوا نہ کچھ بھی تھا خاک
عیسٰے نفس ایک خضر آئی | چھینٹے سے جلی ہوئی جلائی
شعلے سے زیادہ پاک و اماں | آکر ہوئی انجمن میں رقصاں

[1] قولہ جاگی الخ اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں یعنی پریاں تھیں چونکہ لفظ سب مصرعۂ اول میں آچکا ہے اسوجہ سے لفظ پری موجبِ اعتراض میں فرض کیجئے اگر یوں کہا جاتا جب بکاؤلی جاگی تو دیکھا کہ سب اپنے الیاں بکاؤلی کی جوڑ کی تھیں نہ کہ عورت تھیں تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ناجائز یا غیر فصیح ہوتا بس جبکہ وہ غیر تو پری تھیں کیونکر غیر فصیح ہوسکتا ہے بلکہ عین محاورہ ہے ہاں اگر لفظ سب مصرعۂ اول میں موجود نہ ہوتا تو البتہ کسیقدر مکروہ سمجھا جاسکتا تھا نہ کہ غلط ۱۲ ام ش [2] قولہ کافور سی الخ یعنی شعلہ کیطرح ہمہ تن جلنے لگی ۱۲

ناچی گائی عندلیب ناچار
اغیار ادا سے کر لیئے یار

برخاست کا وقت صبحدم تھا
راجا وہ کہ صاحب کرم تھا

بولا جا یوں ہی آئیو روز
جل بجھ کے سدا سنائیو سوز

رخصت پاتے ہی وہ ہوائی
پیراں پیراں ہوا سی آئی

پشواز کنار حوض اتاری
شب کی پوشاک پہنی ساری

بیتاب آرام گہ تک آئی
ہمخواب کی آنکھ بند پائی

یوں سیج پہ آ کے سوئی بیتاب
جس شکل سے آئے آنکھ میں خواب

وہ آہوئے مست خواب خرگوش
یعنی تاج الملوک بیہوش

اُس[۱] شب کو بغل میں آ کے جاگا
پر دوسری شب وہ جاگے جاگا

دیکھا[۲] تو وہ متصل نہیں ہے
پہلو میں جگر کے دل نہیں ہے

حاجت کی گماں سے جب تُنی دیر
جھنجھلا کے پلنگ سے اٹھا شیر

دائیں دیکھا نظر نہ آئی
بائیں دیکھا کہیں نہ پائی

عورت تھی گمان بد سے کھٹکا
جانا کہیں دل کسی سے اٹکا

اثر در نظر آیا در کا سایہ
سمجھا وہ پلنگ چارپایہ

آنکھوں[۳] میں جو چھا گیا اندھیرا
پل مارتے ہو گیا سویرا

---

[۱] اُس شب کو الخ یعنی پہلی رات میں سوتے جاگا جب بکاؤلی واپس آ کر اسکو اپنی بغل میں لیکر لیٹ چکی تھی لیکن دوسری رات میں سوتے جاگا جب بکاؤلی اسکے پاس سے اٹھ کر جا چکی تھی اور ہنوز واپس نہیں آئی تھی ۱۲ ام ش [۲] دیکھا تو الخ متصل اتصال رکھنے والا یعنی بکاؤلی جو تاج الملوک کیلئے دل کے مانند تھی نہیں ہے ۱۲ ام ش [۳] آنکھوں میں الخ یعنے جوش غیظ یا فرط غم نقدان بکاؤلی میں وہ خود رفتگی طاری ہوئی کہ درازی شب معلوم ہی نہیں ہوئی گویا طرفۃ العین میں صبح ہو گئی ۱۲ ام ش

جاگا[۱] تو پری بغل میں پائی — وہ نقش وفا عمل میں پائی
دانستہ خبر ہوا نہ بیتاب — گویا کہ وہ شب کا حال تھا خواب
جب مہرِ فلک گیا لبِ بام — مہتابی پہ آئی وہ سرِ شام
معمول سے بزم میں ہوئے جمع — مینا و کباب و مجمر و شمع
جام اس نے بھرا کہا پیالے — دل اس کا بھرا تھا جام کیا لے
ٹھانی تھی کہ آج رہ کے بیدار — دیکھوں جاتی کہاں ہے عیار
بولا کہ ہیں دردِ سر کے کچھ طور — میں آج نہ ہوں گا شاملِ دور
ہٹ اُس نے جو کی تو ہاتھ مارا — شیشہ ہوا چور چور سارا
ہوتی ہے جو نوکِ شیشہ خنجر — پور کے لگے اسکی اُنگلیوں پر
بیداریِ شب کی گھات پائی — حکمت سرِ دست ہاتھ آئی
کف میں نمکیں کباب لے کر — چھڑکا نمک اُن جراحتوں پر
بند آنکھیں کیے ہوئے شکر لب — بیدار رہا تو آخرِ شب
پریوں نے ہوا سے تخت اُتارا — ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا
سوتا اِسے جان کر اُٹھی وہ — پوشاک بدلنے کو گئی وہ
اُس تخت کا یہ پکڑ کے پایہ — پوشیدہ ہوا برنگ سایہ
بن ٹھن کے جب آئی رشکِ ناہید — ذرہ ہوا ہمرکابِ خورشید
آتے ہی زمین سے آسمان پر — پہونچی اُس بزم میں سماں پر
لوگوں سے بھرا وہ دائرہ تھا — پُرصوت و صدا وہ دائرہ تھا
ٹھیکے پہ پہونچ کے تخت ٹھہرا — مرکز پہ وہ نجم بخت ٹھہرا

۱ جاگا الخ ظاہراً جاگا تحریف ہے چونکا یعنے جب اس وارفتگی جوشِ غم و فقدان بکاولی سے افاقہ ہوا اور ہوش درست ہوئے دیکھا تو بکاؤلی بغل میں موجود ہے ۱۲ شش

آتشکدہ پریوں نے بنا کر
پھینکا اُسے پھول سا اُٹھا کر

شہزادہ کہ زیر تخت زرکار
تھا پہلوئے گل میں صورتِ خار

فریاد نہ کرنے پایا مضطر
تاباں ہوئے راکھ میں سے اخگر

راجا جس رُخ محفل آرا
دل لیتی ہوئی چلی دل آرا

ہمراہ چلا وہ چھوڑ پایا
آگے تھی پری تو پیچھے سایا

محفل میں جو آئی شمع محفل
پروانوں کا ہاتھ سے گیا دل

جو گاتی تھیں بیٹھیں مثل آواز
مجرے کو اُٹھی وہ صورتِ ناز

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی
خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

رقص اُس کا اگرچہ خوشنما تھا
سنگت کا پکھاوجی تھکا تھا

شہزادہ نے دیکھ دائیں بائیں
لیں طبلہ نواز کی بلائیں

آہستہ کہا کہو تو آؤں
فرماؤ تو بندگی بجاؤں

اُسنے جو پکھاوج اسکو دیدی
کیفیت اتفاق نے دی

تھا سم پہ یہ اُس پری کا نقشا
سب آنکھ ملا کے کہتے تھے آ

محظوظ کیا جو سب کو اکبار
بخشا راجہ نے نولکھا ہار

انداز سے اُس نے لیکے مالا
کاندھے پہ پکھاوجی کے ڈالا

برخاست کا تھا وہ رخصتی ہار
برہم ہوئی بزم اُٹھے سب اکبار

لے ہار وہ شاہزادہ فی الفور
پنہاں ہوا زیر تخت اُسی طور

بادِ سحری چلی جو سن سے
وہ شمع سدھاری انجمن سے

خورشید سے پہلے اُڑ کر آئی
تاروں کی چھاؤں میں گھر آئی

وہ حوض کے رُخ چلی اُتر کر
یہ آنکھ بچا کے سوئے بستر

وہ آئی تو غافل اس کو پایا
آغوش میں آ گلے لگایا

جب پردۂ صبح ہو گیا فاش — خنداں خنداں اُٹھا وہ بشاش
اس غنچہ دہن کا مُسکرانا — بے رنگ بکاؤلی نے جانا
ہنستے ہنستے کہا ہنسے کیوں — ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں
بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا — آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر — دلسوزی کرے گا کوئی دلگیر
بولا وہ کہ رات کو افق میں — خورشید تھا آتشِ شفق میں
بولی وہ کہ پھر سے شب و روز — عالم میں رہو گے رونق افروز
بولا وہ کہ اک مقامِ ہو تھا — گلزارِ خلیل رو برو تھا
بولی وہ بشر ہو تم دلاور — سرسبز ہو قومِ آتشی پر
بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں — شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں
بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں — جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا — بخشا مہِ انجمن نے ہالہ
ہالہ مہِ انجمن کا کیا تھا — وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا
گھبرائی پری کہ ہیں یہ کیا ہے — بولا وہ کہ ہار نو لکھا ہے
کاندھے[له] پہ تھا جسکے رات ڈالا — پہچانتی ہو وہ طبلہ والا
کیوں جی یہ اکیلے شب کو جانا — اوپر اوپر مزے اُڑانا
یہ سُن کے پری وہ سوختہ تن — بولی کہ سُن او صلاح دشمن
میں جا کے جلی تو غم نہیں ہائے — ڈر ہے کہ نہ تجھ پہ آنچ آجائے
میرے سر جلنے پہ خاک ڈالو — تم نام نہ واں کے چلنے کا لو

له قولہ کاندھے الخ پہچانتی ہو وہ طبلہ والا یعنی تم پہچانتی ہو جسکے کندھے پر تمنے رات کو ہار ڈالدیا تھا وہی طبلہ والا گویا یہ بطور اشارہ و طنز آمیز کے ہے اور اس اشارہ کی فصاحت ظاہر ہے ۱۲ حشم

افروختہ آتشِ حسد ہے / جلنا یہ سپند چشم بد ہے
بولا وہ کہ یہ نہ ہوگا مجھ سے / میں دو قدم آگے ہونگا تجھ سے
سمجھاتی رہی اِسے وہ دانا / لیکن اُس نے کہا نہ مانا
عازم ہوا شب کو آتے ہی تخت / یا قسمت یا نصیب یا بخت
واں جاکے وہ سوجھی اسکو یہ لاگ / لے چلئے تو راجہ لائیگا راگ
سنگت سکا پکھاوجی بناکے / گائی یہ غزل مقام پاکے

غزل

ساقی قدح شراب دیدے / مہتاب میں آفتاب دیدے
ساقی باقی جو کچھ ہو لے لے / باقی ساقی شراب دیدے
اُس بت سے نہیں سوال کچھ اور / اپنے منھ سے جواب دیدے
لیلےٰ میں نے تجھے بنایا / مجنوں مجھکو خطاب دیدے
اُس گل سے نسیم زر نہیں مانگ / جو چاہے وہ بیحساب دیدے

نصف پتھر ہو جانا بکاؤلی کا راجہ اندر کی بددعا سے اور بتخانہ میں کرمانا تاج الملوک سے اور کھدنا بتخانہ کا رانی چتراوت کے حکم سے

ہے اب جو بیان سنگساری / یوں پائے قلم ہوا ہے بھاری
خوش لہجہ بہت بکاؤلی تھی / گاتی اور ناچتی بڑی تھی
راجہ نے کہا کہ خوش ہوں تجھ سے / جو چاہے آج مانگ مجھ سے
دکھلاکے اُسی پکھاوجی کو / مانگا کہ یہ دو بکاولی کو
ارمان یہی ہوس یہی ہے / خاطر کی مراد بس یہی ہے
مانگا جو بشر پری نے بیباک / راجا اندر ہوا غضبناک

بولا کہ اس آدمی کی یہ تاب / لے چشمۂ آفتاب سے آب
کھویا تجھے تیری آرزو نے / جا تیری سزا یہ ہے کہ تو نے
کی ہے حرکت خلاف آئیں / پتھر کا ہو نصف جسم پائیں
اس سختی سے کچھ دنوں رہے تو / بعد اسکے خاک میں ملے تو
قالب ترا انقلاب کھائے / جامہ میں تو آدمی کے آئے
بارہ برس اس طرح گذر کر / پھر تجھکو ملے پری کا پیکر
اسوقت جہاں تو چاہے جائے / تو اس کو ملے وہ تجھ کو پائے
روئی وہ بکاولی یہ سن کے / تڑپا شہزادہ سر کو دھن کے
خواہش جو بلائے جاں ہوئی وہ / ہلکا ہوا یہ گراں ہوئی وہ
ناری تھی پری ہوا ہوائی / خاکی تھا بشر زمیں جھکائی
سایہ سا زمیں پہ جب گرا وہ / افتاد کو سوچنے لگا وہ
سبزے کی دھوپ چھاؤں مخمل / صحرا میں بچھی تھی [illegible]
چشمہ ایک آفتاب سا تھا / عاشق کی طرح بھرا ہوا تھا
پریاں کچھ ادھر نہانے آئیں / دیکھا وہ بشر تو کھلکھلائیں
بولیں یہ وہی بکھاوجی ہے / عاشق جس پر بکاولی ہے
وہ چونک کے بول اٹھا کہ اللہ / بتلاؤ کہاں ہے وہ کہا آہ
اندر کے غضب سے بنکے پتھر / ہے بت سی وہ ایک گھر کے اندر
پوچھا کہ کدھر کہا بہت دور / بولا وہ کہ پھر کہا کہ مجبور
یہ کہکے اتاری سب نے پوشاک / باہر ہوئیں جامہ سے وہ بیباک
پردے کا جو کچھ خیال آیا / تن چادر آب سے چھپایا
بے ننگ یہ سب نہا رہی تھیں / موجیں باہم اڑا رہی تھیں

سو جا وہ کہ انکو دیجئے جل
خس پوش کئے وہ جامۂ گل

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں
باہر بصد آب و تاب آئیں

پوشاک دھری ہوئی نہ پائی
جانا کہ حریف نے اُڑا لی

جھک جھک کے بدن چراتی آئیں
رک رک کے قدم بڑھاتی آئیں

دکھلائی کسی نے چشم جادو
چمکائی کسی نے تیغ ابرو

جھنجھلا کے کہا کہ لاؤ مانو
ہمکو بھی بکاولی نہ جانو

بولا وہ چہ خوش تم ایسی کیا ہو
ڈرنے کا نہیں میں کیا بلا ہو

پوشاک جو لینی ہو تو پہنچاؤ
بولیں وہ چلو کہا قسم کھاؤ

عریانی کے ننگ سے لجائیں
ستار کی قسمیں سب نے کھائیں

شہزادے نے کر کے پاس انکا
خلعت سا دیا لباس اُن کا

پریاں ہوئیں رخت سجکے خرسند
ہو جیسے ہوا حباب میں بند

شانے پہ چڑھا کے مثل گیسو
اُس گل کو اُڑایا صورتِ بو

واقف اُس بتکدے سے تھیں وہ
سنگلدیپ اسکو لے گئیں وہ

وہ جائے بکاؤلی بتائی
دیوانے کو باؤلی بتائی

بت خانے میں تھا طلسم کا در
ششدر ہوا چار سمت پھر کر

عُقدہ کھلا شام ہو کر اس کا
شق مثل قمر ہوا در اُسکا

دیکھا تو وہ بت تھی مٹھ کے اندر
جسم آدھا پری تھا آدھا پتھر

تھی ناف سے لیکے تا بہ پا سنگ
تھا کوہ سُریں کے آگے پاسنگ

چومے جو قدم اُس آدمی نے
سینے سے لگا لیا پری نے

نرمی سے کہا بخیر گذری
کس سختی سے تم بغیر گذری

ہم پر تو پڑے وہاں یہ پتھر
تم کیونکہ بچے کہا مقدر

گر پڑ کے زمیں پہ مثل شبنم
پھر پریوں کی مہر سے اُڑے ہم

جذبہ تم پاس کھینچ لایا
سختی اب دُور ہو خدایا

تا آخر شب فسانے کہہ کر
بولی وہ پری کہ اے دلاور

یہ در مانند چشم بے خواب
ہوتا ہے سحر کو بند بیتاب

پیش از دم صبح تم نکل جاؤ
کل پھر سر شام خیر سے آؤ

مصرف کو جو ہو ضرورت زر
زیور مرا مجھ سے لو یہ کہکر

کانوں میں سے موتی کچھ نکالے
دامن پہ مثال اشک ڈالے

صدقے وہ بشر ہوا پری کے
قدموں پہ گرا بکاولی کے

پاؤں اسکے چھوئے تو تخت سے پائے
آنسو چھوڑے گہر اُٹھائے

نکلا جیسے ہی مٹھ کے باہر
پتھرا گئی چشم حلقۂ در

آنکھوں سے یہ دیکھنا ہوا قہر
آگے کو بڑھا چلا سوئے شہر

بازار میں جا کے بیچے گوہر
مفلس سے ہوا وہ صاحب زر

گھوڑا جوڑا الغرض حویلی
جو جو شے چاہیئے تھی لے لی

جب منزل شب میں رہرو روز
لے گوہر شبنم آیا پُرسوز

گنبد گردوں کا تھا جو بے در
تاباں ہوئے اُسمیں ماہ و اختر

سیاروں سے کرکے استخارہ
اُس برج کے رخ وہ مہ سدھارا

دیکھا تو در قبول وا تھا
رگڑا اُنھیں ایڑیوں پہ ماتھا

شب سایۂ زلف میں بسر کی
لی صبح کے ہوتے راہ گھر کی

تقدیر نے راستہ بھلایا
راجا کے محل کی جانب آیا

چتر اوت اُس کی ماہ پارہ
غرفے میں سے کرتی تھی نظارہ

دیکھا تو جوان تھا یہ تصویر
صورت پہ فدا ہوئی وہ بے پیر

یاں پردہ در نظر سے گذرا | واں تیر نظر جگر سے گذرا
دستور تھا بیٹی جسکو چاہے | باپ اُسکا اُسی کے ساتھ بیاہے
راجہ سے خوش خبر بیاں کی | مشاطۂ خوش ادا رواں کی
شادی کی خبر سے وہ یکایک | خوش خوش آئی کہا مُبارک
اِس شہر کا چترسین راجا | دختر رکھتا ہے ماہ سیما
ہر ملک کے شہریار آئے | ہر شہر کے تاجدار آئے
راضی تجھ سے ہوئی وہ بے پیر | طالع قسمت نصیب تقدیر
بیجا[1] وہ ہوا کہا کہ جا جا | کیسی رانی کہاں کا راجا
دکھلا نہ مجھے ہرے ہرے باغ | غنچے کی گرہ میں کیا ہے جز داغ
الفت میں ہے آبرو گنوانی | کب چشمۂ مہر میں ہے پانی
مکار تو مجھ سے کرتی ہے زور | دُور ہو مرے سامنے سے چل دُور
ہٹ دیکھ کے اسکی ہٹ گئی وہ | قسمت کی طرح پلٹ گئی وہ
پایا جو جواب منتظر نے | آنکھوں میں لگا خیال پھرنے
تقدیر کی بات ہونے والی | زر سے ہوا اسکا ہاتھ خالی
من سانپ کا ران سے نکالا | بازار آیا وہ سرو بالا
کیا جوہری مول کرتے اسکا | راجہ تک رفتہ رفتہ پہونچا
جو مدعیوں کا مدعا تھا | موقع وہ ملا تو کیا بُرا تھا
جھنجھلا کے ڈرا کے غل مچا کے | سمجھا کے دبا کے دست پا کے
من[2] چھین کے چوری کے بہانے | بھیجا کھلے بندوں قید خانہ

[1] قولہ بیجا وہ ہوا الخ غالبًا بیجا تعریف ہے تیکھا کی جو بمعنی ترشرو غصہ ہونیکے ہیں ۱۲ م ش

[2] قولہ من چھین کے الخ کھلے بندوں یعنی کھلے خزانہ اور کھلم کھلا اور بے تکلف بھیجا ۱۲ م ش

زنداں میں وہ نیم جاں وہ بسمل　　زنجیر میں پاؤں زلف میں دل

غم کھا کے لہو کے گھونٹ پینا[۱]　　دم کے دھاگوں سے ہونٹھ سینا

داروغۂ محبس جفا نے　　رانی سے کہا کسی بہانے

یوسف کی خبر لے او زلیخا　　زنداں میں ہے وہ عزیز مرتا

اس[۲] چاہ میں کام ہو نہ جائے　　یہ ماہ تمام ہو نہ جائے

دانا تھی وہ چیل خانہ آئی　　بگڑے ہوئے کو منانے آئی

دیکھا تو وہ سرنگوں تھا دلگیر　　تھی حلقہ بحلقہ زلف و زنجیر

آنکھ اس سے نہ جب ملائی اُس نے　　زنجیر اس کی ہلائی اس نے

پابند وفا وہ مبتلا تھا　　کب اُس کو خیال بند پا تھا

رانی نے جو بید کی نگہ کی　　بیڑی کٹوائی بیگنہ کی

قدموں پہ گری کہا اُٹھو آؤ　　انکار و گریز جانے دو آؤ

اُٹھا وہ پری کی آرزو میں　　یہ سمجھی کہ پھانسا گفتگو میں

واں[۳] دھن کہ صنم سے کد خدا ہوں　　یاں دھیان کہ بت کا پارسا ہوں

تجویز کے اپنے مفہوم　　آئی تو محل میں مچ گئی دھوم

راجا نے ستارہ داں بلایا　　سعدین کا زائچہ ملایا

---

[۱] قولہ غم کھا کے الخ دم کے دھاگوں سے ہونٹ سینا یعنی تار نفس سے ہونٹوں کو سیا کرنا حاصل یہ کہ اپنے دم کو گھونٹ گھونٹ کے وقت گذرتا تھا ۱۲ م ش [۲] قولہ اس چاہ میں الخ تمام نہو جائے یعنی مر نجائے لفظ تمام میں دوسرا پہلو لطف کا یہ ہے کہ ماہ تمام پورے چاند کے معنوں میں مستعمل ہے جیسے چودھویں رات کا چاند کہتے ہیں ۱۲ م ش [۳] واں دھن الخ یعنی تاج الملوک اس خیال میں تھا کہ میں بت یعنی بکاؤلی کا پرستار ہوں اور ممکن ہے کہ بت کا پارسا ہوں تحریف ہے بت کے پاس جاؤں۔ کی بہار بت سے مراد بکاؤلی ہے جو نصف پتھر کی ہوگئی تھی ۱۲ م ش

دن ڈھل کے وہ ماہ نو سر شام | غائب ہوا سیر کر کے کچھ کام
دروازہ کا مٹھ کے دیدہ وا تھا | تو بہ کا در کھلا ہوا تھا
آیا تو وہ کب سے تکتی تھی راہ | دیکھا تو کہا کہاں رہے واہ
دیکھے جو حنائی ہاتھ بے راگ | تلووں نے پری کے لگ گئی آگ
پوچھا[۱] کہ بن آئی کس بنی کی | کس راہ کی زن نے رہزنی کی
توفیق یہاں تلک جو لائی | مہندی پاؤں کی گھس نہ جائی
قدموں[۲] سے لگا پسا ہوا وہ | مہندی کا جو رنگ تھا کہا وہ
رانی کی وہ مہر دستگرانی | راجہ کی وہ قہر حکمرانی
من بھیجا اپنا قید ہونا | داموں کے لئے وہ صید ہونا
چتراوت کا وہ آپ آنا | سب کہکے کہا خدا ہے دانا
شادی نہیں کچھ خوشی سے مانی | بے تیرے تھی مرگ زندگانی
غم تھا[۳] کہ ترے قدم سے چھوٹا | شادی کے بہانے غم سے چھوٹا
پیارے یہ نہیں حنائی چنگال | ہاتھ ایسے ملے کہ ہوگئے لال
زنجیروں نے پاؤں سے نکالا | زلفوں پہ نہیں ہے ہاتھ ڈالا
کانٹے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں | چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں
بگڑی وہ کہ چل بنا نہ باتیں | مجھ سے کوئی سیکھے ایسی گھاتیں
میری تجھے ایسی کیا لگی تھی | تلووں سے ترے حنا لگی تھی

۱ قولہ پوچھا کہ الخ مصرعۂ دوم میں غالبًا کس راہ کی زن تحریف ہے کس رہ زن آئیکی اور مفہوم دونوں مصرعوں کا ایک ہی ہے یعنی رہزن اول میں زن رہ اور رہزن دوم بمعنی راہ مار ۱۲ م ش ۲ قولہ قدموں سے الخ پسا ہوا وہ یعنی مصائب زندان کا فرسودہ یا تکالیف عشق بکاؤلی کا فرسودہ ۱۲ م ش ۳ غم تھا الخ یعنے تیری جدائی کے غم میں مبتلا ہوگیا تھا اس شادی کے ذریعہ سے مجکو اس غم جدائی سے نجات نہیں ہوئی ۱۲

تنگ آیا تو دیکھ قید خانا ۔۔۔ آسان نہیں کڑی اُٹھانا
پتھر کی اگر کہو تو میں ہوں ۔۔۔ فولاد جگر کہو تو میں ہوں
سہتی ہوں جہاں کی سختی سستی ۔۔۔ آسائش جان نہ تندرستی
اس تنگ قفس کو سمجھی ہوں باغ ۔۔۔ سنگینی گراں نہ جلنے کا داغ
قسمت سے مفر ہے اب نہ مامن ۔۔۔ پتھر کے تلے دبا ہے دامن
کب جا ہے گی عقل مصلحت سنج ۔۔۔ تم تو کرو شادی ہم کریں رنج
راضی ہیں خدا کی جو رضا ہو ۔۔۔ ہوتی ہے سحر چلو ہوا ہو
وہ معتقد اُسکے پاؤں چھوکر ۔۔۔ اُٹھا چھاتی پہ رکھ کے پتھر
آیا تو وہ نوعروس زیبا ۔۔۔ بستر پہ تھی شکل نقش دیبا
نیند آئی جو تھی بصد کدورت ۔۔۔ تھی چین بجبیں شکن کی صورت
سوئی تو تھی انتظار میں وہ ۔۔۔ جاگی تو ملا کنار میں وہ
سوتے جو کٹی شب جوانی ۔۔۔ سوخفتہ نصیبی اپنی جانی
تھے صبح سے دونوں شام جویاں ۔۔۔ شب کو ہوئی داخل شبستاں
دونوں تھے تصور دنیں کامل ۔۔۔ خلوت خانہ تھا گوشۂ دل
دو آنکھوں کی طرح ایک جا تھے ۔۔۔ پر دل جو ملا نہ تھا جُدا تھے
کروٹ لے کر وہ عنبریں مو ۔۔۔ اُٹھ بیٹھے چلنے کا سوچتا تھا پہلو
چپکی ہوئی پیٹھ سے وہ دلگیر ۔۔۔ آئینہ کی پشت پر تھی تصویر
حیرت پہ چھائی تو کھو گئی یہ ۔۔۔ غفلت آئی تو سو گئی یہ
غافل اسے چھوڑ کر اٹھا وہ ۔۔۔ لپکا تو پری کے رُخ گیا وہ
یہ جاگے ہوئی وہ فتنہ بیدار ۔۔۔ دیکھا تو تھا تکیہ جائے دلدار
دوری نے جو حد سے کی درازی ۔۔۔ جانا کہ کہیں ہے عشق بازی

اُس رات کو چپکی ہو رہی وہ ‏ کل سمجھونگی کہہ کے سو رہی وہ
وقت[1] سحر اس کو پا کے رانی ‏ ہم بستر خواب سرگرانی
خلوت خانے سے باہر آئی ‏ دربانوں کے پاس در پر آئی
حکم ان کو دیا کہ شام کو آج ‏ جانا ہمراہِ صاحبِ تاج
سایہ کی طرح سے ساتھ رہنا ‏ جو آنکھ سے دیکھنا وہ کہنا
جس وقت چلا پری کا مانوس ‏ سایہ سے پس قدم تھے جاسوس
وہ مٹھ[2] وہ پری مقام دیکھا ‏ وہ برج وہ مہ مقام دیکھا
ایک اُن میں سے رانی پاس آیا ‏ کی عرض کہ لو سراغ پایا
صورت یہ ہے جو نگاہ کی ہے ‏ اک مٹھ میں مورت اک پری ہے
آنکھوں[3] سے اُس انجمن کو دیکھا ‏ یکجا بت و برہمن کو دیکھا
لعل و گہر ایک درج میں ہے ‏ شمس و قمر ایک برج میں ہے
آنکھ اُسکی یہ سنکے خون میں ڈوبی ‏ مریخ بنی وہ ماہ خوبی
ہاں اُسنے کہا وہ برج کھدواؤ ‏ واں بولی بکاؤلی کہ کو جاؤ
یاں اُسنے چلے لوگ واں سنے وہ زار ‏ لپکا یہ اِدھر اُدھر وہ خونخوار
توڑا وہ مٹھ حباب آسا ‏ پھوڑا اسے جلے دل کا آبلہ سا
شہزادہ کے آگے بیچیانے ‏ انعام دیا کھلے خزانے
پاس اُس کا ذرا نہیں کیا کچھ ‏ اور اُس سے کہا کہ لو سنا کچھ

ے۱ وقت سحر الخ یعنی صبح کو بیدار ہو کر جب راجہ کی بیٹی نے تاج الملوک کو اپنے پاس گہری نیند میں سوتا پایا تو خوابگاہ سے اُٹھ کر باہر آئی ۱۲ م ش ے۲ قولہ وہ مٹھ الخ پری مقام یعنی پری جیسا مقام وہ پری مصرع میں لفظ تمام صفت مٹھ نہیں ہے بلکہ سب کے معنی مراد ہیں نہ کہ کامل اور پورا ۱۲ م ش۔
ے۳ قولہ آنکھوں سے الخ بت و برہمن کو یعنی بکاؤلی اور تاج الملوک کو ۱۲

بنیاد فساد کھود ڈالی
جاسوسوں نے کھود کر نکالی

غائب رہتے تھے روز شب بھر
اب دیکھو گے جا کے خاک پتھر

سنتے ہی وہ بے قرار لپکا
دوڑا بے اختیار لپکا

دیکھا تو وہ ماہرو نہ وہ برج
وہ لعل گراں بہا نہ وہ درج

شور اس نے کیا کہ کیا یہ شر ہے
آواز آئی کہ بے خبر ہے

بنیاد پراگنی کی بانی
ہے سوت مری تری وہ رانی

کھدوایا جب اس نے مٹھ بصد جور
رہنے کو بلا ہمیں مکاں اور

واں ٹھوکریں کھائی سخت تھیں تنگ
سنگت سجائے خویشتن سنگ

ہونا تھا یہی تو شکوہ کیا ہے
جا کچھ دنوں صبر کر خدا ہے

حیرت زدہ چپ خموش سنسان
ٹوٹا ہوا دل بندھا ہوا دھیان

آیا تو ہنسی وہ شوخ رانی
گویا وہ ہوا بخوش بیانی

تقدیر کو گل کھلانا تھا یوں
تو خار سے بیخ کن ہوئی کیوں

دوراں کو تھا انقلاب منظور
مختار خدا ہے بندہ مجبور

اس دن سے ہوا وہ اس سے مانوس
راتوں کو رہے وہ شمع فانوس

جب کامروا ہوئی وہ رانی
گذری بہ ہزار کامرانی

پیدا ہونا بکاولی کا دہقان کے گھر میں اور جوان ہو کر ملنا تاج الملوک سے

نقطوں سے ہوا اب قلم کا دہقاں
صفحے کی زمین پہ دانہ افشاں

جب مٹھ کی رہی نہ بیخ و بنیاد
جیسے کہ ہو گرد باد برباد

دہقان تھے نئے زمیں کے جویا
سرسوں کا کھیت انھوں نے بویا

لہ جب چین سے کر چکے تردد — کھیتی کی ہوئی زمیں پہ واشد

دہقاں کی زوجہ کے کھلے بھاگ — کھانے لگی نوچ نوچ کے ساگ

۲ه کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا — سرسوں سا ہتھیلی پر جمایا

۳ه وہ بانجھ تھی جب حمل سے رہ لی — سرسوں آنکھوں میں سب کے پھولی

ایام شمر رہی کہ اندر — پیدا ہوئی اک حسینہ دختر

صورت میں پری جمال میں حور — فلفل سی وہ ماں تھی پیشیں کا قور

مشہور ہوئی وہ ماہ پارہ — لوگ آنے لگے پئے نظارہ

منتظر ظہور نیرنگ — یعنی تاج الملوک دل تنگ

چرچا سنکر چلا کہ دیکھوں — دیکھا تو کھلا نظر ملی یوں

جانا کہ پری وہ سوختہ تن — سانچے میں سے ڈھلکے نکلی کندن

چہرہ سے پری کا ڈھنگ پایا — اندر کا وہ قول یاد آیا

دہقاں سے کہا کہ سیم و زر لے — دولت صدقے یہ سیمبر دے

دہقاں نے کہا کہ میرے صاحب — باتیں یہ تمھیں نہیں مناسب

دختر جو پسند مہ لقا ہے — بکتی نہیں لعل بے بہا ہے

پھل سے نہیں پیڑ کو سروکار — جب تک کہ ہو کام کا نہیں بار

سمجھا وہ کہ میوہ ہے ابھی خام — عورت ہو جوان تو نکلے کچھ کام

لہ جب چین سے الخ واشد ن شگفتہ ہونا اور ظاہر ہونا یعنی سرسوں جہاں بوئی تھی اُس زمین سے سبزہ نمودار ہوا حاصل یہ کہ سرسوں کے کھیت کا نشو و نما شروع ہوا ۱۲ ام ش ۲ه کھاتے ہی حمل الخ ظاہرا مصرع اول تحریف ہے کھاتے ہی وہ ساگ حمل پایا کی یا سے کھاتے ہی ساگ حمل پایا کی کیونکہ خبث طور سے بے تکلف لفظ حمل بسکون اوسط موزوں ہو سکتا تھا اور ایسے ماہر فن شاگرد استاد کو یہ عجز پیش آتا اور قیاس نہیں کہ قاعدہ ساکن کو متحرک کر کے استعمال کرتے ۱۲ ام ش ۳ه وہ بانجھ تھی الخ مصرع اول غالباً تحریف ہے وہ بانجھ تھی حمل جب سے لی کی ۱۲

یہ سوچ کے گھر پھرا وہ پرسوز — آیا کیا اس کو دیکھنے روز

دن دن اسے ہو گیا قیامت — بوٹا سی بڑھی وہ سرو قامت

چلتی تو زمین میں سرو گڑتے — باتیں کرتی تو پھول جھڑتے

خواہاں ہوئے ہم وقار اسکے — دہقاں ہوئے خواستگار اسکے

کہہ بیٹھے سرو برگی اپنی دہقاں — بولا کہ ہے رب کے ہاتھ ساماں

شہزادہ[1] نے ایک دن پھر آکر — شادی کو کہا حیا اٹھا کر

دہقاں نے کہا کہ یا شہنشاہ — تم کوہ وقار میں پر کاہ

صحبت ہے برابری میں زیبا — نسبت ہے برادری میں زیبا

دہقاں زادی وہ بے محابا — بول اٹھی کس آن سے کہ بابا

خواہاں[2] سے مرے نہ ہو تو ناخوش — ہے دختر رز نصیب مےکش

مطلب کو سمجھ کے شہزادہ — وقت آنے کا منتظر رہا وہ

یاں تو یہ حساب کرتا تھا سن — واں لوگ ارم کے گنتے تھے دن

گذرا بارے جو عہد سختی — آئے ایام نیک بختی

دختر وہ پکڑ کے باپ کا ہاتھ — پچھواڑے مکاں کے لیگئی ساتھ

واں تھا کسی وقت کا دفینہ — دکھلا کے کہا یہ ہے خزینہ

کہنا نہ کسی سے میں پری ہوں — تو کیا جانے بکاولی ہوں

ایک آدمی زاد کی بدولت — لائی ترے گھر ہے مجکو قسمت

ناگاہ سمن پری لئے تخت — وارد ہوئی اور کہا کہ لے رخت

---

[1] شہزادہ نے ایکدن الخ حیا اٹھا کر یعنی بیحیا بنکر یا اپنی چرب زبانی سے اسکے باپ کی اپنے مقابلہ میں تکلف کرکے بیحال حیا اٹھا دینا یعنی پردہ حیا دور کر دینا اور بیحیا ہوجانا محاورہ مستعمل اور بہت ہی فصیح محاورہ ہے ۱۲ م ش

[2] خواہاں سے مرے الخ دختر رز مراد انگور یعنی انگور میکشوں ہی کا حصہ ہوا کرتے ہیں ۱۲ م

رخصت اسے صبح کے تخت اڑایا
دامان نظر سے منہ چھپایا

چتراوت کا محل جدھر تھا
سوتا جس رخ وہ سیمبر تھا

واں جاکے ہوئی وہ نور آگیں
پروانے کی اپنی شمع بالیں

بیدار[لہ] کیا وہ ماہ پیکر
جاگا تو تھا آفتاب سر پر

اٹھا جو وہ کہہ کے آؤ جانی
آواز سے چونک اٹھی وہ رانی

منہ دیکھتے ہی بکاولی کا
سایا اسے ہوگیا پری کا

بولی وہ بکاولی سیانی
ہے سوت مری یہی وہ رانی

بولا وہ کہ لونڈی ہے تمہاری
یہ کہہ کے اسے کہا کہ پیاری

چوٹی ہے مری تو ہاتھ اسکے
چل آکہ چلا میں ساتھ انکے

رانی نے کہا کہ گو یہ ہے غیر
میں تیری ہوں تو کسی کا ہو خیر

یہ بات بکاولی کو بھائی
شہزادے کے ساتھ اسے بھی لائی

اڑتے ہی وہ تخت سحر آگیں
کیا دور تھا گلشن نگاریں

مدت کے جو بعد گھر میں آئے
کھوئے ہوئے جیسے سب نے پائے

فردوس کی بیسوا وہ دلبر
محمودہ دیونی کی دختر

چتراوت چترسین کی جان
آرام ارم بکاولی جان

ان چاروں میں ایک مست بادہ
پورب کا بادشاہ زادہ

پانچوں سر پنجۂ وفا تھے
یا خمسۂ مطلع صفا تھے

ہوتے ہی حواس خمسہ مجموع
آمد ہوئی اقربا کی مسموع

لہ بیدار کیا الخ وہ ماہ پیکر مراد تاج الملوک سے یعنی جب تاج الملوک کے سرہانے پہونچکر بکاولی نے اسے بیدار کیا تو اُس ماہ پیکر نے جاگ کر آفتاب کو اپنے سر پر پایا یعنے بکاولی کو سر بالیں پایا اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جب آنکھ کھلی تو آفتاب کسیقدر بلند ہوچکا تھا ۱۲ م ش

فیروز شہ و جمیلۂ دانا	حُسن آرا اور رُوح افزا
پورب کا وہ شاہ شاہ باز	اطراف سے مملکت کے ہیں تو
جو جو آیا بلا تکلف	اک قافلہ سے ملا وہ یوسف
سلطانوں کی قدر دانیاں کیں	مہمانوں کی میزبانیاں کیں
چندے رہا مجمع بد و نیک	رخصت ہوا رفتہ رفتہ ایک ایک
رُوح[۱] افزا سے بکاولی کو	الفت تھی رو کی دل لگی کو
رکنا[۲] ہوا اس پری کا مشکل	یہ دل لگی اب لگائیگی دل

عاشق ہونا بہرام وزیرزادہ تاج الملوک کا روح افزا پری پہ اور شادی ہونی بکاولی کی سعی سے اور کامیاب ہونا

جب ختم یہ داستاں پہ آئی	یوں شاخ قلم شگوفہ لائی
روح افزا کو بکاولی نے	روکا جو یہاں کئی مہینے
اک شب[۳] کہ وہ زلف مہ رخاں تھی	یا آتش مہر کا دخاں تھی
وہ مست مئے فسانہ گوئی	مہتابی پہ چاندنی میں سوئی

[۱] روح افزا سے الخ مصرعۂ دوم میں روکی غالباً تحریف ہے روکا کی ۔ کیونکہ رکا بہ نسبت روکی کے فصیح تر ہے اگرچہ روکی غلط نہ سہی یعنی چونکہ بکاولی روح افزا سے مانوس تھی اپنے دل بہلنے کیلئے اسکو جانے نہیں دیا ۱۲ م ش [۲] رکنا ہوا الخ یعنی روح افزا کا بکاولی کے روکنے سے رک جانا روح افزا کے لئے اثر مشکل ہوگیا اسلئے کہ بکاولی نے تو اپنی دلگی کیلئے روکا تھا مگر اس روکنے کی وجہ سے دل کے لگ جانے کی بلا میں مبتلا ہوگئی یہ شعر کا شعر مقولہ مصنف ہے چنانچہ اسکے بعد اسی کے دل لگ جانے کا بیان ہے ۱۲ م ش [۳] اک شب کہ وہ الخ زلف مہ رخاں یا باعتبار سیاہی یا باعتبار درازی کے ۱۲ م ش۔

سلطاں کا وزیر زادہ بہرام — گلگشت چمن میں تھا گل اندام
لٹکی[۱] دیکھی پری کی چوٹی — ناگن سی اس کے دل پہ لوٹی
کھٹکے سے مگر بکاولی کے — بھاگا سایہ سے اس پری کے
جب کاکل شب سے روئے خورشید — تاباں ہوا بہر چشم امید
دیکھا تو ماہ نو کا تھا برج — رکھتا تھا دریگانہ وہ درج
بیتابی نے کچھ قرار پایا — شب تیرہ پری میں اختیار پایا
مہتابی[۲] پہ چاندنی جب آئی — سایہ نے پری پہ کی چڑھائی
اُس[۳] فتنہ کے خوابگہ تک آیا — مانند سُہا وہ مہ تک آیا
تجویز رہا تھا گھات گوں کی — ناگاہ وہ مست خواب چونکی
آغوش کی موج سے وہ مضطر — مچھلی سی نکل گئی تڑپ کر
پیچھا کئے صحن تک وہ آیا — مہتاب کے پیچھے جیسے سایا
ملتی اُسے خاک وہ ہوائی — انساں کو پری نہ ہاتھ آئی
ہوتے ہی سحر کے روح افزا — رخصت ہوئی گھر کو رکھ کے پردا
معشوق سے رہ گیا جو ناکام — تھا غم سے کنارہ گیر بہرام
تنہا جو سمن پری تھی اک روز — قدموں پہ گرا کہا بصد سوز

---

۱ لٹکی دیکھی پری کی الخ دل پہ لوٹی یعنی جسطرح ناگن جس عضو سے مس کر جاتی ہے وہ مقام سڑ جاتا ہے اسیطرح اسکی چوٹی کی ناگن نے اسکے دلمیں جگہ کرنیکے سبب اسکے دلکو اسکے عشق کا داغدار یا زخمی کر دیا ۱۲ م ش

۲ مہتابی پہ الخ یعنی جب رات ہوئی یا جب چاندنی نے کیفیت کیا سایہ سے مراد بہرام وزیر زادہ یعنی بہرام روح افزا کیجانب چلا ۱۲ م ش ۳ اُس فتنہ کی الخ سُہا بہرام ماہ روح افزا سہا و ماہ کی تشبیہ باعتبار نظر کے ہے اسلئے کہ سہا مہتاب کے قریب ہوکر نظر آیا کرتا ہے ورنہ درحقیقت مکان سُہا تحقیق طلب ہے کہ فی الواقع کونسے آسمان پر ہے سُہا کو ماہ سے بہت دوری ہے کیونکہ مکان ماہ آسمان اول ہے ۱۲ م ش

دل سے ہوں فدائے رُوح افزا
مرتا ہوں برائے رُوح افزا

بولی کہ ارے بشر سڑی ہے
رُوح افزا کیا بکاولی ہے

شہزادے سے کے ڈھنگ پر تو چل
ہمتائے فلک نہ ہوگا بادل

بولا[۱] یہ کہ مجھ سے اس سے ہے راہ
شبنم کی ہے آفتاب کو چاہ

واقف تھی پری کے دیس سے وہ
لے پہونچی زنانے بھیس سے وہ

فردوس میں مالن ایک تھی حور
گل چہرہ پری بنفشہ مشہور

اُسکے — پوشیدہ گھر اسکے لائی اس کو
منھ بولی بہن بنائی اُس کو — لنباکے

فردوس کی سیر کے بہانے
چھوڑا امنزل پہ ہنانے

روح افزا کے لئے بنفشہ
گلدستہ بناتی تھی ہمیشہ

حاجت کو ذرا گئی جو باہر
بہرام نے پشت آئنہ پر

تحریر کیا کہ بے مروت
آئینہ ہے تجھ پہ میری صورت

افسوس[۲] مجھے تو آرزو ہو
اور آئنہ تیرے روبرو ہو

لیکن تو زبسکہ خود نما ہے
خود بینی سے جو کرے بجا ہے

یہ لکھ کے ہٹا تو مالن آئی
گلدستہ پری کے پاس لائی

روح افزا کا سنگھار کر کے
محو اُس کی ہوئی جو پیار کر کے

اُلٹا اُسے آئینہ دکھایا
خط سمجھی وہ کاکلوں کا سایا

مضمون[۳] جو بڑھا پری تھی دانا
نقش عمل نگار جانا

۱؎ بولا وہ کہ الخ شبنم سے مراد بہرام آفتاب سے مراد روح افزا یعنی بہرام نے کہا کہ درحقیقت روح افزا کو بھی تیری چاہت ہے ۱۲ م ش ۲؎ افسوس مجھے تو الخ یعنی مجکو تو تیرے دیدار اور دوچار ہونیکی آرزو ہے اور دوچار ہونا نصیب نہو مگر آئینہ تیرے روبرو ہو جائے ۱۲ م ش ۳؎ مضمون جو بڑھا الخ نقش عمل نگار جانا نگار نیز بمعنی نقش اور نیز بمعنی معشوق یعنی سمجھ گئی کہ بہرام کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو نقش کے لئے ایراد لفظ نگار میں معشوق کا لطف ظاہر ہے ۱۲ م ش۔

مشاطہ کو دیکھ کر اکیلی — بولی کہ بتا تو یہ پہیلی
ہاتھ آکر جو نہ پائی وہ کون — ہو کر جو نظر نہ آئی وہ کون
سوجھی تو نہ بوجھی وہ کہا گل — کھو دی گئی یہ کہ کے آئی بے کل
بہرام اس سوچ کو سمجھ کر — بولا کیا ہے کہا الجھ کر
وہ جانتا تھا نہ اس کو سوجھی — بولا لو بات کیا ہے بوجھی
ہاتھ آکے نہ پائے جو وہ مجذوب — ہو کر نہ دکھائی دے وہ محبوب
وہ سن کے جو دوسرے دن آئی — تقریر سنی ہوئی سنائی
سمجھی وہ کہ بوجھ آئی ہے یہ — پوچھا کس نے بتائی ہے یہ
بولی وہ سمجھے تو ہاں نہ سوجھی — منہ بولی بہن نے میری بوجھی
روح افزا نے کہا کہ نادان — ہمرہ اسے کیوں نہ لائی تو یاں
بولی وہ ابھی چلی میں لائی — جا کر طلبی اسے سنائی
اس مژدہ کا منتظر ہی تھا وہ — ساتھ اس کے زنانے میں گیا وہ
امرد کا لباس تھا زنانا — دھوکہ کچھ کھا گئی وہ دانا
پوچھا کہو نام کیا کہا ننگ — پوچھا کہ نشان کہا دل تنگ
یہ سن[لہ] کے اشارے سے بٹھایا — بادام بنفشہ کو دکھایا
سمجھی
وہ جا نکلی کہا یہ پردہ پوشی — گندم کے بہانے جو فروشی
بہرام ہے تو ارے دہی چور — رہ تجھ کو بتاؤں سحر سے گور
بد ظن سمجھ کے گور کا نام — پنجرہ اک لائی وہ گل اندام

لہ یہ سن کے اشارے سے الخ بادام سے مراد آنکھ یعنی ادھر بہرام کو بیٹھنے کا آنکھ سے اشارہ دیا ادھر بنفشہ پری کو اشارہ دیا کہ وہ بھی حقیقت حال کی سرہوگئی پھر بہرام سے کہا کہ اس وجہ پردہ پوشی کہ بنفشہ کی بہن تو بنا ہے مصرع حل کیا لفظ بادام کے ایراد کا لطف یہ ہے کہ بنفشہ ایک گل کا نام ہے جو خاص کشمیر میں عمدہ ہوتا ہے ۱۲ م ش

طوق اسکو طلسم کا پنھایا — قمری اُسے سرو نے بنایا

دن بھر تو وہ فاختہ بڑھاتی — شب کو اُسے آدمی بناتی

غماز تھی اک خواص اسکی — دمساز تھی وقت خاص اسکی

اک[۱] دن سنجیرا اڑا کے لائی — حسن آرا کو وہ کل سجھائی

کھولا جو وہ بند سحر بنیاد — دیکھا تو مجسم آدمی زاد

گستاخ جو اس بشر کو پایا — غصہ غضب اس پری کو آیا

لوگوں سے کہا ہٹاؤ اسکو — آتشکدے میں جلاؤ اسکو

لوگ اسکو لیے چلے جلانے — تقدیر کے سنئے کارخانے

شہزادہ بکاولی کے ہمراہ — گذرا اسی راستے سے ناگاہ

دیکھا تو وزیر زادہ بہرام — بوتہ میں تھا مثل نقرۂ خام

جلنے سے پناہ دیکے اسکو — فردوس میں آئی لیکے اسکو

زندہ اُسے پا کے حسن آرا — بولی کہ یہ چور ہے ہمارا

قابل ہے جلانے کے یہ فاسق — روح افزا کا ہوا ہے عاشق

بولی وہ بکاولی کہ قرباں — یہ کون سی فہم ہے چچی جاں

پیارے کا جو اپنے ہو پیارا — کیونکر ستم اُسپہ ہو گوارا

حسن آرا نے کہا بجا ہے — تم کیوں نہ کہو کہ خود کیا ہے

بولی وہ کہ پھر عبث ہے انکار — تب عیب نہ تھا تو اب ہو کیا عار

کیا[۲] کہتی وہ دم بخود سنا کی — سوچی سمجھی رضا خدا کی

---

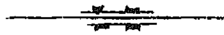
[۱] ایک دن سنجیرا الخ ممکن ہے کہ کل سجھائی تحریف ہو کل بتائی کی یا کل کھائی کی اور سجھائی بھی غلط اور فصیح نہیں ہے ۱۲ م ش [۲] کیا کہتی وہ الخ سوچی سمجھی یعنی جب سوچی تو یہ سمجھی کہ خدا کی رضی ۱۲ م ش

مرسوم تھے جس طرح کے انداز — شادی کا خوشی خوشی کیا ساز
دو ساز طرف سے ملے خوش آہنگ — دور از ادب کھلے بصد ننگ
شادی جو ہوئی تو غم ہوا دور — فردوس سے گھر کو آئی وہ حور
گلزار جو ارم میں آکر — آباد ہوئی وہ یاسمن بر
حاصل ہوئی اُن گلوں کو بے خار — سیر شب زلف صبح رخسار
جس طرح انھیں بہم ملایا — بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

تاریخ اختتام تصنیف از مصنف

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد — گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد — توقیع قبول روزیش باد

۱۲۵۴ھ



انتخاب دیوان نسیم

جب ہو چکی شراب تو میں مست ہو گیا — شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

نے قاصد خیال نہ پیک نظر گیا — اُن تک میں اپنی آپ ہی لیکر خبر گیا

روح روان و جسم کی صورت میں کیا کہوں — جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا اُدھر گیا

سمجھا ہی حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص — یہ چاند اُسکے ساتھ چلا جو جدھر گیا

طوفان نوح اسمیں ہو یا شورِ حشر ہو — ہونا جو کچھ ہے ہوگا جو گذرا گذر گیا

شوریدگی سے میری یہانتک وہ تنگ تھے — رُوٹھا جو میں تو خیر منائی کہ شر گیا

میں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں پریوں کی جاؤ بھی — تمنے دکھائی آنکھ مجھے اور میں ڈر گیا

گذرا جہان سے میں تو کہا سُن کے یار نے — قصّہ گیا فساد گیا دردِ سر گیا

کاغذ سیاہ کرتے ہو کسکے لیئے نسیم — آیا جواب خط نہیں اور نامہ بر گیا

عشق میں دل بن کے دیوانہ چلا — آشنا سے ہو کے بیگانہ چلا

قلقل مینا سے آتی ہے صدا — بھر چکا جسوقت پیمانہ چلا

بے زبانوں کو بھی آئی ہے زباں — بیڑی غل کرتی ہے دیوانہ چلا

عشقبازی بازیِ شطرنج ہے — چال ناداں رہ گیا دانہ چلا

شب جو آیا بزم میں وہ شعلہ رُو — شمع گل کرنے کو پروانہ چلا

بوئے گل غنچہ سے کہتی ہے نسیم — بات نکلی منھ سے افسانہ چلا

چمن میں دہر کے آکر میں کیا نہال ہوا
برنگ سبزۂ بیگانہ پائمال ہوا

کہانی کہہ کے سُلاتے تھے یار کو سُو اب
فسانہ عمر ہوئی خواب، وہ خیال ہوا

جنوں کی چاک زنی نے اثر کیا واں بھی
جو خط میں حال لکھا تھا وہ خط کا حال ہوا

نسیم دزدیِ مضمون نہ چھوڑینگے شعرا
اگرچہ شہر کا تبدیل کوتوال ہوا

وہ مار زلف کمر تک اگر چلا چلتا
یقین ہے نہ عدم کا بھی راستا چلتا

اگر نہ ہوتی مسلسل وہ زلف عمر دراز
جنوں کے ناموروں کا نہ سلسلہ چلتا

جنوں میں گرچہ ہوں پیوند دامن صحرا
برنگ چاک ہوں دلسے پھٹا پھٹا چلتا

طریق شعر و سخن میں جو کچھ نہیں اعجاز
قلم کی طرح سے ہر ایک شکستہ پا چلتا

شریک بزم مئے ہو تو دور کیجے حجاب
جو نکلے ناچنے پھر کیا لحاظ گھونگھٹ کا

عجیب محفل رندانہ میں کل تھی کیفیت
پیالہ بزم میں ناچا سبوئے خُم مٹکا

جو خط ہے رُخ پہ تو آنکھوں میں سرمے کی تحریر
وہی رکھائی کا فقرہ یہ ہے لگاوٹ کا

وہ گلعذار جو یاد آگیا چمن میں نسیم
تو آنکھ میں گل تر خار خشک سا کھٹکا

بجز گور غریباں نقش پا تھی پھر نہیں آگے
یہیں تک ہم مسافر نے پتا پایا ہے منزل کا

زبان موج نے طوفاں جوڑا آشناؤں پر
حباب بحر تو بھی توڑ اپنا آبلہ دل کا

نسیم اپنے ہی اعمالوں سے گردش ہے زمانے کی
رواں کشتی یہ آتا ہے نظر ہر نخل ساحل کا

جو فصل میں آئے بہارِ چمنستان یارب
ابر ہو کف کی طرح موج ہوا سے پیدا

صدف و ابر گہربار کو دیکھا تو کھلا
عالم آب میں بھی ہوتے ہیں پیاسے پیدا

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ آج کیونکر ہو خبر اسکو نسیم	بند کیں آنکھیں تو رستا کھل گیا شعر پڑھنے کا بھی فقرا کھل گیا
بلبل کے منھ سے اڑنے لگی ہیں ہوائیاں ہر شب آکھی کچھ تو بگڑتا ہے اسکا نیل	صیاد کرتا کہیں او باغباں ہوا ہر روز یاں بندھتا ہے نئی آسماں ہوا
بتوں کو جو دیکھا گنہ کیا ہمارا بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جائے	خدائی خدا کی تماشا ہمارا یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا
یہ تصویر چہرہ او ترکیوں گیا ہے نسیم اس چمن میں گل تر کی صورت	کھنچے کس سے ہو کیا ہے نقشہ تمھارا پھٹے کپڑے رکھتے ہیں پردا تمھارا
جلد او ماہ تو گھر سے نکلا سیر گلرویوں کی کرتا ہوگا	شکر ہے چاند کدھر سے نکلا ہے نسیم آج سحر سے نکلا
اسکی درگاہ کا راندہ تھا نہ جانے پایا عشرت آباد چمن سے تجھے کیا تو تو نسیم	تا در خلد کس ارمان سے شداد آیا نکہت گل کی طرح ہونے کو برباد آیا
ہے رنج عشق میرے لیے میں برائے رنج ہم شیشۂ شکستہ ہیں تم کیف موج مے یا تنگی کنار تھی یا اب فشار قبر	خود بھی مٹو کہ یقین ہے جو مجھ کو مٹائے رنج بنیاد عیش تمسے ہے ہمسے بنائے رنج وہ ابتدائے عشق تھی یہ انتہائے رنج

قرصِ خور کو دیکھ کر تسکین رکھ اے مہمانِ صبح
تا دہانِ شام پہونچاتا ہے رازق نانِ صبح

معنیِ روشن جو ہوں تو سو سے بہتر ایک شعر
مطلعِ خورشید کافی ہے پئے دیوانِ صبح

سیر چشمی دید کے بھوکوں کی دیکھو کہتی ہے
مہِ نیرِ شام ہے خورشیدِ تابان نانِ صبح

صدقے اُس پروردگارِ پاک کے جس نے کیا
بہرِ طفلِ غنچہ پیدا شیرِ بے پستانِ صبح

صبحدم غائب ہوئے انجم تو ثابت ہو گیا
خندۂ بیہودہ پر ٹوٹے گئے دندانِ صبح

وصل کی شب آنکھ دکھلا کر یہ انجم کہتے ہیں
لو قیامت آئی مشرق سے اٹھا طوفانِ صبح

دیکھے وہ گلشن جو دن دونی دن ہو یاں مثلِ گل
رہتے ہم تو شبنم سان نسیم اکدم ہیں مہمانِ صبح

زار رونے سے ڈریے بھولئے زر پر نہ زور پر
کیجئے نگاہ حالِ سلیمان و مور پر

ایک عمر سے وظیفہ ہے صاحب کے نام کا
ناخن کے خط ہیں انگلیوں کی پور پور پر

کل تک جو شمعِ محفلِ عیش و نشاط تھے
جلتا نہیں چراغ بھی آج اُنکی گور پر

بلبل سے لڑ کے ہمنے کیا سرِ عشق فاش
واقف ہزار تھے تو کھلا اب کرور پر

دل بدل آئینہ ہے دیر و حرم
حق جو پوچھو ایک در ہے دو طرف

خواہ کعبہ خواہ بت خانہ کو جا
دشت دل کا رہگذر ہے دو طرف

کفر و ایماں دونوں جانب کی سنے
اس لیئے گوشِ بشر ہے دو طرف

رخنہ اندازو کی کب چھپتی ہے آنکھ
چشمِ روزن کی نظر ہے دو طرف

باغ ہو یا دشت ہو قسمت نسیم
کوچ کی اپنے خبر ہے دو طرف

شاخ سے چھو جو گیا بادِ سحر کا دامن
صبح شبنم نے بھگویا گُلِ تر کا دامن

بے حجابی پہ وہ در پردہ جو آجاتے ہیں
شرم ڈھک لیتی ہے آنکھوں پہ نظر کا دامن

آئے بہار زاہد ہشیار مست ہو
قلقل سنا کے چھیڑتے ہیں مے پرست کو

شیشہ کی فتح توبۂ مے کی شکست ہو
شیشے سرود یاد دلاتے ہیں مست کو

ذلت ہے جو پھیلائے بشر پیش بشر ہاتھ
خورشید کے پنجہ سے اشارہ ہے کہ غافل

یارب نہ کبھی ہاتھ کا ہو دست نگر ہاتھ
اللہ کی جانب کو اٹھا وقت سحر ہاتھ

ساغر بکف جہاں کوئی مست الست ہے
بیضائے موسوی بھی وہاں داغ دست ہے

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
واللہ ہوشیار رہے وہ جو کہ مست ہے

داغ جہاں میں خاک کوئی فیضیاب ہو
غنچہ کی مٹھی بند ہے گل بادست ہے

یا ہاتھ توڑے جائینگے یا کھولینگے نقاب
سلطان عشق کی یہی فتح و شکست ہے

پاؤں میں بیڑیاں ہیں تو ہاتھوں میں ہتھکڑی
کیا کشور جنوں میں مرا بند و بست ہے

تھے محو زلف دیدۂ تر دل بھی آ پھنسا
مچھلی کو کیا خبر ہے کہ پانی میں شست ہے

تیرے کنار لطف میں لے دایۂ بہار
ہر صبح طفل غنچۂ گل شیر مست ہے

اے مرغ دل تو شاخ نشیمن سے گر پڑا
حیف آشیاں بلند ہے پرواز پست ہے

جب سے ہم آکے بیٹھے ہیں جاگیر دشت میں
مجنوں کے وقت سے کہیں افزوں نشست ہے

شاگرد خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم
کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائیگی

جب ملے دو دل مخل پھر کون ہے
بیٹھ جاؤ خود حیا اٹھ جائیگی

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل اک روز جھونکا کھائیگی

داغ سودا ایک دن دے گا بہار
فصل اس گل کی شگوفہ لائیگی

کچھ تو ہوگا ہجر میں انجام کار
بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائیگی

صندلی رنگوں سے مانا دل ملا
دردِ سر کی کس کے ماتھے جائیگی

خاکساروں سے جو رکھے گا غبار
او فلک بدلی تری ہو جائیگی

جب کرے گا گریباں وہ شعلہ رو
شمع محفل دیکھ کر جل جائیگی

جان نکل جائیگی تن سے اے نسیم
نکہت کو بوئے گل ہوا بتلائیگی

خصم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے
مشتغل ساغر اور کسکے کام آئیے

ابرِ رحمت سنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے

آپ آہو چشم ہیں آہو نہیں
ہم سے وحشت کی نہ لیجئے آئیے

صبر رخصت ہو تو جانے دیجئے
بیقراری آئے تو ٹھہرائیے

جوہرِ تیغِ نگہ کھل جائیگا
منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

دل میں ہے دکھلائیے تاثیر عشق
ٹھنڈی سانسوں سے انھیں گرمائیے

سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیم
کہتے ہیں وہ ٹھنڈے ٹھنڈے جائیے

منت دلا کسی کی نہ اصلاً اٹھائیے
مر جائیے نہ نازِ مسیحا اٹھائیے

جلیے مگر چنار کے پنجہ کی طرح سے
بہرِ دعا نہ دستِ تمنا اٹھائیے

سیلی موج حادثہ پڑتی ہو اے حباب
اس بحرِ بیکنار میں سر کیا اٹھائیے

کیا کیا حسین چنے ہوئے مٹی میں مل گئے
افشاں سمجھ کے خاک سے ذرہ اٹھائیے

چاہ اپنی مانتا نہیں وہ بے یقین اگر
قرآں کا جامہ پہنئے گنگا اٹھائیے

دل سے ہر دم ہمیں آوازِ بکا آتی ہے
بند کانوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

دل سے ہو آنکھ تک آئی اثر گرمیٔ شوق
اشک حسرت سے نگہ آبلہ پا آتی ہے

گل ہوا کوئی چراغ سحری اُڑ بلبل
ہاتھ ملتی ہوئی یہ تو نسیمِ صبا آتی ہے

آئینہ صاف سکندر کو دکھایا تو نے
خوب اے خضر تجھے راہ بتا آتی ہے

چھو لیا دھوکے سے دامان صبا نے تو کیا
غنچۂ گل کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

جسقدر وصل بتاں کا ہمیں رہتا ہی فراق
اے نسیم اتنی کبھی یادِ خدا آتی ہے

کیوں خفا رشکِ حور ہوتا ہے
آدمی سے قصور ہوتا ہے

مئے الفت سے بھر گیا جو دل
صورتِ شیشہ چور ہوتا ہے

خاک عاشق سے جو درخت اُگا
طور ہوتا ہے نور ہوتا ہے

جسکو دیکھا وہ اِس زمانے میں
اپنے نزدیک دُور ہوتا ہے

خاکساری وہ ہے کہ ذرّوں پر
روز بارانِ نور ہوتا ہے

ساقی قدح شراب دیدے
مہتاب میں آفتاب دیدے

ساقی باقی جو کچھ ہو سے لے
باقی ساقی شراب دیدے

لیلے میں نے تجھے بنایا
مجنوں مجھکو خطاب دیدے

پیاسا جاتا ہے نشتر یار
او رگ کچھ خونناب دیدے

اس بت سے نسیم زر نہ تو مانگ
جو چاہے وہ بیحجاب دیدے

فراق دیدہ ہوں میں وصل یار باقی ہے
خزاں رسیدہ چمن کی بہار باقی ہے

وہ فصل گل نہیں پر عندلیب کے دلمیں
گلوں کا داغ ہے گلچیں کا خار باقی ہے

ہوا تو کہتی ہے صاف آمد بہار چمن
صدائے غنچہ و صوت ہزار باقی ہے

غبارِ راہ ہوں پر خاکساری کہتی ہے
ہوا سے اوجِ دماغ و وقار باقی ہے
تو نکلے قہر سے ہمکو مقام یاس نہیں
امیدِ رحمتِ پروردگار باقی ہے

بے رخ ہو وہ پری دل دیوانہ کیا کرے
رو رو کے آنکھ بھرتی ہے پیمانہ کیا کرے
دستِ بُتاں و دیدہ و دل دیتے ہیں دغا
کرتے ہیں وہ یگانے کہ بیگانہ کیا کرے
عاشق سے گرم ہو کے نہ پوچھو جلن کا حال
افروختہ ہو شمع تو پروانہ کیا کرے
بے بس کیا ہے مجھ کو سرِ زلفِ یار نے
زنجیر پاؤں میں ہو تو دیوانہ کیا کرے
کہتا ہے مرغِ دل سے وہ خالِ سیاہِ خط
سبزہ جو دام ہو تو اُسے دانہ کیا کرے

کان میں سب کے اپنی بات نہ ڈال
آبرو مثلِ آبِ گوہر ہے
کیا مخالف ہے اس چمن کی ہوا
خار دیتا ہے جو گُل تر ہے
نوک رکھ لو برہنہ پائی کی
آبلو خارِ دشت نشتر ہے
اب تو جاتے ہیں اُس گلی میں نسیم
ہو رہے گا جو کچھ مقدر ہے

پھنس کے دل ہٹ ڈہل سمجھ لینگے
زلف کرتی ہے بل سمجھ لیں گے
ہم سپاہی ہیں وہ کماں ابرو
تیغ پکڑے اجل سمجھ لیں گے
نیّت شبِ حرام اے ساقی
آج تو سوئیں کل سمجھ لیں گے
آج بے مثل ہو سخن میں نسیم
چار دن میں مثل سمجھ لیں گے

خیر ہے او شبِ درازِ فراق
چاک پیراہنِ سحر کیوں ہے
چشم پوشی نہیں تو رُخ پہ ترے
پردۂ دامنِ نظر کیوں ہے

دانہ کے دام میں ہے طائر دل
عکس و آئینہ کسکے دھیان میں ہو
غنچے ہنستے یہ ہیں کہ گلچیں کو

کچھ نہ پوچھو شکستہ پر کیوں ہے
رخ ادھر کیوں ہے دل ادھر کیوں ہے
خار ہے گل کے پاس زر کیوں ہے

میں بوسہ لونگا بہانے بنائیے نہ مجھے
دموں میں ٹالا لیتے ہو دم نکل ہی جاویگا
نہیں رقیب کی خاطر ہی لو میں جاتا ہوں

جو دل لیا ہے تو قیمت دے لائیے نہ مجھے
میں ناتواں ہوں بہت آزمائیے نہ مجھے
اٹھائیے نہ حیا کو بٹھائیے نہ مجھے

کسیکے دل سے نہ یارب کوئی خراب گرے
کہیں نہ ایسی ہو افتاد بزم ساقی میں
جو دن کو نکلو تو خورشید گرد سر گھومے

نہ شیشہ طاق سے نے شیشے سے شراب گرے
سبو سے بادہ گرے سیخ سے کباب گرے
چلو جو شب کو تو قدموں پہ ماہتاب گرے

ہم تم ہیں جو ایک پھر جدائی کیسی
کافر نہ گھمنڈ رکھ خود آرائی کا
نیت میں تو ہو کہ پاؤں صہبائے طہور

دل ہی نہ ملا تو آشنائی کیسی
سب کچھ ہوں جو بت تو پھر خدائی کیسی
اے شیخ یہ تیری پارسائی کیسی

ہمت پیر مغاں دیکھ لے زاہد چلکر
عہد پیری میں روانہ ہوئے یوں ہوش و حواس

کوئی میخانہ سے پھرتا نہیں سائل خالی
صبح کو جیسے مسافر سے ہو منزل خالی

عشق کے زینہ کو آگے آسماں بھی پست ہے
خاک دیکھا کچھ شبستان جہاں میں اے نسیم

سر جھکایا ہو فرشتوں نے بشر کے سامنے
ڈھیر پروانوں کا تھا شمع سحر کے سامنے

لائے اُس بت کو التجا کرکے
کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

لبِ نازک کے پاس رہنے دو
تِل برابر ہے دل مِسا کرکے

ہر اک ذرہ کی محبت میں ہم سناں پہ چڑھے
ہر ایک شمع کے پروانہ سان بان پہ چڑھے

بلند مرتبہ اپنا ہے چشم تر کے سبب
زمیں سے ابر کے مانند آسماں پہ چڑھے

جو چپ ہوں تو جنوں دل میں جوش کھاتا ہے
فغاں کروں تو گریباں گلا دباتا ہے

مکانِ سینہ کا پاتا ہوں دمبدم خالی
نظر بچا کے تو اے دل کدھر کو جاتا ہے

متفرقات

پیری میں طرزِ عشق جوانی وہی رہا
صورت کے ساتھ دل کا بدلنا محال تھا

دہر میں کیمیا ب کیا نایاب ہیں
کیمیا درویش سچا آشنا

صہبا کشوں کی خاک ہو ہر اک مقام پر
ساقی لنڈھا شراب کو مستوں کے نام پر

دارم ز دین و کفر بہر یک قدم دو سر
من سر برم بکعبہ و دل میبرد بہ دیر

دل پڑنے لگا ابروئے خمدار کے اوپر
آ جائے نہ آفت کہیں دو چار کے اوپر

[illegible]	[illegible]
تیرہ دل کی بزم میں جام شرابِ آتشناک نہیں	جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں
قرار پر نہ ملوا مضطراب ہو کہ نہ ہو	شرابِ غیر کو وہ دل کباب ہو کہ نہ ہو
گلابی آنکھوں سے ساقی کے دل بچے کیونکر	شرابیوں میں جو بیٹھے خراب ہو کہ نہ ہو
چلا دختر رز کو لے کر جو ساقی	فرشتہ ہوئے ساتھ گھر دیکھنے کو
دل بے پھنسائیگی یہ کسی بیگناہ کو	چوٹی کے پیچ یاد ہیں زلفِ سیاہ کو
اشارہ میں وا ہوتا ہے حقِ مدعا گوئی	بیانِ ذوزبانِ حق بن زبان بے بیاں برو
نرخِ طلائے رنگِ حسیناں گراں سمجھ	آنکھوں کی پتلیاں محکِ امتحاں سمجھ
ایدل نہ چھوڑ دامنِ طفلِ سرشک کو	رہجائیگا برنگ قرہ ہاتھ ملکے دیکھ
خود چلا ہر قدم پہ کہتے نسیم	ٹھہر تو نامہ بر کہونگا کچھ
محتسب کی آنکھ پر جب سے چڑھی	دخترِ رز شیشہ کے دل سے گر گئی

ہم تو مژگاں کی نمط ہم چشم ہوں
خالی ہاتھ آئے ہیں ارمان بھرے

آن میں فرق نہ آنے دیجے
جان اگر جائے تو جانے دیجے

آنکھ نرگس سے جو اس کی لڑ گئی
صبحدم کیا اوس گل پر پڑ گئی

وا حسرتا کہ لخت جگر تھے جو طفل اشک
آنکھوں کے سامنے سے ہماری نکل گئے

دنیا میں عیش و غم سے ہیں یکسر بھرے ہوئے
شیشوں کے دل ہیں خالی تو ساغر بھرے ہوئے

گذرے اے پیک صبا تو تو دعا کہہ دینا
کوچۂ زلف میں دل نام جواں رہتا ہے

دوزخ و جنت ہیں اب میری نظر کے سامنے
گھر رقیبوں نے بنایا اسکے گھر کے سامنے

پہونچی نہ راحت ہمسے کسیکو اور اذیت کوش ہوئے
جاں تھی تب بار شکم تھے مرکے وبال دوش ہوئے

مخمس

کس میں پہچان نہیں مہر و محبت کا اثر
ہر مہ داغ ہی دل کھلاتے ہیں ہر شام و سحر
دھو یا شبنم سے کہیں جاتا ہے داغ گل تر
یک بیک دل سے مٹے حرف محبت کیونکر
لالہ رو داغ ترا جائیگا جاتے جاتے

وصل انساں کو پریزادوں کا ہو ہے دشوار
فائدہ کچھ نہیں تم مفت میں کیوں ہوتے ہو خوار
کہتے کہتے تو ہوئے تم کو نسیم اب ناچار
عشق کو ترک کرو یا نہ کرو ہو مختار
نیک و بد زند تمھیں ہم ہیں جتاتے جاتے

مخمس دیگر

زمانہ میں ہیں نکتہ داں کیسے کیسے
خط و خال کے ہیں بیاں کیسے کیسے
زباں زد ہیں وصف بتاں کیسے کیسے
دہن پر ہیں انکے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

وہ خونخوار عاشق کسی پر جو آیا
کوئی دم کے دم بیقرار و نہیں ٹھہرا
رواں جب ہوا تیغ سے تیز تر تھا
نہ مڑ کر بھی بیدرد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

قضا جسدم آجاتی ہو جاں کی دشمن
کسی کی نہیں چلتی ہے مشفق من
اجل ہے گذرگاہ ہستی میں رہزن
عجب کیا چھٹے روح سے جامۂ تن
لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

خزاں خار اپنے دکھاتی ہے کیا کیا
بہار اپنے پھل پھول پاتی ہے کیا کیا
شگوفہ ہر اک فصل لاتی ہے کیا کیا
زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ زخمی بدن ہیں نہ گھائل ہوئے ہیں
نہ خونی کفن ہیں نہ بسمل ہوئے ہیں
لہو کے کشتوں میں داخل ہوئے ہیں
تمہارے شہیدوں میں شامل ہوئے ہیں
گل و لالۂ و ارغواں کیسے کیسے

وجود بشر کیا عدم ہی عدم ہے
کہ ہے آدمی جب تلک دم میں دم ہے

شکم پرورِ حرصِ نان و نعم ہے — کرے جسقدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

جو دلسوزِ فرقت ہیں ہیں داغ سوزاں — تو دمساز ہیں نالہ و آہ و افغاں
بنے اپنے ہیں روز ناخواندہ مہماں — غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

کوئی جانتا ہے کسی کو خبر ہے — کہ پردہ میں کون اے صنم جلوہ گر ہے
کہیں کچھ خیال اور کہیں کچھ نظر ہے — دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

جو مے نوش ہیں رنگ اُنکے جمے ہیں — پئے پھول بدمستیاں کر رہے ہیں
قدم لڑکھڑاتے ہیں ساغر لئے ہیں — بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

ہر اک درد کا کر سکے لوگ چارا — اجل سے نہ پایا کسی نے گذارا
ملے خاک میں سیکڑوں مسند آرا — نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

فسانے جو کچھ حسن اور عشق کے ہیں — لبِ نے سے سب پوست کندہ سنے ہیں
جو مغزِ سخن سمجھے ہیں جانتے ہیں — تپِ ہجر کی کاہشوں نے کئے ہیں
جدا پوست سے استخواں کیسے کیسے

نسیم آج کیونکر نہو مست دل خوش — کہ سبزہ چمن کی رونق پہ ہو دلکش
خزاں باغ سے بھاگتی ہو مشوش — بہارِ گلستاں کی آمد ہے آتش
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

ترجیع بند

دیو تابع ہوتے ہیں تسخیر سے	پھنستے ہیں جن سحر کی تاثیر سے
مس کو کرتے ہیں طلا اکسیر سے	چوکتا غافل نہیں تدبیر سے
آدمی مجبور ہے تقدیر سے	
زعم تھا فرعون کو میں ہوں کردگار	بارش باراں ہوئی جب بیشمار
آبگینہ کا بنایا تھا حصار	قدرت حق سے ہوا وہ سنگسار
آدمی مجبور ہے تقدیر سے	
وہ سلیماں جن کے پریاں بس میں تھیں	اسم اعظم سے جہاں زیر نگیں
اہرمن جب لے گیا خاتم وہیں	پاؤں کے نیچے نہ ٹھہری پھر زمیں
آدمی مجبور ہے تقدیر سے	
وہ کلیم اللہ جو ہر صبح و شام	طور پر ہوتے تھے حق سے ہمکلام
کیا غضب تھا لن ترانی کا مقام	لے سکے پھر رب ارنی کا نہ نام
آدمی مجبور ہے تقدیر سے	
وہ امام دو جہاں حضرت حسینؓ	فاطمہؑ کے اور علیؑ کے نور عین
دودمان مصطفےٰؐ کے زیب و زین	زیر خنجر بس یہی کرتے تھے بین
آدمی مجبور ہے تقدیر سے	
تھا جو افلاطون حکیم ذو فنون	خم نشیں ہو کر رہا اک بخت خوں
چاہا حکمت سے مجسم پھر میں ہوں	عقل و دانش ہو گئی جہل و جنوں
آدمی مجبور ہے تقدیر سے	
قیس لیلےٰ پر جو مفتوں ہو گیا	دہر میں مشہور مجنوں ہو گیا

شہر چھوٹا وقف ہاموں ہوگیا ناقہ آگر بخت داغ دل ہوگیا
آدمی مجبور ہے تقدیر سے

کوہ کن شیریں کا عاشق تیشہ گیر لے گیا تھا پیش خسرو سے فقیر
پیرزن کی حسرت سنگ ناگزیر جان شیریں کھوئی لا کر جوئے شیر
آدمی مجبور ہے تقدیر سے

میں کہ ہوں گلزار معنی میں نسیم حرف میرے رکھتے ہیں گل کی شمیم
بلبل آسا گو ہزاروں ہیں فہیم ایک سے حاصل ہوا نے زر نہ سیم
آدمی مجبور ہے تقدیر سے

مخمس دیگر

لیتا ہے جسکا نام ترا دان نشاں کہاں کیا تاب تیری چاند کہاں اور کتاں کہاں
ذرہ اور آفتاب کا ممکن قراں کہاں دل تو کہاں وہ موش نامہرباں کہاں
ناداں ہے زمین کہاں آسماں کہاں

اپنے ہی دن بُرے تھے تجھے کیا بھلا کہیں پھیر اپنی ہی سمجھ کا رہا دلکو کیا کہیں
سرگشتگی کے شوق کا کیا ماجرا کہیں کعبہ کہیں کنشت کہیں میکدہ کہیں
تیرے لئے خراب ہوئے ہم کہاں کہاں

حاصل کسی سے تھا نہ جواہر نہ زر نہ سیم ایک واہ وا فقط سو ہوا ہو گئی فہیم
وہ وقت ہے کہ کہتے ہیں خاقانی و کلیم کیا کہئے شعر خون جگر کھا کے اے نسیم
جوہر شناس کی کہاں قدرداں کہاں

تمام شد

قطعہ تاریخ طبع سابق از شاعر شیریں مقال ناظم نازک خیال منشی بھگوان دیال صاحب عاقل ایجنٹ مطبع ہذا

گلزار نسیم در لطافت	گلدستۂ گلشن طرب ہست
عاقل گل سال عیسوی چید	باغ شاداب این عجب ہست
	۱۹۱۲ء

ولہ

بلا تشبیہ گلزار نسیم است	تر و تازہ عجب پر آب باغے
زکلک شاخ گل عاقل بہ ہجری	رقم کردم چھپا شاداب باغے
	۱۳۳۰ھ

خاتمۃ الطبع مباحثۂ گلزار نسیم

از فخر الاطبا ابو المعانی ظہیر الدین حکیم سید حسین صاحب گریاں زیدی لکھنوی

ہزار ہزار شکر ہے اُس خدا کیلئے کہ جسنے انسان کو قوت گویائی عطا فرمائی کہ جو اُسکے اظہار فضل و کمال کا ذریعہ قرار پائی۔ بنا بر مذاق حکما یہی قوت ما بین انسان و دیگر حیوانات حد فاصل ہوئی۔ گویا انسان جا بہ انسانیت میں اسی کے زینے ہن ہونے سے ہوا۔ صحن عالم زمانہ کے طویل ہونے اور مخلوق کے کثیر ہونیسے جوں جوں وسیع و کشادہ ہوتا گیا شعر و سخن و فصاحت و بلاغت کیطرف ہر شخص فطرتاً اُسی قدر زیادہ متوجہ ہوتا گیا بغرض کے آخر زمانہ کی حالت اس امر سے بخوبی معلوم ہوسکتی ہے کہ ہمارے پیغمبر آخر الزماں کو معجزہ میں بھی ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہوئی کہ جو تمام فصاحت و بلاغت کا دعویٰ کرنیوالوں کے دم بند کرکے سب کے سر ایسے واحد یکتا کی طرف جھکادے کہ جسنے اس قوت کو کوہ طور پر ایک درخت میں ظاہر فرما کر حضرت موسیٰ سے باتیں کرادیں۔ اور یہ امر خلاف فطرت دکھا کر اپنی قدرت کاملہ کو ثابت فرمادیا زمانہ سابق میں جس نبی کو جس معجزہ کی ضرورت تھی وہ اُسے عطا ہوا چنانچہ ہمارے نبی ایسے زمانہ میں معبوث ہوے کہ اُس زمانہ میں عرب کا بچہ بچہ بھی شاعر فصیح و بلیغ تھا لہذا اُسی فن میں کہ جسمیں اُنکو بڑے بڑے دعوے تھے اور یہاں تک نوبت پہونچی تھی کہ اشعار کی فصاحت پر سجدے کیے جاتے تھے ایسی کتاب حضرت کا اعجاز قرار دیگئی کہ جسکی ایک آیت کا بھی بڑے سے بڑے فصیح و بلیغ جواب دیسکے اور اپنا سا منھ لیکر رہگئے اور بالآخر کہدینا پڑا کہ انسان کا تو ایسا

کلام ہو ہی نہیں سکتا۔" خداوند عالم کا خوان نعمت فصاحت و بلاغت عرب ہی کیلئے مخصوص نہ تھا بلکہ ہمارے ہند میں
بھی ایسے ایسے شاعران نازک خیال شیریں مقال پیدا ہوئے کہ جنھوں نے اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت سے ہمارے
ہند کی زبان کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں دلہن کیطرح سجدیا۔ اور کلام میں ایسی ملاحت و دلبری پیدا کی کہ بیساختہ
دلدادگان سخن کی رال ٹپک پڑے۔ نہ معلوم لفظوں میں کچھ ایسی ادائیں پیدا ہوئیں کہ جو دلوں کو اپنا کیے لیتی ہیں
کلمات ایسا چلتا ہوا جادو بن گئے کہ جو کبھی خطا ہی نہیں کرتا چنانچہ کتاب مباحثہ گلزار نسیم میں کسی کو اختلاف
نہیں ہوسکتا کہ اسکے سلسلۂ مضامین کے روبرو اچھی خاصی موتیوں کی لڑی بھی مات ہے ایسی ایسی دلربائیاں
اور دلچسپیاں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہیں کہ اگر ہزارہا مرتبہ دیکھیے تو تسکین و سیری نہو بلکہ ہر مرتبہ شوق بڑھتا
جائیگا کیونکہ اسکے مضمون کی آمد ہے کہ ایک موسلا دھار مینھ کی بوچھار یا یہ کہیے کہ ایک دریا اُمڈا چلا آتا ہے
گویا وہ وہ منظر کہ جنکو اُبھرتی ہوئی نوجوان طبیعتیں ہر چہار طرف ڈھونڈتی تھیں جن جنکا اسمیں جمع کئے گئے ہیں ہر
تصنیف مصنف کی بقدر حیثیت دلچسپی اور خوبی میں حصہ لیتی ہے اسمیں جو کچھ بھی خوبیاں ہوں کم ہیں کیونکہ وہ
کونسا شخص ہوگا کہ جو شاعر خوش مقال عدیم المثال پنڈت دیا شنکر صاحب نسیم لکھنوی سے یا انکی مثنوی
موسوم بہ گلزار نسیم سے بیخبر ہوگا کہ جسکو آپنے بہت سا اپنا وقت عزیز صرف کرکے صرف پبلک کی دلچسپی اور تفریح
طبع کی جہت سے قصہ گل بکاؤلی کو اسطرح سے نظم میں ادا فرمایا تھا کہ جسکے حسن و خوبی کا تمام اہل ہند نے باتفاق
اعتراف و اقرار کر لیا۔ اور یہ امر کیا اس کتاب کی بلندی قدر کیلئے کم ہے کہ شعرائے نامدار اور سخن سنجان دیار و امصار نے
گویا اسپر اعتراض کرنا اپنا فخر سمجھا ہے اسی وجہ سے کتاب مباحثہ گلزار نسیم کا مطالعہ علاوہ ان تمام خوبیوں کے پبلک
کیلئے نور علی نور سے بھی بڑھکر سہ چند لطف زائد کرنیوالا ہے کہ یہ جہاں اور دلچسپیاں بخشیگی وہاں پر بطور ایک
کامل استاد مناظر کے ثابت ہوکر مناظرہ اور مباحثہ کا سبق پڑھائیگی۔ کیونکہ یہ ان تمام شعرائے نامدار و باذوقان زمانہ
روزگار کے اعتراضات و جوابات کا مجموعہ بھی ہے کہ جو نسیم سے شخص کے کلام پر کئے گئے۔ کتاب کیا ہے گویا عطر مجموعہ
ہے کہ جسمیں ہر ہر قسم کے پھول کی مہک آرہی ہے ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ بنا بریں یہ کتاب
لاجواب بسرپرستی عالیجناب مستغنی عن الالقاب رائے بہادر منشی رام کمار صاحب بھارگو دام اقبالہ و زاد جلالہ
مالک مطبع منشی نولکشور حصہ اول و حصہ دوم یکجائی دوسری مرتبہ بحسن اہتمام کیسر داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ مطبع
موصوف بماہ جولائی ۱۹۴۲ء مطابق رجب المرجب ۱۳۶۱ھ بتصحیح تمام و تنقیح مالا کلام حلیۂ طبع سے مزین ہوکر
کحل الابصار ناظرین و سرمۂ چشم شائقین ہوئی۔ حق تعالیٰ مقبول عالم فرمائے بمنہ و کرمہ۔ آمین۔



ٹینی مرغی کے خاکی انڈے

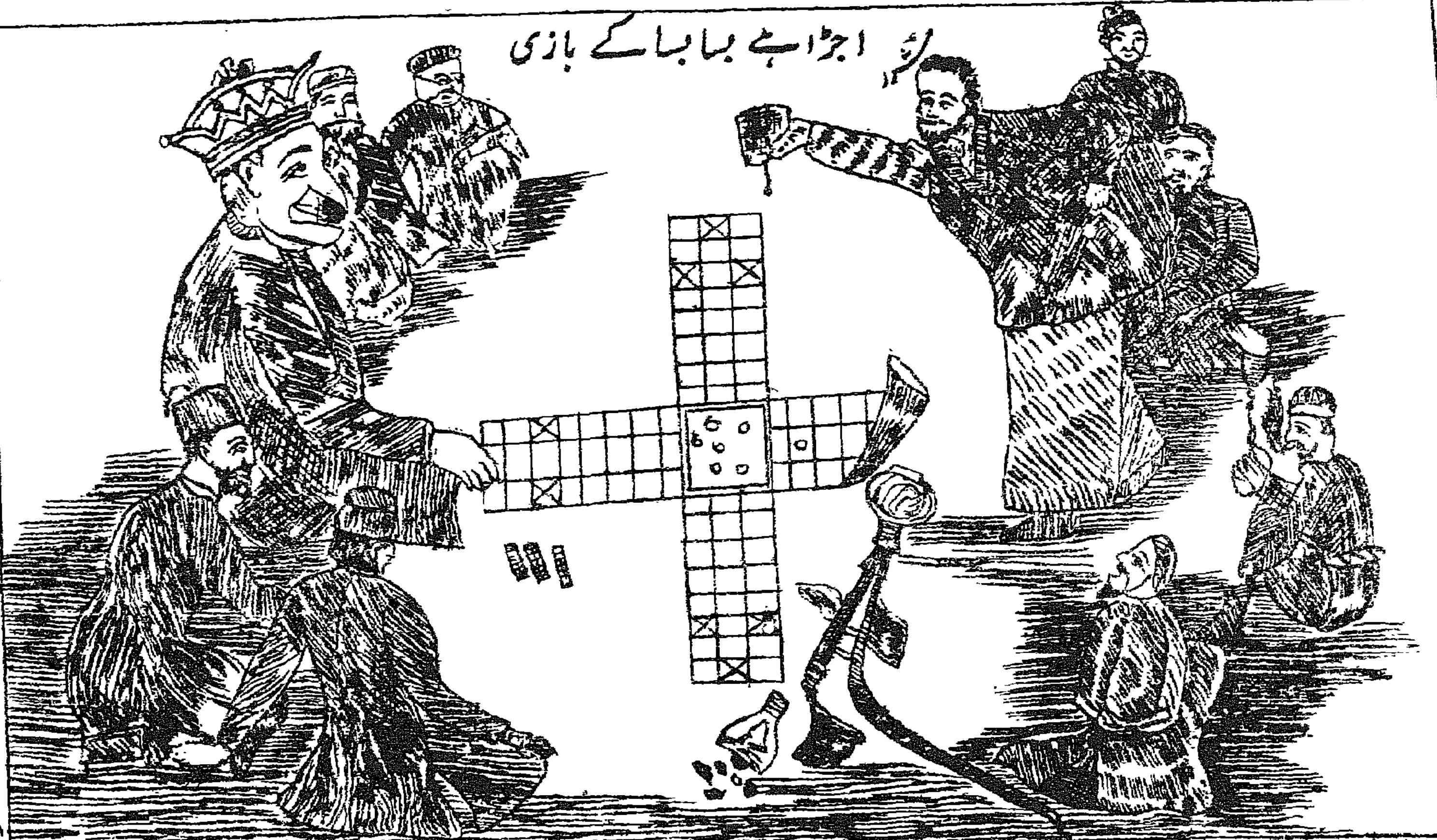


ہر کہ با فولاد بازو پنجہ کرد پنجۂ سیمین خود را رنجہ کرد

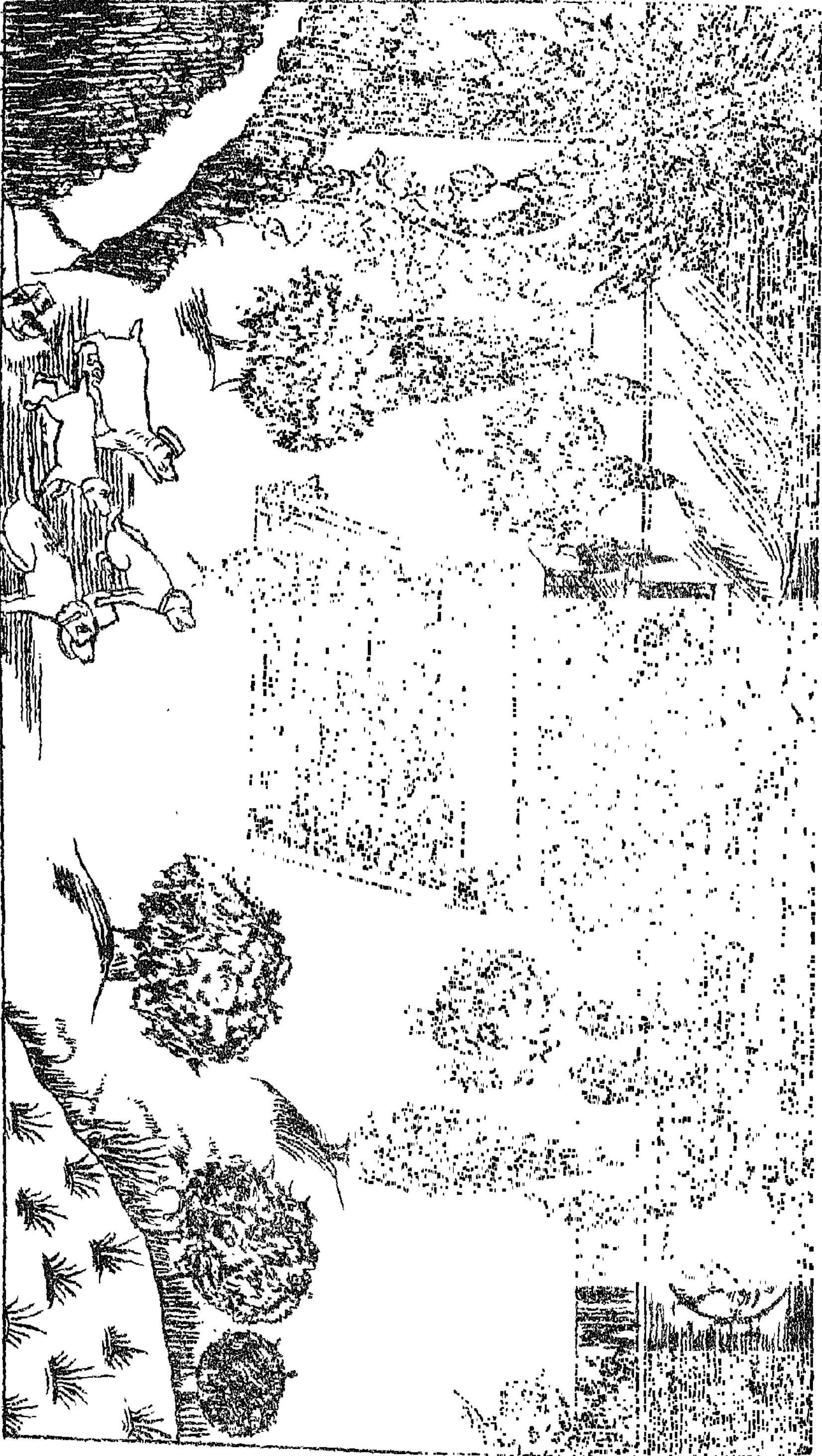


گلزارِ نسیم اور معترض





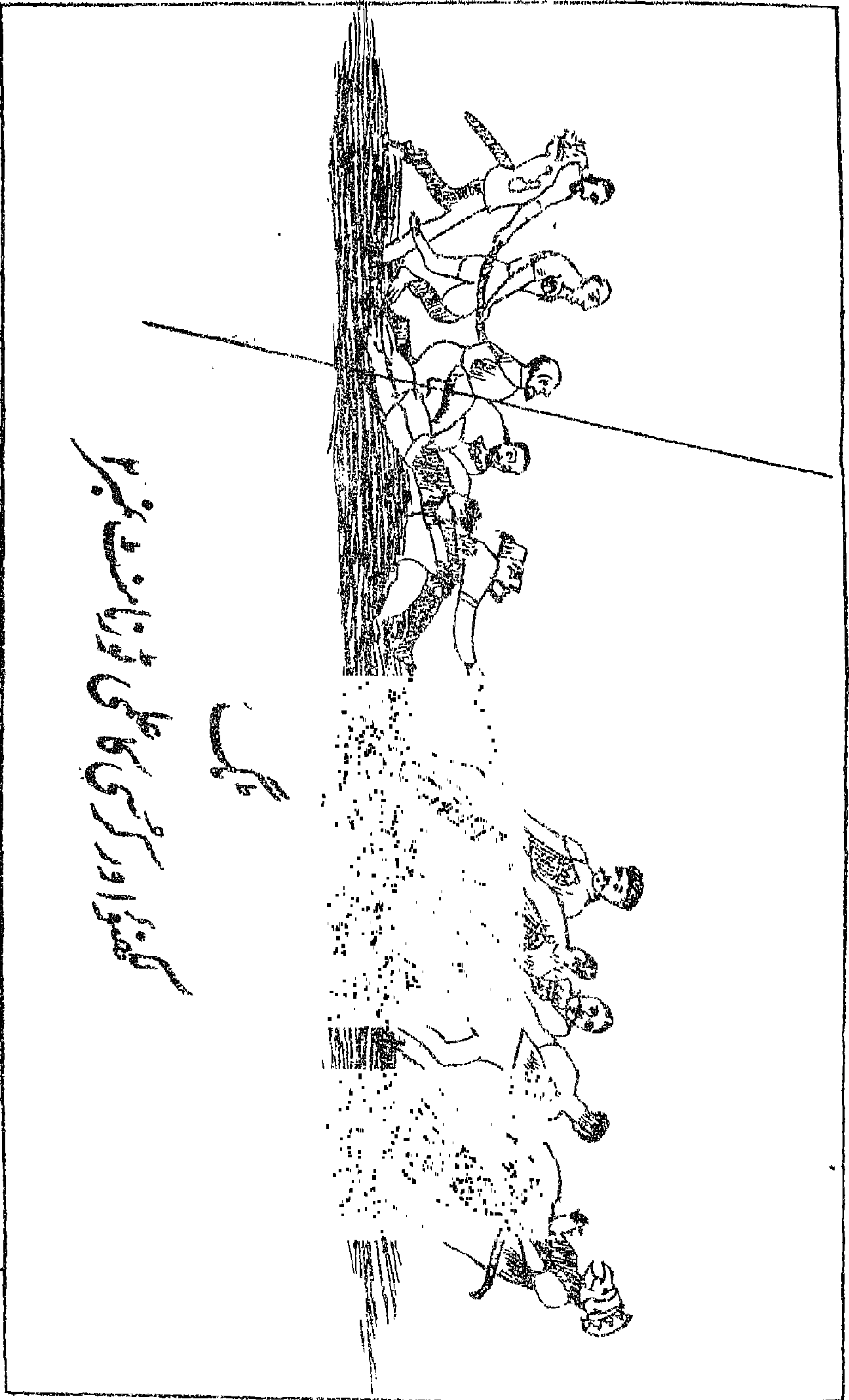
ہارا جواری - (تمر ہ) جائیے .. .. میں ایسے شہدوں سے نہیں کھیلتا .. .. میری سب گوٹیں پیٹ لیں .. بڑے جیتنے ہو .. .. سب بتائی ہوئی چالیں ہیں .. چکبست اشارے کرتا تھا
پنچ - واہ راجہ نل - ہارے تو لگے گالیاں دینے - رونے کی تمہیں بڑی ہے - یہ کھیل نہیں ہے چوسر کی بازی ہے -



مہ نور مے فشاند و سگ بانگ مے زند



لکھنؤ اور کرسی کا علمی فٹ بال ٹورنامنٹ


ٹاگ
لکھنؤ اور کرسی کا علمی ٹورنامنٹ نمبر ۲



کرکٹ ۔ لکھنؤ اور کرسی کا ٹورنامنٹ نمبر ۳



بیاباں کا ٹیلہ